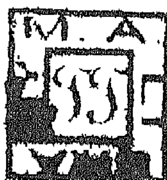
معاشیاتِ قومی

از

فریڈرش لسٹ

مترجمہ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب



کتاب منزل۔ لاہور

اپریل ۱۹۴۶ء

بار اوّل   تعداد ۲۰۰۰

قیمت مجلد آٹھ روپے   عـہ ۲

شیخ غلام علی اینڈ سنز مالکان "کتاب منزل" نے اپنے مطبع علمی پرنٹنگ پریس
میں باہتمام فیروز الدین پرنٹر طبع کرا کے کشمیری بازار۔ لاہور سے
شائع کی

فہرست مضامین

دوسری کتاب

نظریہ

تعارف

مشہور جرمن معاشی فریڈرش لسٹ کی مشہور کتاب **Das nationale System der politischen Oekonomie** کا ترجمہ اردو پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ ترجمہ کئی سال ہوئے کیا تھا۔ خیال تھا کہ معاشیات کی چند مستند کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو جائے۔ انگریزی کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے، سوچا کہ کچھ جرمن کتابیں بھی ترجمہ ہو جائیں تو اچھا ہے۔ یہ ترجمہ کیا لیکن اسے اب تک شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس لئے اور کسی کتاب کی باری نہ آسکی۔ اتفاق دیکھئے کہ اس کتاب کی اشاعت کی صورت ۱۹۴۶ء میں نکلی۔ اس کے مصنف نے شدید علالت اور آلامِ روزگار سے تنگ آکر جون ۱۸۴۶ء میں خودکشی کر لی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جس جرمن قومی معیشت کی تعمیر میں اس کا حصہ شاید اور کسی سے کم نہ تھا وہ بھی قیادتِ عالم کے جوئے میں اپنے وجودِ قومی کی بازی لگا کر ہار چکی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے بھی خودکشی کر لی۔

پھر یہ کتاب کیوں شائع کی جا رہی ہے؟ اس لئے کہ انسانی زندگی کے اکثر مسائل مختتم طور پر حل نہیں ہوتے۔ بار بار نیا روپ لیکر سامنے آتے ہیں اور دعوتِ تلاش دیتے ہیں۔ پچھلی جنگ میں جرمن اور جاپان کی شکست کے بعد سے زندگی کے معاشی نظم کی از سرِ نو ترتیب کا سوال دنیا کے سامنے ہے۔ ایک عالمی نظام کے منصوبے بن رہے ہیں۔ آزاد تجارت کی تائید میں وہ آوازیں اٹھ رہی ہیں جن کو سننے پر

دنیا مجبوری معلوم ہوتی ہے۔ ساتھ ہی نئی قومیں جو زندگی کی دوڑ میں اوروں سے پیچھے نہیں اور ابتدائی تجربات سے آگے بڑھنے کا حوصلہ کر رہی ہیں اپنی معیشتوں کو مضبوط کرنا چاہتی ہیں لیکن آزاد تجارت کے پرانے خیال کے ساتھ آزاد معیشت کا جو خیال تھا وہ اب کسی کو بھاتا نظر نہیں آتا۔ ریاست اور معیشت کے تعلق کے باب میں اہل عمل اور اہل فکر دونوں ہی کا رجحان ریاست کی مداخلت کی حمایت میں معلوم ہوتا ہے اگرچہ اب بھی کہیں کہیں کوئی میزز Mises اور کوئی ہائک Hayek انسانیت کو اس فتنۂ عظیم سے متنبہ کرتے ہی جاتا ہے۔ بہرحال جس قسم کے مسائل سے لسٹ کا زمانہ دوچار تھا وہ ہی نہیں تو اس جیسے مسائل اس وقت بھی دنیا کیلئے مرکز توجہ بنے ہوئے ہیں شاید اس کتاب کا مطالعہ ان مسائل کے صحیح فہم میں کچھ مدد دے سکے۔

ہمارے ملک میں اس کتاب کا مصنف کچھ بہت معروف نہیں ہے اس لئے اس کی زندگی اور اس کے خیالات کا ایک مختصر سا خاکہ اس تعارف میں پیش کر دینا شاید مفید ہو۔

فریڈرش لسٹ ۶۔ اگست ۱۷۸۹ء کو رائٹلنگن میں پیدا ہوا۔ باپ دباغ تھا۔ کھاتا پیتا اور ہم جنسوں میں معزز۔ نسب نوابان وارٹم برگ کے ایک میر شکار سے ملتا ہے۔ خاندان کی ایک شاخ علوم دینی کی طرف مائل ہوئی۔ اور اس میں بہت سے عالم اور مذہبی لوگ پیدا ہوئے۔ دوسری شاخ نے دباغی کا پیشہ اختیار کیا۔ لسٹ کے باپ نے اس پیشہ میں اچھی حیثیت حاصل کی۔ ماں بڑی سلیقہ والی .. بیوی تھی دو بیٹیوں سات بیٹیوں کا پالنا کچھ کھیل نہیں۔ ماں کا انتقال ۱۸۱۴ء میں ہوا جب لسٹ کی عمر ۲۵ سال کی تھی باپ کا انتقال ایک سال پہلے ہو چکا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد وراثت کے قضیوں کے سلسلہ میں بیوی سے، بلکہ اس کے وکیل سے، کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ سرکاری اہلکاروں نے اسے قابل مواخذہ قرار دیا اور دو ... بیت کے زور نے اس غریب بیوہ کو عدالت میں گھسیٹا۔ یہ شریف عورت ایسی پکڑ دھکڑ کی

عادی کہاں تھی، پھر عدالت میں جرح قدح اس بدتمیزی سے کی گئی۔ کہ اس غریب کا دل ٹوٹ گیا۔ سو بیمار پڑی مشکل سے سہارا دیکر گھر تک لائے۔ تبھی اس وقت کہا کہ بس میں تو ہو چکی، اور واقعی چند روز بعد ہی دنیا سے چل بسی۔ یہ لسٹ کا پہلا تجربہ تھا دفتریت اور اس کی جبروت کا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد لسٹ کے بھائی پر ایک واقعہ گزرا۔ یہ نوجوان شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فوجی خدمت لازم تھی۔ اس سے بریت کے لیئے کچھ کارروائی کرنی تھی۔ دفتر میں گیا۔ بتایا گیا کہ اسٹٹ گارٹ میں کاغذات ملیں گے۔ جن محرر صاحب نے یہ اطلاع دی انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ دس چہرہ شاہی ادھر کھسکاؤ تو اس سفر کی زحمت سے بچ سکتے ہو۔ نوجوان کو یہ بات بری لگی، کہا معاف کیجیئے میں خود جا کر کاغذات لے آؤنگا۔ بیچارہ کاغذات کے لیئے اسٹٹ گارٹ گیا۔ وہاں بتایا گیا کہ کاغذات تو رائٹلنگن ہی میں ہیں اور اگر ۲۴ گھنٹہ کے اندر داخل نہ کرائے گئے تو فوجی خدمت کے لیئے حاضر ہونا ہوگا۔ اس غریب نے ایک اچھا سا گھوڑا لیا۔ اور اسٹٹ گارٹ سے رائٹلنگن تک کا ۱۰ میل سے اوپر کا فاصلہ ہے۔ گھوڑے پر طے کرنا چاہا۔ منزل پر پہنچنے سے کچھ ہی پہلے گھوڑا دم ہار کر گر گیا اور سوار کے بھی ایسی چوٹیں آئیں کہ جانبر نہ ہوا۔ ان دونوں واقعات نے دفتریت کے خلاف لسٹ کے دل میں ایسی نفرت پیدا کر دی کہ عمر بھر نہ مٹی اور اس نے خود اس کی زندگی کو بھی بہت کچھ تلخ بنایا۔

لسٹ ۱۷۸۹ء میں ۶۔ اگست کو پیدا ہوا تھا۔ یعنی فرانس کے اس تاریخی جلسہ کے دو ہفتے بعد جس نے حقوق امتیازی کو ختم کر دیا تھا۔ اس لیئے لسٹ کے سر میں پہلے دن سے اس نئے انقلابی دور کی ہوا بھری تھی۔ جو جمہوریت قومی کے خیال کو دنیا کی نجات کا ضامن مانتا تھا۔ وہ ساری سادہ

دلی اور خوش عقیدگی جس نے ایک نئے عہد کو حرکت دی، جس نے زندگی میں عظیم الشان تغیرات پیدا کئے اور جس کے غلط استعمال نے زندگی کو بے حساب پیچیدگیوں میں بھی ڈالا اور جو بالآخر جنگ و جدال کے طوفانِ خونی میں ڈوب کر ختم ہوئی۔ وہ ساری سادہ دلی اور خوش عقیدگی لسٹ کے دل و دماغ میں کارفرما ہے۔ لیکن اس کے یہاں تربیت کے خیال میں صحیح جمہوریت کی بھینی بھینی مستی ہے اس کے خمار سے وہ نا آشنا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس انقلابی مستی میں پہلا خیال قوم کا نہ تھا، انسانیت کا تھا۔ چنانچہ لسٹ کی قوم پرستی کا پس منظر بھی انسانیت عامہ ہے۔ ایک طرف دفتریت کے تلخ تجربے اسے چھوٹی چھوٹی نوابیوں اور ریاستوں کا مخالف بناتے ہیں، دوسری طرف صنعت جدیدہ کی ترقیاں خصوصاً وسائل حمل و نقل کی ترقیاں، ساری انسانیت کے ایک اچھے نظم کی امید دلاتی ہیں۔ دونوں کے بیچ میں اسے متحدہ مضبوط قومی معیشت ایک درمیانی عبوری منزل کی حیثیت سے دکھائی دیتی ہے۔ قومی آئین جس کی حمایت کے ساتھ اس کا نام منسوب ہے، وہ بھی اس کے نزدیک بس ایک عارضی تعلیمی و تربیتی عمل ہے، مقصود ہے دراصل مساوی الحقوق قوموں کی جمعیت جس میں ایک قوم دوسری قوم کی حق تلفی نہ کر سکے۔

کوئی دیکھے تو طبیعت کے رجحان لڑکپن ہی سے معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن ماں باپ، استاد، عزیز و اقارب، اکثر و بیشتر اپنی مرضی کا ٹھپہ بچہ کی اثر پذیر طبیعت پر لگانا چاہتے ہیں۔ اور اس نرم مسالہ کو اپنے من مانے سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ لسٹ کا باپ بھی چاہتا تھا کہ اپنے اس لڑکے فریڈرش کو کسی علمی پیشہ میں بھیجے۔ چنانچہ انہیں لاطینی مدرسہ میں بھیجا گیا۔ اس میں یہ کچھ یونہی یونہی سے رہے۔ تجربی علوم کی طرف میلان زیادہ لیکن کلاسکی ادبی ذوق سے تقریباً بے بہرہ۔ شاعری

سے بھی بس یونہی سا لگاؤ۔ فلسفہ کی طرف ذرا بھی میلان نہیں۔ ادبی تعلیم کا انتظام اور طبیعت میں علوم
فطری اور صنعت جدید کی طلب۔ غرض تعلیم راس نہ آئی۔ اور ۱۴ برس کی عمر ہی میں اسے مدرسہ سے اٹھا
لیا گیا۔ باپ نے دیکھا کہ لڑکا ادیب نہیں بن سکتا تو سوچا کہ آبائی پیشہ ہی میں اسے لگایا جائے۔ چنانچہ
۱۸۰۳ء میں فریڈرش نے باپ کے ساتھ چمڑا صاف کرنے کا کام شروع کر دیا۔ مگر اس سے بھی بیزار
نظر آیا۔ یہ کام کی کثافت، بدبو، اور غلاظت پر پہلے ہی دن سے ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اس کے دل
میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ایسا کام تو شرفِ انسانیت کے خلاف ہے۔ اسے تو مشینوں سے کرانا
چاہیئے۔ غرض زمانہ کے عام رجحانات سیاسی اور صنعت کی نئی نئی ترقیاں رفتہ رفتہ اس کی زندگی کا
تانا بانا بن جاتی ہیں۔ قومیت کا جدید تصور جو فرانسیسی انقلاب سے سارے ترقی پسند جرمن نوجوانوں نے
مستعار لیا تھا وہ آہستہ آہستہ لسٹ پر قابو پاتا ہے اور اس کا تخیل بھاپ کے انجن اور مشینوں کی ایجاد سے
اس طرح متحرک ہوتا ہے کہ آئندہ یہ اپنے ملک کے لیئے جو کچھ کرتا ہے اور جو کچھ سوچتا ہے وہ اسی خیال
سے کہ نئی صدی کی تقدیر مشین کے ہاتھ ہے بخصوصیت سے جرمنی کی قسمت۔

ادبی مدرسہ سے بیزار، دباغی کے مکروہ کام سے نفور، یہ پرجوش انسان کرے تو کیا کرے بس
ایک ہی راہ فرار نظر آتی ہے، محرّری! چنانچہ ۱۸۰۶ء میں محرری شروع کی جس دفتریت کا یہ عمر بھر مخالف
رہا۔ اس کی مصیبت میں سے خود بھی گزرا ہے، افسروں کی خوشامدیں کی ہیں۔ ان کی سرپرستی حاصل کیے
جلد جلد ترقی بھی ہوتی ہے۔ ہمارے دفتروں میں بھی آج کتنے ہی نوجوان ایسے ہیں جو لسٹ کی طرح
اپنی قومی زندگی کے رخ کو بدلنے کا کام کر سکتے ہیں، مگر ساری عمر محرّری میں صرف کرنے پر مجبور سے
ہیں۔ پھر کون سا دانا ہے جو دفتریت کی اس بھاری چکی میں سے گزرے اور بے پسے ثابت نکل آئے

بس کوئی کوئی ہی ہو سکتا ہے، فریڈرش ان میں ہی سے تھا۔ چھ سات سال پورے کرنے کے بعد
۱۸۳۱ء میں اس کا تبادلہ ٹیوبنگن Thuebingen کا ہوا۔ یہاں لکھے پڑھے لوگوں سے ملنے کا موقع
ملا۔ تو اُسے اپنی کم علمی کا شعور ہوا۔ ٹیوبنگن کے دارالعلوم کی علمی فضا نے اُسے اپنی طرف کھینچا اور اُس
نے یونیورسٹی کے قانون کے لیکچروں میں شرکت کرنی شروع کی۔ چونکہ یہ شرکت اپنے دفتری کاموں کے
علاوہ تھی۔ اس لئے طلبا کی تفریحی زندگی سے الگ ہی رہا۔ یُوں بھی طبیعت ذرا سنجیدہ تھی۔ پینے پلانے
کی محفلوں سے کنارہ کش ہی رہتا تھا۔ عمر بھر پانی کو شراب پر ترجیح دی۔ اپنے کام کے علاوہ جو وقت بچتا
مطالعہ پہ صرف کرتا۔ اور مطالعہ ایسا نہیں جیسے امتحان پاس کرنے والے رسمی طور پہ کرتے ہیں بلکہ اس
طرح جیسے کسی چیز کی تلاش ہے اور تلاش میں دوسروں کے افکار سے مدد کا طالب ہے۔ اس کے
ایک اُستاد پروفیسر مال بلانک کی رائے اس کے متعلق محفوظ ہے جس سے اس کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے
فرماتے ہیں کہ "یہ لسٹ نہ جانے کہاں کہاں کی سوچتا ہے، جو من میں آتی ہے پڑھتا ہے، کبھی اس خیالی
مانٹسکیو کو، کبھی ابراہیم اشمد کو (مراد ہے آدم اسمتھ) کبھی یوحان آدم کو (مراد ہے فان پانسٹ سے) اور کبھی
نواس باگل شان شاک تک کو (مراد ہے ژان ژاک روسو) غرض اسی قسم کی بے معنی لغویات، یہ کبھی متفق
نہیں ہو سکے گا"۔ بالکل صحیح کہا تھا حضرت اُستاد نے کہ یہ متفق نہیں ہو سکے گا۔ بیشک لسٹ ان لوگوں
میں نہیں تھا جو اپنے سماج کو جس حال میں پاتے ہیں، اسی میں قائم رکھنے کے لئے قانون کے حصار بناتے
ہیں، وہ ان میں سے تھا جو سماج کے لئے تازیانہ کا کام دیتے ہیں۔ اسے تشکیل حیات کے لئے نئے
امکانات سُجھاتے ہیں، اور اس کی طرف انہیں بڑھاتے ہیں۔ اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں افکار
جدیدہ کے جس طوفان سے لسٹ کا ذہن دوچار تھا اس سے حضرت استاد کی سطحی واقفیت کا پتہ تو "ابراہیم اشمد"

اور "یوحان آدم" اور "شان شاک" ہی سے چلتا ہے، استاد صاحب ماضی پر تکیہ کیے ہوئے ہیں، اور شاگرد کی نظر مستقبل پر جمی ہوئی ہے۔ وہ اسے منشی بنانا چاہتے ہیں اور وہ ایک نئی معیشت کی بنا ڈالنا چاہتا ہے، استاد نے سچ کہا تھا، لسٹ منشی تو نہ بن سکا، مگر اس نے ایک نئی معیشت کی طرح ضرور ڈال دی۔

یونیورسٹی سے لسٹ نے ایک امتحان بھی پاس کیا۔ چانسلری میں مددگاری کے عہدہ پر پہنچا اور اس کے بعد وزارت میں معتمد ہو گیا، تھوڑے ہی دن میں یعنی ۱۸۱۶ء میں وہاں نگرانِ اعلیٰ بنا دیا گیا، صورتِ حال یہ تھی کہ ریاست ورٹمبرگ کے جمہور میں بے چینی تھی اور بادشاہ کا خیال تھا کہ ایک لبرل دستور دے کر اس بے چینی کا آغاز ہی میں تدارک کر دے، بادشاہ کے ساتھ لسٹ اور اس کے دوست شلائر Schlever جو بعد کو وزیر بھی ہوا، لگ گئے، دفتری بدنظمی پر بھی بڑی بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ وزیر وانگن ہائم نے اس گھس گھس کو ختم کرنے کے لئے تجویز کی کہ پرانے محرروں کی جگہ یونیورسٹی میں تعلیم پائے ہوئے عہدہ دار مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ اس نے ٹیوبنگن یونیورسٹی میں قانون اور معاشیات کا شعبہ کھلا، اور اس میں لسٹ کو پروفیسر مقرر کیا۔ استاد کی حیثیت سے لسٹ نے جن آزادانہ خیالات کی تلقین کی ان کا کچھ پتہ اس کتابچے سے چلتا ہے جو لسٹ نے اپنے درس کے اشارات کے طور پر ۱۸۱۸ء میں شائع کیا تھا[1]، اس زمانہ میں لسٹ نے ایک رسالہ بھی نکالنا شروع کیا[2]۔ لیکن جب وانگن ہائم کی وزارت

---

[1] Die Staaskunde und Staatspraxis Wuertembergs
(ورٹمبرگ کا نظم و نسق، علمی اور عملی نقطۂ نظر سے)

[2] Der Volksfreund aus Schwaben, ein Vaterlandsblath fuer Sitte, Freiheit, und Recht

ٹوٹی تو لسٹ پر بھی اس کے خیالات کی وجہ سے لے دے شروع ہوئی، جواب طلب ہوا۔ پھر ۱۸۱۹ء
میں جب اس نے جرمن جمعیتہ تجارت و صنعت Deutscher Handels und
Gewerbeverein قائم کرائی تو پروفیسری سے علیحدہ ہونا پڑا۔ قصہ یوں ہوا کہ گوٹے
ٹنگن جاتے ہوئے ایک مرتبہ فرانک فرٹ میں بہت سے تاجروں اور کارخانہ داروں سے مبادلۂ خیالات
ہوا۔ انہوں نے لسٹ سے درخواست کی کہ جرمن ریاستوں کی تجارتی مجلس میں پیش کرنے کے لئے ایک
درخواست کا مسوّدہ تیار کر دیں کہ ملک کی اندرونی تجارت کو داخلی محاصل سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔
انہیں اُٹھا دیا جائے۔ لسٹ نے مسوّدہ تو تیار کر دیا لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ سب مل کر ایک انجمن
بنائیں اور اپنے خیال کو منوانے کی کوشش کریں، اس کے لکھنے پڑھنے کا سارا کام اپنے سر لیا، اس کی وجہ
سے حکومت ناخوش ہوئی تو اس نے پروفیسری سے استعفا دے دیا جو ۱۲ مئی ۱۸۱۹ء کو منظور ہو گیا۔

لسٹ نے اس زمانہ میں ٹیوبنگن ہی میں پروفیسر زائی بولڈ Seybold کی لڑکی سے شادی
بھی کر لی تھی، استعفے کے بعد اس نے اپنا زیادہ تر وقت اس انجمن کے کاروبار کے لئے وقف کر دیا لیکن
یہ کام بھی بہت دن نہ چل سکا، ۱۸۱۹ء ہی میں اپنے شہر کی طرف سے اس کا انتخاب ورٹم برگ کے
چیمبر میں نمائندہ کی حیثیت سے ہوا تھا مگر انتخاب کو اس وجہ سے مسترد کر دیا گیا کہ اس کی عمر پورے ۳۰
سال کی نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۲۰ء میں آخر اس کا انتخاب پھر سے ہوا، چیمبر میں اس نے بڑی شد و مد سے کام
کیا، اپنے شہر کے لوگوں کی طرف سے ایک درخواست پیش کی جس میں موجودہ نظامِ حکومت اور نظم و نسق
کی برائیاں دکھائیں، اور شہر کے معاملات میں حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے مقدمہ
چلایا، الزام یہ لگایا کہ انتظامِ حکومت کے خلاف لوگوں کو اُکساتا ہے، چیمبر کی رکنیت سے خارج کر دیا،

اور دس ماہ کی نظر بندی کا حکم بھی دیا، (۲۹ دسمبر ۱۸۲۲ء کو) سزا پہلے نہ دی جا سکی۔ اس لیے لسٹ نے راہِ فرار اختیار کی، اس کے بعد برابر جگہ بہ جگہ رہا کہ جہاں جا کر ٹکنا چاہا، الساس میں، باڈن میں، سوئٹستان میں، وہیں حکومت نے پیچھا کیا اور کہیں قدم جمنے نہیں پائے، آخر اس گردش سے تنگ آ کر کچھ مالی پریشانیوں کی وجہ سے، کچھ اپنے ہم وطنوں کے اصرار پر ۱۸۲۴ء میں ورٹم برگ واپس آیا، ترحم خسروانہ کی درخواست دی، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا اور جو سزا دو برس پہلے تجویز کی گئی تھی اُسے پورا کرنے کے لیے آس برگ بھیج دیا گیا، جب یہ وعدہ کیا کہ ملک کے باہر چلا جاؤں گا تب کہیں جنوری ۱۸۲۵ء میں اُسے رہا کیا گیا۔ امریکہ جانے کا قصد پہلے سے تھا، امریکہ چلا گیا۔ ۱۰ جون کو امریکہ پہنچا، جنرل لافایت سے دوستانہ تعلقات تھے لیکن ان کی سفارش کے باوجود پہلے کوئی مناسب کام نہ مل سکا۔ پن سلوینیا میں ایک چھوٹی سی جائیداد خرید لی، سال بھر اسی پر گزر کیا لیکن سال بھر بعد اُسے چھوڑ کر ریڈنگ Reading میں ایک اخبار کی ادارت سنبھالی، یہاں تاجروں اور کارخانہ داروں سے سابقہ پڑا، صنعت کو فروغ دینے کے لیے یہاں ایک انجمن تھی۔ اس کے صدر انگرسل Ingersoll نے اس سے فرمائش کی کہ آزاد تجارت اور تامین کی جو بحث اس وقت چھڑی ہوئی تھی اس پر اپنے خیالات قلم بند کرے، تو اُس نے ۱۸۲۵ء میں دو رسالے لکھے، ایک

Outlines of American Political Economy in a series of letters addressed by Fredrick List to Charles J. Ingersoll.

اور دُوسرا

Appendix to the Outlines of American Political Economy in three additional letters to C. J. Ingersoll.

ان رسالوں میں پہلی مرتبہ تامین پر نظری بحث ملتی ہے اور آدم اسمتھ کے رائج الوقت مذہب کی مخالفت۔ تامین کی موافقت میں لسٹ کی ان تحریروں کو امریکہ کے اہلِ صنعت نے بہت پسند کیا۔ لیکن لسٹ کا دھیان ایک اور طرف ہو گیا تھا۔ اس لیے اُس نے اس تحقیق کو اس وقت اور آگے نہیں بڑھایا۔ ہوا یہ کہ ایک جگہ پہاڑوں میں گھومتے ہوئے اُسے ایک کوئلہ کی کان کا پتہ چلا، اُسے چلانے کے لیے اس نے سرمایہ داروں کی ایک کمیٹی بنائی، اُسے کامیابی سے چلایا، اس کی مالی حالت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مالی حالت جو سنبھلی تو وطن یاد آیا، گردش کے اس سارے زمانے میں اُس کا دل سچ یہ ہے کہ وطن ہی میں رکھا تھا، اب اُس نے وطن جانے کا ارادہ کیا، ۸ جون ۱۸۲۷ء کو صدر جمہوریہ نے ہامبرگ کا قنصل نامزد کر دیا تھا، خیال ہوا کہ یہ اور بھی اچھا ہوا، اب وطن میں زیادہ پوچھ ہو گی، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تائید ہو گی، کچھ کر سکیں گے، چنانچہ رختِ سفر باندھا اور ۲۰ دسمبر کو ہاور Havre میں جہاز سے اُترا، لیکن بدنصیبی دیکھئے فرانس میں پہنچنے کے بعد خبر ملی کہ امریکی سینٹ نے صدر کی نامزدگی کو قبول نہیں کیا، غریب وہیں فرانس میں ٹھہر گیا Revue Encyclopedique کے مدیروں سے مل کر ان کے پرچے میں ایک اہم مضمون ریلوں کے متعلق اور فرانس اور امریکہ کے تجارتی تعلقات کی اہمیت پر شائع کیا، اکتوبر ۱۸۳۱ء میں جا کر اپنے بال بچوں کو ساتھ لایا، اور کہیں ۱۸۳۲ء کی گرمیوں میں جرمنی پہنچا، امریکن حکومت نے اس بار اسے لائپزگ میں اپنا قنصل مقرر کیا تھا مگر سیکسنی کی حکومت نے کچھ دشواریاں پیدا کیں، تو پھر اُسے باڈن میں قنصل بنایا گیا، اسی زمانہ میں اسی Revue Encyclopedique کی فرمائش پر اس نے علوم سیاسی پر ایک جامع کتاب کی تصنیف کا کام شروع کیا۔ اس کتاب کی طباعت بھی ابھی شروع

نہ ہوتی تھی کہ اس نے ایک اور طرف رُخ کیا اور نہایت شدت سے ریلوں کی حمایت شروع کی، امریکہ ہی سے اُسے ریلوں کے مسئلے سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی اب اُس نے یہ کوشش شروع کی کہ سیکسنی میں پہلی ریل بنے، ایک زمانہ تک بس یہی دھن رہی، اس کی دلیلوں کی تاثیر اور اس کی پیہم تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لائپزگ سے ڈریسڈن تک ریل بن گئی، ۱۸۳۵ء میں اس نے مان ہائم سے بازل اور برلن سے ہامبرگ تک ریلوں کی تیاری کا کام شروع کرایا، ۱۸۳۵ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی ریلوں سے متعلق مسائل پر بحث کے لئے ایک پرچہ بھی نکال دیا[1]۔

یہاں لسٹ ان کاموں میں الجھا ہوا تھا اور امریکہ میں اس کی کانوں کا کام بگڑ رہا تھا، گزر اسی سے ہوتی تھی، تصنیف سے نام تو ہو رہا تھا لیکن پیٹ تو نہ پلتا تھا، اب جو کانوں کی آمدنی بند ہونے لگی تو کمانے کی فکر ہوئی، ۱۸۳۷ء میں پیرس گیا اور وہاں لکھ کر کمانے کا ڈول ڈالا۔ پیرس اکاڈیمی کی طرف سے ایک انعام کا اعلان ہوا تھا، مضمون لکھنا تھا اس مسئلہ پر "پابندی سے آزاد تجارت کی طرف آنے کا سب سے مناسب طریقہ کیا ہے"۔ لسٹ نے بھی مضمون لکھا۔ انعام تو اسے نہیں ملا مگر اس نے اس مسئلہ کو بنیادی طور پر سوچا، اور اس سے مضامین کا وہ سلسلہ ممکن ہوا جو جرمنی میں شائع ہوا، کچھ Allgemeine Zeitung میں، کچھ Deutsche Vierteljahrsschrift میں، یہی مضمون دراصل اس اہم تصنیف کی تیاری اور اس کا پیش خیمہ تھے، جس کا ترجمہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ۱۸۴۰ء میں یہ جرمنی واپس آیا اور اسی سال کے آخر میں یہ مشہور کتاب شائع ہوئی۔ جلد ہی اس کے

---

[1] Eisenbahnjournal und National Magazin fuer die bortschritte in Handel, Gewerbe und Ackerbau

نئین ایڈیشن نکلے، اور اس کا مصنف جو عملی آدمی بھی تھا، اس کتاب کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے
کے لئے اپنی جان کھپاتا رہا۔ کارخانہ والوں کی انجمنیں بنوائیں، اخباروں میں مضامین لکھے ۱۸۴۳ء میں
خود اپنا پرچہ Zollvereinblatt نکالا، اس میں نت نئے انداز سے بار بار حکومت کے
اس فرض کو لوگوں کے ذہن نشین کراتا رہا کہ محاصل کو بڑھا کر صنعت کو ترقی دینا اور اس کی منڈی کو
وسیع کرنا ریاست کا فرض ہے۔ انہیں خیالات کی حمایت میں ۱۸۴۴ء میں ایک لمبا سفر کیا، بلجیم
میں جا کر کوشش کی کہ بلجیم اور Zollverein میں تجارتی معاہدہ ہو جائے، ویینا جا کر زراعت
اور جنگلات والوں کی کانفرنس میں اپنے خیالات پیش کئے اور انہیں سمجھایا کہ صنعت کی تامین میں
زراعت اور جنگلات والوں کا بھی فائدہ ہے۔ دسمبر ۱۸۴۴ء میں ہنگری گیا، وہاں سے وہیں جگہ جگہ
پہنچا، ملک ملک کی ترقی کے منصوبے بنائے اور بتائے، اور کہیں جولائی ۱۸۴۵ء میں اپنی قیام گاہ
آوگزبرگ کو لوٹا۔ یہ آخری زمانہ بڑا سخت گزرا، سرکاری ملازمت میں مستقل روزگار کی تلاش ناکام رہی
صنعت والوں نے زبانی بہت واہ واہ کی مگر کمبخت پیٹ باتوں سے تو نہیں بھرتا، خدمات کا
معاوضہ کچھ بھی نہ دیا، خود اس کا اپنا امریکی کاروبار برباد ہو گیا، جن خیالات کے لئے اپنی ساری
قوت صرف کی تھی ان کے منوانے میں بھی دشواریاں ہی دشواریوں سے سابقہ رہا، مصیبت پر مصیبت
یہ کہ شدید بیماریوں نے آگھیرا۔ پھر بھی یہ جوانمرد کمر ہمت کھولنا نہ چاہتا تھا، رسالہ کا کام پابندی سے
کرتا رہا۔ جون ۱۸۴۶ء میں لندن کا سفر بھی کر ڈالا، کہ جا کر انگریزوں کو یہ یقین دلائے کہ جرمن قوم
کی خوشحالی اگر تامینی محاصل سے بڑھے تو اس میں انگلستان کا سیاسی فائدہ بھی ہو سکتا ہے، مگر قوتیں جواب
دے چکی تھیں، امراض و افکار، غم روزگار، ناکامی اور نامرادی، شکستگی و انتشار نے قوت عمل کے

اس مصیبے کو گھیر کر شکست دے دی، مایوسی غالب آگئی، زندگی کا بوجھ اس کے کندھے پر سنبھل سکا اور اس نے اس بارِ دوش کو اُتار پھینکا! پستول لیا اور ۳۰ جون ۱۸۴۶ء کو اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی ختم کر لی۔

"معاشیاتِ قومی" اسی شخص کی تصنیف ہے۔ لسٹ کے علمی کام میں یہ چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں:۔

(۱) اس نے معیشتِ قومی کی اہمیت جتائی، یہ بتایا کہ جدید معیشتِ قومی مظاہرِ قدرت میں سے ایک مظہر نہیں بلکہ بشری سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی ہے اور اسے اسی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

پندرھویں صدی سے جو عظیم الشان سیاسی قوتیں یورپ میں کارفرما ہیں انہوں نے جدید ریاست ہی کو نہیں پیدا کیا بلکہ جدید معیشتِ قومی کو بھی پیدا کیا ہے۔ یہ در اصل سترھویں اٹھارھویں صدی کی پیداوار ہے اور مرکزی سیاست کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی ہے۔ قدیم زمانہ میں معیشت قومی نہیں ہوتی تھی، بلدی معیشتیں ہوا کرتی تھیں، یا خاندانی معیشتیں۔ عظیم الشان سلطنتوں اور فاتحانہ مملکتوں میں بھی ربطِ معاشی نہیں ہوتا تھا، اور ان میں قومی معیشت کی سی یکجہتی مشکل ہی سے پائی جاتی تھی۔ سولھویں سے اٹھارھویں صدی تک کے زمانہ میں یہ سب بدل گیا، پہلے اٹلی کی نشاۃ ثانیہ والی ریاستوں میں، پھر ہسپانیہ اور پرتگال میں، پھر ہالینڈ، فرانس اور انگلستان میں، اور سب سے آخر میں جرمنی میں، اور وہاں سب سے پہلے پرشیا اور آسٹریا میں۔ لسٹ نے فرانس، انگلستان اور ریاستہائے متحدہ کی سیاست اور ان کے اداروں کا مطالعہ بغور کیا تھا اور قومی معیشت سے اُن کے ربط کو خوب

سمجھا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر بڑی ریاست کا اپنا معاشی نظام ہوتا ہے، اور وہ مجبور سی ہوتی ہے کہ اس میں وجود خود اختیاری کی خواہش کرے، اور اس کے لئے کوشاں ہو۔ اس کے قومی معاشی اغراض کا ایک مرکز ہوتا ہے اور ان کی تحصیل اس پر فرض۔ اس کا خیال ہے کہ معاشی معاملات میں بین الاقوامی تعاون، انفرادی نجی معیشتوں کے تعلق پر نہیں بلکہ قومی معیشتوں کے تعلق باہمی پر منحصر رہتا ہے۔ اس نے دوسری قومی معیشتوں کی تاریخ سے جرمن قومی معیشت کے لئے بہت سے سبق حاصل کئے تھے، اپنی علمی زندگی میں اس نے جو جو کوششیں بھی کیں، مثلاً ایک عظیم الشان ریلوں کا نظام قائم کرنے، نہروں کا نظام قائم کرنے، محصول خانوں کا نظام قائم کرنے کی کوششیں، یہ سب اس نے انگلستان اور شمالی امریکہ میں دیکھا تھا اور اسی راہ سے یہ تامین کے نظریے تک پہنچا تھا، جو بعد کو دراصل ایک معتدل سا مطالبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہمیشہ دہرایا ہے کہ ہمیں ہمیشہ تامین کی ضرورت نہ ہوگی، اور انگلستان مشین کی صنعت میں پہل نہ کر چکا ہوتا اور اسے دوسری ریاستوں پر غیر معمولی فوقیت نہ حاصل ہو گئی ہوتی تو اس وقت بھی اس کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن معیشت کے تقاضے ہر جگہ اور ہر وقت ایک سے نہیں ہوتے، حالات کے پیش نظر اسے بھی خالص زرعی جرمنی کی پہلی ضرورت وہی نظر آئی جو ہملٹن کو ریاستہائے متحدہ میں نظر آئی تھی یعنی ایک خالص زرعی ملک کو آگے بڑھنے کے لئے ہر دامن پر قومی صنعت قائم کرنی چاہئے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ترقی یافتہ پردیسی معیشتوں کے مقابلہ سے کچھ پناہ ملے، اور قدم جمانے کی مہلت حاصل ہو۔ یہ خیال اس لئے اسے اور بھی آیا ہوگا کہ نپولین کی براعظم والی ناکہ بندی میں جو صنعتیں یورپ میں وجود میں آگئی تھیں انہیں اس کے سامنے انگریزی مقابلہ کا ریلا بہائے

لئے جا رہا تھا۔ غرض لسٹ کے مسلک میں تاجن کا مسئلہ اتنا اہم نہیں جتنا یہ خیال کہ قومی معیشت ایک وجود مستقل رکھتی ہے، جس کے تقاضوں کی رعایت ریاست پر واجب ہے۔

(۲) دوسرا مسئلہ جسے لسٹ نے خاص اہتمام سے پیش کیا ہے، قوائے دولت آفرین کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ اس نے آدم اسمتھ کے نظریۂ اقدار کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ یہ سمجھنا تو نا انصافی ہوگی کہ اسمتھ نے صرف مادی اقدار کو پیش نظر رکھا ہے، اسمتھ معاشی ہی نہیں تھا بلکہ علم اخلاق میں بھی بڑا مرتبہ رکھتا تھا اور اس کی Theory of Moral Sentiments شاید علم کے لئے اس کی دولت والی کتاب سے کچھ زیادہ نہیں تو کم اہم بھی نہیں ہے لیکن چونکہ اس کا قصد تھا کہ معاشیات پر مستقلاً بحث کرے اور جو کچھ بلا واسطہ اس بحث سے متعلق نہ ہو اسے خارج کر دے، پھر ترگو Turgot کے نقش قدم پر چل کر معیشت کا ایک فطری نظریہ بنائے، لہٰذا اس منصوبہ میں اس نے بازار کو مرکزی حیثیت دے دی ہے اور قیمتوں اور قدروں کے توازن اور اتار چڑھاؤ کو عمل معاشی کی قوت محرکہ قرار دے کر انسانوں اور ان کے نفسیاتی محرکات و اعمال کو ذرا پس پشت ڈال دیا ہے۔ کہیں کہیں شاید بہت بہک بھی گیا ہے، مثلاً سرمایہ کے اضافہ یا قدرتی مصنوعی عناصر کو آخری حقیقت مان کر آدمیوں کو بالکل نظر انداز سا کر گیا ہے۔ لہٰذا ایک نئے نظریہ کے لئے بڑا اچھا نعرہ تھا کہ "خالی معاشی قدریں اصل نہیں قوائے دولت آفرین پر نظر رکھنی چاہیئے!" لسٹ نے یہ نعرہ لگایا اور سچ یہ ہے کہ یہ نعرہ عہد آفرین ثابت ہوا۔ دولت آفرین قوتوں میں اگر صنعتی علم، کاروباری مہارت اور عادتیں شامل ہیں تو ان سے پہلے لسٹ کے نزدیک اخلاق محاسن، ذہنی ترقی، سیاسی آزادی بھی شامل ہیں۔ یہ اپنی تمام تحریروں میں انفرادی انسان کی خوبی فکر و عمل

کی طرف بار بار لوٹتا ہے اور اس کو آخری درجہ میں قومی کامیابی کا راز بتاتا ہے۔ اس کے لیئے علم معیشت کا موضوع دولت نہیں انسان ہیں، ان کے معاشی ادارے ہیں، ان کے سیاسی ادارے ہیں، اور ان کی معاشی اور سیاسی عادتیں۔ اس کے نزدیک ہر قوم کی دولت آفرینی اس کے معاشی، جماعتی، معاشرتی اور سیاسی اداروں اور اس کی ان ذہنی صلاحیتوں سے متعیّن ہوتی ہے۔ جو ان اداروں کا نتیجہ بھی ہوتی ہیں اور سبب بھی۔

(۳) لسٹ کے نظریہ میں تیسرا اہم حصہ قومی معیشت کے منازل تدریجی کا ہے۔ یہ نظریہ بالکل نیا تو نہیں ہے۔ قدمائنے بھی اسے بیان کیا ہے۔ اسمتھ نے اسے یوں پیش کیا ہے کہ قرون وسطیٰ میں معیشت منصب داریت پر اور اجناس پر مبنی تھی۔ اس کے مقابلہ میں معیشت زر تقسیم عمل، اور بازار کے لین دین پر منحصر ہے لیکن لسٹ کے نزدیک یہ دو تقسیمیں کافی نہیں۔ وہ چرواہوں کی زندگی سے شروع کرتا ہے، اس کے بعد زراعت آتی ہے۔ پھر زراعت کے ساتھ صنعت اور دستکاری ملتی ہے۔ پھر پوری ترقی کے عہد میں زراعت، صنعت، تجارت نشوونما پاتی ہیں۔ ہم لسٹ کی اس تقسیم کو شاید تاریخی واقعہ کے طور پر نہ مانیں۔ کہ اکثر قوموں کی تاریخ میں چرواہوں والی منزل کو چنداں اہمیت نہیں ہوتی۔ اور اکثر زراعتی قوموں میں صنعت کی ترقی سے بہت پہلے خاصی ترقی یافتہ تجارت رہی ہے مگر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کچھ خود آدم اسمتھ نے اور اس سے بہت زیادہ اس کے متبعین نے معیشت قومی کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا ہے جو ان کے نزدیک زمان و مکان کی قیود سے آزاد سا ہے۔ ان کے خیال میں وہ ہر وقت ہر قسم کی قوم کے لیئے ایک ہی سا رہتا ہے۔ اور اس لیئے ان کے ادارے اور انتظامات ایک ہی سے

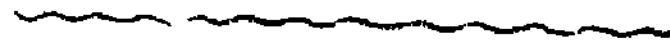
ہونے چاہئیں۔ ان کا مسلک ایک عالمی مسلک ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مختلف منازل ترقی پر اصرار اور یہ جتانا کہ ہر منزل آبادی کے ایک خاص درجہ، ایک خاص ذہنی ارتقاء اور خاص خاص قسم کے معاشی اداروں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے ایک ضروری تنبیہ تھی اور فہم مظاہر کے باب میں ایک ایسی ترقی جس پر بعد کو روشر (Roscher) کنیز (Knies) اور اشمالر Schmoller اور سارے تاریخی مذہب والوں نے اپنے کام کی بنیاد رکھی۔ ان کے مسلک کی اساس لسٹ کا یہی خیال تو ہے کہ قومی معیشت کی ہر منزل کے لئے الگ ادارے، الگ نظام زر، الگ نظام اعتبار، الگ تقسیم کار درکار ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ "فریڈرش لسٹ سے علم کا ایک بالکل نیا عہد شروع ہوتا ہے۔"

لسٹ کے یہ خیالات اس کی بہت سی چھوٹی بڑی کتابوں، رسالوں اور بے شمار مضمونوں میں طرح طرح سے پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے واضح اور موثر اظہار اس کی "معاشیات قومی" میں ملتا ہے۔ اکثر ناقدوں نے کہا ہے کہ اس کتاب کو خالص علمی اور تحقیقاتی معیاروں سے نہ جانچنا چاہئے۔ اس میں کہیں کہیں جزوی واقعات کی غلطیاں بھی ہیں۔ لیکن اس سے شاید انکار نہ ہو سکے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک نرالی کتاب ہے۔ اور ایک دوربین دماغ کے صحیح اور عمیق وجدان علمی و عملی کا پتہ دیتی ہے۔ اس سے فکر و عمل کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ سوچنے والوں کو اور کرنے والوں کو سوچنے اور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اور یہ بتاتی ہے کہ معیشت میں سب کے لئے

نہ کوئی فکر قطعی فکر ہے نہ کوئی راہ، بس ایک راہ۔ حالات کو سمجھنا چاہیئے اور مناسب حال راہ نکالنی چاہیئے۔ پڑھنے والے پر اس سے ذمہ داری کا بوجھ ضرور پڑتا ہے جو شاید بہتوں کو ناگوار ہو۔ لیکن جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ بوجھ بھی اٹھانا ہی چاہیئے۔

جامعہ نگر۔ دہلی
۳۰۔ مارچ ۱۹۴۶ء

ذاکر حسین



تمہید

معاشیات کی کسی دوسری شاخ میں نظری اور عملی لوگوں میں رائے کا اتنا اختلاف نہیں ہے جتنا کہ بین الاقوامی تجارت اور سیاست تجارتی کے متعلق۔ اور پھر اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں جو قوموں کی خوشحالی اور تہذیب اور ان کی خودمختاری، طاقت اور استقلال کے لئے اتنی اہمیت رکھتا ہو۔ بعض کمزور اور غیر متمدن ملک زیادہ تر اپنی دانشمندانہ تجارتی سیاست کی وجہ سے دولتمند اور طاقتور سلطنتیں بن گئے ہیں اور مخالف وجوہ سے دوسرے ملک اقتدار قومی کے اعلیٰ درجہ سے کس مپرسی کی حالت کو پہنچ گئے ہیں ہاں، اس کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں کہ قومیں صرف اس وجہ سے اپنی خودمختاری اور اپنی ہستی تک کھو بیٹھی ہیں کہ ان کے تجارتی نظام قومیت کی نشوونما اور تقویت کے لئے مفید نہ تھے ۔

معاشیات کے تمام دوسرے مسائل کے مقابلہ میں اس مسئلہ کو ہر زمانہ سے زیادہ ہمارے زمانہ میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے اسلئے کہ صنعتی ایجاد و ترقی اور اجتماعی و سیاسی تکمیل کی

ذہنیت جتنا فروغ پاتی ہے اُسی قدر آگے بڑھنے والی اور خاموش کھڑی رہنے والی قوموں میں تفاوت بڑھتا جاتا اور پیچھے رہنا اتنا ہی خطرناک ہوتا جاتا ہے۔ اگلے وقتوں کی سب سے اہم صنعت کی شاخ، یعنی اونی کپڑے کی صنعت پر کامل اجارہ حاصل کرنے کے لئے اگر پہلے صدیاں درکار تھیں تو بعد کو اس سے کہیں زیادہ اہم شاخ، یعنی سوتی کپڑے کی صنعت پر قبضہ کرنے کے لئے چند قرن کافی ہوئے اور ہمارے زمانہ میں تو چند سال کی سبقت نے برطانیہ عظمیٰ کو اس قابل کر دیا کہ وہ براعظم یورپ کی ساری مشینی صنعت اپنے ہاتھ میں لیلے ؛

کسی اور زمانہ میں دُنیا نے ایسا صنعتی اور تجارتی تفوق کبھی نہ دیکھا ہوگا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں کہ بیحساب قوتوں سے مسلح وہ ایک نظام محکم پر چل رہا ہے اور نہایت شدت سے کوشاں ہے کہ ساری صنعت، ساری تجارت، ساری جہاز رانی، تمام اچھی اچھی نوآبادیاں اور تمام سمندروں پر حکومت کا اجارہ دار بنجائے اور تمام دوسری قوموں کو بیچارہ ہندیوں کی طرح صنعت اور تجارت میں اپنا دست نگر بنالے ؛

اس سیاست کے نتائج سے ڈرکر، نہیں نہیں، ان انقلابوں سے مجبور ہوکر جو اس نے پیدا کئے ہیں ابھی حال میں براعظم یورپ کی ایک ایسی قوم نے، جو اپنی تہذیب اور تمدن کی وجہ سے صنعت کی کم اہلیت رکھتی تھی، یعنی روسی قوم نے، اپنی نجات اس نظام امتناعی میں ڈھونڈی جسے نظریہ رائج بہت برا بتلاتا ہے اور نتیجہ اس کا کیا ہوا ؟ قومی خوشحالی !

نظریہ رائج نے جو سبز باغ دکھائے ہیں اس کے اثر سے ادھر شمالی امریکہ نے، جو نظام تامین کی وجہ سے خوب ترقی کر رہا تھا، اپنے بندرگاہ انگریزی مصنوعات کیلئے کھول دئیے اور ہاں

آزاد مقابلہ کا کیا پھل ملا ؟ انقلاب اور بربادی !

ایسے تجربوں سے بجا طور پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظریہ واقعی خطا سے ایسا ہی بری ہے جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے کہ عمل ایسا ہی حماقانہ ہے جیسا کہ نظریہ نے اپنے پیش کر رکھا ہے ؟ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کہیں ہماری قوم کو اس نظریہ کی کسی ذہنی غلطی کی وجہ سے بالآخر جان نہ دینی پڑے، جیسے کہ وہ مریض جو ایک چھپے ہوئے نسخہ کا استعمال کر رہا تھا طباعت کی ایک غلطی کی وجہ سے آخر اپنی جان سے گیا شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہ ہو کہ جس نظریہ کی اتنی تعریفیں ہیں اسے اتنا پھیلاؤ اسلئے دیا گیا ہو اور اتنا بلند اسلئے کیا گیا ہو کہ یونانی گھوڑے کی طرح اس میں آدمی اور ہتھیار چھپائے جاسکیں اور ہم دھوکہ میں آکر اپنی شہر پناہوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے مسمار کر دیں !

کم سے کم اتنی بات تو مسلّم ہے کہ سب قوموں میں کوئی پچاس برس سے تصنیفوں کے اندر اور قانون ساز جماعتوں میں ذہین سے ذہین لوگوں نے اس عظیم الشان مسئلہ پر بحث مباحثہ کیا ہے لیکن نظریہ اور عمل میں جو خلیج کینٹے اور آدم سمتھ کے وقت سے چلی آتی ہے۔ وہ بھی نہیں، کہ پٹی نہیں بلکہ سال بسال اور زیادہ بڑھتی گئی ہے۔ پھر ہمارے لئے اس علم کی کیا حیثیت ہو جو عمل کے راستہ پر روشنی نہیں ڈال سکتا؟ بھلا ہم معقولیت کے ساتھ یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ انکی عقل تو اتنی بڑی ہے کہ وہ ہر جگہ ماہیتِ اشیاء کو صحیح معلوم کر سکتے ہیں اور انکی عقل اتنی چھوٹی ہے کہ انہوں نے جو حقائق معلوم کر لئے ہیں اور سب کے سامنے روشنی میں لا کر دکھا دیئے ہیں خود ان کو نہیں سمجھ سکتے اور قرنوں تک صریح غلطیوں کو صداقتیں جانتے رہ سکتے ہیں

کیا یہ بات زیادہ قرینِ قیاس نہیں کہ عملی لوگ، ہر چند کہ یہ عموماً حالاتِ موجودہ ہی کی پابندی پر مائل ہوتے ہیں، پھر بھی نظریہ کی مخالفت اتنے عرصہ تک اور اس شدت سے نہ کرتے اگر خود نظریہ ماہیتِ اشیاء کے مخالف نہ ہوتا؟

واقعہ یہ ہے، اور ہم اسے ثابت کر سکتے ہیں، کہ سیاستِ تجارتی میں نظریہ اور عمل میں اختلاف کی ذمہ داری نظریین پر بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ اہلِ عمل پر۔

معاشیات کو چاہیئے کہ بین الاقوامی تجارت سے متعلق اپنی تعلیمات کو تجربہ سے حاصل کرے، اپنی تدابیر میں صورتِ موجودہ اور ہر قوم کے مخصوص حالات کا خیال رکھے لیکن مستقبل کے، اور کل انسانیت کے مفاد کو بھی پسِ پشت نہ ڈالے۔ لہذا اس کی بنیاد ہونی چاہیئے فلسفہ، سیاست، اور تاریخ پر۔

مستقبل کے اور کل انسانیت کے مفاد میں تو فلسفہ کا مطالبہ ہے کہ قومیں برابر قریب تر ہوتی جائیں، حتی الوسع جنگ نہ ہو، بین الاقوامی عدل قائم ہو جائے اور ترقی پائے، آج جسے بین الاقوامی قانون کہتے ہیں اس کی جگہ ایک جمعیت اقوام کا قانون ہو، مادی اور ذہنی دونوں لحاظ سے بین الاقوامی ربط ضبط میں آزادی ہو، اور آخر میں یہ کہ یہ سب قومیں قانونِ عدل کے ماتحت متحد ہو جائیں، ایک عالمی اتحاد قائم ہو جائے۔

لیکن ہر مخصوص قوم کے مفاد میں سیاست کا مطالبہ ہے کہ اس کی خود مختاری اور بقا کی ضمانت ہو، اپنے تمدن، خوشحالی اور قوت کو بڑھانے کے لئے خاص تدابیر کی جائیں، اور اجتماعی حالات میں ایسا نشوونما ہو کہ قوم ایک ایسے ملک اور مستقل سیاسی جسم کی حیثیت حاصل کر سکے جس کے

تمام حصّے پورے طور پر نشوونما حاصل کر چکے ہوں اور ہم آہنگ ہوں۔

اُدھر تاریخ صاف صاف مستقبل کے مطالبات کی موافقت ہی میں منہ کھولتی ہے اور سکھاتی ہے کہ ہمیشہ آدمیوں کی مادّی اور ذہنی خوشحالی اسی نسبت سے بڑھی ہے جیسے جیسے ان میں سیاسی اتحاد اور تجارتی تعلق بڑھا ہے لیکن تاریخ زمانہ حال کے اور قومیت کے مطالبات کی بھی تصدیق کرتی ہے اور سکھاتی ہے کہ جن قوموں نے خود اپنی قوت اور اپنے تمدن کی ترقی کو پیش نظر نہیں رکھا وہ برباد ہو گئیں۔ زیادہ ترقی یافتہ قوموں سے لین دین ہر قوم کیلئے ابتدائی منازل میں مفید ثابت ہوتا ہے لیکن پھر ہر قوم ایک ایسے نقطہ پر پہنچ جاتی ہے کہ وہاں سے آگے ترقی کرنے کیلئے اور زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے برابر پہنچنے کیلئے بین الاقوامی لین دین پر کچھ پابندیاں عائد کرنی ہی پڑتی ہیں۔ گویا تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ فلسفہ اور سیاست کے دوگونہ مطالبات میں درمیان کی راہ پیدا کی جائے۔

بس بات یہ ہے کہ معاشیات میں اس وقت عملی اور نظری پہلو دونوں ایک ایک کے طرفدار ہو گئے ہیں، وہ قومیت کے مخصوص مطالبات کا حامی، یہ عالمیت کے مطالبات کا ساتھی۔

عملی لوگ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ تجارتی مذہب کی تو بڑی غلطی یہ ہے کہ اس کے نزدیک پابندیاں عائد کرنا عام طور پر اور بلا استثنا ضروری اور مفید ہے اسلئے کہ بعض قوموں کیلئے اپنی نشوونما کے بعض زمانوں میں ایسا کرنا ضروری اور مفید رہا ہے۔ وہ مذہب یہ نہیں دیکھتا کہ پابندیاں محض ذریعہ ہے اور مقصد آزادی ہے۔ یہ ہر جگہ قوم کا خیال رکھتا ہے کہیں انسانیت کا نہیں، ہر وقت حال پر نظر رکھتا ہے استقبال پر کبھی نہیں، یہ بالکل سیاسی اور قومی ہے، اور فلسفیانہ نظر

اور عالمی رجحان سے یک قلم محروم ؂

برخلاف اسکے نظریہ رائج رعیبا کہ کینے نے اسکا خواب دیکھا تھا اور آدم سمتھ نے اسے ترقی دیکر بنا دیا کی نظر تمام دکمال مستقبل کے عالمی مطالبات پر ہے اور وہ بھی مستقبل بعید پر۔ عالمی اتحاد اور بین الاقوامی تجارت میں کامل آزادی کے عالمی خیال کو، جو شاید صدیوں بعد عمل کا جامہ پہن سکے، یہ آج قابلِ عمل سمجھتا ہے۔ یہ حال کی ضرورتوں کو اور قومیت کی ماہیت کو نہیں سمجھتا، بلکہ قوم کے وجود تک سے بے اعتنائی برتتا ہے اور اسی کے ساتھ قوم کو خود مختاری کی تعلیم دینے کے اصول کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ چونکہ یہ یکسر عالم دوست ہے اسلئے ہمیشہ ساری انسانیت ہی کا خیال رکھتا ہے، ساری نسلِ انسانی کی خوشحالی ہی اسکے پیشِ نظر رہتی ہے، کبھی بھی قوم اور قومی خوشحالی کا دھیان نہیں آتا۔ یہ سیاست سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے اور تجربہ اور عملی زندگی کو محض روز مرہ کے کام چلانے کی ناقابلِ اعتماد باتیں جانتا ہے۔ یہ تاریخ کو بس وہیں مانتا ہے جہاں وہ اسکے یک طرفہ میلان کی تائید کرتی ہے اور جہاں یہ اسکے نظام کیخلاف پڑتی ہے وہاں یا تو اسے نظر انداز کر دیتا ہے یا اس کی تاویلیں کرتا ہے۔ چنانچہ اسے ضرورت پڑتی ہے کہ انگلستان کے قوانینِ جہاز رانی، معاہدۂ میتھوین، اور کل انگریزی سیاست تجارتی کے اثرات سے انکار کرے اور واقعے کیخلاف یہ دعویٰ کرے کہ انگلستان نے اپنی سیاست تجارتی کیوجہ سے دولت اور طاقت حاصل نہیں کی بلکہ اس مخالف عنصر کے باوجود حاصل کر لی ؂

جب دونوں کی طرفداری معلوم ہو جائے تو پھر زیادہ تعجب نہیں ہوتا کہ عملی زندگی نے اپنی اہم غلطیوں سے قطع نظر، اس نظریہ سے نہ اپنی اصلاح کرنی چاہی نہ کر سکی۔ اور یہ بات بھی صاف

ہوجاتی ہے کہ نظریہ نے کیوں تاریخ و تجربہ سے سیاست اور قومیت سے بالکل سروکار ہی نہیں رکھنا چاہا! اور اگر یہ بے بنیاد سے کا نظریہ دنیا کے گلی کوچوں میں پھیلا اور بام و در سے اس کی تائید ہوئی، خصوصاً ان قوموں میں جن کے وجود قومی کو اس سے سب میں زیادہ خطرہ تھا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ کا میلان غالب ہی انسان دوستی کے تجربوں اور فلسفیانہ مسائل کے حل کرنے کی طرف تھا۔

لیکن افراد کی طرح قوموں کی زندگی میں بھی افکار پرستی کے فریب سے نجات دو دواؤں سے حاصل ہوتی ہے، تجربہ سے اور ضرورت سے اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو ہمارا خیال ہے کہ جن قوموں نے حال میں وقت کے سب سے بڑے تفوق صنعتی و تجارتی (انگلستان) سے آزاد لین دین میں اپنی فلاح ڈھونڈنی چاہی ہے وہ عنقریب بہت اہم تجربے حاصل کرنیوالی ہیں۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ شمالی امریکہ کی آزاد ریاستیں موجودہ تجارتی حالات کو جاری رکھکر اپنی معیشت قومی میں کچھ تھوڑا بہت نظم بھی پیدا کر لیں۔ قطعاً لازم ہے کہ وہ سابقہ تاہینی محاصل کی طرف پھر لوٹیں۔ چاہے غلاموں والی ریاستیں اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں اور برسر اقتدار سیاسی جماعت چاہے ان کا ساتھ ہی دے دے، حالات کی طاقت فرقہ وارانہ سیاست سے زیادہ قوی ثابت ہوگی۔ ہمیں توقع ہے کہ جو چیز قانون سازی کیلئے عقدۂ لاینحل رہی اسے جلدی یا دیر سے توپیں حل کرینگی، امریکہ انگلستان کو اپنا قرض گولی اور بارود میں ادا کریگا اور جنگ سے واقعتہً جو اقتضاعی نظام پیدا ہو جائیگا وہی امریکی قانون سازی کی ان غلطیوں کو درست کریگا جو محاصل سے متعلق ہیں۔ اور ہمیں کس نے ممنوعہ تجارت کے ایک عظیم الشان نظام کی جو پیشگوئی کی تھی

اسے کینیڈا کو فتح کر کے ہمیشہ کے لیئے ختم کر دیا جائیگا ۔

خدا کرے ہم غلطی پر ہوں لیکن اگر ہماری پیشگوئی پوری ہوئی تو ہم اس جنگ کا الزام آزاد تجارت کے نظریہ پر رکھیں گے۔ تقدیر کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو نظریہ امن دائمی کے عظیم الشان تصور پر مبنی ہو وہ دو ایسی قوموں میں جنگ کی آگ بھڑکائے جو اسکے دعویٰ کے بموجب آپس میں تجارت کے لیئے ہی بنی ہیں۔ یہ اتنی ہی انوکھی بات ہوگی جتنی یہ کہ انسان دوستی میں حبشیوں کی تجارت روکنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں حبشی سمندر میں ڈوب ڈوب کر جان دے رہے ہیں [1] ۔

---

[1] کیا یہ زیادہ قرین عقل نہ ہوتا کہ جن ریاستوں میں غلام بستے تھے ان سے ایسے قانون نافذ کرائے جاتے۔ کہ مالکان زمین مجبور ہوتے کہ غلاموں کو بھی انکی کاشت کی زمین میں ایک محدود مساحت ملکیت دیں اور انہیں محدود سی شخصی آزادی بخشیں یا بالفاظ دیگر ایک نرم سی زرعی غلامی قائم کریں جسمیں آئندہ پوری آزادی کی توقع ہو اور اس طرح آزادی کامل کیلیئے حبشیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاتا۔ اور کیا یہ حبشی افریقہ میں اپنے مطلق العنان بادشاہوں کے ماتحت اس سے کم غلام تھے جتنے امریکنوں کی زمینداری میں ؟ کیا فطری آزادی سے متمدن آزادی تک پہنچنا بغیر اس کے ممکن ہو سکتا ہے کہ غیر متمدن قوم سخت ماتحتی اور اطاعت کے مدرسے سے گزرے ؟ کیا پارلیمنٹ کے قوانین سے جزائر غرب الہند کے حبشیوں کو یکایک آزاد اور محنتی انسانوں میں تبدیل کیا جا سکا ؟ کیا ساری نسل انسانی کو آزادی اور کام کی تعلیم ہمیشہ اسی طریق سے نہیں ملی ؟ یقیناً انگریز انسانیت کی تاریخ تمدن سے اس درجہ ناآشنا نہیں ہیں کہ ان سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب کبھی کا نہ جانتے ہوں ظاہر ہے کہ غلامی مٹانے کے سلسلے میں انگریزوں نے جو کچھ کیا اور اب بھی کر رہے ہیں اس میں بہت سے دوسرے محرکات اپنا عمل کر رہے تھے، صرف انسان دوستی کے محرکات نہ تھے، جیسا کہ ہم نے کسی اور جگہ بحث کر کے دکھایا ہے ۔

فرانس نے گذشتہ پچاس سال میں (بلکہ صرف گزشتہ ۳۵ سال میں کہ انقلاب اور جنگ کا زمانہ تو اس میں شامل نہ کرنا چاہیئے) تجارتی پابندیوں کے نظام کا، باوجود اس کی غلطیوں ضمنی باتوں اور زیادتیوں کے، ایک عظیم الشان تجربہ کیا ہے۔ اس کی کامیابی ہر اس شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے جو پہلے سے تعصب نہیں رکھتا۔ نظریہ رائج جو اس سے انکار کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اپنے نظام میں یکسانیت قائم رکھنے کا بھی تقاضا ہے اگر وہ زچ ہو کر یہ دعوی کر دیتا ہے اور دنیا کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ انگلستان اپنی سیاست تجارتی کی وجہ سے مالدار اور طاقتور نہیں بنا بلکہ باوجود اس کے تو وہ یہ دعویٰ کیوں نہیں پیش کر دیتا جس کا ثبوت کرنا سہل تر ہے کہ فرانس اپنی صنعت کی تائید کے بغیر اس سے بہت زیادہ مالدار ہوتا اور پھلتا پھولتا جتنا کہ آج ہے! بس یہ کہدینا کافی ہوتا! اور بہت سے لوگ جو پڑھے لکھے اور ہوشیار مانے جاتے ہیں اسے اسی طرح قبول کر لیتے جیسے کوئی کھرے سکہ کو قبول کرتا ہے، چاہے پھر سمجھنے بوجھنے والے عملی لوگ اس کی کتنی ہی مخالفت کرتے رہتے اور واقعہ ہے کہ انگلستان کے ساتھ آزاد تجارت کی آرزو آجکل فرانس میں بہت عام طور پر پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس سے انکار بھی نہیں ہوسکتا (اور ہم کسی دوسری جگہ اس پر تفصیل سے گفتگو کرینگے) کہ بہت سی صورتیں ہیں جن میں باہمی تجارت کی ترقی ان دونوں قوموں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ لیکن انگریزوں کا ارادہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کی زرعی پیداوار اور تعیش کے سامان کے عوض میں صرف اپنی خام اجناس مثلاً کچا لوہا ہی نہ بیچ سکیں بلکہ بڑی مقدار میں عام استعمال کی مصنوعات بھی۔ فرانس کی حکومت اور آئین ساز جماعت انگریزوں کے اس خیال کو کہاں تک قبول کرنے پر مائل ہوگی یا کہاں تک اسے قبول کرے گی اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جاسکتا لیکن

اگر یہ لوگ واقعی اس حد تک اسے مان گئے جس حد تک انگریزوں کا ارادہ ہے تو دنیا کو اس مہتم بالشان سوال کے مؤافق یا مخالف ایک نئی دلیل حاصل ہو گی کہ موجودہ حالات میں یہ کس حد تک ممکن اور مفید ہے کہ دو بڑی بڑی صنعتی قومیں جن میں سے ایک بہ اعتبار اپنے مصارف پیدائش اور بہ اعتبار اپنی مصنوعات کی وسیع یہ دیسی منڈی کے دوسرے کے مقابلہ میں بہت زیادہ سہولتیں رکھتی ہے، خود اپنی ملکی منڈیوں میں باہم مقابلہ کریں اور اگر ایسا ہو تو اس کے اثرات کیا ہوں گے۔

مذکورہ بالا سوالات نے جرمنی میں ابھی اتحاد تجارت کی وجہ سے عملی قومی مسائل کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اگر فرانس کو شراب (کی برآمد) کا لالچ دے کر انگلستان تجارتی معاہدہ کیلئے آمادہ کرنا چاہتا ہے تو جرمنی کو غلّہ اور لکڑی کی برآمد کا لیکن ابھی تو یہ سب فرضی باتیں ہی باتیں ہیں، اسلئے کہ ابھی کون جانتا ہے کہ مستعفی ٹوری (قدامت پسند) جماعت میں اتنی سمجھ آ جائیگی کہ جرمن غلّہ اور لکڑی کی درآمد میں آسانیاں پیدا کرنے کیلئے وہ حکومت کیساتھ وہ رعائتیں کر دینگے جو اتحاد تجارتی کے خلاف کام میں لائی جا سکیں۔ اس لئے کہ جرمن لوگ سیاست تجارتی میں اتنے آگے تو ضرور آ چکے ہیں کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ ٹھوس سونے چاندی کے عوض بس امیدیں اور پیار کی باتیں قبول کر لی جائیں تو وہ اس خیال کو گستاخی پر محمول نہ کریں تو مضحکہ انگیز تو ضرور سمجھینگے۔ فرض کیا کہ پارلیمنٹ نے یہ رعایتیں کر دیں تو سیاست تجارتی کے مسائل فوراً جرمنی میں عام طور پر زیر بحث آئینگے ڈاکٹر بورنگ کی جدید ترین رپورٹ سے ہمیں ان ترکیبوں کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو اس معاملہ میں انگلستان اختیار کریگا۔ انگلستان اس رعایت کو ان سہولتوں کے مساوی نہیں تسلیم کریگا جو اسے جرمنی کی مصنوعات

کی منڈی میں پہلے سے حاصل ہیں، وہ اس رعایت کو صرف اس بات کی قیمت نہ سمجھے گا کہ جرمنی کو اپنی ضرورت بھر سوت آپ کاتنے سے روکے یا اجناس خام براہِ راست منطقہ کے ممالک سے منگانے سے اور ان کی قیمت اپنی مصنوعات کی شکل میں ادا کرنے سے باز رکھے، وہ اس رعایت کو یہ نہ سمجھے گا کہ دونوں ملکوں کی باہمی درآمد برآمد میں جو عدم تناسب ہے یہ اس کے پورا کرنے کا ذریعہ ہو جائیگی۔ نہیں نہیں، جرمنی میں انگریزی سوت بھیجنے کا حق تو انگلستان کے نزدیک پہلے سے حاصل ہی ہے۔ اور اب ان نئی رعایتوں کے عوض وہ کوئی نئی چیز مانگیگا اور نئی چیز اس سے کم نہ ہو گی کہ جرمنی اپنی تمام روئی اور اُون کی صنعت کی قربانی پیش کرے یہ رعایتیں جرمنی کے سامنے لقمۂ تر بنا کر رکھی جائیں گی اور اس کے بدلہ میں اسکے پیدائشی حق کا پٹہ لکھا لیا جائیگا۔ اور اگر ڈاکٹر بورنگ نے جرمنی کے قیام کے دوران میں دھوکہ نہیں کھایا ہے، اور اگر اُنہوں نے جیسا کہ ہمارا قیاس ہے برلن کی خاطر تواضع کی میٹھی میٹھی باتوں کو بالکل سنجیدہ گفتگو نہیں سمجھ لیا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات پر کہ جرمن اتحاد تجارتی کی سیاست کی تشکیل ہوتی ہے وہاں لوگ ابھی تک اسی عالمی نظریہ کی جادہ پیمائی کرتے ہیں یعنی ابھی تک وہاں مصنوعات کی برآمد اور زرعی پیداوار کی برآمد میں فرق نہیں کیا جاتا اور سمجھا جاتا ہے کہ برآمد مصنوعات کو نقصان پہنچا کر بھی اگر زرعی پیداوار کی برآمد کو بڑھایا جائے تو قومی مفاد کے موافق ہو گا۔ یہاں ابھی تک قوم کی صنعتی تعلیم کے اصول کو اتحاد تجارتی کا بنیادی اصول بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کو اس میں ذرا تامل نہیں کہ چار سال کی تامین سے جو صنعت ترقی پا چکی ہے اور اندرونی مقابلہ سے جن کی قیمتوں کو بہت نیچا کر دیا ہے ان

صنعتوں کو بدیسی مقابلہ پر سے قربان کردیں اور جرمن حوصلہ مندی کی بنیاد کو خطرہ میں ڈالدیں اس لئے تامینی محاصل کے کم ہونے کی وجہ سے یا اور کسی سرکاری کارروائی کی وجہ سے جو کارخانہ بھی تباہ ہوگا اس کا اثر اس کھیت میں لٹکے ہوئے مردہ جانور کا سا ہوگا جو اپنی جیسی تمام زندہ چیزوں کو دور دور تک بھڑکا دیتا ہے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان باتوں کو بالکل صحیح تسلیم کرنا ہم سے بہت بعید ہے لیکن پھر دیہ بات کہ اس قسم کی باتیں عام طور پر بیان کی گئیں اور کی جا سکیں خاصی خرابی کی چیز ہے اس لئے کہ محض اس وجہ سے بھی محاصل تامینی کے قائم رہنے کی امید کو اور اس کی وجہ سے جرمن حوصلہ مندی کو بہت سخت دھکّا پہنچے گا۔ مذکورہ بالا رپورٹ سے ہمیں اس کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ جرمن صنعتوں کو یہ مہلک زہر کس طرح دیا جائیگا کہ تباہی کا سبب بالکل تو ظاہر نہ ہونے پائے لیکن پورے یقین کے ساتھ شجرۂ حیات تک پہنچ جائے تجویز ہے کہ وزن پر جو محاصل ہیں ان کی جگہ قیمت پر محاصل لگا دیئے جائیں تا کہ انگلستان کیلئے چوری چھپے کی تجارت کا اور فریب و بیجا بچنے کا دروازہ کھل جائے اور یہ تجویز ہے بھی ٹھیک۔ عام استعمال کی چیزوں کے متعلّق جن کی الگ الگ قیمت تو کم ہوتی ہے مگر مجموعی قیمت اور سب مال سے زیادہ، یعنی یہ تجویز ان چیزوں کے متعلّق ہے جو صنعت کی بنیاد ہیں ۔

اس سے معلوم ہوگا کہ اس وقت بین الاقوامی تجارت کی آزادی کا عظیم الشان مسئلہ کس درجہ عملی اہمیت رکھتا ہے اور کس قدر ضروری ہے کہ آخر ایک مرتبہ تو غیر جانبدارانہ اور بنیادی طور پر اس کی تحقیق ہو جائے کہ آیا نظریہ اور عمل نے اس معاملہ میں کچھ غلطیاں کی ہیں اور کی ہیں تو کس حد تک۔ اور بالآخر ایک مرتبہ ان دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کا کام انجام پا

جائے یا کم سے کم یہ ہو کہ سنجیدگی کے ساتھ چھڑ جائے ۔

تکلّف اور خاکساری سے نہیں بلکہ اپنی قولوں کی کمی کے احساس کیسا تھ مصنّف یقین دلاتا ہے کہ خود اپنے آپ سے سالہا سال مقابلہ کے بعد جب کہ اس نے اپنی رائے کی صحت کو سیکڑوں مرتبہ شبہ میں ڈال دیا اور سیکڑوں مرتبہ اسے سچا بھی پایا، جب کہ اس نے مخالف آرا کو اور اُن کے دلائل کو بھی اتنی مرتبہ جانچا اور اتنی ہی مرتبہ غلط پایا تب کہیں اس نے یہ قصد کیا کہ اس مسئلہ کے حل کی جرأت کرے، وہ اپنے کو اس بے سُود خواہش سے پاک پاتا ہے کہ قدیم مسلّمہ حکما کی تردید کرے اور نئے نظریے گڑھے۔ اگر مصنّف انگریز ہوتا تو اس نے مشکل ہی سے آدم اسمتھ کے نظریہ کے اصول بنیادی پر شبہ کیا ہوتا۔ یہ تو اسکے وطنی حالات تھے جنہوں نے اسے آمادہ کیا کہ پہلے گمنام اخباری مضامین میں اور اسکے بعد اپنے نام کے ساتھ ذرا طویل مقالوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ آج بھی زیادہ تر جرمنی کے فائدہ کے خیال ہی نے اسے یہ جرأت بخشی کہ وہ اس کتاب کو لیکر سامنے آیا۔ اگرچہ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اسمیں ایک شخصی وجہ کی آمیزش بھی ہے یعنی یہ کہ اس نے ضرورت محسوس کی کہ بالآخر ایک مفصّل کتاب لکھکر بتلا دے کہ معاشیات کے باب میں وہ بھی لب کشائی سے بالکل عاجز نہیں ہے ۔

نظریہ رائج کے طریقہ کے بالکل برعکس مصنّف سب سے پہلے تو تاریخ سے سبق حاصل کریگا اور اس سے اپنے بنیادی اصول مستنبط کرے گا اور جب یہ اصول بن جائیں گے تو گزشتہ معاشیوں کے نظاموں کو جانچیگا اور آخر میں، کہ اس کا رجحان طبع سرتاپا عمل کی طرف ہے، سیاست تجارتی کی جدید ترین کیفیت پیش کریگا ۔

مزید وضاحت کے خیال سے وہ یہاں اپنی تحقیق و تفکر کے خاص خاص نتائج کا ایک خاکہ ذیل میں درج کرتا ہے :۔

جماعتی مقصد کیلئے انفرادی قوتوں کا اتحاد افراد کی خوشحالی و مسرت کا سب سے قوی وسیلہ ہے۔ تنہا اور اپنے بنی نوع سے الگ، فرد کمزور ہوتا ہے اور بے بس، اور ان لوگوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہو جن سے اس کا تعلق ہو، ان کا اتحاد جس قدر مکمل ہو اسی قدر اس کا حاصل یعنی افراد کی ذہنی و جسمانی خوشحالی زیادہ اور مکمل ہو گی ۔

اس وقت تک افراد کا جو سب سے بڑا اتحاد عمل میں آچکا ہے وہ ریاست ہے اور قوم۔ خیال میں جو سب سے بڑا اتحاد ممکن ہے وہ کل انسانیت کا اتحاد ہے جس طرح کہ فرد ریاست اور قوم میں اپنے انفرادی مقاصد کو اس سے کہیں بہتر طور پر حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اکیلا ہو، اسی طرح سب قومیں اپنے مقاصد کو بہت بہتر حاصل کر سکیں گی اگر وہ آئین عدل، امن دائمی، اور آزاد تجارت کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں ۔

قدرت خود قوموں کو اس اعلیٰ اتحاد کی طرف لیجا رہی ہے کہ اس نے آب و ہوا، زمین اور پیداوار کے فرق سے ان سب کو مبادلہ پر اور کثرت آبادی اور فاضل سرمایہ اور صلاحیتوں کی فراوانی سے ہجرت اور نوآبادیاں بسانے پر لگا دیا ہے۔ بین الاقوامی تجارت سے چونکہ نئے نئے احتیاج پیدا ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے محنت و مشقت کی تحریک ہوتی ہے اور نئے خیالات، ایجادیں اور قوتیں ایک قوم سے دوسری قوم میں پہنچتی ہیں اس لئے یہ تہذیب اور قومی خوشحالی کے لئے منجملہ سب سے قوی ذرائع کے ہیں ۔

لیکن اس وقت تک بین الاقوامی تجارت سے قوموں کا جو اتحاد پیدا ہوا ہے وہ بہت ناقص ہے، اس لئے کہ جنگ کی وجہ سے یا بعض قوموں کی خودغرضانہ تدابیر کی وجہ سے یہ یا تو ٹوٹ جاتا ہے یا کم سے کم کمزور تو ضرور ہو جاتا ہے ؎

جنگ سے تو قوم اپنی خودمختاری سے، املاک سے، آزادی سے، استقلال سے، دستورِ حکومت اور قوانین سے، اپنی قومی خصوصیات سے، غرض تمدّن و خوشحالی کے اس درجہ سے جو وہ حاصل کر چکی ہے محروم ہو سکتی ہے، محکوم ہو سکتی ہے، دوسروں کی خودغرضانہ تدابیر قوم کی معاشی تکمیل میں حارج ہو سکتی ہیں یا اسے پیچھے لیجا سکتی ہیں ؎

چنانچہ قومیّت کی بقا، ترقی اور تکمیل ہی اس وقت قومی کوشش کا مقصودِ خاص ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ یہ کوئی غلط اور خودغرضی کی کوشش نہیں بلکہ نہایت معقول کوشش ہے اور کل انسانیت کے سچے مفاد کیلئے اور اس سے ہم آہنگ کوشش اسلئے کہ قدرتی طور پر بالآخر یہ آئینِ حق کے ماتحت سب قوموں کے اتحاد یعنی اتحادِ عالمی کی طرف ہی لے جاتی ہے، اور یہ نسلِ انسانی کی خوشحالی کے لئے اسی وقت مفید ہو سکتا ہے کہ بہت سی قومیں تمدّن اور طاقت کا ایک سا درجہ حاصل کر لیں یعنی یہ اتحادِ عالمی قوموں کے مساویانہ اتحاد سے عمل میں آئے ؎

جو اتحادِ عالم صرف ایک قوم کی غالب سیاسی قوت سے، غالب دولتمندی سے پیدا ہو یعنی دوسری قوموں کی محکومی اور ماتحتی پر مبنی ہو وہ تو تمام قومی خصوصیات کے زوال اور قوموں میں ہر قسم کی مسابقت کے خاتمہ کا باعث ہوگا۔ وہ تو سب ایسی قوموں کے اغراض اور

سیاسی کا درجہ اعلےٰ حاصل کرنے کا اہل سمجھتی ہیں۔ وہ اس چیز کی تکرار ہوگی جو ایک مرتبہ ہو چکی ہے یعنی اہل روما کی کوشش کی تکرار جو پہلے تلوار کے زور پر ہوئی تھی اب کی صنعت اور تجارت کے ذریعہ ہوگی لیکن اس وجہ سے کیا یہ کچھ کم بربریت اور وحشت کی طرف لیجانے والی ثابت ہوگی؟

قوموں کی تہذیب، سیاسی ترقی اور قوت زیادہ تر معاشی حالت پر منحصر ہوتی ہے اور معاشی حالت اُن پر معیشت جس قدر ترقی یافتہ اور مکمل ہوگی اُسی قدر قوم متمدّن اور طاقتور ہوگی جس قدر قوم کی تہذیب اور طاقت بڑھے گی اسی قدر اس کی معاشی ترقی زیادہ ہوسکیگی۔

معاشی ترقی کے باب میں قوموں میں ترقی کے مندرجہ ذیل خاص خاص مدارج ماننے چاہئیں۔ وحشت کا عہد۔ گلہ بانی کا عہد۔ زراعت کا عہد۔ زراعت و صنعت کا عہد۔ زراعت و صنعت و تجارت کا عہد۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے پاس وسیع رقبہ زمین کا ہے جس میں طرح طرح کے قدرتی وسائل موجود ہیں، آبادی بھی اچھی ہے۔ وہ اگر اپنی مملکت میں زراعت، صنعت، جہازرانی، تجارتِ خارجی و داخلی کو یکجا کرلے تو وہ صرف زراعت کرنیوالی قوم سے بدرجہا زیادہ متمدّن، طاقتور اور سیاسی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوگی لیکن تجارت خارجی و داخلی کی، جہازرانی اور ترقی یافتہ زراعت کی بنیاد صنعت ہی ہے اور اس وجہ سے تمدّن اور سیاسی قوت کی بھی۔ اور اگر کوئی قوم یہ کرسکے کہ تمام دنیا کی صنعت کی اجارہ دار بن جائے اور دوسری قوموں کی معاشی ترقی کو اس طرح روک دے کہ وہ بس زراعتی چیزیں اور خام اجناس پیدا کیا کریں اور ضروری مقامی صنعت سے کام لے لیا کریں۔ تو ایسی قوم کو لازماً ساری دنیا کی

حکومت حاصل ہو جائیگی ۔

ہر قوم کو، جس کے نزدیک اپنی بقا اور اپنی خودمختاری کوئی قیمت رکھتی ہے، کوشش کرنی چاہیئے کہ جس قدر جلد ہو سکے پست درجۂ تمدّن سے بلند کی طرف بڑھے اور جس قدر جلد ممکن ہو اپنی مملکت میں زراعت، صنعت، جہازرانی اور تجارت کو یکجا کرلے ۔

وحشت کی حالت سے گلہ بانی میں اور گلہ بانی سے زراعت کے درجہ میں جاتے وقت کسی زیادہ متمدّن قوم سے یعنی کسی صنعتی، تجارتی قوم سے آزاد تجارت ہو تو کم متمدّن قوم کی زراعت کی ابتدائی ترقیوں کیلئے بہت مفید ہوتا ہے ۔

آزاد تجارت کے ہوتے ہوئے زرعی قوم اسی حالت میں زرعی صنعتی۔ تجارتی قوم بن سکتی ہے کہ جتنی قومیں صنعتی قوت کو فروغ دینے کی اہلیت رکھتی ہیں سب میں ساتھ ہی ساتھ ایک سی ترقی شروع ہو اور قومیں ایک دوسرے کی معاشی نشوونما میں کوئی رکاوٹیں نہ پیدا کریں اور جنگوں سے اور محاصل لگا لگا کر ایک دوسرے کی ترقی میں حارج نہ ہوں ۔

لیکن چونکہ بعض قوموں کو خاص حالات کی مدد سے صنعت، تجارت اور جہازرانی میں اوّلیت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ یہ قومیں سمجھ گئی ہیں کہ یہ تکمیلات ہی دوسری قوموں پر سیاسی تفوق حاصل کرنے اور قائم رکھنے کا سب سے مؤثّر ذریعہ ہیں انھوں نے ایسے انتظامات کیئے ہیں جن کا مقصد تھا اور اب بھی ہے کہ صنعت اور تجارت کا اجارہ حاصل کرلیں اور کم ترقی یافتہ قوموں کو آگے بڑھنے سے روک دیں ۔ ان انتظامات کے مجموعہ کو (درآمد کی ممانعت، درآمد پر محصول، جہازرانی پر پابندیاں، برآمد کی امداد وغیرہ) نظام محاصل سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

دوسری قوموں کے پہلے سے ترقی پا جانے کی وجہ سے، اور پردیسی نظامہائے محاصل اور جنگ کے باعث کم ترقی یافتہ قومیں مجبور ہوئیں کہ زراعت کے درجہ سے صنعت کے درجہ میں پہنچنے کے ذرائع خود اپنے اندر تلاش کریں اور اگر زیادہ ترقی یافتہ اور صنعت کے اجارہ کی طالب قوموں سے تجارت اس مقصد میں حائل ہو تو اس تجارت پر اپنے نظام محاصل سے پابندیاں عائد کریں ؎

چنانچہ یہ نظام محاصل، جیسا کہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے تخیلی دماغوں کی اختراع نہیں ہے بلکہ قدرتی نتیجہ ہے قوموں کی اس کوشش کا کہ اپنی بقا اور خوشحالی کی ضمانتیں پیدا کریں یا اوروں کے مقابلہ میں زیادہ طاقت حاصل کریں ؎

لیکن یہ کوشش بس اسی حد تک جائز اور معقول ہے کہ خود اس قوم کی معاشی ترقی کیلئے جو یہ کوشش کرتی ہے مضر نہ ہو بلکہ مفید ہو اور انسانیت کے مقصدِ اعلیٰ یعنی آئندہ اتحادِ عالمی کے قیام کے بھی مخالف نہ پڑتی ہو ؎

جس طرح انسانی ہیئت اجتماعی پر دو نقطوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے یعنی عالمی نقطۂ نظر جو کل انسانیت کو سامنے رکھتا ہے اور سیاسی نقطۂ نظر جو مخصوص قومی اغراض و حالات کا خیال کرتا ہے اسی طرح معیشت پر بھی چاہے شخصی ہو چاہے جماعتی دو نقطوں سے نظر کرنی چاہیے یعنی یا تو ان شخصی، جماعتی اور مادی قوتوں کے نقطۂ نظر سے جن کے ذریعہ دولت پیدا ہوتی ہے یا مادی اشیاء کی قدر مبادلہ کے نقطۂ نظر سے ؎

چنانچہ ایک معاشیاتِ عالمی ہوتی ہے ایک قومی، ایک نظریہ ہوتا ہے اقدار مبادلہ کا اور

ایک قوائے دولت آفریں کا، اور یہ دونوں ایک دوسرے سے اصولاً جُدا مسلک ہیں جن کی الگ الگ توضیح ہونی چاہیئے ؛

قوموں کے قوائے دولت آفریں کا انحصار محض افراد کی محنت، کفایت شعاری، اخلاق اور ذہانت پر نہیں ہوتا نہ قدرتی وسائل اور مادی سرمایہ پر بلکہ معاشرتی، سیاسی، اور شہری اداروں اور قانون پر بھی ہوتا ہے اور سب سے زیادہ قومیت کی بقا، خود مختاری اور طاقت کی ضمانتوں پر، افراد کتنے ہی محنتی، کفایت شعار، جدّت طراز، حوصلہ مند نیک اور ذہین کیوں نہ ہوں اتحادِ قومی کے بغیر بلا قومی تقسیم عمل اور قومی قوائے دولت آفریں کے تعاون باہمی کے، قوم کبھی بھی خوشحالی اور طاقت کا کوئی اعلیٰ درجہ حاصل نہ کرسکے گی نہ اپنی ذہنی، اجتماعی اور مادی املاک پر ہمیشہ قابض رہنے کا یقین رکھ سکے گی ؛

تقسیم عمل کے اصول کو ابھی تک پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے۔ اضافۂ دولت آفرینی اس میں نہیں کہ بس کام کے مختلف حصّوں کو کئی افراد میں تقسیم کر دیا جائے بلکہ اس سے زیادہ اس میں ہے کہ ان افراد کو ذہناً اور جسماً ایک مشترک مقصد کیلئے متحد کر دیا جائے چنانچہ یہ اصول صرف کسی منفرد کارخانہ اور کھیت ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ قوم کی کل زرعی، صنعتی، اور تجارتی قوت پر بھی صادق آتا ہے ؛

قومی پیمانہ پر تقسیم عمل اور قوائے دولت آفریں کا تعاون اس وقت ہوتا ہے جب قوم میں ذہنی اور مادی دولت آفرینی کا تناسب صحیح ہو اور زراعت، صنعت اور تجارت میں یکساں ترقی اور ہم آہنگی ہو ؛

محض زراعت والی قوم میں خواہ وہ صنعتی۔ تجارتی قوموں سے آزاد تجارت بھی کرتی ہو تو اُسے دولت آفریں اور قدرتی وسائل کا بڑا حصہ فضول اور بیکار پڑا رہتا ہے۔ اس کی ذہنی اور سیاسی ترقی اور اس کی مدافعت کی قوتیں محدود ہوتی ہیں۔ اس کے ہاتھ میں نہ بڑی جہازرانی ہو سکتی ہے نہ وسیع تجارت۔ اس کی ساری خوشحالی جہاں تک کہ یہ بین الاقوامی تجارت کا نتیجہ ہے، دوسروں کی تدبیروں سے یا جنگوں کے ذریعہ منقطع کی جا سکتی ہے، منتشر اور برباد ہو سکتی ہے۔

برخلاف اس کے صنعت سے علم اور فن کو ترقی ہوتی ہے اور سیاسی تکمیل، قومی خوشحالی بڑھتی ہے، آبادی، سرکاری آمدنی، اور قوم کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اس سے قوم کو ذرائع ہاتھ آتے ہیں کہ اپنے تجارتی تعلقات کو ساری دنیا میں پھیلا دے اور نوآبادیاں بسائے۔ اس سے ماہی گیری، جہازرانی اور جنگی بیڑے کی پرورش ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے ملکی زراعت ترقی کے اونچے درجہ پر پہنچ سکتی ہے۔

زراعت اور صنعت ایک ہی قوم میں اور ایک ہی سیاسی قوت کے ماتحت متحد ہوں تو ہمیشہ امن سے رہتی ہیں۔ ان کے مفید باہمی اثرات میں جنگوں سے یا دوسرے ممالک کی تجارتی تدابیر سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا اور اس لئے یہ قوم کی خوشحالی تہذیب اور طاقت میں مسلسل ترقی کی ضامن بن جاتی ہیں۔

صنعت اور تجارت قدرتی اسباب سے مشروط ہیں لیکن ان کے شرائط مختلف ہیں۔ جہاں تک قدرتی وسائل کا تعلق ہے منطقہ معتدلہ کے ممالک صنعت کے نشو و نما کیلئے خاص

طور پر مناسب ہیں اس لئے کہ معتدل آب و ہوا کا علاقہ ذہنی اور جسمانی مشقت کا علاقہ ہوتا ہے برخلاف اس کے اگر منطقہ حارہ کے ممالک کو صنعت کیلئے کم سہولتیں ہیں تو ایسی قیمتی زراعتی پیداوار کے اعتبار سے، جو منطقہ معتدلہ کے ممالک کو بہت مرغوب ہے، انہیں گویا ایک قدرتی اجارہ حاصل ہے۔ زیادہ تر منطقہ معتدلہ کی مصنوعات اور منطقہ حارہ کی زرعی پیداوار کے مبادلہ سے ہی عمل کی سنساری تقسیم اور قوتوں کا تعاون باہمی یعنی عظیم الشان تجارت بین الاقوامی وجود میں آتی ہے ؎

منطقہ حارہ کے کسی ملک کے لئے تو خود نہایت مضر آغاز کار ہوا گر وہ خود اپنی صنعت کی پرورش شروع کر دے۔ چونکہ قدرت نے اس میں اس کی اہلیت نہیں رکھی اس لئے وہ مادی دولت اور تمدن دونوں میں بہت زیادہ ترقی کرے گا اگر ہمیشہ منطقہ معتدلہ کے مصنوعات کا اپنی زرعی پیداوار سے مبادلہ کرتا رہے ؎

یہ ضرور ہے کہ اس طرح منطقہ حارہ کے ملک منطقہ معتدلہ کے ملکوں کے پابند ہو جاتے ہیں لیکن یہ پابندی مضرت رساں نہیں رہتی، بالکل ہٹ جاتی ہے جب منطقہ معتدلہ میں بہت سی قوموں کے اُٹھ کھڑے ہونے سے صنعت، تجارت، جہازرانی اور قوت سیاسی میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہے اور بہت سی صنعتی قوموں کا صرف اس میں فائدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے قابو میں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ انہوں میں سے کسی کو منطقہ حارہ کی کمزور قوتوں کے خلاف جبر کا بے جا استعمال کرنے سے روکیں۔ یہ فوقیت مضر اور خطرناک ہو سکتی ہے صرف اس وقت کہ ساری صنعت، ساری تجارت، ساری بڑے پیمانہ کی جہازرانی

اور ساری بحری قوت کی اجارہ دار بس ایک ہی قوم ہو جائے ؛

لیکن جن قوموں کے پاس منطقہ معتدلہ کا ایک بڑا رقبہ ہو اور اس میں طرح طرح کے قدرتی وسائل موجود ہوں اور وہ ضروری معاشی، ذہنی، اور جماعتی وسائل کی فراہمی کیساتھ ہی تقسیم عمل اور قوائے دولت آفریں کے تعاون کے اصولوں کو قومی پیمانہ پر چلانیکی کوشش نہ کریں تو وہ گویا اپنی خوشحالی، تہذیب اور طاقت کے سب سے قیمتی ماخذ کو بیکار ڈالے رکھتی ہیں ؛

معاشی وسائل سے ہماری مراد اچھی خاصی ترقی یافتہ زراعت سے ہے جس میں پیداوار کی معتدبہ ترقی نہیں ہوسکتی۔ ذہنی وسائل سے مراد افراد کی اعلیٰ تعلیم ہے۔ جماعتی وسائل سے ہماری مراد ادارے اور قوانین ہیں جن سے شہریوں کو تحفظ شخصی اور تحفظ املاک کا اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو آزادی سے استعمال کرنے کا یقین ہو، آمد و رفت کو باضابطہ رکھنے اور سہل بنانے کے انتظامات ہوں اور ایسے ادارے نہ ہوں جن سے صنعت میں، آزادی میں، اخلاق میں، اور ذہنی صلاحیتوں میں، نقص پیدا ہو مثلاً منصب داری نظام وغیرہ ؛

ایسی قوم کا فائدہ اس کوشش میں ہے کہ سب سے پہلے تو وہ خود اپنی منڈی میں مصنوعات فراہم کرے اور پھر منطقہ حارہ کے ملکوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ براہ راست تعلقات قائم کرے خود اپنے جہازوں میں لاد کر انہیں مصنوعات بھیجے اور معاوضہ میں اُن کی زرعی پیداوار خریدے ؛

منطقہ معتدلہ کی صنعتی اور منطقہ حارہ کے زراعتی ممالک کے لین دین کے مقابلہ میں باقی ساری بین الاقوامی تجارت کی، دچند چیزوں کو مثلاً شراب کو مستثنےٰ کر کے، بس ضمنی سی اہمیت رہ جاتی ہے ؛

خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزوں کا پیدا کرنا منطقہ معتدلہ کی بڑی قوموں کیلئے صرف اندرونی تجارت کے نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یوں غلہ، شراب، سنی، سن، اُون وغیرہ کی برآمد سے کوئی غیر متمدّن اور غریب قوم تمدّن کی ابتدائی منزلوں میں اپنی زراعت کو معتد بہ ترقی دے لے تو دے لے ورنہ ابھی تک کسی بڑی قوم نے اپنی دولت، تہذیب اور طاقت میں اس کے ذریعہ ترقی نہیں کی ہے۔

بطور کلیہ کے پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک قوم اسی قدر مالدار اور طاقت ور ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ مصنوعات کی برآمد اس کے یہاں سے ہو، جتنی زیادہ خام اجناس کی درآمد اس کے یہاں ہو اور جتنی زیادہ منطقہ حارہ کی پیداوار وہ اپنے صرف میں لائے۔

منطقہ حارہ کی پیداوار منطقہ معتدلہ کی صنعتی قوموں کے لئے صرف چیزیں بن بناتے ہیں یا کھانے پینے میں کام نہیں آتی، زرعی اور صنعتی دولت آفرینی کے لئے محرّک کا کام بھی دیتی ہے۔ چنانچہ آپ ہمیشہ پائیں گا کہ جس قوم میں منطقہ حارہ کی پیداوار سب سے زیادہ صرف میں آتی ہے اسی کے یہاں مقابلتہً سب سے زیادہ زرعی پیداوار ہوتی اور مصنوعات تیار ہوتی اور صرف میں آتی ہیں۔

چنانچہ قوموں کے معاشی نشو و نما میں چار مختلف عہد ہوتے ہیں۔ پہلے عہد میں پردیسی مصنوعات کی درآمد اور دیسی زرعی پیداوار اور اجناس خام کی برآمد سے ملکی زراعت کو ترقی ہوتی ہے۔ دوسرے عہد میں ملکی صنعتیں پردیسی مصنوعات کی درآمد کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی ہیں تیسرے میں ملکی صنعتیں ہی ملکی منڈی کو زیادہ تر مال فراہم کر دیتی ہیں اور چوتھے عہد میں

ملکی مصنوعات کی بڑی بڑی مقداریں باہر جاتی ہیں اور پردیس سے زرعی پیداوار اور اجناس خام کی درآمد ہوتی ہے ؛

نظام محاصل کی ترتیب میں، اس حیثیت سے کہ وہ تجارتِ خارجہ کا انتظام کرکے قوم کی معاشی ترقی کا ذریعہ ہوتا ہے، ہمیشہ قوم کی صنعتی تعلیم کے اصول کو اپنا راہنما بنانا چاہیئے ؛ تامینی محاصل سے ملکی زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کرنا گویا کہ کام کو نہایت احمقانہ طریق پر شروع کرنا ہے، اس لئے کہ ملکی زراعت صرف ملکی صنعت کی معرفت معاشی ترقی کرسکتی ہے اور پردیس سے اجناس خام اور زرعی پیداوار کا آنا روک کر خود ملک کی صنعت کو ترقی سے روک دیا جاتا ہے ؛

جو قوم ذہانت اور تمدّن کے پست درجہ پر ہو یا مملکت کے رقبہ اور زرخیزی کے مقابلہ میں جس قوم کی آبادی ابھی کم ہو اس کی معاشی تعلیم میں اس سے بہت ترقی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ متمدّن، دولتمند اور محنتی قوموں سے آزاد تجارت کرے ایسی قوم کی تجارت پر ہر پابندی جو اس ارادہ سے کی جائے کہ وہ خود اپنی صنعت قائم کرے قبل از وقت ہوتی ہے اور کل انسانیت کی خوشحالی ہی پر مضر اثر نہیں ڈالتی بلکہ خود اس قوم کی ترقی کو بھی نقصان پہنچاتی ہے وہ تو جب آزاد تجارت کے ذریعہ قوم کی ذہنی، سیاسی اور معاشی تعلیم اس حد تک ہو چکتی ہے کہ پردیسی مصنوعات کے آنے سے اور خود اس کی پیداوار کیلئے کھپت کے مواقع کم ہونے کی وجہ سے وہ آگے ترقی کرنے سے رک جاتی ہے اس وقت تامینی تدابیر حق بجانب ہوتی ہیں ؛

جس قوم کے پاس بڑا رقبہ زمین نہیں، نہ طرح طرح کے قدرتی وسائل ہیں، اپنے

دریاؤں کے دہانے اس کے قبضہ میں نہیں اور کسی وجہ سے اس کا رقبہ خوب، نہیں، وہ قوم نظام تامین کو یا تو بالکل کام میں نہیں لا سکتی یا پوری کامیابی کے ساتھ نہیں، ایسی قوم کو سب سے پہلے یہ چاہیئے کہ یا تو ملک فتح کر کے یا کسی معاہدہ کے ذریعہ اس قسم کے نقائص کو دور کرنے کی تدبیر کرے ۔

صنعت علم و ہنر کی اتنی شاخوں پر حاوی ہوتی ہے، اس میں اتنے تجربے مہارتیں اور عادتیں درکار ہوتی ہیں کہ قوم کی صنعتی تعلیم آہستہ آہستہ ہی ترقی کر سکتی ہے۔ تامین میں ہر مبالغہ اور ہر عجلت کی سزا خود قوم کی خوشحالی میں کمی ہوتی ہے ۔

سب سے مضر اور قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ نظامِ امتناعی کے ذریعہ قوم کو یکایک اور بالکل دوسری قوموں سے الگ کر لیا جائے لیکن کبھی کبھی ایسا کرنا بھی حق بجانب ہوتا ہے جب کہ قوم کسی طویل جنگ کی وجہ سے دوسری قوموں سے الگ رہی ہو اور مجبوراً دوسری قوموں کی مصنوعات آنی بند ہو گئی ہوں اور اس کے لئے لازم ہو گیا ہو کہ آپ اپنی ضرورتوں کی کفالت کرے ۔

ایسی صورت میں یہ کرنا چاہیئے کہ امتناعی نظام سے رفتہ رفتہ، شرح محاصل میں تخفیف کو بہت پہلے سے مقرر کر کے اور بہت تدریجی کمی کر کر کے تامینی نظام تک آیا جائے لیکن برخلاف اس کے جو قوم عدم تامین کی حالت سے تامین کی حالت میں جانا چاہتی ہے اسے چاہیئے کہ ہلکی شرح محاصل سے شروع کرے اور پھر اس میں رفتہ رفتہ اور پہلے سے طے کی ہوئی تدریج سے اضافہ کرے ۔

یوں پہلے سے جو شرح محاصل مقرر کی جائے اس پر ریاست کو نہایت پختگی سے قائم رہنا چاہیئے۔ مدّت مقررہ سے پہلے تو اس شرح میں کبھی کمی کرنی ہی نہ چاہیئے، البتہ اگر یہ شرح کافی نہ معلوم ہو تو اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے ؛

بہت بھاری محاصل درآمد، جن سے پردیسی مقابلہ بالکل بند ہو جائے خود عائد کرنے والی قوم کے لئے مُضر ہوتے ہیں اس لئے کہ پردیس کے صنعت والوں سے مسابقت کا جذبہ بالکل جاتا رہتا ہے اور کاہلی کی پرورش ہوتی ہے اگر خاصے اُونچے اور رفتہ رفتہ بڑھنے والی شرح محاصل کے باوجود بھی دیسی صنعت کو فروغ نہ ہو تو اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم کے پاس خود اپنی صنعت قائم کرنے کے ضروری وسائل موجود نہیں ہیں ؛

صنعت کی جس شاخ کو ایک مرتبہ مامون کر دیا جائے اس پر محاصل کی شرح کبھی اتنی کم نہ ہونی چاہیئے کہ اس صنعت کا وجود پردیسی مقابلہ کی وجہ سے خطرہ میں پڑ جائے۔ موجود کو قائم رکھنا اور قومی صنعت کے درخت کی جڑوں اور تنہ کی حفاظت کرنا ایک اٹل اصول ہونا چاہیئے ؛

چنانچہ پردیسی مقابلہ کو بس اس حد تک اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ صرف دولت کے سالانہ اضافہ میں حصّہ لے سکے۔ اور جہاں پر دیسی مقابلہ اس سالانہ اضافہ کو سب کا سب یا اس کے بڑے حصّے کو ہضم کرنے لگے فوراً شرح محاصل کو بڑھا دینا چاہیئے ؛

انگریزوں جیسی قوم، جسے صنعت میں اور سب قوموں پر پہل حاصل ہے، اپنے صنعتی اور تجارتی تفوق کو حتّی الامکان آزاد تجارت سے قائم رکھتی ہے بلکہ بڑھاتی ہے اس

کے لیئے تو عالمی اور قومی اصول دونوں بالکل یکساں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روشن خیال انگریز معاشی کامل آزادی تجارت کے اس درجہ حامی ہوتے ہیں اور دوسری قوموں کے معاشی دنیا کے موجودہ حالات میں اس اصول کو عمل میں لانے سے گریز کرتے ہیں ۔

کوئی پچیس برس سے انگلستان کا نظام امتناعی اور نامینی خود انگلستان کو نقصان پہنچا رہا ہے اور جو قومیں اس کے پہلو بہ پہلو بڑھ رہی ہیں انہیں فائدہ۔ انگلستان کیلیئے سب سے زیادہ مضر اثر ان پابندیوں کا ہے جو اس نے خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزوں کی درآمد پر عائد کر رکھی ہیں ۔

مختلف قوموں میں لین دین اور تجارتی تعلق کو سہل بنانے کے لیئے تجارتی اتحاد اور تجارتی معاہدے سب سے مؤثر ذریعہ ہیں لیکن تجارتی معاہدے اسی وقت جائز ہوتے ہیں اور پائیدار کہ اس سے طرفین کو فائدہ ہو۔ مضر اور ناجائز تجارتی معاہدے وہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے کسی قوم کی ترقی پذیر صنعت کسی دوسری قوم پر سے قربان کر دی جاتی ہے، صرف اس لیئے کہ زرعی پیداوار کی برآمد کے لیئے رعایتیں حاصل کر لی جائیں یعنی معاہدہ میتھوین جیسے معاہدے جس میں ایک فریق غالب ہوتا ہے ۔

ایک ایسا ہی معاہدہ غالب ۱۷۸۶ء میں فرانس اور انگلستان میں ہوا تھا تمام تجاویز جو اس وقت سے اب تک انگلستان نے فرانس کے سامنے یا دوسری قوموں کے سامنے پیش کی ہیں۔ وہ اسی قبیل کی ہیں ۔

محاصل تامینی سے اگر کچھ دن کے لیئے ملک میں مصنوعات کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں تو آئندہ

چل کر خود ملکی مقابلہ کی وجہ سے قیمتیں کم بھی ہوتی ہیں اس لئے کہ جب صنعت پوری ترقی کر لیتی ہے تو مصنوعات کی قیمت اس قدر سستی ہوسکتی ہے جس قدر کہ خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزوں کے ملک سے باہر جانے اور پھر مصنوعات کے باہر سے آنے میں حمل و نقل میں اور کاروباری منافع میں صرف ہو جاتا ‌ؔ

بہر حال تامینی محاصل سے قوم کو جو نقصان ہوتا ہے۔ وہ قدروں کا نقصان ہے لیکن اس کے مقابلہ میں اسے قوتیں حاصل ہوتی ہیں، جن سے وہ ہمیشہ کے لئے اس قابل ہو جاتی ہے کہ قدروں کی بے حساب مقدار پیدا کر سکے۔ قدروں کا یہ خرچ گویا قوم کی صنعتی تعلیم کی قیمت ہے ‌ؔ

مصنوعات پر جو تامینی محاصل ہوتے ہیں ان کا بار تامین کرنے والی قوم کی زراعت پر نہیں پڑتا۔ ملکی صنعت کی ترقی سے دولت اور آبادی بڑھتی ہے، اس وجہ سے زرعی پیداوار کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے لہذا لگان اور اراضی کی قیمت غیر معمولی طور پر چڑھ جاتی ہے، اور جوں جوں زمانہ گزرتا ہے زراعت والوں کو جو مصنوعات درکار ہوتی ہیں ان کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ مصنوعات کی قیمتوں میں عارضی اضافہ سے زراعت والوں کو جو نقصان ہوتا ہے مذکورہ فوائد اس سے دہ چند سے بھی زیادہ ہوتے ہیں ‌ؔ

اس طرح نظام تامین سے تجارت خارجہ و داخلہ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اس لئے کہ یہ تجارت خارجہ و داخلہ انہیں قوموں میں کچھ اہمیت رکھتی ہیں جو اپنی ملکی منڈی میں مصنوعات خود فراہم کرتی ہوں، اپنی زرعی پیداوار کو خود صرف میں لاتی ہوں اور جو فاضل مصنوعات پہنچنے

ہوں ان کا مبادلہ دوسرے ملکوں کے اجناس خام اور کھانے پینے کی چیزوں سے کرتی ہوں منطقہ معتدلہ میں جو قومیں صرف زراعت کرتی ہیں اُن کے یہاں یہ دونوں تجارتیں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں اور ایسی قوموں کی تجارت خارجہ معمولاً ان صنعتی اور تجارتی قوموں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کا لین دین ان سے ہوتا ہے ؛۔

صحیح نظام تامین سے ملکی اہلِ صنعت کو اجارہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ان لوگوں کو نقصان سے محفوظ ہونے کی ضمانت مل جاتی ہے جو اپنے سرمایہ کو، صلاحیتوں کو اور محنت کو نئی اور بے جانی صنعتوں میں لگاتے ہیں۔ اجارہ اس سے یوں نہیں ملتا کہ پردیسی مقابلہ کی جگہ ملکی مقابلہ آجاتا ہے کہ قوم کے ہر فرد کو آزادی ہے کہ قوم نے افراد کی جو مدد کی ہے اُس کی حصہ دار بنے۔ یہ اگر اجارہ دیتا ہے تو اپنی قوم کے لوگوں کو دوسری قوموں کے لوگوں کے مقابلہ میں جنہیں خود بھی اپنے یہاں اس قسم کا اجارہ حاصل ہوتا ہے ؛۔

لیکن یہ اجارہ مفید چیز ہے، اس لئے ہی نہیں کہ قوم کی خفتہ اور بیکار دولت آفرین قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ پردیسی قوائے دولت آفرین کو (مادی اور ذہنی سرمایہ، کارخانوں والے صناع اور مزدور) ملک میں کھینچتا ہے ؛۔

برخلاف اس کے اگر کسی پرانے تمدن والی قوم میں، جس کی قوت دولت آفرین میں خام اجناس اور زرعی پیداوار کی برآمد بڑھا کر اور پردیسی درآمد کے ذریعہ اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اس کی اپنی صنعت فروغ نہ پائے تو وہ طرح طرح کے بڑے نقصانات کا نشانہ بن جاتی ہے ؛۔

ایسی قوم کی زراعت لازم ہے کہ بالکل خراب ہو جائے اس لئے کہ آبادی کا اضافہ جو اپنی صنعت

کے فروغ پانے کی صورت میں مختلف صنعتوں میں کھپ جاتا اور زرعی پیداوار کی خوب مانگ بڑھاتا اور اس طرح زراعت کو فی الجملہ زیادہ نفع بخش بناتا اور فروغ دیتا وہ اضافہ آبادی اب سب کا سب زراعت کے سر پڑتا ہے اور کھیتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرا کے چھوٹی چھوٹی معاشیں پیدا کرتا ہے جو قوم کی قوت اور تہذیب اور اس کی دولت کے لئے سخت مُضر چیز ہے ؂

جو زراعتی قوم بیشتر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں پر مشتمل ہو وہ نہ تو اندرونی تجارت میں بہت سی پیداوار لا کر ڈال سکتی ہے نہ مصنوعات کی مانگ بڑھا سکتی ہے۔ یہاں تو ہر شخص اپنے کو بس خود اپنی پیداوار اور اپنے ہی صرف تک محدود رکھتا ہے۔ ان حالات میں قوم کے اندر کبھی کوئی مکمل نظام حمل و نقل قائم نہیں ہو سکتا اور قوم کو کبھی وہ بیحساب سہولتیں حاصل نہیں ہو سکتیں جو اس نظام کے ساتھ وابستہ ہیں ؂

اس کا لازمی نتیجہ قومی کمزوری ہے، ذہنی بھی اور مادی بھی، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی، اور یہ اثرات اور بھی مُضر ہوتے ہیں جب آس پاس کی قومیں بالکل دوسری راہ پر چل رہی ہوں اور جب ہم پیچھے ہٹ رہے ہوں تو وہ آگے بڑھ رہی ہوں، وہاں بہتر مستقبل کی امید لوگوں کی ہمت، قوت اور حوصلہ کو بڑھا رہی ہو تو یہاں ایک تاریک مستقبل کا نظارہ برابر ذہن اور ہمت کا گلا گھونٹ رہا ہو ؂

تاریخ تو ایسی مثالیں بھی پیش کرتی ہے کہ قوموں کی قومیں اس لئے تباہ و برباد ہو گئیں کہ انہوں نے بر وقت اس اہم مسئلہ کو حل نہیں کیا اور خود اپنی صنعت پیدا کر کے، اور اہل صنعت و تجارت کا مضبوط طبقہ قائم کر کے اپنی ذہنی، معاشی اور سیاسی خود مختاری کی ضمانت نہ کر لی ؂

پہلی کتاب

تاریخ

باب (۱)

اٹلی والے

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے وقت باعتبار تجارت وصنعت کوئی ملک اتنی اچھی حالت میں نہ تھا جتنا اٹلی۔ بربریت، قدیم رومی تہذیب وتمدّن کو پوری طرح نہ مٹا سکی تھی۔ طریقۂ کاشت اگرچہ معمولی ہی تھا پھر بھی اچھی آب وہوا اور زرخیز زمین سے کثیر آبادی کیلئے وافر غذا فراہم ہو جاتی تھی ضروری ضروری فن اور صنعتیں تباہی سے ایسی ہی بچ رہی تھیں جیسے قدیم روما کے انتظاماتِ بلدی۔ ساحل کی خوشحال ماہی گیری ہر جگہ جہاز رانوں کے لئے تربیت گاہ کا کام دیتی تھی۔ اندرونی ذرائع آمد و رفت کم تھے مگر ان کی تلافی وسیع سواحل کی جہاز رانی سے اچھی

طرح ہو جاتی تھی۔ یونان، ایشیا کوچک اور مصر سے قرب اور اُن سے بحری آمد و رفت کے روابط کے باعث اٹلی کو اس مشرقی تجارت سے خاص فوائد بھی حاصل ہو گئے تھے، جو اس سے پہلے روس میں سے گزر کر ممالک شمالی سے ہوا کرتی تھی، اگرچہ کچھ بہت وسیع پیمانہ پر نہ سہی۔ اس تجارتی ربط ضبط کی وجہ سے اٹلی نے علوم و فنون اور وہ صنعتیں بھی سیکھ لی تھیں جنہیں یونان نے ازمنۂ قدیم کی تہذیب سے بچا رکھا تھا۔

آٹو اعظم نے جب سے اطالوی شہروں کو آزادی دی اُسی وقت سے اُن شہروں نے برابر اس حقیقت کی شہادت دی ہے جس کی تصدیق قدماء اور متاخرین دونوں کی تاریخ سے ہوتی ہے، یعنی یہ کہ آزادی اور صنعت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چاہے اکثر یہ ہوتا ہو کہ ان میں سے ایک پہلے رونما ہو اور دوسری بعد کو۔ اگر کسی جگہ تجارت اور صنعت کو فروغ ہو تو یقین جانو کہ آزادی بھی کہیں قریب ہی ہو گی، اگر کہیں آزادی نے اپنا پرچم لہرایا ہے تو یہ اس کی یقینی علامت ہے کہ جلد یا بدیر صنعت کی سواری بھی آنے والی ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ فطری اور کیا بات ہو گی کہ جب آدمی کو مادی یا ذہنی دولت حاصل ہو جائے تو وہ اس بات کی ضمانت پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ یہ دولت اس کے ورثاء کو پہنچ جائے گی، یا جب اسے آزادی حاصل ہو جائے تو وہ اپنی مادی اور ذہنی حالت کے بہتر بنانے میں ساعی ہو۔ زمانۂ قدیم کی آزاد ریاستوں کے زوال کے بعد سب سے پہلی مرتبہ اٹلی کے شہروں نے آزاد اور دولت مند ہیئتِ اجتماعی کا منظر دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ شہروں اور علاقوں نے مرفہ الحالی حاصل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی اور صلیبی جنگیں بھی اس معاملے میں نہایت قوی محرک ثابت ہوئیں۔ صلیبی

جنگ آزماؤں اور اُن کے اسباب و سامانِ جنگ کی۔ اور یونہی نے صرف اٹلی کی جہازرانی ہی کو فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اس بات کی ترغیب بھی دی اور مواقع بھی بہم پہنچائے کہ ممالک مشرق سے سودمند تجارتی تعلقات قائم کئے جائیں، نئی نئی صنعتیں اور اختراعیں رائج کی جائیں، نئے نئے پودے ملک میں لائے جائیں اور حفظِ نفس کے نئے نئے طریقوں سے آگاہی ہو۔ دوسری طرف اسی وجہ سے منصب داری، امرا کا ظالمانہ اقتدار مختلف حیثیتوں سے کمزور پڑ گیا تھا، آزاد کاشتکاروں اور شہریوں کو پہلے سے زیادہ فروغ ہو چلا تھا ؛

وینس اور جنیوا کے علاوہ فلورنس بھی اپنی دستکاری اور مبادلۂ زر کے کاروبار کے لئے خاص طور پر ممتاز تھا۔ بارہویں اور تیرھویں صدی میں ہی یہاں ریشم اور اُون کی صنعت کو خوب فروغ تھا، اِن صنعتوں کی پنچایتیں حکومت میں حصہ لیتی تھیں ؛ اور اُنہی کے زیر اثر جمہوریت قائم ہوئی تھی صرف اُون کی صنعت کے دو سو کارخانے تھے، جن میں ہر سال اسّی ہزار تھان تیار ہوتے تھے اور اُن کے لئے خام جنس ہسپانیہ سے آتی تھی۔ اس کے علاوہ تین لاکھ گلڈن قیمت کا کورا کپڑا ہر سال ہسپانیہ، فرانس، بلجیم اور جرمنی سے شہر میں آتا، اور یہاں ٹھیک ہو کر بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلی ممالک کو بھیج دیا جاتا تھا۔ فلورنس میں تمام اٹلی کے ساہوکارے کا کاروبار ہوتا تھا اور شہر میں اسّی (۸۰) بینک تھے[۱]؛ حکومت کی سالانہ آمدنی تین لاکھ گلڈن تھی (ہمارے موجودہ حسابِ زر سے ڈیڑھ کروڑ فرانک) یعنی اس زمانے میں نیاپل اور اراگان

(۱) De PEcluse : Elorence et ses vicissitudes

صفحات ۲۳، ۲۶، ۳۲، ۱۰۳ اور ۲۱۳ ؛

کی حکومت کی آمدنی سے اور برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ کی ملکہ الزبتھ کے عہد کی آمدنی سے زیادہ (۱)!

چنانچہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہی میں قومی مرفہ الحالی کے تمام عناصر اٹلی کے ہاتھ میں تھے اور یہ تجارتی اور صنعتی دونوں اعتبار سے دوسری قوموں سے کہیں آگے تھا۔ اس کی زراعت اور دستکاریاں دوسری قوموں کے لئے نمونہ تھیں اور محرک تقلید۔ چنانچہ مہذب دنیا نے ساہوکار کے انتظامات، جہاز رانوں کا قطب نما، جہازوں کی تعمیر کا بہتر طریقہ، طریقہائے مبادلہ، بہت سے مفید تجارتی رسوم اور تجارتی قوانین اور اپنے بلدی و سیاسی انتظامات کا ایک بڑا حصہ اسی سے حاصل کیا ہے۔ اس کی تجارتی جہاز رانی اور بحری قوت جنوبی سمندروں میں سب سے زیادہ تھی۔ دنیا کی تجارت اس کے ہاتھ میں تھی، کیونکہ اس غیر اہم حصے کو چھوڑ کر جو شمالی سمندروں میں سے ہو کر گزرتا تھا اور ساری تجارت بحیرۂ روم و بحیرۂ اسود میں محدود تھی یہی تمام قوموں کو دستکاریوں کے نمونے، عیش کے ساز و سامان اور منطقۂ حارہ کی پیداوار مہیا کرتا تھا اور اس کے عوض ان سے اجناس خام حاصل کرتا تھا۔ وہ بننے کے لئے جو ہمارے زمانے میں انگلستان بن گیا ہے، اٹلی میں بس ایک چیز کی کمی تھی، اور چونکہ یہ ایک چیز نہ تھی دولت کے تمام دوسرے عناصر اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس میں قومی اتحاد نہ تھا اور وہ قوت ناپید تھی جو بس اتحاد ہی سے پیدا ہوتی ہے اٹلی کے شہر اور اٹلی کے حاملین اقتدار اپنے کو ایک ہی جسم کا عضو تصور نہ کرتے تھے، بلکہ ایک دوسرے سے جنگ کرتے اور باہم تاخت و تاراج کرتے تھے، گویا کہ جدا جدا خود مختار قومیں اور ریاستیں ہوں۔ ایک طرف خارجی حیثیت سے یہ جنگیں ہو رہی تھیں دوسری طرف ان میں سے

Pechio : Histoire de l'Economie politique en Italie (۱)

ہر ایک داخلی طور پر جمہوریت، امارتی طرزِ حکومت اور استبداد کے باہمی پیکار کا جولاں گاہ تھا مرفہ الحالی کے لئے یہ تباہ کن معرکے خارجی قوتوں کے اشارہ اور ان کے حملوں سے اور بھی بھڑک اُٹھے اور اندرونی ملک میں ویسی پچارپوں اور ان کے مضر اثر کے باعث انہیں اور بھی تقویت پہنچی۔ چنانچہ ایک طرف تمام اطالوی جماعتیں دو فریقوں میں منقسم تھیں اور پھر خود ہر فریق اپنے اندر دو متخاصم فریق رکھتا تھا۔

اٹلی نے اپنے کو کس طرح تباہ کیا، اس کا بہترین علم اس کی بحری ریاستوں کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ پہلے تو ریاست املفی (آٹھویں اور گیارہویں صدی تک)[1] بہت بڑی اور قوی تھی۔ اس کے جہاز سمندروں کو پاٹے ہوئے تھے اور اٹلی اور بحیرہ روم کے مشرقی ساحلی ملکوں میں جو زر بھی رائج تھا وہ املفی زر تھا۔ سب سے زیادہ قابلِ عمل قوانین جہاز رانی املفی ہی کے تھے اور بحیرہ روم کے تمام بندرگاہوں میں یہی املفی قانون رائج تھا۔ بارہویں صدی میں پیزا نے اس بحری قوت کو تباہ کر ڈالا۔ پھر پیزا کی باری آئی تو وہ جینوا کے حملوں کا شکار ہوا۔ اور جینوا نے خود صد سالہ مقابلہ کے بعد وینس کے سامنے سر خم کیا۔

خود وینس کا زوال بالواسطہ اسی تنگ نظر سیاست کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اطالوی بحری قوتوں کی اگر ایک جمعیت ہوتی تو اس کے لئے یہ مشکل کام نہ ہوتا کہ اٹلی کے اقتدار کو یونان، ایشیائے

(۱) ترقی کے زمانے میں املفی میں پچاس ہزار باشندے تھے (Flavio Guio) بحری قطب نما کا مخترع یہیں کا شہری تھا۔ اہلِ پیزا نے جب املفی کو لوٹا ہے (۱۱۳۵ء یا ۱۱۳۷ء) اس وقت وہ قدیم کتاب دستیاب ہوئی تھی جو بعد کو جرمنی کی آزادی اور قوت کیلئے اس قدر مضر ثابت ہوئی یعنی (Pandektan)۔

کوچک، مجمع الجزائر اور مصر میں قائم و برقرار رکھتی، بلکہ اُسے برابر قوت اور وسعت دیتی جاتی۔ یا یہ کہ ایک طرف ترکوں کی بڑی ترقی اور بحری قزاقیوں کا سدِّ باب کرتی اور دوسری طرف پرتگیزوں سے اس امید والے راستے کے لئے لڑائی لیکن معاملات کی صورت اور ہی تھی اور وینس کو صرف تنہا ہی نہیں چھوڑ دیا گیا تھا بلکہ جو ساتھ کی ریاستیں تھیں اُن کے اور دوسری پڑوسی یورپی قوتوں کے حملوں نے اُسے اور بھی کمزور کر دیا تھا ۔

تمام اطالوی قوتوں کی جمعیت کے لئے یہ بھی کوئی دشوار کام نہ تھا کہ اٹلی کو بڑی سلطنتوں کی دستبرد سے بچا لیتی۔ ایسی جمعیت کے قیام کی کوشش ۱۵۲۶ء میں ہوئی تھی لیکن وہی جب واقعی خطرے کا وقت آن پہنچا تھا اور وہ بھی محض عارضی حفاظت کے لئے اس جمعیت کے قائدوں اور دوسرے ارکان کی سرد مہری اور دغا بازی میلان کی شکست اور فلورنس کی جمہوریت کی تباہی کا باعث ہوئیں اور اسی وقت سے اٹلی کی صنعت اور تجارت کا زوال شروع ہوتا ہے (۱) ۔

اپنی ابتدائی اور بعد کی تاریخ دونوں میں وینس بجائے خود ایک علیحدہ قوم بننا چاہتا تھا جب تک چھوٹی چھوٹی اطالوی ریاستوں سے یا بھگتے ہوئے یونان سے سابقہ تھا اس وقت تک تو اس میں کچھ دقت نہ ہوتی تھی کہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود دونوں سواحل پر صنعتی اور تجارتی

---

(۱) ایوں گو یا چارلس پنجم اٹلی میں بھی اس طرح صنعت و تجارت کی تباہی کا باعث ہوا جیسا ہسپانیہ اور نیدرلینڈ میں۔ اس نے حکم شاہی پر مبنی طبقہ اشراف کی بنیاد ڈالی اور یہ خیال پیدا کیا کہ اشراف کے لئے دستکاری اور صنعت باعث ذلت ہے اس خیال سے قومی صنعت پر نہایت مضر اثر پڑا اس کے زمانے سے پہلے اس کے بالکل خلاف خیال رائج تھا۔ چنانچہ مدیچی اقتدار شاہی حاصل کرنے کے بہت بعد تک تجارت میں مصروف رہے ۔

اقتدار قائم رہے لیکن جب متحد اور طاقت ور قومیں سیاسی میدان میں آئیں تو معلوم ہوا کہ وینس بس ایک شہر ہے اور اس کا طبقۂ امرا صرف بلدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وینس نے بہت سے جزیرے اور بعض صوبے فتح کر لئے تھے لیکن ان پر ہمیشہ ایسے حکومت کی جیسے مفتوحہ علاقوں پر ہوتی ہے اور اس طرح تمام مؤرخین کی شہادت کے مطابق اپنی قوت کی بجائے اپنی کمزوری میں ہی اضافہ کیا۔

اسی زمانے میں جمہوریت کے اندر وہ روح بھی رفتہ رفتہ مرگئی جس نے اسے اتنا بڑا بنا دیا تھا۔ وینس کی قوت اور مرفہ الحالی ایک محب وطن اور شجاع طبقۂ امرا کی سعی کا نتیجہ تھی جو ایک منطقی اور حریت پسند جمہوریت میں سے پیدا ہوا تھا۔ یہ قوت اور مرفہ الحالی اس وقت تک قائم رہی اور بڑھتی گئی جب تک جمہوری قوت کی آزادی نے اسے سہارا دیا اور اس کی رہنمائی طبقۂ امرا کے جذبۂ حب وطن، دانشمندی اور شجاعت سے ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے اس طبقۂ امرا نے ایک مستبدانہ اور قوم کی آزادی اور قوت کو تباہ کرنیوالے طبقۂ خواص کی حیثیت اختیار کی ویسے ویسے قوت و مرفہ الحالی کی جڑیں کھوکھلی ہوتی گئیں، اگرچہ چوٹی اور شاخوں پر کچھ عرصے تک کونپلیں لہلہاتی دکھائی دیتی تھیں (۱)۔

---

(۱) Daru : Histoire de Venise جلد (۴) باب (۱۸) "جب امرا وطن کے لئے اپنا خون بہانے کی بجائے، فتوحات سے اس کے نام کو چار چاند لگانے کی بجائے، اور ملک گیری سے اپنے رقبے کو بڑھانے کی بجائے صرف اپنے اعزاز سے ذاتی فائدہ اٹھانے لگے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ۸ یا ۹ سو آدمی آخر ساری جمہوریت پر کیوں قابض تھے"۔

مانٹسکیو کا قول ہے: "جو قوم غلامی میں مبتلا ہو وہ نئی چیزیں حاصل کرنے کی بہ نسبت جو کچھ حاصل کر چکی ہے اسے قائم رکھنے کی زیادہ کوشش کرتی ہے۔ برخلاف اسکے آزاد قوم اپنے مقبوضات قائم رکھنے سے زیادہ نئی چیزیں حاصل کرنے میں ساعی ہوتی ہے"[1] اس پر از حقیقت قول میں وہ اتنا اضافہ اور کر سکتا تھا کہ جب کوئی صرف برقرار رکھنے پر اکتفا کرتا ہے اور حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو اس کی تباہی لازمی ہے، کیونکہ ہر قوم جو آگے ترقی نہیں کرتی اس کے لئے ضروری ہے کہ پیچھے ہٹے اور بالآخر اس کو بالکل زوال ہو جائے۔ اپنی تجارت کو وسعت دینے اور خود نئے اکتشافات کرنے کا تو ذکر ہی کیا، اہل وینس کو کبھی یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ دوسری قوموں نے جو اکتشافات کئے ہیں، اُن سے پورا فائدہ اُٹھائیں۔ ممالکِ مشرق سے تجارت کا نیا راستہ معلوم بھی ہو چکا تھا، اور ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ اس کی وجہ سے تمام مشرقی ہندی تجارت سے محروم ہو سکتے ہیں جو ساری دنیا دیکھتی تھی، یہ اسے نہ مانتے تھے اور جب تغیر حالات کے مضر اثرات محسوس ہونے لگے تو بجائے اس کے کہ نئے راستے کے فوائد سے متمتع ہوں یہ پرانے رستے ہی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ جو چیز متغیر حالات کے دانشمندانہ استعمال، حوصلہ مندی اور بہادری ہی سے حاصل ہونا ممکن تھی، اس کو یہ چھوٹی چھوٹی سازشوں سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور جب بالآخر جو کچھ اُن کے قبضے میں تھا اُسے کھو بیٹھے اور مشرقی و مغربی جزائر ہند کی دولت اُن کے بندرگاہوں کی بجائے فرانس اور سپین میں رکھنے لگی تو بے وقوفوں یا مسرفوں کی

---

(۱) صفحہ ۱۹۲ از Montesquieu : Esprit des lois,)

طرح انھوں نے توجہ کی تو کیمیا سازی کی طرف![1]

جس زمانے میں جمہوریت پھل پھول رہی تھی تو "کتاب زریں" میں کسی کا نام لکھا جانا تجارت، صنعت یا ریاست کی شہری یا فوجی خدمت میں ممتاز کارگزاری کا انعام سمجھا جاتا تھا اس شرط کو پورا کرکے یہ عزت باہر والوں کے لئے بھی قابلِ حصول تھی۔ چنانچہ سب سے ممتاز ریشم ساز کو جو فلورنس سے آیا تھا یہ عزت دی گئی تھی[2] لیکن جب مناصب عزت اور ریاست کے مشاہرے دولتمند خاندانوں کو ورثہ سمجھے جانے لگے تو یہ کتاب بند ہوگئی۔ بعد کو جب لوگوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ غریب اور زوال پذیر اشراف کے طبقے میں پھر ذرا جان ڈالی جائے تو یہ کتاب پھر کھولی گئی لیکن اب پہلے کی طرح اس میں نام لکھوانے کا خاص حق ریاست کی خدمت سے حاصل نہ ہوتا تھا، بلکہ دولت سے اور بڑا اسے شریف خاندانوں میں پیدا ہونے سے۔ بالآخر اس "کتاب زریں" میں نام لکھے جانے کی قدر اس درجہ کم ہوگئی تھی کہ یہ ایک صدی تک تقریباً بالکل بے سود کھلی پڑی رہی۔

---

(۱) ایک شخص چالیا نامی مارکو براساویتو کا جو سونا بنانے کا فن جاننے کا مدعی تھا امرا و ونیس نے نجات دینے والے کی حیثیت سے خیر مقدم کیا' Daru : Histoire de Venise جلد ۳، باب (۱۹)

(۲) ونیس بھی (جس طرح بعد کو ہالینڈ اور انگلستان) ہر موقع سے کام لیتا تھا کہ پردیسی راستوں سے صنعت اور سرمایہ اپنی طرف کھینچے۔ لکاّ میں تیرھویں صدی ہی میں مخمل اور زربفت کا کام خوب زوروں پر تھا جب یہاں کے ظالم حاکم کاستر چیو کاسترا چانی نے بہت ظلم ڈھایا تو ریشم کا کام کرنیوالے خاصی تعداد میں ونیس کھنچ آئے تھے دیکھو Sandu : Histoire de Venise جلد دوم صفحہ ۲۵۶ ، ۲۴۷

تاریخ سے اس جمہوریت اور اس کی تجارت کے زوال کے اسباب پوچھو تو وہ جواب دیگی کہ اس کا خاص سبب ایک زوال آمادہ طبقۂ اُمرا کی حماقت، غفلت اور بُزدلی ہے، اور ایک غلامی میں مبتلا قوم کی بے تعلقی یعنے اگر راس امید والا نیا راستہ نہ بھی نکلتا تو بھی وینس کی تجارت اور صنعت کا زوال لازمی تھا ۔

اس کا سبب اور تمام دوسری اطالوی جمہوریتوں کے زوال کا سبب اتحادِ قومی کا فقدان ہے، اور خارجی اقوام کا تسلط، ملک کے اندر اہلِ کلیسا کا اقتدار، اور یورپ میں دوسری بڑی طاقتور اور زیادہ متحد قوموں کا برسرِکار آنا ۔

اگر ہم وینس کی تجارتی سیاست کا بغور مطالعہ کریں تو پہلی ہی نظر میں یقین ہو جائیگا کہ موجودہ تجارتی اور صنعتی قوموں کی سیاست بس وینس کی ایک نقل ہے البتہ بڑے یعنی قومی پیمانے پر۔ وہاں بھی قوانینِ جہازرانی اور درآمد پر محصول کے ذریعہ دیسی جہازوں اور دیسی صنعتوں کو پردیسیوں کے مقابلے میں محفوظ کیا گیا تھا۔ اور شروع ہی میں یہ اصول قائم ہو گیا تھا کہ دوسری ریاستوں سے اجناسِ خام منگا دی جائیں اور صنعتی پیداوار باہر بھیجی جائے(1) ۔

کامل آزادیٔ تجارت کی حمایت میں؟ حال میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ تامینی سیاست ہی وینس کے زوال کا سبب ہوئی۔ اس بیان میں تھوڑا سا سچ ہے اور بہت سا جھوٹ۔ اگر ہم وینس کی تاریخ پر بے تعصبی سے نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وینس میں جیسے کہ اسکے بعد دوسری

---

(1) Sismondi : Histoire des republiques italiennes حصہ اول صفحہ ۲۸۵ ۔

حکومتوں میں بین الاقوامی تجارت کی آزادی یا اس میں رکاوٹیں دونوں مختلف اوقات میں ریاست کی قوت اور مرفہ الحالی کے لئے ممد بھی ثابت ہوئی ہیں اور مانع بھی۔ اپنے وجود کے ابتدائی ایام میں بے روک ٹوک کی تجارتی آزادی اس جمہوریت کے لئے مفید تھی۔ ورنہ مچھیاروں کے محض ایک گاؤں سے یہ اپنے کو اتنی بڑی تجارتی قوت کیسے بنا سکتی؟ لیکن دولت و قوت کے ایک خاص درجہ تک پہنچنے کے بعد تاہین بھی اس کے لئے مفید تھی۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ اس نے اپنی تجارتی اور صنعتی فضیلت حاصل کی۔ تاہین مضر اس وقت ہوئی جب اس کی تجارت اور صنعت کو یہ فضیلت حاصل ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے تمام دوسری قوموں سے مقابلہ ختم ہو گیا اور کاہلی کی پرورش ہوئی۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تاہین کے اجرا نے وینس کو واقعی نقصان پہنچایا۔ بلکہ تاہین کو اس وقت بھی قائم رکھا۔ جب کہ اسے جاری رکھنے کے وجوہ ختم ہو چکے تھے ؛

اس دلیل میں جس کا ہم نے ذکر کیا ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ یہ موروثی بادشاہوں کے ماتحت جو بڑی بڑی نئی قومیں اُبھر رہی تھیں ان کا بالکل لحاظ نہیں کرتی۔ وینس اگرچہ چند صوبوں اور جزیروں کا حاکم سہی پھر بھی ایک اطالوی شہر تھا اور جس زمانے میں یہ ترقی کر کے ایک تجارتی اور صنعتی قوت بن رہا تھا اس وقت اس کا مقابلہ صرف اطالوی شہروں سے تھا لہذا اس کی تامینی تجارتی سیاست بس اسی وقت تک اس کے لئے مفید ہو سکتی تھی کہ پوری قوموں کی قومیں اپنی متحدہ قوت کے ساتھ اس کے مقابلہ میں نہ آئی تھیں۔ لیکن جب یہ نوبت آن پہنچی تو وہ اپنا اقتدار صرف اس طرح قائم رکھ سکتا تھا کہ اپنے کو ایک متحدہ اٹلی کا سردار بنا نا

اور اپنے نظام تجارت میں پوری اطالوی قوم کو شامل کرنا۔ کوئی بھی تجارتی حکمت عملی ہو اتنی دانشمند آنہ تو نہیں ہو سکتی کہ ہمیشہ کے لئے متحدہ اقوام کے مقابلے میں ایک تنہا شہر کی فضیلت کو قائم رکھ سکے ۔

وینس کی مثال سے (اگر لوگ اسے آجکل تامینی تجارتی سیاست کے خلاف استعمال کرنا بھی چاہیں) بس اتنا نتیجہ نکلتا ہے، نہ زیادہ نہ کم، کہ ایک اکیلا شہر یا ایک چھوٹی سی ریاست بڑی ریاستوں اور سلطنتوں کے مقابلے میں اس سیاست کو کامیابی کے ساتھ نہ جاری کر سکتی ہے نہ قائم رکھ سکتی ہے۔ نیز یہ کہ جب کوئی طاقت تامین کے ذریعہ تجارتی اور صنعتی فضیلت حاصل کر چکے تو پھر آزادیِ تجارت کے اصول کی طرف لوٹ آنا اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے"

مذکورۂ بالا دلیل میں اور ہر اس دلیل میں جس کا موضوع آزادی تجارت ہو لفظ "آزادی" کے غلط استعمال کی وجہ سے ایک غلط فہمی ملتی ہے جس کی وجہ سے اور بہت سی غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لوگ آزادی تجارت کا ذکر اسی طرح کرتے ہیں جیسے مذہبی آزادی کا، یا بلدی آزادی کا اور محبان و حامیانِ آزادی، آزادی کی ہر شکل کی حمایت پر اپنے کو مکلف سمجھتے ہیں اسی لئے "آزادیِ تجارت" بھی اس قدر ہر دلعزیز ہو گئی ہے اور لوگ ریاست میں اندرونی تجارت کی آزادی اور بین الاقوامی تجارت کی آزادی میں جو ضروری تفریق ہے وہ نہیں کرتے حالانکہ یہ دونوں اپنی ماہیت اور اثر کے اعتبار سے اسی طرح مختلف ہیں جیسے آسمان سے زمین اس لئے کہ کسی ریاست کی اندرونی تجارت پر پابندیاں صرف شاذ صورتوں میں اس طرح عاید کی جا سکتی ہیں کہ شہریوں کی شخصی آزادی قائم رہے، حالانکہ بین الاقوامی تجارت کے

معاملے میں سخت تامینی سیاست کے ساتھ بھی انتہائی شخصی آزادی باقی رہ سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ انتہائی آزاد بین الاقوامی تجارت کا نتیجہ غلامی ہو جیسا کہ ہمیں امید ہے کہ ہم آگے چل کر پولینڈ کے معاملے میں ظاہر کر سکینگے۔ اس بارہ میں مانتسکو نے سچ کہا ہے کہ تجارت پر کہیں اتنی زیادہ پابندیاں نہیں ہوتیں جتنی آزاد قوموں میں، اور کہیں اتنی کم نہیں ہوتیں جتنی ان قوموں میں جو استبدادی حکومت کے زیر نگیں ہیں[1]۔

---

[1] Esprit des Lois, کتاب (۲۰) باب (۱۲)

باب (۲)

اہلِ ہنزا

صنعت و تجارت اور حریت کی روح جب اٹلی پر پورا تسلط پا چکی تو البانی سلسلۂ کوہ کو پار کر کے جرمنی میں ساری ہوئی اور شمالی سمندروں کے ساحل پر اپنے لئے ایک نیا تخت تعمیر کیا۔

اطالوی بلدیوں کے آزاد کرنے والے بادشاہ کے باپ ہنری اوّل ہی نے نئے شہروں کے قیام اور ان پرانے شہروں کی توسیع میں بڑی کوشش کی تھی جو پہلے سے کچھ تو رومانی آبادیوں کے موقع پر اور کچھ شاہی علاقوں میں قائم تھے۔ بعد کے فرانسیسی اور انگریز بادشاہوں کی طرح یہ اور اس کے جانشین شہروں کو طبقۂ امرا کے مقابلے میں توازن کا بہترین ذریعہ خیال کرتے تھے، نیز ریاست کی آمدنی کا بہترین منبع اور تحفّظِ قومی کی نئی اساس۔ اطالوی شہروں سے تجارتی تعلّق، اطالوی صنعت سے مقابلہ، اور خود اپنے آزاد انتظامات کے باعث ان شہروں نے بہت جلد تہذیب اور مرفہ الحالی کا اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا۔ شہریوں کی باہمی جماعتی زندگی نے فنون اور صنعت میں ترقی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ دولت اور حوصلہ مندی سے امتیاز حاصل کیا جائے۔ دوسری طرف دولت ملی تو اس نے تمدّنی ترقی

اور سیاسی حالات کی اصلاح کی طرف انہیں متوجہ کیا۔

نئی نئی آزادی اور پھیلتی پھولتی صنعت نے اگرچہ شہروں کو بہت مضبوط بنا دیا تھا، تاہم شمالی جرمنی کے یہ ساحلی شہر خشکی اور تری دونوں طرف سے قزاقوں کے حملوں کیلئے کھلے ہوئے تھے۔ چنانچہ بہت جلد انہوں نے اپنے تحفظ کے لئے ایک مضبوط اتحاد باہمی کی ضرورت محسوس کی۔ اس غرض سے ہامبرگ اور لیوبک نے ۱۲۴۱ء میں ایک اتحاد قائم کیا۔ جس میں اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے بحیرۂ بالٹک اور بحرِ شمالی کے ساحل کے تمام تھوڑے بہت اہم شہر اور دریائے اوڈر، الب، ویزر اور رھائن کے کناروں کے شہر شامل ہو چکے تھے (یعنی کل ۸۵ شہر) اس اتحاد نے "ہنزا" کا نام اختیار کیا جس کے معنی تحتانی جرمن میں "جمعیت" کے ہوتے ہیں۔

ان شہروں نے بہت جلد یہ سمجھ لیا کہ ان کی قوتوں کے اتحاد سے شخصی کاروبار کو کیسے کیسے فائدے پہنچتے ہیں اور پھر وقت ضائع کئے بغیر انہوں نے ایک ایسی تجارتی سیاست کو اختیار کر کے ترقی دی کہ جس کے اثر سے بے مثال تجارتی مرفہ الحالی پیدا ہوئی۔ انہوں نے خوب سمجھ لیا کہ جو قوت بحری تجارت پیدا کرنا اور قائم رکھنا چاہے اس کے پاس اس کے تحفظ کے ذرائع بھی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ انہوں نے نہایت طاقتور بیڑہ تیار کیا۔ یہ اس حقیقت کے بھی قائل تھے کہ بحری قوت اسی نسبت سے مضبوط یا کمزور ہوتی ہے جس نسبت سے اس کی تجارتی جہازرانی اور ماہی گیری کے مقامات زیادہ یا کم ہوں۔ چنانچہ انہوں نے قانون بنا دیا کہ ہنزا شہروں کا مال صرف ہنزا کے جہازوں میں جائے اور وسیع پیمانے پر سمندر میں مچھلی کی شکارگاہیں قائم کیں

جیسے ہنزا والوں نے ان قوانین جہازرانی میں وینس کی نقل کی تھی، اسی طرح انگریزی جہازرانی کے قوانین جمعیت ہنزا کی نقالی تھے[1]۔

انگلستان نے اس معاملے میں ان لوگوں کی مثال کا اتباع کیا۔ جو اس سے پہلے بحری اقتدار حاصل کر چکے تھے۔ پھر بھی جب طویل دارالشوریٰ کے زمانے میں قانون جہازرانی کے نفاذ کی تجویز پیش ہوئی تو اسے جدت سمجھا جاتا تھا۔ آدم اسمتھ نے اس قانون پر جو رائے زنی کی ہے[2]، اس میں یا تو وہ واقف نہ تھا یا بالارادہ اس کے اظہار سے باز رہا ہے کہ اس سے صدیوں پہلے اور متعدد بار اسی قسم کی پابندیاں عاید کرنے کی کوشش کی جا چکی تھی۔ اس قسم کی ایک تجویز دارالشوریٰ نے ۱۴۶۱ء میں کی تھی۔ جسے ہنری ششم نے مسترد کر دیا تھا پھر شاہ جیمس اول نے یہی تجویز کی جسے دارالشوریٰ نے مسترد کر دیا[3]۔ بلکہ ان دونوں تجویزوں سے بہت پہلے (یعنی ۱۳۸۱ء میں) رچارڈ ثانی نے واقعی ایسی پابندیاں عائد کر دی تھیں، اگرچہ تھوڑے ہی دنوں بعد ان پر عمل درآمد بند ہو گیا، اور یہ وقف طاق نسیاں ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ قوم ابھی اس قسم کے قانون کے لئے تیار نہ تھی۔ قومی صنعت کی حفاظت کے دوسرے وسائل کی طرح قوانین جہازرانی ان قوموں کی فطرت ہی میں موجود ہوتے ہیں جو اپنی آئندہ صنعتی اور تجارتی عظمت کا احساس اپنے اندر رکھتی ہیں۔ چنانچہ شمالی امریکہ کی ریاستہائے متحدہ نے

---

(۱) Anderson : Origin of Commerce — حصہ اول صفحہ ۴۶

(۲) Wealth of Nations — کتاب (۴)، باب (۲)

(۳) Hume : History of England — حصہ (۴)، باب (۲۱) صفحہ ۲۵۰

پوری طرح آزادی حاصل کرنے سے پہلے ہی جمیس میدلیسن کی تجویز پر بیرونی جہازرانی پر پابندیاں لگادی تھیں اور انہیں ان پابندیوں سے بے شبہ اس سے کچھ کم مفید نتائج حاصل نہیں ہوئے جتنے کہ انگلستان نے ان پابندیوں سے ڈیڑھ سو سال پہلے حاصل کیئے تھے (جیسا کہ آئندہ ایک باب میں ظاہر کیا جائیگا) *

اہلِ ہنزا سے تجارت میں جو جو فائدے تھے جب والیانِ ملک نے انہیں جان لیا تو یہ اُسے بڑی خوش نصیبی سمجھتے تھے کہ ہنزا والے ان کے علاقے میں کارخانے قائم کریں اور ہر قسم کے مراعات دے دیکر انہیں اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح یہی نہیں کہ ان کے علاقوں کی فاضل اجناس ٹھکانے لگ جاتی تھیں اور انہیں اس کے بدلے میں اس سے کہیں بہتر صنعتی پیداوار ملتی تھی جیسی کہ یہ خود اپنے علاقوں میں بنا سکتے، بلکہ محاصل درآمد و برآمد کے ذریعہ اپنے خزانے پُر کرنے کا موقع بھی ہاتھ لگتا تھا[1]۔ اور ان کی رعایا جو کاہلی، شورہ پشتی اور

(۱) شاہانِ انگلستان کی آمدنی اس وقت زیادہ تر محاصل برآمد سے تھی، اور کم محاصل درآمد سے۔ آزادی درآمد اور برآمد یعنی صنعتی پیداوار پر محصول، یہ ترقی یافتہ صنعت اور روشن خیال انتظام ملکی کی نشانیاں ہیں۔ شمالی ممالک اور حکومتوں کا درجۂ تہذیب و تدبر اس وقت کم و بیش وہ تھا جہاں آج کل باب عالی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ سلطان نے ابھی حال ہی میں تجارتی معاہدے کیئے ہیں۔ جن کی رُو سے یہ قرار پایا ہے کہ اجناسِ خام اور صنعتی پیداوار پر ۱۴ فی صدی اور درآمد پر ۵ فی صدی سے زیادہ محصول نہ لگایا جائیگا۔ یہاں گویا وہ طریق محصول پوری طرح سے جاری ہے جس کی غایت حکومت کی آمدنی ہے۔ اس طریقہ کی اتباع یا حمایت کرنیوالے مدبرین اور مصنفین کو ترکی کا رُخ کرنا چاہیئے کہ یہاں یہ واقعی رفتار زمانہ کے ساتھ ہونگے ! (مصنف)

بدامنی کی عادی تھی اسے محنت مشقت کا عادی بنانے کی صورت نکلنی تھی۔ اس معاملے میں انگلستان کے بادشاہ اور سب سے پیش پیش تھے ؛

بقول ہیوم[1] "انگلستان کی تجارت پہلے بالکل پردیسیوں کے ہاتھ میں تھی، اور خصوصاً مشرقیوں کے ہاتھ میں جنھیں ہنری سوم نے ایک شرکت متحدہ تسلیم کر کے مراعات عطا کی تھیں اور مختلف پابندیوں سے اور ان محاصل درآمد و برآمد سے آزاد کر دیا تھا، جو دوسرے پردیسیوں پر عاید تھے۔ اس زمانے میں انگریز تجارت میں ایسے ناتجربہ کار تھے۔ کہ ایڈورڈ دوم کے عہد سے لیکر برابر اہل ہنزا "Merchants of the Steelyard" کے نام سے مملکت کی ساری تجارت پر قابض تھے۔ اور چونکہ یہ اپنی ساری تجارت اپنے ہی جہازوں سے کیا کرتے تھے، لہذا انگلستان کے اغراض جہاز رانی بھی نہایت ہی افسوس ناک حالت میں تھے[2] ؛

کولون کے بعض جرمن تاجروں نے انگلستان سے ایک عرصے تک تجارتی تعلقات رکھنے کے بعد بالآخر ۱۲۵۰ء میں بادشاہ انگلستان کے ایما سے لندن میں وہ کارخانہ قائم

---

[1] اہل ہنزا کو پہلے انگلستان میں Easterlings یا مشرقی تاجر کہا کرتے تھے تاکہ مغربی تاجروں یا بلجیم اور ہالینڈ والوں سے انہیں ممتاز کیا جا سکے، اسی لفظ سے لفظ Sterling یا Pound Sterling نکلا ہے جو دراصل Easterling کا مخفف ہے کیونکہ پہلے انگلستان میں جو کچھ بھی سکہ رائج تھا وہ سب کا سب جمعیت ہنزا کا تھا ؛

[2] Hume: History of England باب ۳۵ ؛

کیا جو بعد کو Steelyard کے نام سے اتنا مشہور ہوا۔ اس کارخانے کا پہلے تو انگلستان کے تمدن و صنعت کی ترقی میں بڑا اثر تھا لیکن بعد کو یہ سخت قومی رقابت کا باعث ثابت ہوا اور ۵۰۰/۳ سال تک یعنی اپنی آخری تباہی تک، نہایت شدید اور طویل تنازعات کی وجہ بنا رہا۔

انگلستان کا تعلق جمعیت ہنزا سے پہلے اسی قسم کا تھا جیسا کہ بعد میں پولینڈ کا ولندیزیوں سے اور جرمنی کا انگلستان سے۔ انگلستان انہیں اُون، ٹین، چمڑا، مکھن اور دوسری معدنی اور زرعی اجناس فراہم کرتا تھا اور ان کے عوض صنعتی پیداوار لیتا تھا، یہ اجناس خام جو انگلستان سے اور شمالی ریاستوں سے آتی تھیں انہیں یہ ہنزا والے بروجس کے کارخانے میں لے جاتے (جو ۱۲۵۲ء میں قائم کیا گیا تھا) اور یہاں اس کا مبادلہ بلجی کپڑے اور دوسری صنعتی پیداوار سے یا مشرقی صنعتی اشیاء سے ہوتا، جو اٹلی سے آتی تھیں، یہ موخر الذکر چیزیں ہنزا والے شمالی سمندروں کے تمام ساحلی ممالک میں پہنچاتے تھے۔

ان کا ایک تیسرا کارخانہ روس میں بمقام نووا گرود، ۱۲۷۲ء میں قائم ہوا تھا، یہاں سے انہیں صنعتی اشیاء کے بدلہ میں پشمینہ اور سن ملتا تھا، ایک چوتھا کارخانہ ناروے میں بمقام برگن ۱۲۷۲ء میں قائم ہوا تھا، اس کا کاروبار زیادہ تر مچھلیوں، مچھلی سے بنی ہوئی چیزوں اور تیل کا تھا[1]۔

---

[1] M.S. Sortorius : Geschichte der Hansa

تمام زمانوں اور تمام قوموں کا تجربہ ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ جب تک قومیں بربریت کی حالت میں رہتی ہیں اس وقت وہ آزاد اور بے روک ٹوک تجارت سے بہت فائدہ اٹھاتی ہیں۔ یہ اس طرح اپنے شکار اور چراگاہوں، جنگلات اور زراعت کی پیداوار غرضیکہ تمام اجناس خام کو ٹھکانے لگا سکتی ہیں اور ان کے عوض بہتر لباس، کلیں، برتن اور وہ بیش قیمت دھاتیں حاصل کرتی ہیں جو بطور ذریعہ مبادلہ بہت اہم ہیں۔ اور اسی لئے یہ شروع شروع میں ہمیشہ آزاد تجارت کو پسند کرتی ہیں لیکن تجربہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ یہی قومیں جب تہذیب اور صنعت میں ترقی کر لیتی ہیں تو اس طریق تجارت کو پسند نہیں کرتیں، اور بالآخر اسے مضر اور اپنی آئندہ ترقی کیلئے نقصان دہ سمجھنے لگتی ہیں۔ یہی حال انگلستان اور ہنسا کے مابین تجارت کا تھا Steelyard کے کارخانہ کو قائم ہوئے ابھی مشکل سے ایک صدی گزری تھی کہ ایڈورڈ سوم کو یہ خیال ہوا کہ ایک قوم اپنے لئے شاید اس سے کچھ زیادہ مفید راہ بھی نکال سکتی ہے کہ بس اون باہر بھیجے اور اونی کپڑا خرید لا کرے، چنانچہ اس نے طرح طرح کے مراعات دیکر فلیمی جلاہوں کو انگلستان میں بلانے کی کوشش کی اور جب ان کی خاصی تعداد کام میں لگ گئی تو اس نے حکم نافذ کر دیا کہ پردیسی کپڑے کی کوئی چیز بھی پہننا ممنوع ہے[1]۔ دوسرے ممالک کے حکمرانوں کی حماقت نے اس بادشاہ کی دانشمندانہ کارروائی کی کچھ عجیب طرح سے مدد کی۔ ایسے اتفاقات تجارتی تاریخ میں کسی طرح بھی نوادر سے نہیں ہیں۔ فلینڈرس اور برابان کے پہلے حکمرانوں نے اگر دیسی صنعت کی ترقی کے لئے تمام امکانی کوششیں کی تھیں، تو بعد والوں نے تجارتی صنعتی طبقہ کو غیر مطمئن بنا نے اور چھوڑ کر

---

[1] قانون یازدہم، ایڈورڈ سوم، باب ۵

چلے جانے پر آمادہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا[1]۔

۱۲۱۳ء میں انگریزی اُون کی صنعت نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ ہیوم اس زمانہ کے متعلق لکھتا ہے "اس زمانہ میں پردیسی تاجروں کے خلاف بڑی رقابت پیدا ہو گئی تھی اور ان کی تجارت پر بہت سی پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اشیا درآمد سے جتنی رقم حاصل کرتے تھے اسی قیمت کی چیزیں اُنہیں انگلستان میں خریدنی لازمی تھیں[2]"۔ ایڈورڈ چہارم کے زمانہ میں پردیسی تاجروں کے خلاف اس رقابت کی یہ نوبت پہنچی کہ بدیسی کپڑے اور بہت سی دوسری چیزوں کی درآمد مطلق ممنوع قرار دے دی گئی[3]۔

ہر چند کہ اہلِ ہنزا نے بعد میں بادشاہ کو اس ممانعت کے ہٹانے اور پرانے مراعات واپس دینے پر مجبور کر لیا، تاہم اس سے انگریزی اُون کی صنعت کو بہت فروغ ہو گیا جیسا کہ ہیوم نے ہنری ہفتم کے عہد کے بیان میں ذکر کیا ہے، جو ایڈورڈ چہارم سے کوئی نصف صدی بعد تخت پر بیٹھا تھا۔ کہتا ہے :-

"قانون کے تشدد سے کہیں زیادہ مؤثر طور پر صناعت اور فنون کی ترقی نے امراء کی

---

[1] صفحہ ۴۵ De Witt: Interest of Hollend

[2] صفحہ ۱۹۹ Rymer's Foed

[3] باب ۲۵ Hume: History of England

[4] قانون سوم، ایڈورڈ چہارم، باب ۴۔ اس قانون کے افتتاحی الفاظ اس زمانہ کے حالات پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہم یہاں اسے لفظ بہ لفظ نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس مضر عادت کو روکا کہ بے گنتی نوکر چاکر رکھیں، اب اپنے متوسلین کی تعداد اور شجاعت میں مسابقت کے بجائے ان میں ایک اور قسم کے مقابلہ کا جذبہ پیدا ہوا، جو تہذیب و تمدّن کے رجحان کے زیادہ مطابق تھا، یعنی اب یہ اپنے مکانوں کی خوبی، گھوڑے گاڑی کی نفاست اور اپنے ساز و سامان کی قیمت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنا چاہتے تھے۔ عوام

بسلسلہ صفحہ ۵۱

" Whereas the said parliament, by the artificers men and women, inhabitant and resident in the city of London and other cities, towns, boroughs and villages within this Realm and Wales, it has been piteously showed and complained how that all they in general and every of them be greatly impoverished and much injured and prejudiced of their worldly increase, and living by the great multitude of divers chaffers and wares pertaining to their mysteries and occupations being fully wrought and ready made to sale as well as by the band of strangers being the Kings enemies as others brought into this Realm and Wales from beyond the sea as well by merchant strangers or denizens or other persons, where of the greatest part is dece tful and nothing worth, in regard of anyman's occupation or profits by occasions whereof the said artificers cannot live by their mysteries and occupations as they used to

چونکہ اب اپنے آقاؤں اور مربیوں کی ملازمت کر کے منفعت رساں بیکاری میں ٹھہر
پھر سکتے تھے، لہذا یہ سب مجبور ہو گئے کہ کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھ کر اپنے کو ہیئت اجتماعی
کے لئے مفید بنائیں، قیمتی دھاتوں کی (مسکوک و غیر مسکوک) دونوں شکلوں میں برآمد کے متعلق
قوانین نافذ کئے گئے، لیکن جب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو پھر پردیسی
تاجروں پر یہ شرط عاید کی گئی کہ درآمد سے جو کچھ قیمت حاصل ہو اسے سب کا سب انگریزی

بسلسلہ صفحہ ۵۲

do in times past, but divers of them as well householders as hirelings and other servants and apprentices in great number be at this day unoccupied and do hardly live in great idleness, poverty and ruin, whereby many inconveniences have grown before this time and hereafter more the like to come (which God defend) if due remedy be not in their behalf provided."

پیداوار کی خرید میں لگا دیا کریں[1]"

ہنری ہشتم کے عہد میں پردیسی صناعوں کی کثیر تعداد کے باعث تمام کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اور یہ ایک یقینی علامت تھی اس بڑے نفع کی جو ملک کی زراعت کو ملکی صنعت کی ترقی سے پہنچ رہا تھا۔

لیکن اس صورتِ حال کی نوعیت اور اس کے اسباب کو بادشاہ نے بالکل غلط سمجھا اور پردیسی صناعوں کے مقابلہ میں انگریز صناعوں کی ناواجب شکایات پر کان دھرا حالانکہ بات اصل میں یہ تھی کہ انگریزی صناع یہ دیکھتے تھے کہ پردیسی ہوشیاری اور کارکردگی میں ہر طرح فوقیت رکھتے ہیں، الغرض پریوی کونسل کے حکم سے پندرہ ہزار بلجی صناع ملک سے نکال دیئے گئے، اور یہ اس لئے کہ "انہوں نے سب اجناس کی قیمتیں بڑھادی ہیں اور قوم کو قحط کے خطرے میں لا ڈالا ہے"۔ اس خرابی کو جڑ سے دور کرنے کی خاطر ذاتی مصارف، طرزِ لباس، قیمت اجناس اور شرحِ اُجرت سب کو پابند کرنے کے لئے قوانین نافذ کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ اہلِ ہنزا نے اس طرزِ عمل کو بہت پسند کیا، اور انہوں نے اس بادشاہ کو بھی مدد دینے پر اسی طرح آمادگی ظاہر کی جس طرح اس سے پہلے ان تمام بادشاہوں کے ساتھ کرچکے تھے جنہوں نے اُن کے اغراض کی حمایت کی ہو یا جس طرح آجکل ہمارے سامنے انگریزوں نے پرتگیزی بادشاہوں کی مدد کی، یعنی انہوں نے اپنے جنگی جہازوں کی خدمات پیش کر دیں۔ اس بادشاہ کے سارے عہد میں ہنزا والوں کی تجارت انگلستان

---

[1] ہیوم ۔ باب ۲۶

سے بڑے زور پر رہی، بات یہ تھی کہ ان کے پاس جہاز تھے اور سرمایہ! یہ اس بارہ میں اس سے کچھ کم چالاک نہ تھے جتنے ہمارے زمانے میں انگریز ہیں اور خوب جانتے تھے کہ ان قوموں اور حکومتوں پر کس طرح اثر حاصل ہوسکتا ہے جو خود اپنے اغراض کو اچھی طرح نہیں سمجھتیں۔ ہاں۔ یہ ضرور تھا کہ ان کے دلائل کی بنیاد اس سے بالکل مختلف تھی جو ہمارے زمانے کے تجارتی اجارہ خواہوں کی ہے۔ ہنزا والوں کا یہ دعویٰ کہ وہ تمام ممالک کو اشیاء صنعتی مہیا کریں عہدناموں پر مبنی تھا اور تجارت پر عرصۂ دراز سے قابض ہونے پر؛ اور ہمارے زمانے میں انگریزوں کا یہی دعویٰ محض ایک نظریہ پر مبنی ہے جس کا مصنف خود ان کا ایک جنگی کا افسر ہے، مؤخر الذکر نام نہاد علم کی بنا پر وہ مطالبہ کرتے ہیں جو اوّل الذکر عہدناموں اور انصاف کی بنیاد پر کیا کرتے تھے۔

ایڈورڈ ششم کے عہد میں پریوی کونسل نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر Steelyard کے تاجروں کے سارے مراعات ختم کرنے کے بہانے نکال لئے۔ ہنزا والوں نے اس ہی چال کے خلاف احتجاج کیا لیکن پریوی کونسل اپنے عزم میں ثابت قدم رہی، اور قوم کے لئے اس کارروائی کے مفید نتائج بہت جلد رونما ہونے لگے، انگریزی تاجر چونکہ خود ملک کے رہنے والے تھے اس لئے کپڑے، اُون اور دوسری چیزوں کی خریداری میں انہیں پردیسی تاجروں کے مقابلہ میں بہت سی آسانیاں تھیں، البتہ اُنہوں نے اب تک ان آسانیوں کو اتنی اچھی طرح نہ سمجھا تھا کہ اتنی مالدار شرکت تجار سے مقابلہ کے لئے آمادہ ہوجاتے، لیکن جب سے تمام پردیسی تاجروں پر ایک سی پابندیاں ہوگئیں اُس

وقت سے انگریزوں کے حوصلے کو بھی حرکت ہوئی، اور تجارتی حوصلہ مندی کی ہوا تمام مملکت میں پھیل گئی[1]۔

جس بازار پر ہنزا والے تین صدی سے ایسے ہی بلاشرکت غیرے قابض تھے جیسے کہ ہمارے زمانے میں انگلستان، جرمنی اور ریاستہائے متحدہ کے بازاروں پر قابض ہے" جب اس سے یہ لوگ سالہا سال تک بالکل خارج رہ چکے تو جرمن شہنشاہ کی سفارش پر ملکہ میری نے پھر اُن کے تمام قدیم مراعات واپس عطا کر دیئے[2]۔

لیکن ان کی یہ خوشی بس چند روزہ خوشی تھی۔ "چونکہ یہ صرف اپنے قدیم مراعات کو قائم رکھنے ہی کے متمنی نہ تھے، بلکہ اُن میں اضافہ بھی کرانا چاہتے تھے لہذا ملکہ الزبتھ کے عہد کے شروع ہی میں انہوں نے ایڈورڈ ششم اور ملکہ میری کے عہد حکومت کی بدسلوکیوں کے خلاف سخت شکایات کیں، الزبتھ نے نہایت دانشمندانہ جواب دیا کہ "مجھے کسی چیز میں تغیر کرنے کا اختیار نہیں، البتہ جو مراعات اور سہولتیں پہلے سے حاصل ہیں اُن کی خوشی سے حفاظت کرونگی" لیکن اس جواب سے ان تاجروں کی تشفی نہ ہوئی، بہر حال کچھ عرصہ بعد اُن کی تجارت پھر مسدود ہو گئی۔ اس سے انگریز تجار کو بڑا فائدہ پہنچا انہیں اب اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا، اپنے ملک کی ساری تجارت برآمد پر اُنہوں نے تسلط حاصل کیا اور ان کی کوششوں کو ہر طرح کی کامیابی نصیب ہوئی اُنہوں نے اپنے کو تاجران منظم اور تاجران جنگجو کے دو طبقوں میں منقسم کیا

---

[1] ہیوم، باب ۳۵۔

[2] ہیوم، باب ۳۷ نیز Heylen صفحہ ۱۰۸ Heyward صفحہ ۲۲۴۔

اوّل الذّکر کسی ایک جگہ پر تجارت کرتے اور مؤخر الذکر دوسرے شہروں اور ریاستوں میں انگریزی کپڑا اور دوسری صنعتی چیزیں لیکر قسمت آزمائی کرنے جاتے تھے اس سے ہنزا والوں کی آتش رقابت بہت مشتعل ہوئی، اور انھوں نے دوسری قوموں میں انگریز تاجروں کی طرف سے بے اعتباری پیدا کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بالآخر یکم اگست ۱۵۹۷ء کو انھوں نے ایک فرمان شاہی حاصل کر لیا جس کی رُو سے انگریزی تجار کے لئے سلطنتِ جرمنی میں تجارت ممنوع قرار دے دی گئی ملکہ نے اس کارروائی کا بدلہ اس طرح لیا کہ ہنزا کے ۶۰ جہاز گرفتار کرائے جو سپانیہ سے اشیاء ممنوعہ کی تجارت کرتے تھے پہلے تو اس کارروائی سے ملکہ کا ارادہ صرف یہ تھا کہ ہنزا والوں کو بہتر سمجھوتہ پر مائل کیا جائے، لیکن جب یہ خبر ملی کہ شہر لیوبک میں ہنزا والوں کی ایک مجلس ہو رہی ہے کہ انگریزی تجارت برآمد کو برباد کرنے کی تجاویز پر غور کرے تو اس نے یہ سارے جہاز اور ان کا مال و اسباب ضبط کر لیا، صرف دو جہازوں کو اس پیغام کے ساتھ لیوبک بھیجا کہ میں جمعیت ہنزا اور اس کی تجاویز اور کارروائیوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتی ہوں [۱]"

یہ رویّہ تھا الزبتھ کا ان تاجروں کے ساتھ جنھوں نے اس کے باپ کو اور بہتیرے اور انگریز بادشاہوں کو معرکہ آرائیوں کے لئے اپنے جنگی جہاز مستعار دیئے تھے جن کی خوشامد یورپ کے والیان ملک نے کی تھی، جو صدیوں تک ڈنمارک اور سویڈن کے بادشاہوں کے ساتھ باجگذاروں کا سا برتاؤ کرتے رہے تھے، انہیں جب چاہتے انکے علاقوں

---

[۱] Lives of the Admirals جلد اوّل صفحہ ۱۰۴ ؎

میں تسلّط دلا دیتے جب چاہتے نکال دیتے تھے، جنہوں نے بحیرۂ بالٹک کے جنوب و مشرقی سواحل کو آباد کیا تھا، اور وہاں تہذیب پھیلائی تھی، جنہوں نے تمام سمندروں کو بحری لٹیروں سے پاک کر دیا تھا، جنہوں نے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہاتھ میں تلوار لیکر انگلستان کے ایک بادشاہ کو اپنے حقوق تسلیم کرنے پر مجبور کیا تھا، جن کے پاس ایک سے زائد مواقع پر انگریز بادشاہوں نے قرضوں کے لئے اپنے تاج گرو رکھے تھے، جنہوں نے ایک مرتبہ انگلستان کے خلاف اپنی بیرحمی اور گستاخی کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ ننو انگریز مچھیاروں کو صرف اس جرم پر ڈبو دیا کہ انہوں نے ان کے ماہی گیری علاقہ تک آنے کی جرأت کی تھی، سچ تو یہ ہے کہ ہنزا والوں میں اب بھی ملکہ انگلستان کی بدسلوکی کا بدلہ لینے کی طاقت تھی، لیکن ان کی قدیم شجاعت، بلند حوصلگی، آزادی اور تعاون باہمی کی قوت ان سے جا چکی تھی۔ رفتہ رفتہ گھٹ کر یہ لے پستی تک پہنچ گئے، حتّٰی کہ جب یورپ کے تمام درباروں میں تجارتی مراعات کے لئے دریوزہ گری کر چکے اور ہر جگہ سے حقارت کے ساتھ نکالے گئے تو ۱۶۳۰ء میں اُن کی جمعیّت باضابطہ منتشر ہی ہو گئی ۔

علاوہ ان اندرونی اسباب کے جن کا ذکر اس کے بعد کیا جائیگا بہت سے خارجی اسباب بھی تھے جنہوں نے ان کے زوال میں مدد دی۔ ڈنمارک اور سویڈن کو جمعیّتِ ہنزا نے اتنے عرصہ تک جو ماتحتی میں رکھا تھا یہ دونوں اس کا بدلہ لینا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے جمعیّت کی تجارت میں ہر ممکن طریقہ سے رکاوٹیں پیدا کیں۔ زارانِ روس نے ایک انگریز شرکت کو مراعات عطا کیں، ٹیوٹن نائٹس (Knights) کی جماعتیں جو

اتنی صدیوں سے ان کے حلیف یا یوں کہئے کہ خود ان کی آوردہ تھیں، وہ بھی زوال پذیر ہو کر منتشر ہو گئیں، ولندیزیوں اور انگریزوں نے انہیں تمام بازاروں سے نکال باہر کیا، اور ہر دربار میں ان کی جگہ چھین لی، آخر میں جب راس امید ہو کر ہندوستان کا راستہ معلوم ہؤا، تو اس نے انہیں اور بھی نقصان پہنچایا ؛

یہ ہنزا والے جو اپنی قوت اور مرفہ الحالی کے زمانہ میں جرمن سلطنت سے اتحاد کو مشکل ہی سے قابلِ التفات سمجھتے تھے، اب ضرورت کے وقت جرمن رائشتاگ کے سامنے یہ دکھڑا لیکر پہنچے کہ انگریز ہر سال ۲ لاکھ تھان کپڑے کے اپنے ملک سے باہر بھیجتے ہیں، جن کا بڑا حصہ جرمنی آتا ہے اور انگلستان میں ان کے قدیم تجارتی مراعات کے دوبارہ ملنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے کہ جرمنی میں انگریزی کپڑے کی درآمد ممنوع قرار دی جائے۔ بقول اینڈرسن اس قانون کا مسوّدہ تیار ہو گیا تھا، یا کم از کم اس پر سنجیدگی سے غور ضرور ہؤا تھا، لیکن رائشتاگ میں جو انگریزی سفیر گلپین تھا، اس نے ترکیبیں کر کے اس کی تکمیل نہ ہونے دی۔ جمعیت ہنزا کے باضابطہ انتشار کے ۱۵۰ سال بعد ہنزا شہروں میں اپنی پرانی عظمت کی یاد اس قدر مفقود ہو چکی تھی، کہ ٹسبٹس مورز اپنی کتاب کے کسی حصہ میں لکھتا ہے کہ جب وہ ان شہروں میں گیا اور یہاں کے تاجروں سے اس قوت و عظمت کا ذکر کیا جو انکے پیشروں کو حاصل تھی تو یہ مشکل سے اسے یقین کرتے تھے۔ ہامبرگ جس کا نام تمام سمندروں میں بحری لٹیروں کے لئے ہیبت کا باعث تھا، اور ان قزاقوں کو مٹا کر جو خدمت اس شہر نے تہذیب و تمدن کی کی تھی اس کے لئے ساری مسیحی دنیا میں شہرت حاصل کر چکا تھا، وہ

اب اس قدر پست ہو گیا تھا کہ الجیری لٹیروں کو سالانہ باج دے کر اپنے جہازوں کیلئے مامون راستہ کا سودا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب سمندر کی فرمانروائی ولندیزیوں کے ہاتھ میں پہنچی، تو بحری لٹیروں کے متعلق اور ہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ جمعیت ہنزا کے اقتدار بحری کے زمانہ میں بحری لٹیرے مہذّب دنیا کے دشمن سمجھے جاتے اور جہاں کہیں ممکن ہوتا بالکل مٹا دیئے جاتے تھے۔ برخلاف اس کے ولندیزی ان بربر لٹیروں کو مفید شریکِ کار تصوّر کرتے تھے، جن کے ذریعے سے زمانۂ امن میں ولندیزیوں کے فائدے کے لئے دوسری قوموں کی بحری تجارت تباہ کی جا سکتی تھی۔ اس طرزِ عمل کی مؤافقت میں ڈی وِٹ نے جو لکھا ہے اس سے ایک مقام نقل کرتے ہوئے اینڈرسن نے یہ بلیغ تنقید کی ہے کہ "دشمن سے بھی سبق حاصل کرنا درست ہے[1]"۔ باوجود کمال اختصار اس نصیحت کو اس کے ہم وطنوں نے خوب سمجھا، اور اس پر اس طرح سے کاربند ہوئے کہ ساری عیسائی دنیا کے لئے باعثِ شرم ہے، چنانچہ خود ہمارے زمانہ تک انگریز شمالی افریقہ کے سواحل پر بحری لٹیروں کی قابلِ نفرت کارروائیوں کو روا رکھتے رہے، حتیٰ کہ فرانسیسیوں نے تہذیب کی یہ بڑی خدمت انجام دی کہ انہیں تباہ کر ڈالا۔

ان ہنزا شہروں کی تجارت قومی نہ تھی، یہ نہ تو اندرونی قوائے دولت آفرینی کے توازن اور کامل نشو و نما پر مبنی تھا، نہ اس کی پشت پر کافی سیاسی قوت تھی۔ اراکین جمعیت کو جو رشتہ باہم مربوط کئے ہوئے تھا، وہ بہت کمزور تھا، ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ وہ

---

[1] Anderson جلد ۲ صفحہ ۵۸۵۔

اوّلیت حاصل کرلے اور جداگانہ اغراض کی پائیداری (یا جیسے ایک سوئٹزرلینڈ کا باشندہ یا ایک امریکن کہے، ضلع وار اغراض یا جدا جدا ریاستوں کے حقوق) کا زور تھا۔ یہ کوشش جمعیت کے احساس یگانگت پر غالب تھی، حالانکہ صرف یہی احساس الگ الگ شہروں کے مقابلہ میں جمعیت کے عالم مفاد کو زیادہ اہم تسلیم کرا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ ہوا رقابت اور اکثر غداری، مثلاً جمعیت سے انگلستان کی جو مخالفت تھی اسے کولون نے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا، اور ڈنمارک اور لیوبک میں جو جھگڑا ہوا اسے ہامبرگ نے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

ہنزا شہروں نے اپنی تجارت کی بنیاد اس ملک کی پیدائش و صرفِ دولت یا اس کی زراعت اور صناعت پر نہیں رکھی تھی، جس میں ان کے تاجر رہتے بستے تھے۔ انہوں نے خود اپنے وطن کی زراعت کو کسی طرح بھی فروغ دینے کی کوشش نہیں کی، حالانکہ دوسرے ملکوں کی زراعت کو ان کی تجارت سے بہت ترقی ہوئی۔ انہیں اسی میں سہولت معلوم ہوتی رہی کہ بلجیم سے صنعتی پیداوار خریدیں، بجائے اس کے کہ خود اپنے ملک میں صنعتیں قائم کریں۔ انہوں نے پولینڈ کی زراعت کو، انگلستان میں بھیڑیں پالنے کو، سویڈن میں لوہے کی پیدائش کو، اور بلجیم میں عام صنعت کو ترقی بخشی۔ یہ صدیوں تک اس اصول پر کاربند رہے جس کی صلاح ہمارے زمانہ کے نظری معاشین تمام قوموں کو دیتے ہیں یعنے یہ کہ ہمیشہ "سب سے سستے بازار" میں خریداری کرتے رہے، لیکن جب ان قوموں نے جن کے ہاتھ یہ اپنا مال بیچتے تھے اور انہوں نے جن سے یہ خریدتے تھے انہیں اپنے بازاروں سے نکال دیا اور خود

ان کے ملک کی نہ تو زراعت اتنی ترقی یافتہ تھی نہ صنعت کہ یہ اس میں اپنا فاضل تجارتی سرمایہ لگا سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سرمایہ ہالینڈ اور انگلستان پہنچا، اور یوں انکے دشمنوں ہی کی صنعت، دولت اور طاقت میں اضافہ کے کام آیا۔ یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس بات کا کہ محض شخصی کاروبار، جس کو اختیار ہو کہ جو راہ چاہے اختیار کرے، ہمیشہ قوموں کی قوت اور مرفہ الحالی میں ترقی کا باعث نہیں ہوتا۔

محض مادّی دولت کے حصول کی کوشش میں ان شہروں نے اپنی سیاسی اغراض کو بالکل پس پشت ڈال دیا، ان کے زمانۂ اقتدار میں یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ انہیں جرمن سلطنت سے کوئی تعلّق بھی ہے۔ ان تنگ نظر، خودغرض اور معزّز شہریوں کو بس اس سے بہت خوشی ہوتی تھی کہ امرا، بادشاہ اور شہنشاہ ان کی خوشامد کرتے ہیں، اور سمندر پر یہی مالک کل نظر آتے ہیں۔ اپنے بحری اقتدار کے زمانہ میں ان کے لئے یہ کتنی آسان بات تھی کہ شمالی جرمنی کے شہروں سے مل کر سلطنت کے امراء کے مقابلہ میں ایک طاقت ور ایوان زیریں ترتیب دیتے، شاہی قوت کے ذریعہ اتحادِ قومی کی بنیاد ڈال لیتے، ڈنکرک سے لیکر ریگا تک سارے ساحل سمندر کو ایک ہی قومیت میں متحد کر لیتے اور اس طرح جرمن قوم کے لئے صنعت، تجارت اور بحری قوت کے معاملہ میں افضلیت حاصل کرتے اور اسے قائم رکھتے، لیکن جب سمندروں کی عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ سے نکلی تو ان کا اتنا اثر بھی باقی نہ رہا تھا کہ جرمن ریشتاگ ان کی تجارت کو کوئی قومی معاملہ سمجھتی۔ برخلاف اس کے جرمن طبقۂ امراء نے ان ذلیل و رسوا شہریوں کو اور بھی دبانے کی پوری کوشش کی، ان کے اندرون ملک والے شہر رفتہ رفتہ مختلف نوابوں کے

تسلط میں آ گئے اور اس طرح ساحلی شہروں کے تعلقات اندرون ملک سے منقطع ہو گئے ۔

انگلستان ان تمام غلطیوں سے بچا رہا۔ اس کی تجارتی جہازرانی اور خارجی تجارت ملکی زراعت اور ملکی صنعت کی مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔ اس کی اندرونی تجارت کو اسی نسبت سے ترقی ہوئی جیسے خارجی تجارت کو اور شخصی آزادی میں برابر توسیع ہوتی گئی، بغیر اس کے کہ اتحاد قومی یا قومی قوت کو کوئی نقصان بھی پہنچے۔ انگلستان کے معاملہ میں بادشاہ، امرا اور جمہور سب کے اغراض نہایت اچھی طرح متحد و متفق رہے ۔

اگر ان تاریخی واقعات پر نظر رکھی جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ سوائے اس تجارتی حکمت عملی کے جو انگریزوں نے اختیار کی اور جس پر وہ کاربند رہے کوئی اور صورت بھی اس کی تھی کہ یہ اپنی صنعتی قوت کو اس درجہ وسعت دیتے، ایسی بے حد و پایاں تجارت کے مالک بنتے، اور اس قدر عظیم الشان بحری قوت حاصل کرتے، نہیں! یہ بیان کہ انگریزوں نے اپنی موجودہ تجارتی سطوت و طاقت اپنی تجارتی حکمت عملی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے باوجود حاصل کی ہے، ہماری رائے میں منجملہ ان سخت ترین غلط بیانیوں کے ہے جو اس صدی میں پھیلائی گئی ہیں ۔

اگر انگریز ہر چیز کو اس حال پر چھوڑ دیتے، جیسا کہ مروجہ مذہب معاشی کا خیال ہے۔ "یعنے جو ہوتا ہے ہونے دو، جیسا چلتا ہے چلنے دو"۔ تو آج بھی Steelyard کے تاجر لندن میں کاروبار کرتے ہوتے، انگریزوں کے لیے اب بھی بلجیم میں کپڑا بنایا جاتا، انگلستان اب بھی ہنزا والوں کی بھیڑوں کا چراگاہ ہوتا، اسی طرح جیسے ایک مکار سیاست دان کی چال سے پرتگال، انگلستان کا غلبستان بن گیا، اور آج تک ہے اغلب تو یہ ہے کہ انگلستان میں اپنی اس سیاست

تجارتی کے بغیر کبھی اس قدر بلدی اور شخصی آزادی بھی نہ ہوتی جتنی کہ آجکل ہے، کیونکہ آزادی تو صنعت اور دولت کی بیٹی ہے ؛

اِن تاریخی ملاحظات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آدم سمتھ نے جمعیّتِ ہنزا اور انگلستان کی صنعتی و تجارتی رقابت کی تاریخ پر شروع سے آخر تک کیوں کبھی نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی ؟ اگرچہ اس کی تصنیف کے بعض حصّوں سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس جمعیّت کے اسبابِ زوال اور اس کے نتائج سے بے خبر نہ تھا، وہ لکھتا ہے کہ "تاجر اپنے اغراض میں کسی خاص ملک کا پابند نہیں ہوتا، اس کے لئے یہ بات بڑی حد تک ایک سی ہے کہ وہ اپنی تجارت کا کاروبار کہاں سے چلاتا ہے، ذراسی بے اطمینانی پیدا ہو تو وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جاسکتا ہے اور اپنے ساتھ وہ سارا سرمایہ یعنی وہ ساری صنعت لیجاتا ہے۔ جو اس سرمایہ سے قائم ہے اس کا کوئی حصّہ اس وقت تک کسی خاص ملک سے متعلّق نہیں کہا جاسکتا جب تک وہ اس ملک میں عمارتوں یا مستقل ترقیات زمین کی شکل میں نہ پھیل جائے ہنزا شہروں کی کثیر دولت کا آج کوئی نشان باقی نہیں، بس کہیں تیرھویں اور چودھویں صدی کی گمنام تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا ہے، ان میں سے بعض کے متعلّق تو یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تھے کہاں اور ان میں سے بعض کے جو لاطینی نام تھے وہ آخر کن شہروں کے نام ہیں[1]" ؛

کیسی عجیب بات ہے کہ آدم سمتھ جو جمعیّت ہنزا کے زوال کے ثانوی اسباب کے متعلّق

---

[1] Smith : Wealth of Nations جلد ۳ ؛ باب ۴ ؛

اس قدر صاف بصیرت رکھتا ہے وہ اس کے اصلی وجوہ کی تحقیق کے لئے اپنے کو مجبور نہیں پاتا
اس غرض کے لئے یہ بالکل ضروری نہ ہوتا کہ ان تباہ شدہ شہروں کے مواقع کا تعین کیا جائے،
یا یہ معلوم کیا جائے کہ ناقابلِ فہم لاطینی تاریخوں میں جو نام ہیں وہ کن شہروں کے لئے ہیں
اس کے لئے تو ان تاریخوں کے حوالہ کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی، خود اس کے ہم وطن
اینڈرسن اور میکفرسن، کنگ اور ہیوم اس واقعہ کی ضروری تشریح بہم پہنچا دیتے۔ پھر یہ
کیا بات ہے اور اس کا کیا سبب ہے کہ ایسا غائر النظر محقق ایسی دلچسپ اور باعتبار نتائج
اس قدر نتیجہ خیز تحقیق سے باز رہا ہ سوائے اس کے اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس
تحقیق سے ایسے نتائج نکلتے جو اس کے اصولِ آزادیِ تجارت کو بہت کم مدد پہنچا سکتے تھے
لازم تھا کہ اس کے سامنے یہ واقعہ آتا کہ جب ہنزا والوں سے بے روک ٹوک تجارتی تعلقات
نے انگلستان کی زراعت کو بربریت کی منزل سے نکال لیا تو اس وقت اس تامینی تجارتی سیاست
نے جو انگلستان نے اہلِ ہنزا، بلجیم اور ہالینڈ کے مقابلہ میں اختیار کی انہیں صنعتی افضلیت بخشی
اور جب اس کی مدد قوانین جہازرانی نے کی تو اس کا نتیجہ انگلستان کا تجارتی اقتدار ہوا ؛

معلوم ہوتا ہے کہ آدم اسمتھ ان واقعات کو جاننا اور تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ یہ
ان ناگوار واقعات کے ضمن میں آتے ہیں جو بقول جے، بی، سے اس کے نظام کے بہت
مخالف ثابت ہوتے ؛

باب (۳)

اہلِ نڈرلینڈ

ہالینڈ، فلینڈرس اور برابان اپنے مزاج اور اطوار، اپنے اصل اور زبان، کی وجہ سے، نیز اپنے سیاسی تعلق اور جغرافی موقع کے اعتبار سے، جرمن سلطنت کا جزو تھے۔ چارلس اعظم کی اس نواح میں اکثر موجودگی، اور اس کے قیام گاہ کے قرب نے، لازم ہے کہ ان علاقوں کی تہذیب و تمدن پر بہ مقابلہ دیگر جرمن علاقوں کے، جو دور تھے زیادہ گہرا اثر ڈالا ہوگا۔ پھر فلینڈرس اور برابان کو زراعت اور صناعت کے لئے فطرت نے زیادہ موزون بنایا تھا، اور ہالینڈ کو تجارت اور مویشی پالنے کے لئے۔ جرمنی میں اور کسی جگہ بھی اندرونی تجارت کو سمندر اور دریاؤں کی عمدہ جہازرانی نے اس قدر مدد نہ دی تھی جتنی ان ساحلی علاقوں میں، ان بحری ذرائع آمد و رفت سے جو مفید اثرات زراعت کی ترقی اور شہروں کی توسیع پر پڑتے تھے ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شروع ہی زمانہ میں ان کے تمام موانع کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے اور مصنوعی نہریں تعمیر کی جائیں۔ فلینڈرس کی مرفہ الحالی اس وجہ سے بھی خاص طور پر بڑھی کہ تمام دوسرے جرمن حکمرانوں سے پہلے یہاں کے حکمرانوں (کاؤنٹ) نے امنِ عامہ، اچھی سڑکوں، عمدہ صناعت اور پھلتے پھولتے شہروں کی قدر و قیمت کو سمجھا اور

ملک کی قدرتی حالت کی مدد سے اُنھوں نے نہایت جوش و انہماک کے ساتھ قزاقوں کے سرداروں، اور وحشی جانوروں کے استیصال کا کام ہاتھ میں لیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شہر اور دیہات میں سلسلہ تجارت خوب اچھی طرح قائم ہو گیا، مویشی پالنے خصوصاً بھیڑیں پالنے کے کام کو ترقی ہوئی اور سن کی کاشت بڑھی۔ پھر جہاں اجناس خام کثرت سے پیدا ہوں، اور املاک اور ذرائع آمد محفوظ ہوں، وہاں ان خام اجناس کو صنعتی پیداوار بنانے کے لئے ضروری محنت اور ہنرمندی بہت جلد مل ہی جاتی ہے۔ یہ بھی تھا کہ فلینڈرس کے کاؤنٹ اس وقت تک یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہے کہ کہیں اتفاق سے انہیں اون بُننے والے مل جاتے، بلکہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے دوسرے ملکوں سے کاریگر بلوائے بھی ۔۔

جمعیت ہنزا اور ہالینڈ کی درمیانی تجارت کی مدد اور اپنی اون کی صنعت کے باعث فلینڈرس جلد شمالی تجارت کا مرکز بن گیا جس طرح اپنی صنعت اور جہاز رانی کے باعث وینس جنوبی تجارت کا مرکز بن گیا تھا۔ جمعیت ہنزا اور ولندیزیوں کی تجارتی جہاز رانی اور باہمی تجارت نے، فلینڈرس کی صناعت سے مل کر ایک عظیم الشان قومی صنعت کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ تجارتی رکاوٹیں پیدا کرنے کی ضرورت یہاں اس لئے اور بھی نہ ہوئی کہ فلینڈرس کے صنعتی اقتدار کا کوئی مدمقابل ہی نہ تھا۔ یہ بات کہ ایسے حالات میں صنعت آزاد تجارت کی شکل ہی میں خوب پھلتی پھولتی ہے فلینڈرس کے کاؤنٹ آدم سمتھ کی تصانیف پڑھے بغیر بھی جانتے تھے، اس میں موجودہ نظریہ معاشی ہی کی روح تو ساری تھی جب کاؤنٹ

رابرٹ سوم نے شاہ انگلستان کی اس درخواست کے جواب میں کہ فلیمی بازار سے اسکاٹستان والوں کو خارج کر دے یہ کہلایا تھا کہ فلینڈرس نے اپنے کو ہمیشہ سے تمام قوموں کے لیئے ایک آزاد منڈی متصور کیا ہے اور اس اصول سے انحراف کرنا اس کے اغراض کیخلاف ہے"

جب فلینڈرس صدیوں تک شمالی یورپ کا صنعتی ملک اور بروجیس اس کی خاص منڈی رہ چکا تو اس کی صنعت اور تجارت قریب کے صوبہ برابان میں منتقل ہو گئی۔ وجہ یہ تھی، کہ یہ صنعت و تجارت اپنے معراج کمال پر پہنچکر ایسی مراعات کی طالب ہوئی جن کے عطا کرنے سے وہاں کے کاؤنٹوں نے انکار کیا۔ اب انٹورپ شمالی یورپ میں تجارت کا خاص مرکز اور لووین اس کا خاص صنعتی شہر بن گئے، اس تغیر حالات کے باعث برابان کی زراعت بڑے عروج کو پہنچی۔ علاوہ اس کے شروع ہی میں بجائے اجناس کے بشکل نقد محاصل ادا کرنے کا طریقہ رائج ہو گیا، اور اس سے بھی زیادہ منصفانہ نظام پر جو پابندیاں عاید کی گئی تھیں انہوں نے زراعت کو اور بھی فائدہ پہنچایا ۔

اسی اثنا میں ہالینڈ والوں نے، جو برابر متحدہ قوت کے ساتھ جمعیت ہنزا کے رقیب کی حیثیت سے میدان میں آرہے تھے، اپنی آئندہ بحری قوت کی بنیاد رکھی۔ قدرت نے اس چھوٹی سی قوم کے لیئے اپنی مہربانی اور اپنی نامہربانی دونوں سے برکتیں پیدا کی تھیں سمندر کے طوفان سے آئے دن کے مقابلے نے لازمی طور پر ان میں حوصلہ مندی محنت اور کفایت شعاری پیدا کر دی تھی، پھر ان ناقابل بیان کوششوں کے بعد جو زمین انہوں نے سمندر سے لیکر محفوظ کی تھی وہ ان کی نظر میں کیوں نہ ایسی چیز ہوتی جس پر جتنی توجہ کی جاتی کم تھی خود قدرت

نے چونکہ ان پر یہ پابندی لگا دی تھی کہ بس جہاز رانی اور ماہی گیری، گوشت، پنیر اور مکھن کی تیاری ان کا شغل ہوں؛ لہٰذا یہ مجبور تھے کہ اپنے لئے غلّہ، لکڑی اور لباس کی چیزیں، باربرداری درمیانی تجارت اور پنیر اور مچھلیوں کی برآمد سے مہیا کریں۔

اور سچ پوچھو تو یہی وجہ ہے کہ ہالینڈ والوں نے بعد کو اہلِ ہنزا کو شمالی و مشرقی ممالک کی تجارت سے رفتہ رفتہ خارج کر دیا۔ ہالینڈ والوں کو زرعی اجناس اور لکڑی کی اس سے کہیں بڑی مقداریں ملک میں منگانی پڑتی تھیں جتنی ہنزا والے منگاتے تھے، کیونکہ انہیں تو یہ چیزیں شہروں کے ملحقہ علاقوں سے مہیا ہو جاتی تھیں۔ علاوہ اس کے ہالینڈ سے بلجیم کے صنعتی اضلاع قریب تھے، نیز دریائے رہائن کے وسیع اور زرخیز نخلستانوں سے پٹے ہوئے ساحل اور خود اس کا دھارا جس میں سوئیزرلینڈ تک جہاز رانی ہو سکتی تھی، اور یہ قرب، ہالینڈ والوں کے لیئے بہت ہی فائدہ کی بات تھی۔

اس سے ایک اصولِ عام سمجھا جا سکتا ہے کہ ساحلی ممالک کی تجارت اور خوشحالی ان دریائی رقبوں کے کم یا زیادہ وسیع ہونے پر منحصر ہوتی ہے جن سے پانی کے ذریعہ اُن کا تعلق آمد و رفت ہو۔ ذرا اٹلی کا نقشہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دریائے پو کی وادی کی وسعت اور زرخیزی ہی وہ قدرتی وجہ ہے جس کے سبب وینس کی تجارت کو جنیوا اور پیزا کے

لہ اچھی سڑکوں اور اس سے بھی زیادہ ریلوں کی تعمیر نے جو زمانۂ جدید میں عمل میں آئی ہیں اس کو بہت کچھ بدل دیا ہے۔

مقابلہ میں اس قدر فروغ ہُوا۔ ولندیزی تجارت کی جڑیں دراصل رہائن اور اس کے معاون دریاؤں کے علاقوں میں تھیں، اور یہ علاقے وینزرا اور ایلب کی وادیوں کے مقابلہ میں جس قدر زرخیز تھے اسی نسبت سے ہنزا والوں کے مقابلہ میں ہالینڈ کی تجارت کو فوقیت حاصل تھی ؛

مذکورہ بالا فوائد کے علاوہ ایک اور حسن اتفاق تھا، یعنی پیٹر بوبکل نے ہیرنگ مچھلی کو نمک میں محفوظ کرنے کا طریقہ معلوم کیا مچھلیاں پکڑنے اور انہیں نمک میں رکھنے کا یہ بہترین طریقہ جسے مخترع کے نام کی رعایت سے "بوبکلانا" کہتے ہیں عرصۂ دراز تک ایک سربستہ راز رہا جسے صرف ہالینڈ والے جانتے تھے۔ اس طریقے سے ہیرنگ مچھلی میں یہ لوگ ایسی خوبیاں پیدا کر دیتے تھے جن کا پیدا کرنا دوسرے مچھلی والوں سے ممکن نہ تھا اور اس طرح ہر جگہ انہیں بکری اور قیمتوں کے معاملہ میں اوروں پر ترجیح حاصل تھی۔ اینڈرسن کا بیان ہے[1] کہ ان اختراعات کے صدیوں بعد انگریزی اور اسکاٹستانی مچھیاروں کو جنہیں برآمد پر خاص مراعات حاصل تھیں، پردیسی منڈیوں میں ولندیزیوں سے کم قیمت پر بیچنے کے باوجود بھی خریدار نہ ملتے تھے، اگر یہ امر پیش نظر ہو کہ مذہبی سدھار سے پہلے تمام

[1] حال میں لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ولندیزی ہیرنگ کی خوبی مچھلی پکڑنے کے قواعد کے علاوہ اِس بات پر بھی منحصر ہے کہ یہ لوگ جن برتنوں میں ہیرنگ مچھلی کو نمک لگا کر "بوبکلاتے" اور باہر بھیجتے ہیں۔ وہ شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوتے ہیں ؛

ممالک میں سمندری مچھلی کی نکاسی کس قدر زیادہ تھی، تو پھر یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس زمانہ میں کہ ہنزا والوں کی جہاز رانی کا انحطاط شروع ہو چکا تھا، ولندیزیوں نے سالانہ ۲۰۰۰ ہزار نئے جہاز کیسے بنوا ڈالے۔ پھر جب سے کہ تمام بلجیم اور بتاوی صوبے برگنڈی حکومت کے ماتحت متحد ہوئے تو ان ممالک کو اتحاد قومی کے فوائد مہمہ بھی حاصل ہو گئے تھے، چنانچہ شمالی جرمنی کے مقابلہ میں ہالینڈ کو جو کامیابی نصیب ہوئی، اس پر غور کرتے وقت اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے شہنشاہ چارلس پنجم کے زمانہ میں متحدہ ندرلینڈ قوت اور صلاحیتوں کا ایک ایسا مرکب تھا جو اپنے فرمانروا کو اس سے کہیں موثر طریقہ سے تمام دنیا پر بحری و بری اقتدار حاصل کرا سکتا تھا، جتنا کہ ساری دنیا کی سونے کی کانیں اور ساری پاپائی عنایتیں اور فرامینِ مذہبی، شرط بس یہ تھی کہ یہ ان قوتوں کی ماہیت کو سمجھتا اور انہیں استعمال کرتا اور ان سے فائدہ اٹھانا جانتا ؛

اگر چارلس پنجم ہسپانیہ کے تاج کو اس طرح پھینک دیتا جیسے ہم اس پتھر کو پھینک دیتے ہیں جو ہمیں نیچے کسی قعر میں لئے جاتا ہو، تو ولندیزی اور جرمن قوموں کی قسمت کیسی مختلف ہوتی ہے متحدہ ندرلینڈ کے حکمراں، جرمنی کے شہنشاہ اور مذہبی سدھار کے سرگروہ کی حیثیت سے اس چارلس کے پاس تمام وہ مادی اور ذہنی وسائل موجود تھے جن سے یہ دنیا کی سب سے قوی صنعتی اور تجارتی ریاست اور سب سے بڑی بحری اور بری قوت کی بنیاد ڈال سکتا تھا، یہ بحری قوت ایسی ہوتی کہ ڈنکرک سے لیکر ریگا تک تمام بس ایک ہی جھنڈے تلے ہوتے ؛

جرمنی کو دنیا کی سب سے مالدار اور اہم سلطنت بنا دینے، اس کی صنعتی اور تجارتی فرمانروائی کو ساری دنیا پر پھیلانے، اور شاید صدیوں تک کے لئے مضبوط کر دینے کے لئے اس وقت بس ایک تصوّر کی ضرورت تھی، اور بس ایک شخص کے عزم و ارادہ کی۔ چارلس پنجم اور اس کے منحوس لڑکے نے بالکل اُلٹا راستہ اختیار کیا، انہوں نے مذہبی متعصّبین کے سردار بنکر ندرلینیڈ میں ہسپانیت پھیلانا چاہی، اس طریق عمل کا جو نتیجہ ہوا وہ سب جانتے ہیں۔ شمالی صوبوں نے اس قدرتی عنصر کی وجہ سے جن پر انہیں قابو حاصل تھا خود مختاری حاصل کرلی، جنوبی اقطاع میں صنعت، حرفت اور تجارت کو جلّادی ہاتھ نے مُردہ کر دیا، صرف وہ بچے جو وہاں سے ہجرت کر گئے، انٹورپ کے بجائے ایمسٹرڈم دنیا کی تجارت کا مرکز بن گیا، ہالینڈ کے شہروں میں، جہاں پہلے ہی برابان کی بدامنی کی وجہ سے بلجی جولاہوں کی بڑی تعداد آکر بس چکی تھی، اب اتنی جگہ نہ تھی کہ ان سارے مہاجرین کو جگہ دیتے، چنانچہ ان کی کثیر تعداد کو انگلستان اور سکیسنی جانا پڑا ۔

جنگ آزادی نے ہالینڈ میں شجاعت کی وہ روح پیدا کر دی جسے پھر کوئی چیز مشکل نظر نہ آتی تھی، اور جو کسی مہم میں نہ رکتی تھی۔ برخلاف اس کے تعصّب مذہبی نے ہسپانیہ کے تمام اعصاب کو کمزور کر ڈالا، ہالینڈ ہسپانیہ کے جہاز پکڑ پکڑ کر مالدار بنا، بالخصوص چاندی سے لدے ہوئے جہازوں کو گرفتار کرکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس جزیرہ نما اور بلجیم سے نہایت وسیع پیمانہ پر ممنوع تجارت بھی کرتا رہا، پرتگال اور ہسپانیہ میں اتحاد کے بعد ہالینڈ کو ہندوستان میں نہایت اہم پرتگیزی نوآبادیوں پر قبضہ مل گیا، ادھر

برازیل کا بندرگاہ بھی ہاتھ لگا؛ چنانچہ سترھویں صدی کے نصف اوّل تک لندیزی لہ عتبار صنعت اور نوآبادیات، تجارت وجہازرانی، انگریزوں سے اتنے ہی بڑھے چڑھے تھے جس قدر ہمارے زمانہ میں انگریز ان تمام حیثیتوں میں فرانسیسیوں سے آگے ہیں۔

لیکن انقلابِ انگلستان کے ساتھ ساتھ صورتِ حال میں ایک بڑا تغیّر رونما ہوا۔ حریّت کی روح ہالینڈ میں بس شہری جذبہ ہو کر رہ گئی تھی، جیسا کہ تمام تاجر امراء کا قاعدہ ہے، یہاں بھی جب تک جسم وجان، دولت و املاک کی حفاظت کا سوال رہا، اور جب تک مادّی فوائد صاف ظاہر رہے اُس وقت تک بڑے بڑے کاموں کی صلاحیت بھی رہی لیکن بس، اس سے زیادہ گہری حکمتِ سیاسی اُن کے حصّہ کی چیز نہ تھی، یہ کسی نے نہ سمجھا کہ یہ سارا حاصل کردہ اقتدار اُسی وقت قائم رہ سکتا ہے کہ ایک بڑی قومیت پر اس کی بنا ہو، اور ایک قومی ریاست اس کی پشت پناہ ہو۔ ادھر دوسری طرف جن ریاستوں نے شاہی حکومت کے ماتحت اپنی قومیت کو بڑے پیمانہ پر ترقی دی تھی، لیکن تجارت وصنعت میں ابھی پیچھے تھیں، ان میں ایک طرح کی شرم پیدا ہوئی کہ زمین کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا تجارت وصنعت مچھلی کے کاروبار اور بحری قوت کے اعتبار سے اُن کے آقا کی سی حیثیت رکھتا ہے انگلستان میں اس جذبہ کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ جمہوریت کی پوری قوت بھی تھی، قوانین جہازرانی وہ دعوت پیکار تھے جو انگلستان کے آنے والے اقتدار نے ہالینڈ کے موجودہ اقتدار کو دی تھی، اور جب مقابلہ کا وقت آیا تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ انگریز قوم میں ہالندیزیوں سے کہیں زیادہ بل بوتا تھا، چنانچہ ان کی کامیابی میں کبھی شبہ نہ ہو سکتا تھا۔

انگلستان کی ریس فرانس نے کی، کالبیر نے تخمینہ کیا تھا کہ بحری بار برداری میں کوئی بیس ہزار جہاز کام کرتے ہیں، جن میں سے سولہ ہزار صرف ولندیزیوں کے ہیں، اور یہ تعداد اس چھوٹی سی قوم کے لئے نسبت سے کہیں زیادہ ہے، ہسپانیہ میں بوربون خاندان مالکِ تخت ہوا تو فرانس اپنی تجارت کو بھی اس جزیرہ نما میں پھیلا سکا (جس میں ولندیزیوں کا بڑا نقصان تھا) اور اسی طرح بحیرہ روم کے مشرقی سواحل پر۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرانس نے خود اپنی دیسی صنعت، جہاز رانی، مچھلی کی شکار گاہوں کو ترجیح دے کر ہالینڈ کی صنعت و تجارت کو بے حد نقصان پہنچایا ۔

انگلستان نے، شمالی ممالک سے اپنی تجارت، ہسپانیہ اور ہسپانوی نوآبادیوں سے اشیاء ممنوعہ کی تجارت اور ہندوستان و مشرقی جزائر ہند سے تجارت اور مچھلی کی شکار گاہوں کا بڑا حصہ، یہ سب ہالینڈ سے حاصل کیا تھا، لیکن اس پر سب سے کاری ضرب ۱۷۰۳ء کے میتھوین کے عہد نامہ سے لگی، کہ اس سے پرتگال اور پرتگیزی نوآبادیوں سے نیز ہندوستان سے ولندیزیوں کی جو تجارت تھی اُسے سخت صدمہ پہنچا ۔

ہالینڈ کے ہاتھ سے جب اپنی تجارتِ خارجہ کا اتنا بڑا حصہ نکلنے لگا تو یہاں بھی وہی ہوا جو پہلے ہنزا شہروں میں اور وینس میں ہو چکا تھا، یعنی مادی اور ذہنی سرمایہ کا وہ حصہ جس کے لئے اب اندرونِ ملک میں کوئی مصرف نہ تھا، وہ لوگوں کے ہجرت کر جانے سے یا قرضوں کی شکل میں ان ممالک میں پہنچ گیا جو ہالینڈ کے سابقہ اقتدار کے وارث بنے تھے ۔

اگر ہالینڈ نے اپنے ساتھ بلجیم، رہائنی اضلاع اور شمالی جرمنی کو ملا کر ایک قومی علاقہ بنایا ہوتا تو انگلستان اور فرانس کے لیئے ذرا مشکل ہی سے ممکن ہوتا کہ اس کی بحری قوت، تجارتِ خارجہ اور اس کی ملکی صنعت کو سیاستِ تجارتی اور جنگوں کے ذریعہ اس طرح کمزور کر سکتے جیسے کہ انہوں نے کیا۔ ایسی قوم دوسری اقوام کے نظامِ تجارتی کے مقابلہ میں خود اپنا نظام لا سکتی تھی، اگر ان دوسری سلطنتوں کی ترقی صنعت سے جرمن صنعت کو کچھ نقصان بھی پہنچتا تو خود اس کے اندرونی وسائل اور اس کی نوآبادیاں اس نقصان کی تلافی اچھی طرح کر دیتیں۔ ہالینڈ کو زوال اس لیئے نصیب ہوا کہ یہ ساحلی زمین کا محض ایک ٹکڑا جس میں تھوڑے سے جرمن ماہی گیر، جہاز ران، تاجر اور مویشی پالنے والے بستے تھے، بجائے خود ایک قومی قوت بننا چاہتا تھا، اور ان اندرونی علاقوں کو جن سے مل کر ہی اسکی تکمیل ممکن تھی، یہ ہمیشہ پردیس سمجھتا رہا اور ان سے اسی قسم کا برتاؤ کرتا رہا؛

بلجیم، ہنزا شہروں اور اطالوی جمہوریتوں کی طرح ہالینڈ کی مثال بھی یہی سکھاتی ہے کہ اگر حالاتِ عمومی مساعد نہ ہوں تو محض خانگی کاروبار سے پوری پوری ریاستوں اور ملکوں کی تجارت، صنعت اور دولت کا قائم رکھنا ممکن نہیں، یہ مثالیں ہمیں یہ بھی بتلاتی ہیں کہ افراد کو اپنی قوتِ دولت آفرینی کا سب سے بڑا حصہ حکومت کے نظامِ سیاسی اور قوم کی قوت سے حاصل ہوتا ہے (مثلاً) بلجیم کی زراعت آسٹروی حکومت کے ماتحت پھر سے پھلنے پھولنے لگتی ہے، فرانس سے متحد ہو کر اس کی صنعت بھی اپنی قدیم وسعت اور تشکل حاصل کرنا شروع کرتی ہے۔ ہالینڈ اپنی جگہ پر تنہا کبھی اس قابل نہ تھا کہ بڑی سلطنتوں کے مقابلہ میں خود

اپنا نظام تجارت پیش کرنا اور اسے قائم رکھ سکتا، لیکن امن عام کے قیام کے بعد جب بلجیم سے ہالینڈ کا اتحاد ہوگیا اور اس کے اندرونی وسائل، آبادی اور قومی علاقوں کو اتنی وسعت نصیب ہوئی کہ بڑی قوموں کے مقابلے میں اپنے کو پیش کر سکے، اور جب یہ خود باعتبار تعداد و تنوع، روز افزوں دولت آفریں قوتوں کا مالک بن گیا، تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں نیدرلینڈ میں بھی تاجرانہ نظام وجود میں آیا، اور اس کے اثر سے زراعت، صنعت اور تجارت کو خاصی ترقی حاصل ہوئی لیکن بعض وجوہ سے، جن پر بحث اس تحقیق کی حدود سے باہر ہے، یہ اتحاد پھر ٹوٹ گیا، اور اس طرح ہالینڈ کے تاجرانہ نظام کی اساس ہی جاتی رہی، حالانکہ بلجیم میں یہ آج بھی قائم ہے ۔

ہالینڈ اب اپنا پیٹ اپنی نوآبادیوں سے پالتا ہے، یا جرمنی سے باربرداری کی تجارت کے ذریعہ، لیکن بس اگلی بحری جنگ اسے اول الذکر سے محروم کر سکتی ہے اور جوں جوں جرمن "اتحاد محاصلی" میں اپنے اغراض کا احساس پیدا ہوجائیگا اور جوں جوں یہ اپنی قوتوں کو استعمال کرنا شروع کریگا، اسی قدر یہ اس ضرورت کو محسوس کریگا کہ ہالینڈ کو بھی اپنے اندر ملالے ۔

باب (۴)

اہلِ انگلستان

ہنزا والوں کے ذکر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ انگلستان میں زراعت اور بھیڑیں پالنے کو تجارت خارجہ سے کس طرح فروغ ہوا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ان پردیسی کاریگروں کے ملک میں آنے سے جو اپنے دیس کے مظالم کی وجہ سے، وہاں سے ہجرت کر آئے تھے اور انگریزی حکومت کی زندگی بخش تدابیر سے ملک کی اُونی صنعت کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ صنعت کی ترقی اور ملکہ الزبتھ کی دانشمندانہ اور زوردار کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری خارجی تجارت، جو پہلے پردیسیوں کے قبضہ میں تھی، رفتہ رفتہ ملکی تاجروں کے ہاتھ میں آگئی ؂

پہلے ہم انگریزی صنعت کی اصل کے متعلق کچھ باتیں کہنا چاہتے ہیں اور اس کے بعد انگریزی معیشت قومی کے نشوونما کا بیان اس مقام سے آگے بڑھائیں گے جہاں سے ہم نے دوسرے باب میں اسے چھوڑا تھا ؂

انگلستان کی صنعتی اور تجارتی عظمت کی اصل ہمیں خاص کر بھیڑیں پالنے اور اُونی صنعت میں ڈھونڈنی چاہیئے۔ سرزمین انگلستان پہ اہلِ ہنزا کے پہلے پہل قدم رکھنے

سے قبل انگریزی زراعت کی حالت بہت خراب تھی، اور بھیڑیں پالنے کو بھی کچھ ایسی اہمیت حاصل نہ تھی، مویشیوں کے لئے جاڑے میں چارے کی کمی ہوتی تھی، اس لئے اُن کا بہت بڑا حصّہ خزاں میں ذبح کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مویشی اور کھاد دونوں کی کمی تھی، جیسے تمام غیر متمدّن ممالک کا قاعدہ ہے۔ جیسے پہلے جرمنی میں اور آج بھی امریکہ کے غیر مزروع اضلاع میں، سؤر پال پال کر غذا کا جُزو خاص یعنی گوشت حاصل کیا جاتا تھا۔ وجوہ اس کے ظاہر ہیں، سؤروں کے لئے بہت کم نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے، یہ اپنی غذا آپ ڈھونڈ نکالتے ہیں، اور یہ انہیں جنگلوں اور غیر مزروع کھیتوں میں مل بھی کافی مقدار میں جاتی ہے، بس جاڑے میں تھوڑی سی سؤرنیاں رکھنے کی ضرورت ہے، اور موسم بہار میں ایک اچھا خاصہ گلّہ لے لیجئے۔

تجارتِ خارجہ جوں جوں بڑھی سؤر پالنا کم ہوتا گیا، بھیڑیں زیادہ پالی جانے لگیں، اور بہ حیثیت مجموعی زراعت اور مویشی پالنے کی حالت میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی، ہیوم نے اپنی "تاریخ انگلستان" میں[1] چودھویں صدی کے آغاز کی انگریزی زراعت کا نہایت دلچسپ بیان دیا ہے اس کا بیان ہے کہ ۱۳۲۷ء میں لارڈ اسپنسر کی مملوکہ ۶۳ جائدادوں میں ۲۸۰۰۰ بھیڑیں، ایک ہزار بیل، ۱۲۰۰ گائیں، ۵۶۰ گھوڑے، دو ہزار سؤر تھے یعنی ایک جائداد میں ۴۵۰ بھیڑیں ۳۵ راس مویشی ۹ گھوڑے ۳۲ سؤر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں اسی زمانہ میں دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں بھیڑوں

---

[1] جلد ۲، صفحہ ۱۴۳۔

کی تعداد کا تناسب کتنا زیادہ تھا۔ انگریزی طبقۂ امرا نے بھیڑیں پالنے سے جو فائدے حاصل کئے اس سے ان میں صنعت اور ترقی زراعت سے دلچسپی پیدا کردی اور یہ اس سے پہلے کہ برّ اعظم یورپ کی دوسری ریاستوں میں امرا کو اپنے مقبوضات کے بڑے حصّے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور مصرف نہ معلوم تھا، کہ اس میں جنگلی جانوروں کے گلّے محفوظ رکھیں، اور جب ان کے لئے اس سے زیادہ قابلِ عزّت کوئی اور پیشہ نہ تھا، کہ بس طرح طرح کے جھگڑوں ٹنٹوں سے اپنے پڑوسی شہروں اور ان کی تجارت کو نقصان پہنچایا کریں، اس زمانہ میں (جیسا کہ حال میں ہنگری میں ہوا) انگلستان میں بھیڑوں کے گلّے اس قدر بڑھے کہ ان کی گنتی ایک ایک جائداد میں دس ہزار سے ۲۴ ہزار تک پہنچ گئی، ایسی صورت میں لازم تھا کہ اُون کی صنعت جو پہلی حکومتوں کے زمانہ میں ہی خاصی ترقی کرچکی تھی، وہ اب ملکہ الزبتھ کی (زنامینی) تدابیر کے اثر سے نہایت تیزی کے ساتھ نمایاں خوشحالی حاصل کرے[1]

ہم نے دوسرے باب میں ہنزا والوں کی اس عرضی کا ذکر کیا تھا جس میں جرمن رائشتاگ سے انتقامی کارروائیوں کی درخواست کی گئی تھی، اس میں انگریزی کپڑے کی

[1] اس میں شک نہیں کہ اُون کی برآمد کو ممنوع قرار دینے والے احکام اور ساحلی مقامات میں اُون کے لین دین پر اس غرض سے پابندیاں کہ اُون کی برآمد کو روکا جائے۔ یہ نہایت ناگوار اور غیر منصفانہ کارروائی تھی، لیکن ان سے انگریزی اُون کی صنعت کو فروغ دینے اور اہلِ فلینڈرس کی صنعت کو تباہ کرنے میں بڑی مدد ملی ۔

برآمد کا تخمینہ ۲ لاکھ تھان کیا گیا ہے۔ لیکن جیمس اوّل کے عہد میں انگلستان سے جو کپڑا برآمد ہوتا تھا، اس کی کل قیمت ۲۰ لاکھ پونڈ ہو گئی تھی، حالانکہ ۱۳۵۴ء میں برآمد اُون کی کل قیمت ۲ لاکھ ستّر ہزار پونڈ اور تمام دیگر اشیاء برآمد کی سولہ ہزار چار سو پونڈ سے زائد نہ تھی، اس بادشاہ کے عہدِ حکومت تک اکثر تھان یونہی بے صاف کئے بلجیم بھیج دیئے جاتے تھے، اور وہاں رنگ کر اُن پر استری وغیرہ ہوتی تھی لیکن جیمس اوّل اور چارلس اوّل نے جو ہمت افزائی کی اور تامینی تدابیر اختیار کیں، اُن سے کپڑے کو دھونے اور استری کرنے کا فن انگلستان میں ایسے کمال کو پہنچ گیا کہ اس کے بعد سے نفیس قسم کے کپڑے کی درآمد تو تقریباً بند ہو گئی، اور صرف رنگے ہوئے باریک کپڑوں کی برآمد ہونے لگی ؎

انگریزی سیاست تجارتی کے ان نتائج کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابھی زمانۂ حال میں رُوئی، ریشم اور لوہے کی صنعتوں میں جو بڑی ترقی ہوئی ہے اس سے پہلے کپڑا ہی تمام یورپی قوموں کی تجارت میں سب سے بڑا ذریعہ مبادلہ تھا، بالخصوص شمالی حکومتوں سے نیز بحیرہ رُوم کے مشرقی ساحلی ملکوں اور مغربی جزائر ہند سے تجارت میں اس کے رواج کا اندازہ اس سے ہو گا کہ خود جیمس اوّل کے زمانہ میں اُونی مصنوعات کی برآمد اور تمام چیزوں کی مجموعی برآمد کے مقابلہ میں دس میں نو تھی۔ صنعت کی اس شاخ سے

۱؎ ہیوم (۱۶۱۳ء کے تذکرہ میں) میکفرسن: Histoire du commeree . . . . (۱۶۵۱ء کے ذکر میں) ؎

انگلستان کو اس بات کے ذرائع ہاتھ لگ گئے کہ وہ اہلِ ہنزا کو روس، سویڈن، ناروے اور ڈنمارک کی منڈیوں سے نکال باہر کرے، اور لیوانٹ اور ہندوستان اور مغربی جزائر ہند کی تجارت کے فوائد کا بہترین ثمرہ اپنے لئے حاصل کرلے اسی صنعت نے کوئلہ نکالنے کے کام کو ترقی دی، اسی سے ماہی گیری اور وسیع پیمانہ پر ساحلی تجارت شروع ہوئی اور ان دونوں نے بہ حیثیت بحری قوت کے ان مشہور قوانین جہاز رانی کے نفاذ کو ممکن بنایا جن سے انگلستان کے اقتدارِ بحری کی بنیاد پڑی، اسی صنعت کے ارد گرد انگریزی صنعت کی دوسری شاخیں اس طرح بڑھیں جیسے ایک مشترک تنے سے بہت سی ڈالیاں، چنانچہ اسی صنعت، تجارت اور بحری قوت پر انگریزی عظمت کی بنیاد ہے ؎

ہاں، یہ نہیں کہ انگریزی صنعت کی دوسری شاخوں کی طرف سے غفلت یا بے توجہی برتی گئی ہو۔ الزبتھ ہی کے عہدِ حکومت میں دھات اور چمڑے کی چیزوں اور بہت سی دوسری مصنوعات کی درآمد ممنوع قرار دی گئی تھی[1] لیکن جرمن کان کنوں اور دھات کا کام کرنیوالوں کو ملک میں آکر بسنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ پہلے جہاز یا تو ہنزا والوں سے خریدے جاتے تھے یا بحیرۂ بالٹک کے بندرگاہوں میں بنوائے جاتے تھے، لیکن اس ملکہ نے ایک طرف رکاوٹیں پیدا کر کے اور دوسری طرف مراعات دیکر خود ملکی جہاز سازی کو ترقی دی۔ اس غرض کے لئے جو لکڑی درکار تھی وہ شمال مشرقی ممالک سے آتی تھی، لہٰذا ان علاقوں سے جو انگریزی تجارت برآمد تھی اسے بہت فروغ ہوا۔ پھر انگریزوں نے ہیرنگ مچھلی کا پکڑنا

---

[1] اینڈرسن (۱۵۶۴ء کے ذکر میں) ؎

بھی ولندیزیوں سے سیکھا، اور خلیج بسکے کے ساحل پر رہنے والوں سے وہیل مچھلی کا پکڑنا اور
ان دونوں کاموں کو مراعات دے دیکر ترقی دی گئی (اہلِ جرمن میں Jakob I ہے)
جیمس اوّل نے خاص طور پر جہاز سازی اور ماہی گیری کو ترقی دینے کی طرف توجہ کی، یہ بادشاہ
جو ہمیشہ اپنی رعایا کو مچھلی کھانے کی تلقین کیا کرتا تھا اس پر ہم آج جتنا چاہیں ہنس لیں،
لیکن اس کے ساتھ اتنا انصاف ضرور کرنا چاہیئے کہ اس نے خوب اچھی طرح پہچان لیا کہ انگلستان
کی آئندہ عظمت کا دارومدار کس چیز پر ہے۔ پھر فلپ ثانی اور لوئی چاردہم نے جن پروٹسٹنٹ
کاریگروں کو بلجیم اور فرانس سے وہیں نکال دیا تھا، اُن کے انگلستان میں آنے سے اس
ملک کی صنعتی ہنرمندی اور سرمایہ میں بےحساب اضافہ ہوا۔ انہیں لوگوں کی بدولت
انگلستان میں اُون کا باریک سامان بننے لگا، ٹوپیاں، کپڑا، شیشہ، کاغذ، ریشم اور گھڑیاں
بنانے کے فن میں ترقیاں ہوئیں، اور دھات کی مصنوعات کے ایک حصہ میں بھی، یعنی
صنعت کی ان تمام شاخوں میں جنہیں درآمد کی ممانعت کرکے اور اونچے اونچے محاصل کے
ذریعہ انگلستان نے بہت جلد ترقی دے لی ؛

اس جزیرہ نے برِّاعظم کے ہر ملک سے اس کی مخصوص ہنرمندی مستعار لی اور اپنے
نظامِ محاصل کے سایہ میں اسے اپنی سرزمین میں مستحکم کر لیا۔ وینس کو منجملہ دیگر اشیائے تعیش کے
شیشہ کی صنعت دینی پڑی اور ایران تک کو اپنا قالین بننے اور رنگنے کا فن ؛

جہاں صنعت کا کوئی شعبہ ان کے قبضہ میں آتا تو صدیوں تک اس پر ایسی توجہ کیجاتی
اور اس کی نگہداشت ہوتی جیسے ایک نازک پودے کی جسے سہارے اور دیکھ بھال کی

ضرورت ہو۔ جو کوئی اس کا قائل نہ ہو کہ محنت، ہنرمندی اور کفایت شعاری سے زمانہ گذرنے پر صنعت کی ہر شاخ فائدہ رساں ہو سکتی ہے، جو کوئی نہ مانتا ہو کہ ہر قوم جو زراعت اور تمدن میں کچھ ترقی کر چکی ہے، چاہے اس کی نئی صنعتوں کی پیداوار پہلے پہل کتنی ہی مہنگی اور ناقص کیوں نہ ہو، وہ معتدل سی تامین کے ذریعہ انہیں مشق، تجربہ اور اندرونی مقابلہ و مسابقت سے پرانی پردیسی مصنوعات کے مقابلہ میں لا سکتی ہے، جو کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ صنعت کی ایک شاخ کی ترقی بہت سی دوسری شاخوں کی ترقی پر منحصر ہوتی ہے۔ یا جسے اس بات کا علم نہیں کہ جس قوم کی ہر نسل صنعت کے کام کو اس مقام سے آگے بڑھانے کا التزام کرتی ہے جہاں پچھلی نسل نے اسے چھوڑا تھا، وہ اپنی قوت دولت آفرین کو کس درجہ ترقی دے سکتی ہے، تو ایسے شخص کو چاہیئے کہ نظری نظام مرتب کرنے یا ان مدبرین کو مشورہ دینے سے پہلے جن کے ہاتھ میں قوموں کی بھلائی برائی ہے انگریزی صنعت کی تاریخ کا مطالعہ کر لے!

جارج اوّل کے عہد میں انگریزی مدبرین قوموں کی عظمت کے اسباب کبھی کے تاڑ چکے تھے، سنہ ۱۷۲۱ء میں جب پارلیمنٹ کا افتتاح ہوتا ہے تو وزارت بادشاہ کی زبان سے یہ کہلواتی ہے کہ "یہ بات ظاہر ہے کہ عام خوشحالی کو اور کسی چیز سے اتنی ترقی نہیں ہوتی جتنی مصنوعہ اجناس کی برآمد اور دوسرے ملکوں سے اجناس خام کی درآمد سے"[1] ؎

[1] دیکھئے Ustoritz Theorie du commeree باب ۲۸ ؎
ہم دیکھتے ہیں کہ جارج اوّل یہ نہیں چاہتا تھا کہ چیزیں باہر بھیجے اور اس کے عوض سوائے سونے کے اور کچھ نہ لے۔ جیسا کہ لوگوں نے "مذہب تجارت" کا اصول مقرر رکھا ہے یہ تو بالکل بے معنی بات ہوتی ہے وہ تو صنعتی چیزیں بھیجنا اور اجناس خام منگانا چاہتا تھا ؎

یہی صدیوں سے انگریزی سیاست تجارتی کا اصل الاصول رہا ہے جیسا کہ اس سے پہلے وینس کا تھا۔ یہ آج بھی (۱۸۴۱ء) ایسا ہی نافذ ہے جیسے کہ ملکہ الزبتھ کے عہد حکومت میں تھا، اس کے ثمرات دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہیں، علمائے نظری نے بعد کو دعویٰ کیا ہے کہ انگلستان نے اپنی سیاست تجارتی کے سبب سے نہیں بلکہ اس کے باوجود دولت و قوت حاصل کی ہے، یہ لوگ اتنی ہی سچائی کے ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ درخت اُن ٹھنیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کے باوجود مضبوط اور بارآور ہو گئے ہیں، جو شروع شروع میں اُنہیں سہارا دیتی تھیں ؛

انگریزی تاریخ ہمیں اس بات کا بھی ایسا ہی یقین اور ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ سیاسیات عامہ کو معیشت ملکی سے نہایت قریب کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ انگلستان میں صنعت کی ترقی اور توسیع کے ساتھ جب آبادی بڑھی تو نمک میں سوندی ہوئی مچھلیوں اور کوئلہ کی مانگ بڑھی اور اس سے مچھلیاں لانے کے لئے اور ساحلی تجارت کے لئے تجارتی بیڑہ میں اضافہ ہوا۔ ماہی گیری کی جگہیں اور ساحلی تجارت دونوں پہلے ولندیزیوں کے ہاتھ میں تھیں، باہر کے مال پر زیادہ محاصل اور اپنے لئے امداد شاہی کے ذریعہ جب ہمت افزائی ہوئی تو انگریزوں نے خود مچھلی پکڑنے کی طرف توجہ کی اور قوانین جہازرانی کے ذریعہ سمندر کے راستہ آنے والے کوئلہ ہی کی نہیں بلکہ ساری بحری باربرداری کو انگریز ملاحوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ اس کی وجہ سے تجارتی بیڑہ میں جو اضافہ ہوا۔ اُس کا لازمی نتیجہ تھا کہ بحری قوت کو بھی اسی نسبت سے بڑھایا جائے۔ چنانچہ اس نے انگریزوں کو

اس قابل بنا دیا کہ ولندیزی بیڑہ کا مقابلہ کر سکیں اور قوانین جہازرانی کے نفاذ کے کچھ ہی عرصہ بعد انگلستان اور ہالینڈ میں بحری جنگ شروع ہو گئی۔ ہالینڈ کی جتنی تجارت رو و بار انگریزی سے پرے ممالک میں تھی وہ اس وجہ سے تقریباً رک گئی اور بحر شمالی اور بحیرۂ بالٹک میں ان کی جہازرانی انگریزی بحری قزاقوں کے ہاتھوں بالکل تباہ ہو گئی۔ ہیوم نے تخمینہ کیا ہے کہ جبکہ ولندیزی جہاز انگریزوں کے ہاتھ لگے تھے ان کی تعداد ۱۶۰۰ سے اوپر تھی اور ڈیوننٹ اپنی "رپورٹ بابت آمد فی عامہ" میں یقین دلاتا ہے کہ قوانین جہازرانی کے نفاذ کے ۲۸ سال بعد انگریزی جہازرانی پہلے سے دوگنی ہو گئی تھی[1]۔

قوانین جہازرانی کے اہم نتائج میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

(۱) تمام ممالک شمالی میں، جرمنی اور بلجیم میں، انگریزی تجارت کی توسیع (یعنی مصنوعات کی برآمد، اجناس خام کی درآمد) جن سے اینڈرسن کے بیان کے مطابق ۱۶۰۳ء میں انگریزوں کو ولندیزیوں نے بالکل خارج کر دیا تھا۔

(۲) اسپین و پرتگال اور ان کی مغربی ہندی نوآبادیوں سے اشیاء ممنوعہ کی تجارت میں غیر معمولی توسیع۔

(۳) انگلستان کے ہیرنگ اور وہیل مچھلیوں کے کاروبار میں، جو پہلے تقریباً بالکل ولندیزیوں کے ہاتھ میں تھا، اضافہ۔

(۴) مغربی جزائر ہند میں انگریزوں کی سب سے اہم نوآبادی، جمائیکا کی فتح، اور اس کی

---

[1] ہیوم: جلد ۵ صفحہ ۳۹۔

وجہ سے مغربی ہندی تسکر کی تجارت پر تسلط، لیکن ان سے اہم یہ کہ :-

(۵) پرتگال سے عہدنامہ میتھوین ہوا جس کا ضمنی تذکرہ ہم نے اسپین اور پرتگال کے بیان کے ساتھ کیا ہے۔ اس عہدنامہ کی رو سے ولندیزی اور جرمن، پرتگال اور اس کی نوآبادیوں سے بالکل نکال دیئے گئے، پرتگال سیاسی حیثیت سے انگلستان کا دست نگر ہوگیا، اور انگلستان کو موقع ملا کہ اس پرتگیزی تجارت میں جو سیم و زر ہے اس کی مدد سے چین اور مشرقی ہند سے اپنے تجارتی کاروبار کو بحد وسعت دے سکے، اور اس طرح بعد کو اپنی عظیم الشان سلطنتِ ہند کی بنیاد رکھے، اور ولندیزیوں کو اُن کے خاص تجارتی مرکزوں سے نکال باہر کرے۔ آخر میں جن دو کامیابیوں کا ذکر ہوا ان میں باہم بہت ہی قریب کا تعلق ہے، اور انگلستان کا یہ ہنر خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے کہ اس نے پرتگال اور ہندوستان دونوں کو کیسے اپنی آئندہ عظمت کا آلہ بنایا، اسپین اور پرتگال زیادہ تر قیمتی دھاتیں دے سکتے تھے اور ممالک مشرق میں کپڑا چھوڑ کر انہیں کی مانگ تھی۔ یہاں تک تو سب کچھ بہت ٹھیک تھا، لیکن ان ممالک مشرق کے پاس مبادلہ میں دینے کے لئے بھی زیادہ تر روئی اور ریشم کا کپڑا تھا، اور یہ بات انگریزی وزارت کے اس اصول سے مطابقت نہ کرتی تھی جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں، یعنی مصنوعہ اشیاء کی برآمد اور خام اجناس کی درآمد، اچھا تو اس صورت میں اُنہوں نے کیا کیا؟ کیا یہ اس منافع پر قانع ہوگئے جو پرتگال میں کپڑے کے تھانوں اور ہندوستان کے روئی اور ریشم کی چیزوں کی تجارت سے حاصل ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، انگریزی وزراء کی نظر اس سے آگے پہنچی تھی۔

اگر یہ انگلستان میں ہندوستانی روئی اور ریشم کے سامان کی آزادو رآمد کی اجازت دیتے تو انگریزی روئی اور ریشم کے کارخانے، لازم تھا کہ، بند ہو جائیں۔ ہندوستان کو صرف سستی محنت اور سستے اجناس خام کا فائدہ ہی حاصل نہ تھا بلکہ صدیوں کا تجربہ، ہنرمندی اور مشق بھی اس کے ساتھ تھی۔ آزاد مقابلہ میں ان باتوں کا اثر ناممکن ہے کہ نہ ہوتا۔ انگلستان یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ ایشیا میں اپنی بستیاں بسائے، کہ اس سے صنعتِ ایشیائی اثر میں آجاتی۔ انگلستان تو تجارتی اقتدار چاہتا تھا اور خوب جانتا تھا کہ جب دو ملکوں میں باہم آزاد تجارتی لین دین ہو تو حکومت وہ کرتا ہے جو مصنوعات بیچتا ہے اور وہ اطاعت کرتا ہے جس کے پاس صرف زرعی پیداوار دینے کو ہو۔ اپنی شمالی امریکی نوآبادیوں میں انگلستان نے اسی اصول پر عمل کرکے تو یہ حکم کر دیا تھا کہ ایک نال کی کیل بھی وہاں نہ بننے پائے اور اس سے بھی زیادہ یہ تھا کہ وہاں کی بنائی ہوئی ایک کیل بھی انگلستان نہ پہنچے، اس سے یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی صنعت کی آئندہ فتحمندی کو، جو اُس کی آنے والی عظمت کی اساس تھی، ہندوستان جیسی قدیم طریق صنعت میں ماہران جیسی کثیر التعداد، اور کفایت شعار قوم کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا؟

چنانچہ انگلستان نے ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑوں کی، جن کا کاروبار خود ان کے کارخانے کرتے تھے، درآمد کو ممنوع قرار دے دیا[1]، یہ ممانعت مکمل تھی اور سخت، انگلستان ایک پردیسی تاگہ بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ان خوشنما اور سستے کپڑوں سے کچھ

---

[1] اینڈرسن، ۱۷۲۱ء کے تذکرہ میں "

سروکار نہ رکھنا چاہتا تھا بلکہ اپنے ہی موٹے جھوٹے اور مہنگے کپڑوں کو ترجیح دیتا تھا۔ ہاں یہ اس پر آمادہ تھا کہ برِّ اعظم کی دوسری قوموں کو کم قیمتوں پر ہندوستان کے نہایت نفیس کپڑے فراہم کرے اور انہیں سستے پن کا پورا فائدہ اُٹھانے دے، مگر خود وہ اس میں سے کچھ نہ لینا چاہتا تھا!

اپنے اس طرزِ عمل میں کیا انگلستان نے حماقت کی ؟ آدم اسمتھ، جے۔ بی سے، اور نظریۂ قدر کے لحاظ سے تو یقیناً حماقت کی۔ ان کے خیال کے مطابق تو انگلستان کو جو کچھ خریدنا تھا وہ اس جگہ خریدنا چاہیئے تھا جہاں مال سب سے اچھا اور سب سے سستا ملتا ہو۔ یہ تو سراسر حماقت تھی کہ جو چیزیں یہ دوسری جگہ کم داموں پر خرید سکتا تھا انہیں خود مہنگے داموں اپنے یہاں تیار کرائے، اور یہ سستی چیزیں برِّ اعظم یورپ والوں کی نذر کرے ؛

لیکن ہمارے نظریہ کے اعتبار سے جس کا نام ہم نے "نظریہ قوائے دولت آفرین" رکھا ہے، صورت حال بالکل مختلف ہے۔ اسی نظریہ پر انگریزی وزراء بلا اس کی بنیادوں کی تحقیق کیئے، اس اصول کی شکل میں عمل پیرا رہے کہ اجناس خام خرید و مصنوعات بیچو۔ ان انگریزی وزراء کو کم قیمت اور عارضی مصنوعات کی فکر نہ تھی، بلکہ بیش بہا اور مستقل صنعتی قوت کی ؛

چنانچہ انہوں نے اپنا مقصد نہایت خوبی سے حاصل کیا، آج انگلستان ۷ کروڑ پونڈ کا سوتی اور ریشمی کپڑا بناتا ہے، کل یورپ کو اپنی مصنوعات پہنچاتا ہے، ساری دنیا کو، خود ہندوستان کو۔ ہندوستان سے مصنوعات کی پہلے جو تجارت تھی آج خود اس کی صنعتی

پیداوار اس سے پچاس۵ سے نناوگنی تک ہے ۔

اُسے کیا ملتا اگر سو برس پہلے یہ ہندوستان کا سستا مال خریدتا ، انہیں کیا ملا جو اس وقت ہندوستان سے سستا مال خریدتے تھے ، انگریزوں نے قوت پیدا کر لی ، بے پایاں قوت ، دوسروں کے حصّہ میں قوت کی جگہ کمزوری آئی ۔

ایسے نتائج کے ہوتے ہوئے ، جن پر تاریخی حیثیت سے کوئی شبہ وارد نہیں ہوتا ، آدم اسمتھ کا قوانین جہاز رانی کے متعلق وہ غلط حکم لگانا ، جو اس نے لگایا ہے ، صرف اس ایک بنا پر سمجھ میں آسکتا ہے جس سے ہم ایک دوسرے باب میں تاہین کے متعلق اس مشہور مصنّف کی غلط آرار کی تشریح کرینگے ۔ یہ واقعات اس کے محبوب خیال ، یعنی بے روک ٹوک آزاد تجارت ، کی راہ میں حائل ہوتے تھے ، اسے ضرورت تھی کہ ان اعتراضوں کو ، جو قوانین جہاز رانی کے نتائج سے اس کے اصول کے خلاف پیدا ہوئے تھے ، اس طرح ہٹانے کی کوشش کرے کہ سیاسی اور معاشی مقاصد کو جُدا کر دے اور دعوی کرے کہ قوانین جہاز رانی سیاسی حیثیت سے تو البتہ ضروری اور مفید تھے ، لیکن معاشی اعتبار سے مضر ۔ تفریق ماہیتہ اشیاء اور تجربہ دونوں کے لحاظ سے کہاں تک جائز ہے یہ اس کتاب سے ظاہر ہو جائیگا ۔

جے ۔ بی ۔ سے ، جسے شمالی امریکہ کے تجربہ کی وجہ سے بہتر علم ہونا چاہئے تھا ، وہ اس معاملہ میں بھی ، جیسے کہ ہر اُس معاملہ میں جہاں آزاد تجارت اور تاہین کے اصولوں کا مقابلہ ہو ، اپنے پیشرو سے بھی ایک قدم آگے ہے ۔ سے نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ماہی گیری کی سرکاری امداد کے باعث فرانسیسی قوم کا ایک ملّاح پر کیا صرف ہوتا ہے اور اُس

سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ امداد کس قدر مسرفانہ ہے ؛

بے روک ٹوک آزاد تجارت کے حامیوں کی راہ میں جہازرانی پر پابندیوں کا مضمون ایک سنگ گراں ہے، یہ خوش ہوتے ہیں اگر چپ چاپ اسے نظرانداز کرسکیں خصوصاً اگر یہ کسی بندرگاہ کی تجارتی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں ؛

سچ تو یہ ہے کہ جہازرانی پر پابندیوں کا حال وہی ہے جو کسی تجارتی تعلق پر پابندی کا ہے آزاد جہازرانی اور پردیسیوں کی باربرداری کی تجارت قوموں کے لئے آغاز تمدن کے زمانہ میں مفید اور پسندیدہ ہوتی ہے جب تک اُن کی زراعت اور صنعت معقول ترقی نہیں کر چکتی، سرمایہ اور تجربہ کار ملاحوں کی کمی کی وجہ سے یہ قومیں جہازرانی اور تجارت خارجہ کو خوشی سے پردیسیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتی ہیں، لیکن بعد کو جہاں ان کے قوائے دولت آفریں ایک مقررہ حد تک نشو ونما پا گئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ جہاز بنانے اور جہاز چلانے کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچالیں، تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اپنی تجارتِ خارجہ کو وسعت دیں، یہ تجارت خود اپنے ہی جہازوں کے ذریعہ کریں اور خود ایک بحری قوت بنیں۔ رفتہ رفتہ ان کی جہازرانی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پردیسیوں کو اس سے بالکل خارج کر دینے اور دور دراز مقامات سے بھی خود ہی اپنے جہازوں میں بحری تجارت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جہازرانی پر پابندیاں عاید کر کے ایک قوم کامیابی کے ساتھ دولتمند، تجربہ کار اور طاقتور پردیسیوں کو اس کام کے منافع میں شرکت سے باز رکھ سکتی ہے۔ لیکن جب جہازرانی اور بحری قوت کی

ترقی کی آخری منزل آجاتی ہے تو ایک دوسرا عہد شروع ہوتا ہے، اسی وقت کے متعلق ڈاکٹر پرٹیسٹلے نے کہا ہے کہ اس وقت جہازرانی کی پابندیوں کا اُٹھا لینا اسی قدر قرینِ مصلحت ہے جیسا کہ اُس وقت اُن کا عاید کرنا تھا۔

ایسی حالت میں یہ قوم جہازرانی کے متعلق دوسری قوموں سے معاہدہ کر کے، جو مساوات حقوق پر مبنی ہوں، کم متمدن اقوام کے مقابلہ میں تو فوائد حاصل کر سکتی ہے، کیونکہ ان معاہدوں کی وجہ سے یہ دوسری قومیں اپنی خاص اغراض کے موافق جہازرانی پر پابندیاں نہیں عاید کر سکتیں، اُدھر خود اپنی جہازراں آبادی میں سستی و کاہلی پیدا نہیں ہوتی، اور انہیں ہر وقت مہمیز لگتی رہتی ہے کہ تعمیر جہازات اور فن جہازرانی میں دوسری اقوام کے برابر رہیں۔ وینس جس وقت حصولِ اقتدار کی سعی میں مشغول تھا تو اُس وقت جہازرانی پر قیود نے اُسے بلاشبہ بہت کچھ فوائد پہنچائے، لیکن جب تجارت، صنعت اور جہازرانی میں اقتدار حاصل ہوگیا تو اُس وقت اُن قیود کا باقی رکھنا حماقت تھی، اِس لئے ان قیود کی وجہ سے وہ تعمیرِ جہازات، فنِ جہازرانی اور ملّاحوں کی ہنرمندی کے اعتبار سے ان دوسری قوموں سے پیچھے رہ گیا جو شاہراہ ترقی پر اس کے قدم بہ قدم بڑھ رہی تھیں۔ انگلستان نے تو اپنی حکمت عملی سے پہلے اپنی بحری قوت کو بڑھایا، پھر اپنی بحری قوت کے ذریعہ اپنی صنعتی اور تجارتی صلاحیتوں اور قوتوں کو وسعت دی، پھر انہیں قوتوں کی توسیع سے اس کی بحری طاقت اور نوآبادیوں میں نئے نئے اضافے ہوئے۔

آدم اسمتھ جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ قوانین جہازرانی انگلستان کے لئے تجارتی

حیثیت سے مفید ثابت نہیں ہوئے تو یہ ضرور تسلیم کرنا ہے کہ ان قوانین نے اس کی طاقت کو بڑھایا اور طاقت دولت سے زیادہ اہم چیز ہے ۔

بیشک بات تو یہی ہے کہ دولت سے طاقت زیادہ اہم ہے، لیکن کیوں؟ اس لئے کہ قوم کی طاقت ایک قوت ہے جس سے نئے نئے وسائل دولت آفرین پیدا ہوتے ہیں اور یہی قوائے دولت آفرین وہ درخت ہے جس پر دولت کے پھل لگتے ہیں، اور درخت جس پر پھل لگیں وہ پھل سے زیادہ اہم ہوتا ہے! طاقت دولت سے اس لئے زیادہ اہم ہے کہ اس سے صرف نئے وسائل دولت آفرینی ہی پیدا نہیں ہوتے بلکہ قوم کی پہلے کی حاصل کردہ پرانی دولت پر قبضہ بھی قائم رہتا ہے اور طاقت کی ضد یعنی کمزوری سے صرف دولت ہی نہیں بلکہ ہمارے قوائے دولت آفریں، ہمارا تمدن، ہماری آزادی، خود ہماری قومی خود مختاری، غرض جو کچھ بھی ہمارا ہے ان لوگوں کے سپرد کرنا پڑتا ہے جو طاقت میں ہم سے زیادہ ہیں۔ اس کی تصدیق اطالوی جمہوریتوں جمعیت ہنزا، بلجیوں اور ولندیزیوں، ہسپانیوں اور پرتگیزوں سب کی تاریخ کرتی ہے ۔

لیکن جب طاقت، قوائے دولت آفرین اور دولت میں یہ باہمی عمل اور ردِ عمل کا رشتہ ہے تو آدم اسمتھ نے پھر یہ دعویٰ کیسے کیا کہ عہد نامہ میتھوین اور قوانین جہازرانی تجارتی اعتبار سے انگلستان کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئے۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ انگلستان نے اپنی سیاست کی مدد سے طاقت، اور اپنی طاقت کی مدد سے قوائے دولت آفرین اور ان قویٰ کی مدد سے دولت حاصل کی، اب آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اسی

سیاست کے ذریعہ طاقت میں طاقت اور فوائدے دولت آفرین میں دوسری قومیں کس طرح جمع ہوتی جاتی ہیں ؂

انگلستان نے اپنے ہاتھ میں تمام سمندروں کی کنجیاں لے لی ہیں؛ اور ہر قوم پہ ایک ایک سنتری بٹھا دیا ہے، جرمنوں پہ ہیلگولینڈ، فرانسیسیوں پر گرنسے اور جرسی، شمالی امریکہ والوں پر نووا اسکوشیا اور برمودا اس، وسطی امریکہ پر جمائیکا، بحیرہ رُوم کے تمام ساحلی ممالک کے لئے جبرالٹر، مالٹا اور (اینوینی) جزائر سبعہ، ہندوستان کے دونوں راستوں پہ جنگی اہمیت کے جتنے مقامات ہیں وہ سوائے خاکنائے سویز کے انگلستان ہی کے قبضہ میں ہیں اور اس خاکنائے کے حصول کی بھی کوشش ہو رہی ہے، بحیرۂ روم پہ یہ جبرالٹر سے اپنا اقتدار قائم کرتا ہے بحر احمر پہ عدن سے، اور خلیج فارس پر بوشہر اور کراک سے، اب بس دروانیال، اور ساؤنڈ کی آبنائے، اور سویز اور پانامہ کی خاکنائے باقی رہ گئی ہیں کہ یہ مل جائیں تو انگلستان جس سمندر اور بحری راستہ کو جب چاہے کھولے جب چاہے بند کر دے ؂

تنہا اس کی بحری قوت، اور سب قوموں کی جمہوری بحری قوت سے زیادہ ہے اگر جہازوں کی تعداد میں نہ بھی ہو تو قوت مجادلہ میں تو ضرور ہے۔ اس کی صنعتی قوت با عتبار اہمیت اور تمام قوموں سے افضل ہے۔ اونی کپڑے کی صنعت تو جیمس اوّل کے عہد کے مقابلہ میں دس گُنے سے زیادہ بڑھ ہی چکی ہے (یعنی چار کروڑ ساڑھے بیالیس لاکھ پونڈ سٹرلنگ تک) لیکن ایک اور صنعت کی شاخ کی پیداوار جو ابھی پچھلی صدی میں قائم ہوئی تھی یعنی روئی کی صنعت وہ اس سے بھی اوپر پہنچ گئی ہے یعنی پانچ کروڑ پچیس لاکھ پونڈ تک[1] ؂

---

[1] یہ اور ذیل کے اعداد جو انگلستان کے متعلق ہیں وہ ایک مضمون سے مقتبس ہیں جو مشہور انگریزی

انگلستان اس پر بھی قانع نہیں ہے، بلکہ اپنے سنی کے کپڑے کی صنعت کو، جو دوسرے ممالک کے مقابلہ میں عرصہ سے پیچھے رہی ہے، ان مذکورہ بالا دو صنعتوں کے برابر بلکہ ہو سکے تو ان سے برتر حالت میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب بھی اس کا کام ایک کروڑ ۵۵ لاکھ پونڈ کا ہے ؂

چودھویں صدی عیسوی تک انگلستان میں لوہا اس قدر کمیاب تھا کہ اس ضروری دھات کی برآمد کو ممنوع قرار دینا ضروری سمجھا گیا تھا اور اب انیسویں صدی میں انگلستان دنیا کی تمام دوسری قوموں سے زیادہ لوہے اور فولاد کا سامان تیار کرتا ہے یعنی تین کروڑ دس لاکھ پونڈ کا اور تین کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کا پتھر کا کوئلہ اور دوسری معدنیات پیدا کرتا ہے۔ ان دونوں رقموں کو جوڑ دو تو دنیا کی ساری اقوام کے سیم وزر کی پیداوار کا سات گنا ہوتا ہے۔ (سیم وزر کی پیداوار تقریباً ۲۲ کروڑ فرانک یا ۹۰ لاکھ پونڈ ہے) ؂

آج وہ اس سے زیادہ ریشم کا سامان تیار کرتا ہے جتنا کہ قرون وسطیٰ میں تمام اطالوی جمہوریتیں مل کر تیار کرتی تھیں، یعنی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ پونڈ قیمت کا ؂

صنعت کی وہ شاخیں، جن کا نام بھی ہنری ہشتم اور ملکہ الزبتھ کے عہد میں مشکل سے لیا جا سکتا تھا، بڑی بڑی رقمیں دیتی ہیں، مثلاً شیشہ، چینی اور پتھر کے سامان کی صنعت ایک

ماہرین اعداد بیات Tait's Edinburgh magazine نے M' Queen کی جولائی ۱۸۲۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔ ممکن ہے کہ ان میں فی الوقت کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اگر ایسا ہو بھی تو غالب ہے کہ دس سال کے اندر اندر نوبت ان اعداد تک پہنچ جائیگی ؂

کروڑ دس لاکھ پونڈ کا کام کرتی ہے، تانبے اور ٹین کی صنعت ۴۵ لاکھ پونڈ کا، اور کاغذ، کتابوں رنگوں اور گھر کے ساز و سامان کی صنعت ایک کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کا، یہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کا چمڑا، ایک کروڑ کی اور متفرق اشیاء تیار کرتا ہے، اس وقت اس کے بیئر اور شراب کا کام جیمس اوّل کے زمانہ کی کل قومی پیداوار سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہے یعنی چار کروڑ ستر لاکھ پونڈ ۔

حکومت متحدہ کی کل صنعتی پیداوار کا تخمینہ اس زمانہ میں تقریباً ۲۵ کروڑ ۹۵ لاکھ پونڈ کیا گیا ہے ۔

چنانچہ زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہے کہ زراعت کی قوت دولت آفرینی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ اس رقم کے دوگنے سے زیادہ قیمت کی یعنی ۵۲ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ کی اجناس پیدا کرتی ہے ۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کی طاقت اور فوائے دولت آفرین کی یہ افزائش صرف تجارتی قیود، قوانین جہازرانی، اور تجارتی عہد ناموں پر نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کی حکمی اور فنی فتوحات پر بھی مبنی ہے ۔

لیکن یہ کیا بات ہے کہ آج ایک ملین انگریز کاریگر سینکڑوں ملین کے برابر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ؟ اس کی وجہ ہے صنعتی اشیاء کی مانگ، جو اس نے ممالک غیر میں اور خصوصاً اپنی نوآبادیوں میں اپنی دانشمندانہ اور قومی سیاست سے پیدا کر دی ہے ؛ اس کی وجہ ہے وہ دانشمندانہ اور مضبوط قوانین جو اس نے اپنی دیسی صنعتوں کو بخشی؛ اس کی

وجہ ہیں وہ بڑے بڑے انعامات جو اس نے اپنے قانون سٹیٹیوٹ کی رُو سے ہر نئی اختراع کے لیئے دلوائے، اور وہ غیر معمولی ترقی جو اس نے سڑکوں، نہروں، اور ریلوں کے ذریعہ اپنے اندرونی ذرائع آمد و رفت کو بخشی، انگلستان نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ آمد و رفت کی سہولتوں کا کس قدر گہرا اثر فوائے دولت آفرینی کی توسیع پر پڑتا ہے اور اس طرح قوم کی دولت آبادی اور قومی طاقت کی افزونی پر۔ اس نے بتا دیا ہے کہ ایک آزاد محنتی اور منظم قوم خارجی جنگوں کے باوجود نصف صدی کی مختصر سی مدت میں کیا کچھ کر سکتی ہے۔ اطالوی جمہوریتوں نے اس باب میں اس سے پہلے جو کچھ کیا تھا، وہ محض بچوں کا کھیل تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ قومی قوت دولت آفرینی کے ان عظیم الشان وسائل پر انگلستان میں کوئی ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں ؛

البتہ انگلستان نے ان تعمیروں کی ابتدا اُس وقت کی کہ اس کی صنعتی قوت مضبوط ہونا شروع ہو گئی تھی، اس وقت سے ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ صرف وہی قوم ایسی تعمیرات کر سکتی ہے جس کی صنعتی قوت اعلیٰ پیمانہ پر ترقی کرنے لگی ہو، اور یہ کہ صرف جس قوم کی صنعتی قوت زرعی قوت کے دوش بدوش ترقی کر چکی ہو اُن کثیر الصرف وسائل پر روپیہ اُٹھانا مفید ہو سکتا ہے اور بس ایسی ہی قوم میں یہ اپنا صحیح مقصد پورا کر سکتے ہیں ؛

بضرور سچ ہے کہ انگلستان کی بے پایاں قوت دولت آفرین اور اس کی عظیم الشان دولت صرف قوم کی طاقت اور افراد کے جذبہ طلب منفعت کا نتیجہ نہیں ہیں ؛ قوم کی فطری حُبّ آزادی وانصاف، اس کی قوت عمل، مذہبیت، اخلاق، اس میں ان سب کا حصہ ہے؛

ملک کے دستورِ اساسی کا، دوسرے انتظامات کا، حکومت اور طبقۂ امرار کی دانشمندی اور طاقت کا بھی اس میں دخل ہے، ہاں جغرافی موقع، ملک کی قسمت اور خوش نصیبی تک کا اس میں ہاتھ ہے۔

یہ بتانا کچھ آسان نہیں کہ مادی قوتوں کا اثر اخلاقی قوتوں پر زیادہ ہوتا ہے اور جماعتی قوتوں کا انفرادی پر یا اس کے برعکس، لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ دونوں میں نہایت قوی عمل و ردّ عمل کا رشتہ ہوتا ہے، ایک کی بڑھوتری سے دوسرے کی بڑھوتری اور ایک کی کمزوری سے لازماً دوسرے کی کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

جن لوگوں کی نظر میں انگلستان کے عروج کی تہہ اوجا انگل سیکسن اور نورمانی خون کی آمیزش میں پنہاں ہے وہ ذرا ایک نگہ اس ملک کی ایڈورڈ سوم سے پہلے کی حالت پر ڈالیں، اس وقت قوم کی جفاکشی اور کفایت شعاری کہاں تھی؟ جو لوگ اس عروج کی وجہ ملک کی دستوری حریت میں تلاش کرتے ہیں وہ ذرا سوچیں کہ ہنری ہشتم اور الزبتھ تک پارلیمنٹ کیساتھ کیا سلوک کیا کرتے تھے، اس وقت یہ دستوری حریت کہاں تھی؟ اس زمانے میں تو جرمنی اور اطالیہ کے شہروں میں فی الجملہ شخصی آزادی انگلستان سے کہیں زیادہ تھی۔

دوسری گرمانی النسل قوموں کے مقابلہ میں حریت کے خزانہ کا بس ایک چھوٹا سا انگ اس انگل سیکسن نورمانی نسل نے محفوظ رکھا تھا اور یہ وہ بیج تھا جس سے حریت و انصاف کے تمام انگریزی تصوّرات پیدا ہوئے ہیں، اور یہ بیج جیوری کے سامنے مقدمہ کا حق تھا جب اطالیہ میں لوگ پنڈکٹ کو (رومی قوانین کا مجموعہ) کھود کھود کر نکال رہے تھے اور برآمدہ لاش سے

رجو بلاشبہ زندگی میں ایک دانشمند اور موت کے بعد ایک عظیم الشان مردہ کی لاش تھی !) یہ اعظم یورپ کی اقوام میں آئین مدوّنہ کی وباء پھیل رہی تھی، اس وقت انگریز بیرن یہ اعلان کر رہے تھے کہ انگریزی آئین کی کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ اس طرح آئندہ نسلوں کے لئے انہوں نے ذہنی قوت کا کیا کچھ ذخیرہ محفوظ نہ کر دیا ! اور اس قوتِ ذہنی سے بعد میں مادی پیدائش دولت پر کیا کچھ اثر نہ پڑا !

جماعتی اور ادبی حلقوں سے، ریاست کے محکموں سے، اور قانونی عدالتوں سے جب پہلے ہی لاطینی زبان نکال دی گئی اس کا کتنا اثر قوم کی نشو و نما، قانون سازی، نفاذ قوانین، ادب اور صنعت پر پڑا ؟ اس زبان کو پردیسی قوانین کے ساتھ ساتھ بہت بعد تک قائم رکھنے سے جرمنی میں اور ابھی خود ہمارے زمانہ تک ہنگری میں کیا اثر پڑا ؟ بارود کی ایجاد، اور برقی طباعت کی اختراع، مذہبی سدھار، ہندوستان اور امریکہ کے نئے راستوں کی دریافت کا انگریزی حریت، انگریزی تہذیب، اور انگریزی صنعت پر کیا اثر پڑا ؟ جرمنی اور فرانس میں ان چیزوں کا جو اثر ہوا ذرا کوئی اس سے ان اثرات کا مقابلہ کرے ! جرمنی میں، سلطنت اور صوبوں میں خود شہروں کی فصیلوں کے اندر تک انفراق، ادب، سیاسی و آئینی نظام میں بربریت، خانہ جنگی، مظالم، اخراج، خارجی حملے، آبادی کی کمی اور بربادی، شہروں کی تباہی، صنعت کا، زراعت و تجارت کا انحطاط، حریت اور شہری انتظامات کا زوال، طبقہ امراء کی حکومت، شاہی قوت اور قومیت کا زوال، سب سے اچھے حصّوں کی سلطنت کی علیحدگی ؛

فرانس میں : استبدادی حکومت کی خاطر شہروں اور اشراف کی مغلوبیت، حریت فکر

کے خلاف مذہبی پیشواؤں سے اتحاد، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد و قوت، اپنی تمام خوبیوں اور برائیوں کے ساتھ فتوحات، لیکن اس کے مقابلہ میں حریت اور صنعت کا زوال ؛

اور انگلستان میں: شہروں کا عروج، زراعت، تجارت، صنعت کی ترقی، امراء کا آئین ملک کے ماتحت آنا، اور اس طرح قانون سازی، انتظام ملکی و نفاذ قوانین، نیز صنعت کے فوائد میں شرفاء کی بہت زیادہ شرکت، ملک میں داخلی وسائل کی نشوونما؛ باہر سیاسی طاقت کی ترقی، اندرونی امن، تمام کم ترقی یافتہ اقوام پر اثر، شاہی حقوق پر پابندیاں، اور شاہی آمدنی، شان شوکت میں اضافہ، بہ حیثیت مجموعی ملک کے اندر، خوشحالی، تہذیب اور حریت کا ایک بلند درجہ اور باہر تسلط و اقتدار ؛

بھلا کون بتا سکتا ہے کہ ان اچھے نتائج میں سے کتنے انگریزی قومی روح اور دستور اساسی کے، کتنے ملک کے جغرافی موقع اور حالات ماضی کے، یا کتنے اتفاق، تقدیر یا خوش نصیبی کے نتائج سمجھے جائیں۔ چارلس پنجم اور ہنری ہشتم کی جگہیں بدل دو تو ممکن ہے (لوگ سمجھ لینگے کہ ہم نے ممکن ہے، کیوں کہا) ایک ذلیل مقدمہ طلاق کی وجہ سے جرمنی اور نیدرلینڈ کا وہ حال ہوتا جو انگلستان اور ہسپانیہ کا حال ہوا۔ الزبتھ کے بجائے ایک کمزور سی عورت رکھ دو جو فلپ دوم سے مل جاتی تو برطانیہ عظمیٰ کی طاقت تمدن اور حریت کا کیا حال ہوتا! اگر اس انقلاب عظیم میں صرف سیرت قومی کی قوت کا اثر ہو تو پھر کیا اس کے مفید نتائج کا سب سے بڑا حصہ اس قوم کو نہ ملنا چاہیئے تھا جہاں اس کی ابتدا ہوئی یعنے جرمن قوم کو؟ لیکن برخلاف اس کے، یہی قوم ہے جس نے اس ترقی سے صرف مصیبت اور کمزوری کا پھل پایا ؛

یورپ کی تمام حکومتوں میں سے کسی میں طبقۂ امراء کی ترتیب اس دانشمندی کے ساتھ نہیں ہوئی ہے جیسے انگلستان میں۔ کہ یہاں تاج اور عوام کے مقابلہ میں ان کی شخصی خود مختاری، نشان اور استقلال کی ضمانت ہے، پارلیمنٹ میں اُن کی ایک حیثیت ہے اور انہیں اس کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کی قوتوں کو وطنی اور قومی راہ پر ڈالا جاتا ہے۔ عام شہریوں کا سارا نچوڑ، خواہ اس نے اپنی اعلیٰ ذہنیت کے باعث امتیاز حاصل کیا ہو یا دولت کی زیادتی یا عظیم الشان کارگزاریوں کے ذریعہ، یہ سب کا سب اپنے اندر شامل کر لیتے ہیں؛ اور دوسری طرف اپنی اولاد کا فاضل حصہ پھر عام شہریوں کے طبقہ میں واپس کر دیتے ہیں اور اس طرح شرفاء اور شہریوں کی آئندہ نسلوں کو ہمیشہ ایک دوسرے میں مدغم کرتے رہتے ہیں۔ اس طریقہ سے طبقۂ اشراف میں عوام سے برابر شہری بیداری اور حب وطن کی قوت، علم و حکمت، ذہنیت اور مادی وسائل کے تازہ جرعے پہنچتے رہتے ہیں اور یہ طبقہ قوم کو برابر وہ تہذیب اور آزادی رائے بدلہ میں دیتا رہتا ہے، جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اپنی اولاد کو خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور شہریوں کے لئے نمایاں کارناموں کا محرک بنتا ہے۔ ایک انگریز لارڈ کی اولاد کتنی ہی ہو صرف ایک اس کے منصب کا حامل ہوتا ہے دوسرے اراکین خاندان بس عام شہری ہوتے ہیں۔ جو یا تو کسی علمی پیشے سے، خدمت سرکاری سے یا تجارت، صنعت یا زراعت سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ قصہ مشہور ہے کہ انگلستان کے ایک قدیم ڈیوک کو ایک دفعہ خیال ہوا کہ اپنے تمام خون کے شریک رشتہ داروں کو اپنے مکان پر دعوت دے، لیکن جب معلوم ہوا کہ انکی تعداد گنتی شمار سے باہر ہے تو مجبوراً اس ارادہ کو ترک کرنا پڑا اور یہ اس حالت میں کہ شجرۂ نسب میں

چند ہی صدی پچھلے تک کے لوگوں کو لیا گیا تھا! انگریزی قوم کی حوصلہ مندی، نوآبادیاں بسانے کی صلاحیت، اس کی طاقت اور آزادی اور خصوصاً اس کے قوائے دولت آفرین پر اس انتظام کے اثر کی توضیح کے لئے خود ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے ۔

انگلستان کے جغرافی موقع کا بھی اس قوم کے نرالے نشو ونما پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ یورپ کے مقابلہ میں انگلستان ہمیشہ سے علیحدہ اپنی دنیا آپ تھا، یہ ہمیشہ دوسری قوموں اور ریاستوں کی رقابت، تعصّب، خود غرضی، جذبات اور حادثات کے اثر سے آزاد رہا ہے۔ اسی علیحدگی کا نتیجہ ہے کہ اس کے دستورِ اساسی نے اپنے خاص رنگ میں بلا آمیزشِ خارجی نشو ونما پائی ؛ اسی وجہ سے مذہبی سدھار کی تحریک کی بے روک ٹوک تکمیل یہاں ہو سکی ؛ اور اسی سے کلیسائی املاک کی اہلِ دنیا کو وہ ایسی عمل میں آئی جو اس کی صنعت کے لئے اس قدر مفید نتائج کا باعث ہوئی، اور اگر خانہ جنگی کے زمانہ کو نکال دیا جائے تو اسی علیحدگی کی بدولت انگلستان صدیوں کے مسلسل امن سے بہرہ یاب ہوا ؛ اسی نے اسے مستقل افواج رکھنے سے مستغنی کر دیا اور اوروں سے پہلے ایک محکم اور باضابطہ نظامِ محاصل کا اجرا آسان بنا دیا، اس علیحدگی کی وجہ سے صرف یہی نہیں کہ انگلستان ملکی جنگوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہا، بلکہ اس نے برِّ اعظم کی جنگوں سے اپنے اقتدارِ صنعتی کے لئے بیحساب فوائد حاصل کئے۔ برّی جنگوں اور علاقوں کی تاراج سے ان علاقوں کی صنعت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے ؛ اوّل تو بالواسطہ یعنی زراعت کے کام میں ہرج کر کے کہ اس سے کسان کے پاس سے وہ ذرائع جاتے رہتے ہیں جن سے وہ صنعتی اشیا خرید سکے اور صنعت والوں کو غذا اور اجناسِ خام پہنچا سکے ؛ پھر براہ

راست یوں، کہ صنعتیں اکثر تباہ ہو جاتی ہیں یا کم از کم اجناس خام کے منگانے یا مصنوعات کے بھیجنے میں ہرج پیدا ہوتا ہے اور ایک طرف سرمایہ اور محنت کی فراہمی دشوار ہو جاتی ہے دوسری طرف غیر معمولی محاصل ادا کرنے ہوتے ہیں رہی نہیں بلکہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد بھی اس کے مضر اثرات کام کرتے رہتے ہیں، کیونکہ سرمایہ اور محنت دونوں اسی نسبت سے صنعت سے زراعت کی طرف منتقل ہونے لگتے ہیں جس نسبت سے ملک کی زراعت کو جنگی تاخت و تاراج نے تباہ کیا ہو، کیونکہ سرمایہ اور محنت کے لئے اس حالت میں صنعت کے مقابلہ میں زراعت زیادہ سودمند میدان ہوتی ہے۔ جرمنی کے اندر انیسویں صدی میں یہ صورت حال چند بار رونما ہوئی اور اس سے اس کی صنعتیں پیچھے رہ رہ گئیں لیکن انگلستان کی صنعت بے روک ٹوک مسلسل ترقی کرتی رہی اور جب کبھی انگلستان نے بحری بیڑوں یا فوجوں کے لئے ساز و سامان مہیا کر کے یا امدادی رقوم لیکر یا ان دونوں طریقوں سے بر اعظم کی جنگوں میں حصہ لیا تو انگریزی کارخانے بر اعظم والوں کے مقابلہ میں دوہرے نہرے فائدے میں رہے۔

ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو جنگ اور قیام عساکر کے فضول اخراجات کی حمایت کریں یا ملکی قرضہ کے سراسر سودمند ہونے کے مدعی ہوں، لیکن ہم یہ بھی نہیں مانتے کہ رائج الوقت مذہب کا یہ خیال صحیح ہے کہ تمام وہ مصارف جو براہ راست سودمند نہ ہوں مثلاً جنگ کے مصارف وہ لازماً مضر ہوتے ہیں۔ فوجوں کا ساز و سامان، جنگیں اور ان سے جو قرض پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بعض حالتوں میں قوم کے قوائے دولت آفرین کو ترقی دینے میں بہت زیادہ مدد دیتے ہیں، جیسا کہ انگلستان کی مثال سے ظاہر ہے۔ مادی سرمایہ ممکن ہے دولت آفرین طریقہ سے

صرف نہ ہوا ہو لیکن پھر بھی یہ صرف صنعتوں کو غیر معمولی کوشش کی تحریک دے سکتا اور ترقیوں اور اختراعوں کا باعث ہو سکتا اور فی الجملہ قوائے دولت آفرین کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ قوت دولت آفرین ایک رہنے والی چیز ہوتی ہے جو برابر بڑھتی جاتی ہے اور جنگ کا خرچ تو بس ایک ہی مرتبہ ہو چکتا ہے[1]۔

چنانچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ، اگر اسباب ایسے مساعد ہوں، جیسے انگلستان میں تھے۔ تو وہی خرچ جو ہمارے نظریہ کے نزدیک بالکل دولت آفرین نہیں قوم کے لئے نقصان سے زیادہ فائدہ کا باعث ہو۔ یہ کہ انگلستان میں ایسا ہوا اس کا ثبوت قواعد سے دیا جا سکتا ہے اس

---

[1] انگلستان کا قومی قرضہ جو ایک بہت بڑا عیب معلوم ہوتا ہے وہ ایسا نہ معلوم ہوتا اگر انگلستان کے امرا تسلیم کر لیتے کہ اس کا بار انہیں کو اٹھانا چاہئے جنہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، یعنی امیروں کو، M' Queen نے تخمینہ کیا ہے کہ ممالک متحدہ کی کل املاک کی قیمت بشکل سرمایہ ۴-ارب پونڈ ہے، اور جو سرمایہ نوآبادیوں میں لگا ہوا ہے اس کا اندازہ مارٹن نے ۲-ارب ۶۰ کروڑ کیا ہے، یعنی انگریزوں کی ملک شخصی کا ایک نواں حصہ سارے قرضہ جنگ کو ادا کر دینے کے لئے کافی ہے، اس سے زیادہ قرین انصاف اور کیا ہوگا، کہ یہ حصہ ریاست لے لے یا کم سے کم قرضہ قومی کا سود آمدنیوں پر ٹیکس لگا کر وصول کیا کرے، لیکن انگریز امرا اپنے لئے اسی میں سہولت سمجھتے ہیں کہ یہ سود اشیاء صرف پر محصول لگا کر ادا ہو، جس سے محنت کش طبقہ کی زندگی ناقابل برداشت حد تک تلخ ہو گئی ہے۔

قوم نے جنگ کے دوران میں روئی کی صنعت میں ایک ایسی دولت آفریں قوت حاصل کر لی کہ ملک کو قومی قرضہ پر جو سود دینا پڑتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمت کا حاصل اس سے ہر سال ہو جاتا ہے، اور پھر صنعت کی دوسری شاخوں کی ترقی اور نوآبادیوں میں اضافہ کا تو ذکر ہی نہیں۔

انگریزی اقتدار صنعتی کو برّاعظم کی جنگوں سے جو فائدے ہوئے ان میں سب سے زیادہ یقین وہ ہیں جو برّاعظم پر فوجیں رکھ کر یا امدادی رقوم دے کر انگلستان نے حاصل کیئے ایسی صورت میں سارا خرچ موقع جنگ پر انگریزی مصنوعات کی شکل میں پہنچتا تھا، ان مصنوعات کی درآمد اس ملک کی صنعت کو جو پہلے ہی سے مصیبت میں ہوتی اور دبی ہوتی تھی اور اس ملک کا بازار مستقل طور پر انگریزی صنعت کے ہاتھ آ جاتا تھا۔ اس کا اثر بالکل وہی ہوتا تھا جو انگریزی صنعت کے فائدے اور یورپی صنعت کے نقصان کے لیئے برآمد مصنوعات پر مراعات عطا کرنے سے ہوتا۔

اس طریقہ سے گویا ممالک برّاعظم کی صنعت کو انگریزوں کی دشمنی کے بہ نسبت ان کی دوستی سے زیادہ نقصان پہنچا، ہم اس موقع پر صرف جنگ ہفت سالہ اور فرانسیسی انقلاب اور سلطنت کے خلاف جنگوں کو یاد دلاتے ہیں۔

مذکورہ صدر فوائد کتنے ہی کیوں نہ ہوں لیکن باعتبار اثرات ان سے بہت زیادہ اہم وہ فوائد تھے جو اپنے سیاسی، مذہبی اور جغرافی حالات کے باعث انگلستان نے دوسرے ممالک کے مہاجرین کو اپنے یہاں کھینچ کر حاصل کیئے۔ بارھویں صدی ہی میں سیاسی حالات نے فلیمی اُون بُننے والوں کو ویلس پہنچایا۔ بہت صدیاں نہ گزری تھیں کہ اپنے ملک سے نکالے ہوئے

اطالوی لندن میں آکر بسے اور صرافی اور مہاجنی کا کام شروع کیا۔ جیسا کہ ہم دوسرے باب میں دیکھ چکے ہیں، فلینڈرس اور برابان سے مختلف اوقات میں کاریگروں کی جماعتیں کی جماعتیں انگلستان میں آکر سکونت پذیر ہوئیں۔ اسپین اور پرتگال سے نکالے ہوئے یہودی آئے، ہنزا شہروں سے اور زوال آمادہ وینس سے تاجر آئے اور اپنے جہاز اور تجارتی علم کا سرمایہ اور حوصلہ مندی ساتھ لائے۔ اس سے بھی زیادہ اہم سرمایہ اور صناعوں کی وہ آمد ہے جو اسپین، پرتگال، فرانس، بلجیم، جرمنی اور اٹلی سے مذہبی سدھار اور تشدد کی وجہ سے عمل میں آئی۔ پھر قوانین جہاز رانی اور عہد نامہ میتھوین کے باعث، تجارت اور صنعت کی کساد بازاری کی وجہ سے، ہالینڈ سے تاجر اور صناع آ آکر یہاں بسے، اس آزادی، حق پناہی، اندرونی امن اور چین، تحفظِ حقوق، اور عام خوشحالی کے باعث جو انگلستان کو حاصل تھی برِاعظم کی ہر سیاسی تحریک اور ہر جنگ سے اس ملک کو بہت زیادہ سرمایہ اور ہنرمندی حاصل ہوتی رہی، مثلاً حال میں انقلاب فرانس اور سلطنت کی جنگوں میں یہی حال ہوا؛ یہی حال اسپین، میکسیکو اور جنوبی امریکہ کی سیاسی اور انقلابی اور اس کی مخالف تحریکوں اور جنگوں میں ہوا۔ اپنے قوانین پیٹنٹ کے ذریعہ انگلستان نے تمام قوموں کی اختراعی قوت کا عرصہ تک اجارہ سا لے رکھا تھا، اب جبکہ انگلستان صنعتی ترقی کے معراج کو پہنچ چکا ہے یہ بات قرینِ انصاف ہے کہ برِاعظم کی قوموں سے اس نے جو دولت آفرین قوتیں حاصل کی تھیں ان میں سے کم از کم ایک حصہ تو ان اقوام کو واپس دے۔

باب (۵)

ہسپانی اور پرتگیزی

اُدھر انگریز صدیوں کی محنت سے اپنی قومی خوشحالی کی تعمیر نہایت مضبوط بنیادوں پر اٹھانے میں مشغول تھے اِدھر ہسپانیوں اور پرتگیزوں نے اپنے اکتشافات کی بدولت اپنے نصیب پھیر لئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سی دولت حاصل کر لی، لیکن یہ ایک مسرف کی دولت تھی جس نے کسی لاٹری میں پہلا انعام پا لیا ہو؛ اور انگریزوں کی دولت کی مثال اس اثاثہ کی سی ہے جو کسی خاندان کے محنتی اور کفایت شعار باپ نے جمع کیا ہو۔ اول الذکر اپنے کثیر اخراجات اور تعیّش کے باعث ممکن ہے کچھ دنوں کے لئے دوسرے سے زیادہ قابلِ رشک ہو، لیکن اس کی دولت اسراف اور دقتی حظ کا ایک ذریعہ ہے اور دوسرا اُسے اپنے بعید سے بعید اخلاف کی مادی اور ذہنی خوشحالی کی بنیاد قائم کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے ۔

ہسپانیوں کے پاس عمدہ بھیڑوں کے گلّے اتنے پہلے سے تھے کہ ہنری اول نے ۱۱۷۲ء میں انگلستان کے اندر ہسپانوی اون کی برآمد کو ممنوع قرار دینا ضروری سمجھا تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہی میں اطالوی اون کے صناع اُون کا بڑا حصہ ہسپانیہ سے منگاتے تھے اس سے بھی دو صدی پیشتر خلیج بسکے کے ساحل پر رہنے والوں نے لوہے کی صنعت بھا زرانی

اور مچھلی کے شکار میں امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ وھیل مچھلی کے پکڑنے کا کام سب سے پہلے انہی نے کیا اور ۱۶۱۹ء تک یہ اس کام میں انگریزوں پر اتنی فوقیت رکھتے تھے کہ انگریز اپنے ماہی گیروں کو ان کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیجتے تھے۔[1] دسویں صدی ہی میں عبدالرحمٰن ثالث کے عہد میں (۹۱۲ء تا ۹۵۰ء) مسلمان بلنسیہ کے آس پاس کے زرخیز میدانوں میں کپاس، شکر اور چاول کی وسیع پیمانہ پر کاشت کرتے اور ریشم تیار کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ میں مسلمانوں کے زمانہ ہی میں روئی اور ریشم کے کارخانے تھے۔[2] بلنسیہ، سغوویہ، تولید و اور کستنیاہ کے اور بہت سے شہر صناعی کے لئے مشہور تھے۔ قدیم زمانہ میں اشبیلیہ ہی میں ۱۶ ہزار کرگھوں پر کام ہوتا تھا اور ۱۵۵۲ء میں سغوویہ کی اونی صنعت میں ۱۳ ہزار کاریگر کام کرتے تھے، یہی حال دوسری صنعتوں کا مثلاً اسلحہ سازی اور کاغذ کی صنعت کا تھا، کولبیر کے زمانے تک فرانسیسی ہسپانیہ سے نفیس کپڑا منگاتے تھے۔[3] ہسپانی بندرگاہ نہایت وسیع

---

[1] Anderson جلد ۱ صفحہ ۱۲۶؛ جلد ۲ صفحہ ۳۵۰ ۔

[2] M. G. Simon : Recneil d'observation sur l' l'Angleterre Memoirs et fincnces d'Espagne
Unstaritz : Theorie et pratique de commerce

[3] Chaptal : De l'Industrie francaise جلد ۲ صفحہ ۲۴۵

تجارت اور مچھلی کے کاروبار کا مرکز تھے، اور فلپ دوم کے عہد تک ہسپانیہ کے پاس نہایت طاقتور بیڑا تھا، مختصر یہ کہ ہسپانیہ کے پاس عظمت اور خوشحالی کے تمام عناصر موجود تھے کہ تعصب مذہبی نے استبداد حکومت کے ساتھ مل کر قوم کی اولوالعزمی کا گلا گھونٹنا شروع کیا۔ اس کتاب ظلمت کی ابتدا یہودیوں کے اخراج سے ہوئی تھی اور انتہا مسلمانوں کے اخراج ہے، کہ اس طرح ۲۰ لاکھ سب سے محنتی اور سب سے خوشحال باشندے مع اپنے سرمایہ کے نکال باہر لئے گئے احتساب مذہبی جہاں ملکی صنعت کو دیس نکالا دے رہا تھا وہاں پردیسی صناعوں کو ملک میں آکر بسنے سے بھی نہایت مؤثر طریق پر روکتا تھا۔ امریکہ کے انکشاف اور راس امید والے راستہ کے دریافت نے ان دونوں ملکوں کی دولت میں ظاہری اور عارضی طور پر تو اضافہ کیا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ واقعات ان کی قومی صنعت اور قوت کے لئے پیام اجل تھے کیونکہ اب ہندوستان اور مغربی جزائر ہند میں وہاں کی خام اجناس سے اپنی مصنوعات کا مبادلہ کرنے کے بجائے، جیسا کہ بعد کو ہالینڈ اور انگلستان والوں نے کیا، یہ اب اس سونے چاندی سے جو یہ نوآبادیوں سے گھسیٹ رہے تھے ان یوروپی قوموں کی مصنوعات خریدنے لگے اور یوں اپنے کارگزار اور محنتی شہریوں کو انھوں نے غلاموں کا تاجر اور نوآبادیوں کا جابر بنا دیا، انگلستان اور ہالینڈ والوں کی تجارت اور بحری قوت کی پرورش کی، انہیں اپنا رقیب بنایا جو تھوڑے ہی عرصہ میں اتنے طاقتور ہو گئے کہ انکے بیڑا کو تباہ کر ڈالا اور ان کی دولت کے وسائل ان سے چھین لئے شاہان ہسپانیہ برآمد زر اور درآمد مصنوعات کے خلاف پے بہ پے آئین و قوانین جاری کرتے تھے کاروباری حوصلہ مندی صنعتی محنت و جفاکشی، اور تجارت صرف سیاسی اور مذہبی آزادی کی زمین میں جڑ پکڑتے

ہیں، سونا چاندی وہاں رہتے ہیں جہاں صنعت و محنت انہیں اپنے پاس کھینچتا اور انہیں استعمال کرنا جانتی ہوں ؞

البتہ پرتگال نے ایک روشن خیال اور مضبوط وزیر کے ماتحت اپنی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی اور اس کی شروع شروع کی کامیابیاں حیرت میں ڈالنے والی ہیں ہسپانیہ کی طرح اس ملک میں بھی قدیم الایام سے نفیس بھیڑوں کے گلے ہوتے تھے۔ استر ابوخیرو بتاتا ہے، کہ پرتگال میں اچھی بھیڑیں ایشیا سے بیجا کر پالی گئی تھیں، اور فی راس ایک تالنت قیمت پڑی تھی؛ ۱۶۸۱ء میں جب کاؤنٹ اریکیرا وزیر مقرر ہؤا تو اس نے کپڑے کے کارخانے قائم کرنے کی تجویز کی تاکہ ملکی جنس خام کو مصنوعات میں تبدیل کر کے خود اپنے ملک کے لئے اور نوآبادیوں کے لئے دیسی کپڑا فراہم ہو سکے، اس کام کے لئے انگلستان سے جولاہے بلائے گئے اور تامین کی وجہ سے کپڑے کی صنعت اس تیزی سے بڑھی کہ تین ہی سال بعد (یعنی ۱۶۸۴ء میں) یہ ممکن ہو گیا کہ پردیسی کپڑے کی درآمد کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اب پرتگال اپنے لئے اور نوآبادیوں کے لئے اپنی اجناس خام سے بنی ہوئی مصنوعات فراہم کرنے لگا اور اس وجہ سے ۱۹ سال تک نہایت خوشحال رہا، جس کی تصدیق خود انگریز مصنف کرتے ہیں[1]۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزوں نے اس وقت بھی اپنی مخصوص صلاحیت کا ثبوت دیا، جسے بعد میں انہوں نے درجۂ تکمیل کو پہنچایا ہے، یعنی پرتگال کی ان تجارتی پابندیوں کو ٹالنے کے لئے انہوں نے اون کو اس طرح بننا شروع کیا کہ اس کی ساخت معمولی کپڑے سے ذرا مختلف ہوئی لیکن

---

[1] British Merchant جلد ۳، صفحہ ۷۹ ؞

کام وہی نکلتا اور اس چیز کو پرتگال میں اونی "سرج" اور اونی "درو گے" کے نام سے بھیجنے لگے، مگر ان کی یہ چالاکی جلد پکڑ لی گئی اور ان چیزوں کی درآمد ممنوع کر کے اس کی مضرت کو دور کر دیا گیا۔[۱] ان کارروائیوں کو جو کامیابی ہوئی وہ اس وجہ سے اور بھی قابل لحاظ ہے کہ ابھی بہت دن نہ گزرے تھے کہ یہودیوں کے اخراج کے باعث ملک سے بہت سا سرمایہ باہر جا چکا تھا اور ملک تعصّب مذہبی، خراب حکومت، اور آزادی عامہ اور زراعت کو تباہ کرنیوالے منصبدار امرا کے عذاب میں مبتلا تھا۔ لیکن ۱۷۰۳ء میں جب کاؤنٹ اریکیرا کی وفات پر مشہور انگریز سفیر پال میتھوین نے پرتگیزی حکومت کو سمجھا دیا کہ پرتگال کو بڑا فائدہ پہنچے گا اگر انگلستان اور ملکوں کی شراب پر جو محصول لیتا ہے اس سے ایک تہائی کم محصول پرتگیزی شراب پر لے اور اس کے عوض پرتگال انگریزی کپڑے کی درآمد پر وہی محصول لگائے جو ۱۶۸۴ء سے پہلے لگتا تھا یعنی ۲۳ فی صدی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے تو محاصل سے آمدنی میں اضافہ کی امید اور امرا کی جانب سے زمین کے لگان میں اضافہ کی توقع، اس عہدنامہ کی منظوری کے خاص محرکات تھے۔ اس عہدنامہ میں شاہ انگلستان نے شاہ پرتگال کو اپنا "قدیم ترین دوست اور حلیف" بنایا ہے بالکل اسی طرح جیسے روما کی سینیٹ ان بادشاہوں کے نام کے ساتھ یہ اسمائے صفت استعمال کیا کرتی تھی جو بدقسمتی سے اس جمعیت سے قربت پر مجبور ہوتے تھے۔ اس عہدنامہ کا منظور ہونا تھا کہ پرتگال انگریزی مصنوعات سے پٹ گیا، اور اس طوفان کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگیزی کارخانے بالکل بند ہو گئے، اس نتیجہ کی مثال بالکل ان نتائج کی سی ہے جو

---

[۱] British Merchant، صفحہ ۸۱۔

بعد کو فرانس میں عہد نامہ ایڈن سے اور جرمنی میں نظام بر اعظمی کے منسوخ ہونے سے رُونما ہوئے ۔

اینڈرسن[1] کی شہادت ہے کہ انگریز اس زمانہ میں بھی اپنے مال کو اصل قیمت سے کم کا بتانے میں ایسے طاق تھے کہ نرخ محاصل کی رُو سے جو محصول واجب الادا ہوتا واقعی اُس کا آدھے سے زیادہ ادا نہ کرتے تھے ۔

اخبار British Merchant لکھتا ہے :۔ "ممانعت درآمد کی منسوخی کے بعد ہم ان کے (پرتگیزیوں کے) نقرئی زر رائج کا اتنا حصہ لے آئے کہ ان کی ضروریات کے لئے بھی کافی زر باقی نہ رہا ، پھر اس کے بعد ہم نے ان کے سونے کی طرف توجہ کی"[2] اور یہ کام ابھی ابھی زمانہ حال تک جاری رہا ، جتنی قیمتی دھاتیں پرتگیز اپنی نوآبادیوں سے لاتے سب کی سب باہر بھیج دیتے ، اور بڑا حصہ ہندوستان اور چین جاتا ، یہاں مصنوعات کے بدلے یہ دھاتیں دے کر ان مصنوعات کو پھر براعظم یورپ میں اجناس خام کے بدلہ میں بیچا کرتے تھے ، پرتگال میں انگریزی مال کی سالانہ درآمد پرتگیزی برآمد سے ۱۰ لاکھ پونڈ زیادہ ہوتی تھی ، توازن تجارت انگریزوں کے موافق تھا اس لئے انہوں نے نرخ مبادلہ زر کو پرتگال کے خلاف ۱۵ فیصدی گرا رکھا تھا British Merchant کا مصنف اپنی تمہید کی تحریر میں مشہور وزیر کے بیٹے سر پال میتھوین کو لکھتا ہے کہ :۔ "پرتگال سے لین دین میں توازن تجارت ہمارے لئے

---

[1] Anderson جلد ۳ ، صفحہ ۲۶ ۔

[2] British Merchant جلد ۳ ، صفحہ ۲۶۷ ۔

جتنا موافق ہے اور کسی ملک سے نہیں، اور اس ملک سے قیمتی دھاتوں کی درآمد جو پہلے ۳ لاکھ پونڈ تھی اب ۱۰ لاکھ ۵ ہزار ہو گئی ہے[1]"۔

انگلستان کے تمام تاجروں، معاشیوں اور مدبروں نے اس عہدنامہ کو انگریزی سیاست تجارتی کے شاہکار کی حیثیت سے سراہا ہے، خود اینڈرسن جو انگریزی سیاست تجارتی کے متعلق تمام امور میں روشن بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے انداز خاص میں نہایت دیانت داری سے اُن کا ذکر کرتا ہے، وہ بھی اس عہدنامہ کو "نہایت ہی عمدہ اور سودبخش معاہدہ" کے نام سے موسوم کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتے ہوئے سادہ دلی سے یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ "خدا کرے یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے[2]"۔

اس عام رائے کے خلاف ایک نظریہ بنانا اور یہ دعویٰ کرنا کہ عہدنامہ میتھوین انگریزی تجارت کے لئے کسی طرح فائدہ مند ثابت نہیں ہوا ایسا آدم اسمتھ ہی کا کام تھا۔ اس مشہور آدمی کے خیالات کی (جو کہیں کہیں متضاد بھی ہیں) رائے عامہ جیسی اندھی تعظیم کرتی ہے اس کے اظہار کے لئے اگر کوئی ثبوت ضروری ہو تو بس یہ واقعہ کافی ہے کہ اس کی متذکرہ بالا رائے کی کسی نے آج تک تردید نہیں کی۔

اپنے چوتھے مقالہ کے چھٹے باب میں آدم اسمتھ کہتا ہے کہ "عہدنامہ میتھوین کی رُو سے

---

[1] British Merchant جلد ۳ صفحہ ۱۵، ۲۰، ۲۳، ۳۸، ۱۱۰، ۲۵۳، ۲۵۴۔

[2] Anderson سنہ ۱۷۰۳ کے ذکر میں۔

چونکہ پرتگیزی شراب کے اوپر اور قوموں کے مقابلہ میں ایک تہائی کم محصول لگتا تھا۔ اس لئے گویا اس معاہدہ نے پرتگیزیوں کے ساتھ ایک خاص رعایت کی، لیکن انگریزی کپڑے پر چونکہ وہی محصول لگنا طے ہوا تھا جو اور قوموں کے کپڑے پر تھا، لہٰذا انہیں اس رعایت کے بدلہ میں کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن کوئی پوچھے کہ کیا اس سے پہلے پرتگیز لوگ اپنی ضرورت کا پردیسی مال فرانس، جرمنی اور ہالینڈ سے نہیں منگاتے تھے؟ اور کیا اب انگریزوں کو ایک ایسی صنعتی پیداوار کے لئے بلا شرکت غیرے ساری پرتگیزی منڈی نہیں ہاتھ آ گئی، جس کے لئے جنس خام خود ان کے یہاں پیدا ہوتی تھی؟ کیا اس کی ترکیب انہوں نے نہیں نکال لی تھی کہ پرتگیزی محاصل بس آدھے رہ جائیں؟ کیا نرخ مبادلہ زر نے انگلستان میں پرتگیزی شراب کے استعمال پر ۱۵ فیصدی کا فائدہ نہیں کرا دیا تھا؟ کیا انگلستان میں فرانسیسی اور جرمنی شرابوں کا استعمال بالکل بند نہیں ہو گیا؟ کیا پرتگیزی سیم و زر نے انگریزوں کے ہاتھ میں وہ ذریعہ نہیں دے دیا جس سے یہ ہندوستانی مال کے ڈھیر کے ڈھیر لا کر تمام برّاعظم کو پاٹ سکے؟ کیا انگریزوں کے فائدہ کی خاطر پرتگیزی کپڑے کے کارخانے بالکل تباہ نہیں ہو گئے؟ کیا اس کے باعث تمام پرتگیزی نوآبادیاں (اور بالخصوص دولتمند برازیل) عملاً انگریزی نوآبادیاں نہیں بن گئیں؟ بیشک! اس عہدنامہ نے پرتگیزوں کو ایک رعایت دی تھی، لیکن صرف الفاظ کی شکل میں، اور انگریزوں کو رعایت دی تھی اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے، انگلستان نے اس کے بعد بھی جتنے تجارتی معاہدے کئے ہیں سب کی تہ میں یہی رجحان نظر آتا ہے، اپنے لفظوں میں یہ ہمیشہ شیدائے انسانیت اور عالمی نقطۂ نظر رکھنے

والے ہیں، اپنے عمل اور سعی میں ہمیشہ اجارہ داران بے شریک ؛

آدم اسمتھ کی دوسری دلیل کہ انگریزوں کو اس عہدنامہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا، اس لئے کہ اپنے کپڑے کے عوض پرتگال سے یہ جتنا روپیہ لاتے وہ سب دوسرے ممالک کو وہاں سے اشیاء خریدنے کے لئے بھیجنا پڑتا تھا، حالانکہ اُن کے لئے زیادہ فائدہ اس میں تھا کہ وہ اپنے کپڑے کا مبادلہ ان چیزوں سے کر لیتے جس کی انہیں ضرورت ہوتی، اور اس طرح ایک مبادلہ میں وہ کام ہو جاتا جو پرتگال سے تجارت کے باعث دو مبادلوں میں پورا ہوتا تھا۔ واقعی اگر ہم اس مشہور عالم کی سیرت اور دقت نظر کے متعلق نہایت اچھی رائے نہ رکھتے ہوتے تو یا تو اس کی دیانت سے بدظن ہو جاتے یا اس کی صحابت رائے سے، لیکن ان دونوں صورتوں سے بچنے کے لئے اب سوائے اس راہ کے اور کوئی باقی نہیں کہ فطرت انسانی کی کمزوری کا گلہ کریں، جس کی خدمت میں اوروں کی طرح آدم اسمتھ نے بھی ان متضاد اور فریب قریب مضحکہ خیز دلائل سے اپنا خراج خوب خوب پیش کیا ہے، بظاہر اس فی نفسہٖ اعلیٰ خواہش سے خیرہ ہو کر کہ تجارت کی آزادی مطلق کو حق بجانب ثابت کر سکے!

مذکورہ بالا دلیل میں بس اس سے زیادہ سمجھ اور منطق نہیں جتنی کہ اس بیان میں ہے کہ چونکہ ایک نانبائی اپنی روٹیاں نقد کے عوض گاہکوں کے ہاتھ بیچتا اور اس نقد سے چکّی والے سے آٹا خریدتا ہے، لہٰذا وہ ایک بے سود کام میں مشغول ہے، کیونکہ اگر یہ اپنی روٹیاں براہِ راست چکّی والے کو دے کر اس سے آٹا لے لیا کرے تو اس کا کام بجائے دو مبادلوں کے ایک ہی مبادلہ میں نکل جائے۔ اس دلیل کے جواب میں یہ بات کہنے کے لئے کچھ بہت

عقل و فراست کی ضرورت نہیں ہے کہ چکی والے کو شاید اتنی روٹیوں کی ضرورت نہ ہو جتنی نانبائی فراہم کر سکتا ہے، یا شاید چکی والا خود روٹی پکانے کے کام کو سمجھتا اور کرتا ہو، اور اس لیئے نانبائی کا کاروبار ان مبادلوں کے بغیر ممکن ہی نہ ہو! اور عہد نامہ مذکور کے وقت انگلستان اور پرتگال کے تجارتی تعلقات کا حال بس یہی تھا۔ پرتگال کو ان مصنوعات کے بدلہ جو یہ بھیجا کرتا تھا جنوبی امریکہ سے سونا چاندی ملتا تھا، لیکن سستی کہیئے یا حماقت، ان مصنوعات کو خود تیار کرنے کے بجائے قیمتی دھاتیں دے کر انہیں انگریزوں سے خریدتا تھا، یہ لوگ (انگریز) ان قیمتی دھاتوں کا جو حصہ اپنے روز کے کاروبار سے بچاتے وہ سب ہندوستان اور چین بھیجدیتے، وہاں مصنوعات خریدتے اور ان مصنوعات کو لا کر براعظم یورپ میں بیچتے، اور یہاں سے زرعی پیداوار اجناس خام یا پھر قیمتی دھاتیں اپنے وطن کو لیجاتے تھے ؞

ہم معمولی انسانی سمجھ کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ انگریزوں سے وہ سارا کپڑا کہ جو یہ پرتگال بھیجتے تھے کون خریدتا اگر پرتگال والے اس بات کو ترجیح دیتے کہ اپنا کپڑا آپ بنائیں، یا کسی اور ملک سے خریدیں؟ انگریز اس صورت میں پرتگال کے ہاتھ تو یہ کپڑا بیچ نہ سکتے اور دوسرے ملکوں کے ہاتھ پہلے ہی سے جتنی مانگ تھی اتنا بیچ ہی رہے تھے، نتیجہ یہ ہوتا کہ جتنا کپڑا پرتگال جاتا تھا اب اتنا کم بنایا جاتا، اسی قدر کمی ہوجاتی، قیمتی دھاتوں کی اس مقدار میں جو ہندوستان بھیجی جاتی تھیں، اسی قدر کم سامان تجارت انگریز ہندوستان سے یورپ لا کر یہاں بیچ سکتے، لہٰذا اسی قدر کم اجناس خام اپنے ملک کو یہاں سے بھیج سکتے ؞

بالکل اسی طرح آدم اسمتھ کی تیسری دلیل ناقابل پذیرائی ہے، کہ اگر پرتگیز بجائے انگریزوں

کے پاس یہ کرنہ آتا تو وہ اس چیز کی ضرورت کسی اور طریقہ سے پوری کر لیتے۔ اس کا خیال ہے کہ پرتگال بہرحال اپنے ذخائر سیم و زر باہر بھیجتا اور یہ کسی اور راہ سے ہو کر انگلستان پہنچتے۔ اچھا ہم فرض کرتے ہیں کہ پرتگیزی اپنا کپڑا آپ بناتے، اپنا فاضل سیم و زر خود ہندوستان اور چین میں بھیج دیتے اور وہاں سے جو سامان مبادلہ میں آتا اسے دوسرے ممالک میں خود بھیجتے تو بھلا پوچھئے کہ ایسی حالت میں انگریزوں کو پرتگیزی روپیہ کہیں دیکھنے کو بھی ملتا؟ اور بالکل یہی حال ہوتا اگر پرتگال ہالینڈ یا فرانس سے ایک میتھوین عہدنامہ کر لیتا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں انگلستان میں کچھ نہ کچھ روپیہ پہنچتا، لیکن بس اتنا جتنا کہ یہ اپنی خام اون بیچ کر حاصل کر لیتے۔ مختصر یہ کہ میتھوین عہدنامہ کے بغیر انگریزی صنعت یا تجارت اور جہازرانی کو وہ ترقی و توسیع ہرگز نصیب نہ ہوتی جو اس کی وجہ سے ہوئی۔

لیکن خیر میتھوین عہدنامہ کے اثرات انگلستان کے لئے کیا ہوئے اس پہ آدمی جو حکم چاہے لگائے، یہ بات مسلّم معلوم ہوتی ہے کہ جہاں تک پرتگال کا تعلق ہے یہ اثرات ہرگز ایسے نہ تھے کہ دوسری قوموں کو اس کی ریس کی ترغیب ہو سکے، کہ وہ اپنی ساری زرعی پیداوار برآمد کے لئے سہولتیں پیدا کرنے کی خاطر اپنے ملک میں مصنوعات کی منڈی انگریزی مقابلہ کے لئے کھول دیں۔ بجائے اس کے کہ انگلستان سے تعلقات کی وجہ سے پرتگال کی زراعت، صنعت، تجارت اور جہازرانی کو ترقی ہوتی یہ سب چیزیں روز بروز زوال پذیر ہوتی گئیں۔ پومبال نے انہیں ابھارنے کی لاحاصل کوشش کی، انگریزی مقابلہ نے اس کی تمام کوششوں کو بے اثر بنا دیا۔ یہ ضرور ہے، اور اسے بھولنا نہ چاہئے کہ پرتگال جیسے ملک میں جہاں سارے جاغنی حالات

زراعت، صناعت اور تجارت کی ترقی میں حائل ہوں، وہاں سیاست و تدبر تجارتی سے مشکل ہی سے کچھ ہو سکتا ہے، پھر بھی پومیاں کی کوششوں کا جو کچھ تھوڑا بہت اثر ہوا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حکومت صنعت کو ترقی دینا چاہے تو کیا کیا فائدہ پہنچانا ممکن ہیں بشرطیکہ نظام جماعت کی اندرونی خرابیوں کے باعث جو رکاوٹیں ہیں وہ پہلے دور ہو چکی ہوں ؂

یہی تجربہ ہسپانیہ میں فلپ پنجم اور اس کے جانشینوں کے عہد حکومت میں ہوا۔ بوربون عہد میں، ہر چند کہ ملکی صنعتوں میں تائید کافی نہ تھی، اور قوانین محاصل کے نفاذ میں بھی قوت کی ہر چند کمی تھی، تاہم کالبیر کی سیاست تجارتی کو فرانس سے ہسپانیہ میں منتقل کرنے کے سبب سے صنعت کی ہر شاخ میں اور ملک کے ہر ضلع میں ترقی کے آثار چھپ نہ سکتے تھے۔ استارتس اور الوا کی تصنیف پڑھئے[1] تو اس زمانہ کے حالات میں یہ کامیابیاں نہایت حیرت خیز معلوم ہوتی ہیں، ہر طرف نہایت خراب راستے، جن پر صرف خچر چل سکتے تھے، کہیں کسی اچھی سرائے کا نام نہیں، نہ کہیں پل، نہ نہریں، نہ دریائی کشتی رانی، ہر صوبہ باقی ملک سے محاصل کی دیواروں سے منقطع، ہر شہر کے دروازہ پر ایک شاہی مطالبہ، قزاقی اور بھیک باضابطہ پیشے، اشیاء ممنوعہ کی تجارت نہایت زوروں پر، ٹیکس کا نظام ایسا کہ سب کو پیسے ڈالتا تھا۔ ان اور اسی قسم کی اور باتوں کو مذکورہ بالا مصنفوں نے صنعت و زراعت کے زوال کا سبب قرار دیا ہے۔ ان عیوب کے جو اصلی اسباب تھے یعنی تعصب مذہبی، اہل کلیسا کی ہوس اور برائیاں،

---

[1] Ustaritz : Theorie du commerce
Ulloa : Retablissement des manufactuves d'Espagre

امراء کے خاص حقوق، حکومت کا استبداد، جمہوریت، روشن خیالی اور آزادی کا فقدان، ان کو برا کہنے کی جرأت بھلا ان میں کہاں! پرتگیزی ملیشیوں عہد نامہ کا ایک مثنیٰ ہسپانیہ سے ۱۷۱۳ء والا اسینٹو (Assiento) کا عہد نامہ تھا، جس کی رو سے انگریزوں کو مجاز کیا گیا تھا۔ کہ ہر سال جنوبی امریکہ میں افریقی حبشیوں کی ایک مقررہ تعداد پہنچا سکیں اور سال میں ایک بار اپنا ایک جہاز بندرگاہ پورٹو بلو میں لا سکیں۔ اس طریقہ سے انگریزوں کو ان اقطاع میں مصنوعات کے ڈھیر چوری چھپا کر پہنچانے کا موقع ملا۔

چنانچہ انگریزوں نے جتنے تجارتی معاہدے کئے ان سب میں یہ بات ملتی ہے کہ جن ملکوں سے نامہ و پیام ہوتا ہے وہاں میں اپنی مصنوعات کی بکری بڑھانے کی تدبیر کی جاتی ہے اور انہیں ہی پیداوار اور اجناس خام کے معاملہ میں ظاہرا فوائد پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ سستی مصنوعات اور زیادہ عرصہ تک اعتبار پر قرض دے کر ان ممالک کی صنعتی دنیا کو تباہ کر دیا جائے اگر شرح محاصل نیچی نہیں ملتی تو پھر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ محکمہ چونگی کو دھوکا دیا جائے اور اشیاء ممنوعہ کی تجارت کو بڑے پیمانہ پر منظم کیا جائے، پہلی تدبیر، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پرتگال میں کارگر ہوئی، دوسری ہسپانیہ میں۔ اس معاملہ میں درآمد پر باعتبار قیمت محصول لگانے کے اصول نے ان کی بڑی مدد کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال میں انہوں نے پر اشیا کے مروجہ طریقہ کو کہ وزن پر محصول لگایا جائے خلاف مصلحت ثابت کرنے کی بڑی کوشش فرمائی ہے۔

باب (۶)

فرانسیسی

فرانسیسیوں کو بھی رومی تمدّن کے بہت سے باقیات ورثہ میں ملے تھے، لیکن گیمانی تسلّط کے بعد، کہ یہ لوگ بس اپنے شکار کی دُھن رکھتے تھے، اور مزروعہ کھیتوں کو جنگلوں اور چراگاہوں میں تبدیل کرتے جاتے تھے، یہ سب کچھ پھر ضائع ہو گیا۔ البتہ اور یورپی ملکوں کی طرح فرانس میں بھی قرونِ وسطےٰ میں زراعت کی ترقی ان خانقاہوں کے ذریعہ ہوئی جو بعد کو تمدّن کی راہ میں اتنی بڑی رکاوٹ ثابت ہوئیں، امرا کی طرح ان خانقاہوں کے رہنے والے نہ تو آپس میں معرکہ آرائیاں کرتے، نہ فوجی خدمت لیکر اپنے ماتحتوں کو تنگ کرتے تھے، اور ان کے کھیتوں اور مویشیوں کے لئے اوروں کے مقابلہ میں لوٹ مار اور تاخت و تاراج کا کم ڈر تھا۔ یہ اہلِ کلیسا چین کی زندگی پسند کرتے تھے، جنگ آزمائی سے نفرت کرتے اور حاجت مندوں کی مدد کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ ضرب المثل تھی کہ عصائے خمیدہ کے زیرِ سایہ خوب گزرتی ہے۔

حروبِ صلیبی، مقدّس لوئی کا جمعیتہائے بلدی اور صنعتی پنچائتیں اور برادریاں قائم کرنا، اٹلی اور فلینڈرس کا قرب، یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ فرانس میں پہلے ہی سے

صنعت کو ترقی ہوئی۔ چودھویں صدی ہی میں نارمنڈی اور برٹینی اُون اور سنی کا کپڑا صرف اپنی اندرونی ضروریات کے لئے نہیں بلکہ انگلستان بھیجنے کے لئے بھی مہیا کیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں خصوصاً ہنری کے تاجروں کی وساطت سے، شرابوں اور نمک کی تجارت برآمد نے بھی خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ فرانسس اوّل کے اثر سے ریشم کی صنعت جنوبی فرانس میں آئی، ہنری چہارم نے اس صنعت کو اور شیشہ اور اونی اور سوتی کپڑے کی صنعت کو اور رشیلیو اور مزارین نے رواں اور سیداں کی ریشم مخمل اور اونی کپڑے کی صنعت کو اور ماہی گیری و جہاز رانی کو فروغ دیا۔

امریکہ کی دریافت نے کسی دوسرے ملک پر اتنا اچھا اثر نہیں ڈالا جتنا فرانس پر مغربی فرانس سے بکثرت غلہ ہسپانیہ جاتا، اور ہر سال کثرت سے کسان پائرنی اضلاع سے شمال مشرقی ہسپانیہ میں تلاش روزگار میں جا جا کر بستے، شراب اور نمک کی بڑی مقدار ہسپانی ندرلینڈ بھی جاتی اور ان کے علاوہ ریشم، مخمل اور فرانسیسی صنعت کی اشیا تعیش خاصی مقدار میں انگلستان، ندرلینڈ، ہسپانیہ اور پرتگال میں جا کر بکتیں۔ اس وجہ سے فرانس میں شروع ہی سے بہت کچھ ہسپانی سیم و زر کاروبار میں رواج پا چکا تھا۔ لیکن پھر بھی فرانسیسی صنعت کا شاندار عہد کالبیر سے شروع ہوتا ہے، جب مزارین مرا ہے تو نہ صنعت و تجارت کی حالت کچھ ایسی بہت اچھی تھی، نہ جہاز رانی اور ماہی گیری کی، اور مالیات کا حال تو بہت بُرا تھا، کالبیر میں یہ ہمّت مردانہ تھی کہ اس نے تنہا اپنے سر وہ کام لیا جو انگلستان میں کئی صدی کی پیہم کوشش اور دو انقلابوں کے بعد کامیاب ہوا تھا، دنیا کے تمام ملکوں سے اس نے ماہر کاریگر حاصل کئے

رموز تجارت خریدے اور بہتر اوزار اور مشینیں فراہم کیں، ایک عام اور مؤثر نظام محاصل کے ذریعہ اس نے دیسی بازار کو ملکی صنعت کے لیئے محفوظ کر دیا، صوبہ دار محاصل کو بالکل مٹا کر یا بہت کچھ کم کر کے اور سڑکیں اور نہریں تعمیر کرا کے اس نے اندرونی ملک کے لین دین کو بڑھایا۔ ان کارروائیوں سے زراعت کو صنعت سے بھی زیادہ فائدے پہنچے، اس لیئے کہ خرچ کرنے والوں کی تعداد اس طرح دگنی تگنی ہوگئی اور اشیاء پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں میں تعلقات آسانی سے اور سستے داموں ممکن ہوگئے۔ اس کے علاوہ زمین پر جو براہ راست مطالبہ تھا اسے کم کر کے اور اس سختی میں تخفیف کر کے جو پہلے مالگزاری جمع کرنے میں برتی جاتی تھی، محاصل کی مساوی تقسیم کر کے اور بالآخر شرح سود کو گھٹانے کی تدابیر اختیار کر کے اس نے زراعت کو اور بھی ترقی پہنچائی۔ غلّہ کی برآمد بھی اس نے صرف گرانی اور قحط کی حالت میں ممنوع قرار دی تھی۔ تجارت خارجہ اور ماہی گیری کی توسیع کی طرف اس نے خاص توجہ کی، بحیرۂ رُوم کے مشرقی ساحل والے ممالک سے پھر تجارتی تعلقات جوڑے، نوآبادیوں سے تجارت بڑھائی، ممالک شمالی سے تجارت شروع کی اور نظم حکومت کے تمام شعبوں میں سخت کفایت شعاری اور کامل باضابطگی قائم کی جب یہ مرا ہے تو فرانس میں پچاس ہزار کرگھوں پر اُون کا کپڑا بنتا تھا، اور ۵ کروڑ فرانک کی قیمت کا ریشم تیار ہوتا تھا، ریاست کی آمدنی میں ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ فرانک کا اضافہ ہوگیا تھا، مملکت فرانس کے قبضہ میں پھلتا پھولتا ماہی گیری کا کام تھا، اچھا بڑا تجارتی بیڑہ تھا اور نہایت طاقتور جنگی بیڑہ۔

ایک صدی بعد معاشیوں نے کالبیر کو بہت بُرا بھلا کہا اور الزام لگایا کہ اس نے

زراعت کو نقصان پہنچا کر صنعت کو ابھارا، لیکن اس الزام سے بس یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاشی خود صنعت کی ماہیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔[1] خیر اگر کالبیر نے یہ غلطی کی بھی کہ اجناس خام کی برآمد میں وقتی رکاوٹیں پیدا کیں، تو دیسی صنعت کو ترقی اور نشوونما دے کر اس نے زرعی پیداوار کی مانگ اس قدر بڑھا دی کہ ان رکاوٹوں سے جتنا نقصان ہوا ہوگا اس سے دس گنی تلافی ہو گئی۔ اگر روشن خیال تدبر سیاسی کے خلاف اس نے صنعت کے لئے نئے نئے طریقے متعین کر دیئے اور کاریگروں کو تعزیری قوانین کے ذریعہ ان کے اختیار کرنے پر مجبور کیا، تو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ طریقے اس زمانہ میں سب سے بہتر اور فائدہ مند تھے، اور اسے ایک ایسی قوم سے سابقہ تھا جو ایک طویل استبدادی حکومت کے باعث بالکل بے حس ہو گئی تھی اور ہر جدت کی جانب

[1] دیکھئے کینے (Quesnay) : Physiocratie ou du gouvernement le plus avantageux augenre humain 1786 کا نوٹ ۵ اصول ۵ پر، . . . . . . جہاں کینے بس دو مختصر سے صفحوں میں کالبیر کا رد پیش کرتا اور اس کی برائی کرتا ہے، حالانکہ Necker کو کالبیر کے نظام کی تشریح اور اس کے نتائج کے لئے سو صفحے درکار ہوئے۔ نہ معلوم ہم صنعت، تاریخ مالیات کے متعلق کینے کی عدم واقفیت پر زیادہ تعجب کریں یا اس کی دیدہ دلیری پر کہ وہ وجہ دیئے بغیر کالبیر جیسے آدمی کے پیٹھ پر اپنی لکڑی توڑتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ناواقف تخیل پرست ہیوگو ناٹس کے اخراج کا ذکر تک نہیں کرتا، اور حقیقت کے خلاف یہ کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتا کہ کالبیر نے مختلف صوبوں میں باہمی غلہ کی تجارت کو نہایت تنگ کرنے والی پولیس کے ذریعہ روکا تھا۔

وہ بہتر ہی کیوں نہ ہو، مخالفت کرتی تھی، لیکن یہ الزام کہ کالبیر کے نظام تامینی کے باعث فرانس کی ملکی صنعت کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا یہ صرف اسی مذہب معاشی کے پیرو اس پر لگا سکتے تھے جو ناٹس کے منشور کی تنسیخ اور اس کے مضر اثرات کو یک قلم نظر انداز کرتے ہیں، ان افسوسناک کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالبیر کی وفات کے ۲ ہی سال بعد فرانس کے سب سے محنتی ہنرمند اور مالدار باشندوں میں سے کوئی ۵ لاکھ جلاوطن کر دیئے گئے، اور انہوں نے اپنی صنعت اور اپنا سرمایہ سویٹزرلینڈ میں، جرمنی کے تمام پروٹسٹنٹ صوبوں، خاص طور پر پروشیا میں، اور ہالینڈ اور انگلستان میں منتقل کر دیا، جس سے فرانس کو دوہرا نقصان اٹھانا پڑا، اس طرح ایک متعصب درباری کی سازشوں نے تین سال کے اندر ایک پوری نسل کا اچھا کام تباہ کر ڈالا، اور فرانس کو پھر اسی پرانی بے حسی کی حالت میں لا ڈالا، حالانکہ ادھر انگلستان اپنے نظام دستوری کے ماتحت اور ایک ایسے انقلاب سے مضبوط ہو کر جس نے قوم کے تمام قویٰ کو جنبش دے دی تھی، ملکہ الزبتھ اور اس کے پیشروؤں کے کام کو بلا وقفہ بلکہ روز افزوں جوش کے ساتھ چلائے جا رہا تھا۔

فرانس کی صنعت اور مالیات کی بدحالی اور دوسری طرف انگلستان کی مرفہ الحالی کا نظارہ، انقلاب فرانس سے کچھ پہلے مدبرین فرانس کے لئے باعث رشک تھا، لیکن معاشیین کے خیالی خولی نظریات پر فریفتہ، یہ لوگ کالبیر کے خلاف اس صورت حال کی اصلاح کا ذریعہ بس آزادی تجارت کو سمجھتے تھے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ بس ایک ہی وار میں ملک کی خوشحالی بحال ہو جائیگی، اگر کہیں فرانسیسی شرابوں اور برانڈی کے لئے انگلستان میں بہتر منڈی مل جائے اور اس کے

مقابلہ میں انگریزی مصنوعات کو نرم شرائط پر ملک میں آنے دیا جائے (یعنی ۱۲ فیصدی محصول لیکر) انگلستان تو اس تجویز پر پھولا نہ سمایا، اور ایڈن کے عہدنامہ (۱۷۸۶ء) کی شکل میں اس نے لیفتوین عہدنامہ کا ایک دوسرا ایڈیشن فرانس کو بھی خوشی سے عطا کیا، اور یہ نقل بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے اپنے پرتگیزی اصل سے کم تباہ کن ثابت نہیں ہوئی ؛

انگریز چونکہ جزیرہ نما ہسپانیہ و پرتگال کی تیز شرابوں کے عادی تھے اس لئے اس شراب کی مانگ ان کے یہاں اتنی نہ بڑھی جتنی کہ توقع تھی، اور فرانسیسیوں نے نہایت افسوس سے دیکھا کہ یہ انگلستان کو بس فیشن اور تعیش کی چیزیں دے سکتے ہیں، اور ان کی کل قیمت بہت حقیر ہوتی ہے۔ حالانکہ انگریزی صنعت والے تمام ضرورت کی چیزوں میں، جن کی کل قیمت بیحساب ہوتی ہے، فرانسیسی کاریگروں سے قیمت کی ارزانی، مال کی خوبی اور ادھار دینے میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے مقابلہ کے بعد فرانسیسی کارخانے تباہی کے کنارے آ لگے، اور فرانسیسی انگور کی کاشت کو کوئی بڑا فائدہ نہ پہنچا تو فرانسیسی حکومت نے عہدنامہ کو منسوخ کیا اور اس تباہی کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہا، لیکن اس وقت یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اچھے بھلے کارخانوں کو چند سال میں تباہ کر دینا بہت آسان ہے، اور تباہ شدہ صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنا مشکل۔ انگریزی مقابلہ نے فرانس میں انگریزی اشیاء کا ایسا چسکا لگا دیا تھا کہ عرصہ تک نہایت وسیع پیمانہ پر اشیاء ممنوعہ کی چوری چھپے کی تجارت جاری رہی، جس کا روکنا مشکل ہو گیا، اور انگریزوں پر یہ بات کچھ ایسی گراں نہ گزری کہ عہدنامہ کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ پھر اپنے کام و دہن کو جزیرہ نما کی شرابوں کا عادی بنالیں ؛

ہر چند کہ انقلاب کی ہل چل اور نپولین کی مسلسل جنگیں فرانسیسی صنعت کی خوشحالی کے لئے مفید نہ تھیں اور ہر چند کہ فرانسیسی اس زمانہ میں بحری تجارت کا بہت بڑا حصہ اور اپنی تمام نوآبادیاں کھو بیٹھے تھے، تاہم صرف اس وجہ سے کہ فرانسیسی بازار بلا شرکت غیرے فرانسیسی صنعت کے ہاتھ میں تھا، اور منصب داری پابندیاں اٹھ گئی تھیں، یہ صنعت پچھلی حکومتوں کے مقابلہ میں اب کہیں بہتر حال میں تھی، یہی صورت حال جرمنی میں نظر آتی ہے، اور یہی تمام ان علاقوں میں جن پر براعظمی ناکہ بندی عاید تھی ۔

نپولین نے اپنے چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا کہ " دنیا کی موجودہ حالت میں جو سلطنت آزاد تجارت کا اصول اختیار کرے وہ پس کر خاک ہو جائے گی"۔ جہاں تک فرانس کی سیاست تجارتی کا تعلق ہے نپولین نے ان الفاظ میں تمام معاصر مصنفین معاشیات کی کل کتابوں سے زیادہ سیاسی دانشمندی کا اظہار کر دیا ہے تعجب ہوتا ہے اس عقل عظیم کی ذکاوت پر کہ نظامہائے معاشیات کا مطالعہ کئے بغیر صنعتی قوت کی اہمیت کو اتنی اچھی طرح سمجھتا تھا اور اسکے لئے اور فرانس کے لئے یہ اچھا ہی ہوا کہ اس نے ان نظاموں کا مطالعہ نہ کیا تھا۔ نپولین کا قول ہے کہ " پہلے صرف ایک قسم کی املاک تھی یعنی املاک اراضی لیکن اب اور املاک پیدا ہو گئی ہے، یعنی صنعت"۔ اس طرح نپولین نے وہ بات صاف کہہ دی اور صاف صاف دیکھی جو اس زمانہ کے معاشیوں نے یا تو دیکھی نہ تھی یا اسے صاف بیان نہ کر سکتے تھے، یعنی یہ کہ وہ قوم جو داخلی حیثیت سے قوت زرعی کے ساتھ قوت صنعتی ملالے وہ اس قوم سے کہیں زیادہ مکمل اور خوشحال ہے، جو بس خالص زرعی حیثیت رکھتی ہو۔ نپولین نے فرانس میں صنعتی تعلیم کے اجرا اور ترقی کیلئے

تک کا اعتبار بڑھانے کے لیئے، نئی اختراعات اور جدید طریقوں کے شروع کرنے اور ان کو چلانے کرنے کے لیئے، اور ملک کے اندرونی ذرائع آمد و رفت کی تکمیل کے لیئے، جو کچھ کیا اس کا تفصیلی ذکر ضروری نہیں، کہ ابھی یہ چیزیں لوگوں کو اچھی طرح یاد ہیں البتہ یہ زیادہ ضروری ہے کہ اس رائے کی کجی اور تعصّب کی طرف توجہ دلائی جائے جو اس کے ہمعصر نظر بین نے اس روشن خیال اور طاقتور حکمران کی بابت قائم کی ؛

نپولین کی شکست کے ساتھ ہی انگریزی مقابلہ نے جو اب تک صرف ممنوعہ تجارت تک محدود تھا، پھر یورپ اور امریکہ میں قدم جمائے۔ اب جاکر کہیں پہلی مرتبہ سننے میں آیا کہ انگریز تاہین تجارت کو بُرا کہتے ہیں، اور آدم سمتھ کے نظریہ آزادی تجارت کے حامی ہیں۔ وہی نظریہ جسے اب تک یہ عمل پسند جزیرہ والے صرف ایک بہتر خیالی دنیا کے لیئے کارآمد سمجھتے تھے! لیکن ایک ٹھنڈے دل سے تحقیق کرنے والے پر یہ بات آسانی سے روشن ہو جائیگی کہ اس تغیّر مذہب میں حبِّ انسانیت اور جوشِ عقاید کا مشکل ہی سے کچھ شائبہ ہے۔ کیونکہ یہ عالمی دلائل صرف اس وقت پیش کیئے جاتے تھے، جب برِّاعظم یورپ یا امریکہ کو انگریزی مصنوعات کی برآمد کیلیئے سہولتیں حاصل کرنے کا ذکر ہوتا تھا، لیکن جہاں کہیں غلّہ کی آزاد درآمد یا کہیں انگریزی بازاروں میں مصنوعات غیر ملکی کے مقابلہ کا نام آیا تو فوراً اس میں نہایت اہم ترمیمات کر دی جاتی تھیں[1] ؛

---

[1] امریکہ کا ایک باکمال خطیب اور عدالت عالیہ ریاستہائے متحدہ کا امیر مجلس بالڈون، اس کیننگ سیکسن والے نظام تجارت آزاد کے متعلق خوب کہتا ہے کہ اور تمام انگریزی چیزوں کی طرح یہ کبھی گھر میں استعمال کیلیئے نہیں بنایا گیا، بلکہ باہر بھیجنے کے لیئے"۔ ہم اس فرطِ جوش کا خیال کر کے ہنسیں یا روئیں جو کیننگ

کہا یہ جاتا تھا کہ عرصہ تک انگلستان میں فطری اصولوں کے خلاف جس سیاست پر عمل رہا ہے اس نے ایک ایسی مصنوعی سی حالت پیدا کر دی ہے، کہ اس میں ایک دم دخل انداز ہونا خطرناک نتائج پیدا کئے بغیر ممکن نہیں، اس میں تبدیلی نہایت احتیاط اور دیکھ بھال سے کرنی چاہیئے، انگلستان کی حالت اس بارہ میں قابل افسوس ہے، اور براعظم یورپ و امریکہ کی دوسری قوموں کے لیئے اتنا ہی خوشی کا مقام ہے کہ ان کے حالات و کیفیات نے انہیں اجازت دی ہے کہ بلا توقف آزادی تجارت کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہو سکیں!

بقیہ صفحہ ۱۲۶ - ہسکسن والے نظام کے اعلان کے وقت فرانس اور جرمنی کی لبرل جماعت اور عالمی نقطۂ نظر رکھنے والے نظر بین نے ظاہر کیا تھا ایسی خوشی تھی کہ گویا مملکت ہزار سالہ کا آغاز ہو گیا۔ لیکن ذرا سنیئے کہ کیننگ کا سوانح نگار آزادی تجارت کے موضوع پر اس وزیر کے خیالات کے متعلق کیا لکھتا ہے "مسٹر کیننگ اس مجرد اصول کی صحت کے پورے قائل تھے کہ تجارت جب ہی خوب ترقی کر سکتی ہے جب اس پر کوئی قیود نہ ہوں لیکن چونکہ ہمارے احباب اور پڑوسی قوموں کا یہ خیال نہیں رہا ہے اور اس وجہ سے تمام تجارتی کاروبار پر پابندیاں عاید کی گئی ہیں۔ اس لیئے ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اس پر یہ مجرد اصول لگایا جائے تو چاہے وہ نظری حیثیت سے کتنا ہی صحیح ہو عملی اعتبار سے کچھ مفر ضرر ہو سکتا ہے"۔ Political Life of Mr. Canning by Stapleton ص ۳

۱۸۲۸ء میں انگریزوں کا یہ عمل اس قدر روشن طور پر قوموں کے سامنے تھا کہ لبرل ممبر مسٹر ہیوم نے پارلیمنٹ کے سامنے اسے براعظم کی صنعت کا گلا گھونٹنے سے تعبیر کیا ہے۔

اگرچہ فرانس کا قدیم حکمران خاندان انگلستان کے پرچم کے سایہ ہی میں یا کم از کم انگریزی سونے کے اثر سے پھر تخت پر آیا تھا، تاہم مذکورہ بالا دلائل کو بہت دنوں رواج نہ رہا۔ جو صنعتیں براعظم کی ناکہ بندی کے نظام کے ماتحت خوب پھلی پھولی اور مضبوط ہو گئی تھیں، ان میں انگلستان کی آزادئ تجارت نے ایسی کھلبلی مچا دی کہ فوراً نظامِ امتناعی کی پناہ لینی پڑی جس کے اثر سے دوپیں Dupin کی تصدیق کے مطابق ۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۷ء تک فرانس کی صنعتی قوت دوگنی ہو گئی۔[1]

باب (۵)

جرمن

اہلِ ہنزا کے ذکر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اٹلی کے بعد جرمن نے تجارت کے ذریعہ دوسرے یوروپی ممالک سے بہت پہلے مرفہ الحالی حاصل کی، اس جگہ قدیم صنعتی حالات اور ان کی نشو و نما پر پھر ذرا ایک نظر ڈال کر اس قوم کی صنعتی تاریخ کو آگے بیان کرنا ہے۔

قدیم گرمانیا میں زمین کا بڑا حصہ مویشیوں کیلئے چراگاہ اور شکار کے جانوروں کے محفوظ رکھنے کیلئے

---

[1] Forces productives de la France.

کام میں آتا تھا جو کچھ تھوڑی سی بہت بری بھلی زراعت تھی وہ غلاموں اور عورتوں کے حصہ میں آتی تھی آزاد لوگوں (احرار) کا شغل بس جنگ آزمائی تھا، یا شکار اور یہی تمام جرمن طبقہ اشراف کی اصل ہے۔

سارے قرون وسطیٰ میں جرمن اشراف و امرا اسی نظام پر قائم رہے، یہ زراعت کو دباتے رہے اور صنعت کے دشمن رہے اور یہ نہ سمجھے کہ بحیثیت مالک زمین ان دونوں کی ترقی سے انہیں کیا کیا فائدہ حاصل ہو سکتے تھے۔

ہاں اپنے اصلی شغل محبوب کے ساتھ اس کی محبت تو اس قدر گہری ہے کہ آج بھی، جبکہ عرصہ سے ہل اور کرگھے نے اسے مالا مال کر رکھا ہے، یہ مجالس وضع قوانین میں شکارگاہوں اور قانون شکار ہی کا خواب دیکھتا ہے، گویا بھیڑیا اور بھیڑ، ریچھ اور شہد کی مکھی، ان کے ساتھ پہلو بہ پہلو رہ سکتے ہیں، گویا زمین پر ایک ہی وقت میں باغبانی شجر بندی، اور کمی زراعت بھی کی جا سکتی ہے اور جنگلی سور، ہرن اور خرگوش بھی پالے جا سکتے ہیں!

ہر چند کہ شہروں اور خانقاہوں کے اس اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو قریبی اضلاع پر پڑا، پھر بھی بحیثیت مجموعی جرمن زراعت مدتوں بری حالت میں رہی۔

قدیم رومانی نو آبادیوں میں شہر قائم ہو گئے، دینی اور دنیاوی امرا کے صدر مقاموں پر، خانقاہوں کے قریب، بادشاہان وقت کی مدد سے ان کی جاگیروں اور تعلقوں میں، جہاں کہیں باہم گیرو اور بحری و بری آمد و رفت کی سہولتوں نے مل کر انکے قیام کے مواقع بہم پہنچائے، اکثر صورتوں میں انہیں مقامی ضروریات کی فراہمی اور خارجی تجارت سے فروغ ہوا، خود اپنی صنعت کا ایسا وسیع نظام کہ تجارت برآمد کی ضرورتیں پوری ہو سکیں جب ہی پیدا ہو سکتا تھا کہ وسیع پیمانہ پر بھیڑیں پالی جائیں اور وسیع پیمانہ پر سن کی کاشت ہو لیکن سن کی کاشت کی شرط ہے کہ پہلے سے زراعت کا بلند معیار موجود ہو، اور بھیڑوں کے پالنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھیڑیوں اور قزاقوں سے مامون ہوں، لیکن امرا اور اشراف کے باہمی مناقشے اور

شہروں سے ان کے معرکے، امن کہاں نصیب ہونے دیتے۔ اُدھر مویشیوں پر سب سے پہلے چوروں کی نظر رہتی تھی۔ پھر امرا نے نہایت شوق سے جو وسیع جنگلات رکھ چھوڑے تھے اُس میں جنگلی جانوروں کے یک قلم مٹا دینے کا کہاں امکان تھا؟ مویشیوں کی کمی، قوانین کی ناقابلِ اطمینان حالت، ہر قسم کے سرمایہ اور آزادی کا فقدان ان لوگوں میں جن کے ہاتھ میں ہل تھا اور زراعت سے دلچسپی کا فقدان اُن میں جن کے ہاتھ میں زمین تھی، یہ سب باتیں لازم تھا کہ زراعت کو پست حالت میں رکھیں، اور اس کے ساتھ شہروں کی ترقی کو روکیں۔

ان باتوں کو نظر میں رکھتے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس سے بالکل مختلف حالات میں برابان اور فلینڈرس نے کیسے اس قدر پہلے مرفہ الحالی اور آزادی کا اتنا بلند درجہ حاصل کرلیا۔ پھر بھی، ان رکاوٹوں کے باوجود، بحرِ مشرقی اور شمالی کے جرمن شہر، ماہی گیری، جہازرانی اور بحری باربرداری کے اثر سے پہلے پھولے، "بالائی جرمانیہ" میں اور کوہستان آلپس کے دامن میں اٹلی اور یونان کے اثر سے اور ملک کی درمیانی تجارت کے باعث شہروں نے فروغ پایا۔ ادھر دریائے رہائن کے کنارے پر اور ایلب اور ڈینیوب کی وادیوں میں انگور کی کاشت اور شراب کی تجارت اور زمین کی غیر معمولی زرخیزی سے اور دریائی آمد و رفت کی سہولتوں کی وجہ سے شہروں کو ترقی ہوئی؛ اس کے لئے قرونِ وسطیٰ میں، کہ ابھی سڑکیں بہت خراب تھیں اور عام بدامنی پھیلی ہوئی تھی، یہ سہولتیں ہمارے زمانہ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھیں ؛

ان کی اصل کے اس اختلاف سے جرمن بلدی جمعیتوں کے اختلاف کی تشریح ہو جاتی ہے یعنی جمعیت ہنزا، رہائنی و سوابی، ولندیزی اور طیوٹی جمعیتوں کا اختلاف سمجھ میں آجاتا ہے ؛

تازہ تازہ آزادی کے اثر سے، جو ان شہروں میں ساری تھی، یہ ایک عرصہ تک تو اچھے مضبوط رہے لیکن ان جمعیتوں میں کمی تھی داخلی ضمانت قیام کی، ایک اصول اتحاد کی، اس سیمنٹ کی جو انہیں جوڑتا، یہ ایک دوسرے سے جدا تھے، بیچ میں امراو اشراف کی جائدادیں تھیں اور دیہات کی غیر آزاد آبادی، لہذا جب یہ زرعی آبادی بڑھی اور زیادہ خوش حال ہوئی، اور اس میں امراء کے اقتدار و تسلط کی وجہ سے ایک قسم کا اتحاد تھا ہی تو پھر ان شہروں کا زوال لازمی ہو گیا۔

یہ شہر جنہوں نے فطرتاً زراعت کی ترقی پر اثر ڈالا تھا، گویا خود اپنے فنا کے وسائل فراہم کرنے میں کوشاں تھے، سوائے اس صورت کے کہ زرعی آبادی اور اشراف کو بھی یہ جمعیت بلدی میں شامل کر لیتے لطف اس پر یہ کہ ان میں اعلیٰ سیاسی احساس اور سیاسی علم بھی تو نہ تھا، اور ان کی سیاسی نگاہ مشکل ہی سے کبھی اپنی فصیل شہر کے باہر پہنچتی تھی۔

ان جمعیتوں میں سے دو نے، یعنی سوئٹزرلینڈ اور ریاست صوبجات متحدہ، نے اس اتحاد کو واقعی پورا کیا لیکن یہ بھی کچھ غور و فکر سے نہیں، بلکہ حالات نے کچھ تو مجبور کیا کچھ مساعدت کی اور یہی وجہ ہے کہ یہ جمعیتیں آج بھی قائم ہیں جمعیت سوئٹزرلینڈ بس جرمن شاہی شہروں کا ایک مجموعہ ہے جنہیں درمیانی علاقوں کی اس آزاد آبادی نے قائم کیا اور باہم جوڑے رکھا۔

باقی جرمن شہروں کی جمعیتیں اس لئے تباہ ہو گئیں کہ انہوں نے زرعی آبادی

کو حقیر سمجھا، اور ان کی لغو و بے معنی شہری خود بلبنی و تکبیر کو بھی بات بھائی کہ بجائے اس آبادی کو ترقی دے کر ابھارنے کے اسے دبا کر اپنا محکوم رکھیں۔

ان شہروں کو اتحاد نصیب ہو سکتا تھا صرف اعلیٰ شاہی قوت سے لیکن جرمنی میں یہ قوت نوابوں کے ہاتھ میں تھی، اور ان کی خواہش یہ تھی کہ کوئی موروثی سلطنت قائم نہ ہونے پائے، تاکہ ان کے من مانے اختیارات میں کمی نہ ہو اور یہ شہروں اور چھوٹے امراء کو اپنے ماتحت رکھ سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ جرمن بادشاہوں کے پیش نظر ہمیشہ رومی شہنشاہی کا تصور رہا، یہ تو بس جب فوجوں کے سردار ہوتے تب ہی حاکم ہوتے تھے، اور جب باہر جنگ پر جانا ہوتا تھا۔ اسی وقت یہ نوابوں اور شہروں کو اپنے پرچم تلے مجتمع کر سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ یہ جرمنی میں شہری آزادی کے حامی اور اٹلی میں اس کے دشمن اور تباہ کرنے والے رہے۔ رہا یہ ان جنگی چڑھائیوں نے یہی نہیں کہ جرمن شاہی قوت کو برابر کمزور کیا بلکہ ان خاندانوں کو بھی تباہ کر ڈالا جن سے قلب قوم میں سلطنت کے اندر ایک متحدہ مضبوط قوت پیدا ہو سکتی تھی۔ خاندان ہوہن شٹاؤفن کیا تباہ ہوا کہ متحدہ قوت کا یہ مرکز ہزاروں ٹکڑوں میں منتشر ہو گیا۔

قلب قوم کو مضبوط اور مجتمع کرنے کا کام جب بالکل ناممکن معلوم ہوا تو خاندان ہابزبرگ، جو پہلے بہت کمزور اور بے مایہ تھا، اس بات پر آمادہ ہوا کہ قوم کی قوت کو کام میں لا کر سلطنت جرمنی کے جنوب و مشرقی سرحد پر خارجی قوموں کو مطیع کرے اور ایک مضبوط موروثی سلطنت کی بنا ڈالے، شمال و مشرق میں اسی طرز عمل کی نقل برانڈنبرگ کے مارکس گرافوں نے کی، اس

طرح جنوب و مشرق اور شمال و مشرق میں خارجی اقوام پر تسلط حاصل کر کے وہ موروثی شاہیاں قائم ہوئیں، اور دونوں مغربی گوشوں میں دو جمہوریتیں وجود میں آئیں، جو برابر قوم سے علیحدہ ہوتی گئیں، اور اندرونِ ملک میں قلب ملت میں انفراق، تحلیل بے بسی مسلسل ترقی کرتی گئی۔

جرمن قوم کی بدنصیبی کی تکمیل ہوئی بارود اور فن طباعت کے اختراع سے، رومی قانون کے احیاء اور مذہبی سدھار سے، اور بالآخر امریکہ کے انکشاف اور ہندوستان کے نئے راستہ کے دریافت سے! ان باتوں سے جو ذہنی جماعتی اور معاشی انقلاب پیدا ہوا اس نے جسم سلطنت میں تفریق و تحلیل پیدا کی، نوابوں میں تفریق پیدا کی، شہروں میں تفریق پیدا کی اور خود ایک شہر کے شہریوں میں اور ہر درجہ کے پڑوسیوں میں۔ قوم کی قوت اب صنعت و زراعت سے، تجارت وجہاز رانی سے، نوآبادیوں کے حصول اور اندرونی انتظامات سے، الغرض تمام اہم ترقیوں کی طرف سے ہٹ کر ادھر منتقل ہوگئی اور لوگ عقائد پر اور کلیسا کی وراثت پر باہم جھگڑنے لگے۔

اسی زمانہ میں جمعیت ہنزا اور وینس کا زوال واقع ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ جرمنی کی ملکی تجارت اور شمال و جنوب دونوں میں جرمن شہروں کی قوت و آزادی سب کا زوال۔

اس کے بعد زمانہ آتا ہے جنگ سی سالہ کا اور تمام علاقوں اور شہروں کی تاخت و تاراج کا، ہالینڈ اور سوٹزرلینڈ علیحدہ ہو جاتے ہیں، اور سلطنت کے بہترین صوبوں کو فرانس

فتح کر لیتا ہے۔ پہلے ایک ایک شہر، مثلاً اسٹراسبرگ، نیورن برگ، آوگز برگ، پورے پورے انتخابی حلقوں سے طاقت میں بڑھا چڑھا رہتا تھا، لیکن اب مستقل افواج کے قیام نے انہیں بھی بالکل بے بس کر دیا۔

اگر اس انقلاب سے پہلے شہر اور شاہی قوت اپنے کو مضبوط کر لیتی اور خالص جرمن قوم کا کوئی بادشاہ مذہبی سدھار کی تحریک پر حاوی ہو جاتا، اور اس سدھار کو قوم کے اتحاد قوت اور آزادی کی خاطر تکمیل کو پہنچاتا تو جرمنی کی زراعت صنعت اور تجارت کا نشو و نما کس قدر مختلف ہوتا۔ ان ملاحظات کے سامنے معاشیات کا وہ نظریہ کیسا حقیر اور ناقابلِ عمل معلوم ہوتا ہے، جو قوموں کی مرفہ الحالی کو صرف افراد کی پیدائش دولت سے مشتق کرتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ افراد کی قوت دولت آفرینی بڑی حد تک قوم کے سیاسی اور جماعتی حالات پر منحصر ہوتی ہے۔

آئینِ روما کے اجراء نے کسی قوم پر اتنا مضر اثر نہیں ڈالا جیسا کہ جرمنوں پر۔ اس کے مضر اثرات میں سب سے مضر وہ ناقابل بیان پیچیدگیاں ہی نہ تھیں جو اس نے افراد کے شخصی حقوق اور تعلقات کے بارہ میں پیدا کر دیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ مضرات یہ تھی کہ اس نے علماء اور مفتیوں کی ایک ایسی ذات سی پیدا کر دی جو ذہنیت اور زبان دونوں میں قوم سے بالکل جدا تھی، جو قوم کو بس ایسا سمجھتی تھی جیسے محض قوانین سے ناواقفوں اور نابالغوں کو، جو معقول انسانی سمجھ کے اختیار کی بالکل منکر تھی جس نے ہر موقع پر بنانے کی جگہ چھپانے سے کام لیا، جو خود ارباب قوت پر تمام و کمال سہارا رکھتی تھی۔

اور اس لئے ہمیشہ ان ہی کی حمایت کرتی اور انہیں کے اغراض کی نمائندگی کرتی تھی، اور اس طرح ہر جگہ حریت و آزادی کی جڑوں کو کاٹ کاٹ کر کھوکھلا کرتی تھی۔ چنانچہ ۱۹ ویں صدی کے شروع تک یہ حالت نظر آتی ہے کہ ادب و لسان میں بربریت ہے، وضع قوانین، نظم و نسق اور نفاذ آئین میں بربریت ہے، زراعت میں بربریت، صنعت اور وسیع پیمانہ کی تجارت کو زوال ہے، اتحاد اور جمعیت قومی میں قوت کا فقدان ہے، اور دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہر جگہ اور ہر طرف کمزوری اور بے بسی۔

ہاں جرمنوں نے بس ایک چیز بچا لی تھی یعنی اپنی اصلی سیرت، محنت کا شوق، نظم، کفایت شعاری اور اعتدال کی محبت، تحقیق اور کاروبار میں پامردی اور استقلال، ترقی اور بہتری کی دیانتدارانہ کوشش، اور اخلاق، احتیاط اور سمجھ بوجھ کا ایک بڑا قدرتی سرمایہ۔

یہ سیرت حاکم و محکوم دونوں میں مشترک تھی۔ قومیت کے تقریباً بالکل فنا ہو چکنے کے بعد بھی ذرا امن چین ہوا تو لوگوں نے اپنے اپنے علیحدہ علیحدہ حلقوں میں چیزوں کو ذرا منظم کرنا شروع کیا، ذرا بہتری اور ترقی کی طرف قدم اٹھایا، اور شاید کہیں بھی تعلیم، تہذیب، اخلاق، مذہبیت اور علوم و فنون کی اس جوش سے سیوا نہ ہوئی ہوگی جتنی یہاں ہوئی، اور کہیں بھی استبدادی قوت نے اس قدر اعتدال کے ساتھ اور عام تربیت ذہنی، تنظیم اخلاق، رفع مضرات اور رفاہ الحال کے لئے اس سے زیادہ فائدہ مند صورت میں اپنا اثر نہیں دکھایا ہوگا۔

جرمن قومیت کی حیات ثانی کی پہلی بنیاد تو ظاہر ہے کہ خود ان حکومتوں نے رکھی، اور حکومت و نیادی کے قبضہ میں جو کلیسائی املاک آگئی تھی، اس کی آمدنی انہوں نے نہایت

دیانتداری کے ساتھ تعلیم و تدریس، علوم و فنون اور اخلاق حسنہ کی ترقی اور منافع عامہ کے لئے صرف کی۔ ان ذرائع سے انتظام ملکی میں کچھ روشنی پیدا ہوئی تعلیم و ادبیات میں روشنی ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جمہور میں عام طور پر روشن خیالی پیدا ہوئی۔ یوں گویا جرمنی کے دوسری قوموں سے بالکل جدا طور پر نشو و نما پائی ہے، بجائے اس کے کہ اوروں کی طرح پہلے مادی قوائے دولت آفریں کی ترقی ہو اور پھر اعلیٰ ذہنی نشو و نما، یہاں پہلے ذہنی تربیت ہوئی، اور زیادہ تر اسی سے مادی قوائے دولت آفریں نے نشو و نما پایا۔ چنانچہ جرمنوں کی ساری موجودہ تربیت و تعلیم بالکل نظری ہے، یہی وجہ ہے ہمارے ان بہت سے عمل سے دور اور عجیب و غریب سے صفات کی جن پر دوسری قوموں کی نظر پڑتی ہے ان کی مثال فی الحال اس شخص کی سی ہے جو پہلے اپنے اعضاء کے استعمال سے محروم کر دیا گیا ہو، اور اس نے کھڑا ہونا، اور چلنا، کھانا اور پینا، ہنسنا، رونا، پہلے نظری طور پر سیکھا ہو اور بعد کو عملی مشق کی طرف قدم اٹھائے۔ یہی وجہ ہے اس لگاؤ کی جو جرمنوں کو فلسفیانہ نظام اور عالمی تخیلات سے ہوتا ہے، جو بہ نسبت اس دنیا کے معاملات میں بار آور عمل نہ رکھتی تھی، اس نے عام تخیل میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اور کہیں بھی آدم اسمتھ اور اس کے حواریوں کے مسالک کو اس قدر حمایتی نصیب نہیں ہوتے۔ جتنے کہ جرمنی میں، اور کہیں اور لوگوں نے حضرات کیننگ اور ہسکسن کی عالمی فراخ دلی پر اس قدر اعتماد کامل نہیں کیا۔

صنعت کی پہلی ترقی کے لئے جرمنی فرمان نانٹس کی تنسیخ کا مرہون منت ہے، کہ اس

بے معنی کارروائی سے بے حساب مہاجرین جرمنی کے تقریباً تمام علاقوں میں پہنچ گئے، اور انہوں نے ہر جگہ اُون، ریشم، زیور، ٹوپیاں، شیشہ، چینی، دستانہ بنانے کی صنعت غرض طرح طرح کی صنعتیں، ہر طرف قائم کر دیں۔

حکومت کی طرف سے صنعت کے فروغ دینے کی تدبیریں سب سے پہلے آسٹریا اور پروشیا نے کیں، آسٹریا میں چارلس ششم اور میریا تھریسیا کے زمانہ میں، لیکن اس سے بھی زیادہ یوسف دوم کے عہد میں۔ اس سے قبل آسٹریا نے اپنی پروٹسٹنٹ آبادی کی یعنی اپنے سب سے محنتی شہریوں کی جلاوطنی سے بڑا نقصان اٹھایا تھا، اور یہ بھی مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ فوراً اس کے بعد آسٹریا نے روشن خیالی کی ترویج اور ذہنی تربیت کو ترقی دینے کے باب میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔ پھر بھی تامینی محاصل، بھیڑوں کے پالنے کے بہتر طریقے اور بہتر سڑکوں اور دوسرے طریقوں سے ہمت افزائی کے باعث میریا تھریسیا کے زمانہ ہی میں صنعت نے معقول ترقی کر لی تھی۔

شاہ یوسف ثانی کے زمانہ میں یہ کام زیادہ قوت کے ساتھ کیا گیا اور کامیابی بھی اس سے کہیں زیادہ نصیب ہوئی، شروع شروع میں تو ان کامیابیوں کی کچھ ایسی اہمیت نہ تھی، کیونکہ قیصر کی جیسی عادت تھی وہ اس کام میں بھی دوسری تجاویز اصلاح کی طرح نہایت تیز روی کرتا تھا، اور آسٹریا تھا اور قوموں کے مقابلہ میں ابھی بہت پیچھے، جیسا کہ بسا اوقات ہوتا ہے، یہاں بھی یہ پتہ چلا کہ کبھی کبھی اچھائی بھی ضرورت سے زیادہ کی جا سکتی ہے، اور معلوم ہوا کہ اگر محاصل تامینی کا قدرتی عمل منظور ہو اور حالات موجودہ میں

انتشار سے بچنا مقصود ہو، تو پھر محاصل شروع میں بہت زیادہ نہ ہونے چاہئیں لیکن جتنے دن یہ نظام جاری رہا اسی قدر اس کا قرین عقل ہونا ثابت ہوتا گیا، اور سچ یہ ہے کہ آسٹریا اپنی عمدہ صنعت اور پھلتی پھولتی زراعت کے لئے اسی نظام محاصل کا رہین منت ہے۔

جنگ سی سالہ کے تاخت و تاراج سے پروشیا کی صنعت کو اور تمام ممالک سے زیادہ نقصان پہنچا تھا، اس کی سب سے اہم صنعت یعنی برانڈنبرگ کے تعلقہ میں پارچہ بافی تقریباً بالکل فنا ہو گئی تھی۔ اُدھر اکثر پارچہ باف تو ہجرت کر کے سیکسنی چلے گئے، ادھر انگلستان کا مال درآمد مقامی مقابلہ کو سر نہ اٹھانے دیتا تھا۔ پروشیا کی خوش قسمتی کہ نانٹس کا فرمان منسوخ ہوا، اور فرانس اور سالزبرگ میں پروٹسٹنٹ مذہب والوں پر مظالم شروع ہوئے۔ منتخب اعظم نے بھی پہلی ہی نظر میں وہ پہچان لیا جو اس سے قبل انگلستان نے صاف صاف دیکھا تھا، اس کی تدابیر نے مہاجرین میں سے اکثر کے قدم پروشیا کی طرف پھیر دئے، انہوں نے اس ملک کی زراعت کو زرخیز بنایا، بہت سی صنعتوں کو ابھارا اور علوم و فنون کو ترقی دی، اس بادشاہ کے جانشین سب کے سب اس کے نقش قدم پر چلے اور سب سے زیادہ تن دہی کے ساتھ وہ شہنشاہِ اعظم جو میدان جنگ کی کامیابیوں سے زیادہ زمانہ امن کی حکمت عملی میں بڑا تھا۔ یہاں ان بے تعداد تدابیر کے ذکر کا موقع نہیں ہے جن سے فریڈرک ثانی نے پردیسی کسانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ملک میں کھینچ بلائی، بنجر زمین کو قابل برداشت بنایا، چراگاہیں بنوائیں، چارہ، ترکاریاں، آلو اور تمباکو کی کاشت شروع کرائی، ترقی یافتہ طریقوں سے بھیڑیں، مویشی، گھوڑے پالنا اور معدنی کھاد دینا جاری کرایا اور کاشتکاروں

کے لیے سرمایہ اور اعتبار کا انتظام کیا، پھر ان بلاواسطہ طریقوں سے اس نے زراعت کی ترقی کے لئے جو کچھ کیا اس سے بھی زیادہ بالواسطہ طریقوں سے کیا، یعنی صنعت کے ذریعہ کہ اس کے ترتیب دادہ نظام محاصل، ذرائع آمدورفت کی ترقی اور اس کے جاری کئے ہوئے بینک کی وجہ سے صنعت نے جتنی ترقی پروشیا کے علاقہ میں کی اور کسی جرمن علاقہ میں کی اور کسی جرمن علاقہ میں نہ کی تھی، حالانکہ اس علاقہ کا جغرافیائی موقع اور اس کا ایک دوسرے سے جدا جدا مختلف صوبوں میں منقسم ہونا ان کارروائیوں کے لئے اور جگہوں کے مقابلہ میں کچھ کم ہی موافق تھا، پھر اندرونی حدود جنگی کا یہ نقصان کہ تجارت ممنوعہ بڑھتی ہے، یہاں ان بڑی حکومتوں سے زیادہ ظاہر ہوتا چاہیئے تھا جن کا علاقہ سب یکجا ہوتا ہے اور جو سمندر، دریا، یا سلسلہ کوہ کے قدرتی حدود سے مامون و محفوظ ہوتی ہیں۔

لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس تعریف کے پردہ میں اس نظام کی غلطیوں کی توجیہ کریں مثلاً اجناس خام پر پابندیاں، لیکن باوجود ان غلطیوں کے کوئی روشن خیال اور غیر جانبدار مورخ اس سے انکار نہ کریگا کہ اس کی وجہ سے صنعت کو معتدبہ ترقی حاصل ہوئی۔ ہر غیر متعصب ذہن کے لیے جو چھوٹے نظریوں کے دھندلکے میں نہ گھرا ہو یہ بات صاف ہو گی کہ پروشیا جو اس قابل ہوا کہ دول یورپ کے حلقہ میں جگہ پائے تو یہ کچھ فتوحات کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ زراعت، صنعت، تجارت کو فروغ دینے کی دانش مندانہ تدابیر اور علوم و فنون میں ترقی کے باعث تھا، اور یہ سب کچھ کام تھا ایک تنہا بڑے دماغ کا۔

اس پر لطف یہ کہ ابھی تک تاج شاہی کا سہارا آزاد قومی ادارے نہ تھے، بلکہ محض ایک

نظامِ حکومت، جو ہر چند نہایت منتظم اور دیانتدار بھی، مگر ظاہر ہے کہ ایک مردہ دفتریت کے جال میں گرفتار تھا۔

اُدھر صدیوں سے جرمنی کے باقی علاقے آزاد تجارت کے زیرِ اثر تھے یعنی ساری دنیا آزاد تھی، کہ جرمنی میں اپنا صنعتی مال بھیجے، اور کوئی اس پر راضی نہ تھا کہ جرمن مصنوعات کی درآمد اس کے یہاں ہو، اس کلیہ کے مستثنیات بھی ضرور رہتے لیکن کم، اور بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ آزاد تجارت کے فوائد کے متعلق مذہبِ رائج کی جو پیش گوئیاں ہیں اور جو وعدے ہیں اُن کی تصدیق اِن علاقوں کے تجربہ سے ہوتی ہے، ہر جگہ حالات کا رخ پیچھے ہی تھا آگے کہیں نہیں تھا۔ آوگز برگ، نیورنبرگ، ہنس اکولون وغیرہ شہروں میں اپنی پہلی آبادی کا بس تہائی یا چوتھائی حصہ باقی تھا، اور اکثر یہ ہوتا تھا کہ محض بے قیمت فاضل پیداوار سے پیچھا چھڑانے کے لئے لوگ جنگوں کی تمنا کیا کرتے تھے تمنا پوری ہوئی، انقلاب فرانس کے سلسلہ میں یہ جنگیں آئیں اور ان کے ساتھ ساتھ انگریزی امدادی رقوم اور انگلستان کا پہلے سے بڑھ کر تجارتی مقابلہ بھی آیا اور اگرچہ ایک طرف محض عارضی اور ظاہری زراعت کی خوش حالی بڑھی لیکن صنعت کو زوال ہی ہوا۔

اس کے بعد نپولین نے برِ اعظم کی ناکہ بندی کی۔ یہ واقعہ جرمن اور فرانسیسی صنعت کی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز تھا۔ ہر چند کہ آدم اسمتھ کے مشہور شاگرد موسیو جے بے سے اسے آفت ہی سے کیوں نہ تعبیر کریں۔ اور علما نظری اور خصوصاً انگریز اس کے خلاف جو چاہیں کہیں، یہ بات صاف ہے، داد جرمن صنعت کے سب جاننے والوں کو اس کی

تصدیق کرنی پڑے گی، کیونکہ اس زمانہ کے متعلق جتنے اعداد و شمار ہیں ان میں اس کی شہادت ملتی ہے) کہ اسی ناکہ بندی کے سبب جرمن صنعت کی ہر شاخ نے ترقی کرنا شروع کی۔ بھیڑوں کے پالنے میں جو ترقیاں پہلے شروع کی گئی تھیں، وہ بھی اب جا کر چل نکلیں اور ذرائع آمد و رفت کو ترقی دینے کی کوشش بھی اسی زمانہ میں شروع ہوئی۔ دوسری طرف یہ بات بھی ضرور سچ ہے کہ جرمنی کی تجارت برآمد کا بڑا حصہ ہاتھ سے جاتا رہا خصوصاً کپڑے کی تجارت کا، لیکن فائدہ نقصان سے کہیں زیادہ تھا خصوصاً پروشیا اور آسٹریا کے کارخانوں کے لئے، جو پہلے ہی دوسرے جرمن علاقوں کے کارخانوں سے آگے بڑھ چکے تھے۔

لیکن قیام امن کے ساتھ ہی انگریزی صناعوں نے پھر جرمنوں سے سخت مقابلہ شروع کر دیا۔ دو طرفہ ناکہ بندی کے زمانہ میں بہت سی نئی اختراعیں کر کے اور دوسرے ممالک سے کم و بیش بلا شرکت غیرے برآمدی تجارت کے باعث اس جزیرہ کی صنعت جرمن صنعت سے بہت آگے بڑھ گئی تھی، اس وجہ سے اور نیز اپنے سرمایہ کی بنا پر یہ اس قابل ہو گئے تھے کہ کم داموں پر چیزیں بیچیں، بہت بہتر مال مہیا کریں اور ان سے کہیں زیادہ طویل عرصہ کے لئے مال ادھار دے سکیں، کیونکہ انہیں (جرمنوں کو) تو ابھی آغاز کار دشواریوں سے دوچار ہونا تھا۔ چنانچہ ان پر عام تباہی آئی اور سخت شور مچا، خاص کر نشیبی رہائن کے علاقہ میں ان مقامات پر جو پہلے فرانس کے قبضہ میں تھے، اور اب فرانسیسی بازار بھی ان غریبوں کے لئے بند ہو چکا تھا۔ خود پروشیا کے نظام محاصل میں آزادی تجارت کے خیال کے اثر سے بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں، اور انگریزی مقابلہ کے خلاف اب اس

نظام سے جرمن صنعت کی کافی تامین نہ ہو سکتی تھی۔ پروشیا کی دفتری حکومت نے بھی عرصہ تک ان کی فریاد پر کان نہ دھرا، اور کیسے دھرتی، ان کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں آدم اسمتھ کا مسلک اس طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ جلدی سے ضرورت وقت کا پہچان لینا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا، بلکہ اس زمانہ میں تو جرمنی میں ایسے معاشی بھی موجود تھے جو مذہب طبیعیین کے مردہ نظام کو دوبارہ زندہ کرنے کا خیال خام رکھتے تھے، لیکن یہاں بھی واقعات نظریات سے زیادہ قوی ثابت ہوئے۔ صناعوں کی صدائے مصیبت چونکہ ایسے علاقہ سے اٹھی تھی جو ابھی تک فرانس کے ساتھ اپنے سابقہ تعلقات قائم کرنے کا آرزومند تھا، اور جس کو اپنی طرف مائل کرنا مستحق سعی تھا، اس لئے زیادہ عرصہ تک کان بند نہ کیے جا سکتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ خیال بہت پھیل گیا تھا کہ انگریزی حکومت براعظم کی منڈیوں میں اپنے مال کی بھرمار کی غیر معمولی تدابیر کر رہی ہے تاکہ یہاں کی صنعتوں کا گلا پالنے ہی میں گھونٹ دے۔ ہرچند کہ اس خیال کا لوگوں نے مذاق اڑایا ہے، لیکن اس کا پھیلنا قدرتی بات تھی۔ اوّل تو اس لئے کہ انگریزی مال کی یہ بھرمار کچھ اس قسم کی تھی۔ گویا واقعی اسی غرض سے ہے، دوسرے اس لئے کہ پارلیمنٹ کے ایک رکن مسٹر ہنری بروہم نے (جواب لارڈ بروہم ہیں) ۱۸۱۵ء میں سوکھے منہ سے پارلیمنٹ کے سامنے یہ کہا تھا کہ "اس میں چنداں ہرج نہیں کہ انگریزی مصنوعات کی برآمد پر اس لئے نقصان اٹھا لیا جائے کہ ہم پردیسی صنعتوں کا گلا پالنے ہی میں گھونٹ دیں[1]"

[1] Report of the Committee of Commerce and Manufactures of the House of Representatives of the Congress of the United States. February 13, 1816.

اس لارڈ کے خیال کو، جو بعد میں محب انسانیت محب عالم اور لبرل کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہوا، ۱۰ سال بعد ایک اور رکن پارلیمنٹ نے، جو اپنے لبرل عقائد کے لیئے اس سے کم ممتاز نہ تھا، یعنی ہیوم نے تقریباً انہیں الفاظ میں دہرایا، اس نے بھی یہی خواہش ظاہر کی کہ برِاعظم کے کارخانوں کو کلیوں کی صورت ہی میں توڑ لیا جائے۔"

انجام کار لوگوں نے برِوشیا کے صناعوں کی فریاد سنی، اگرچہ بہت دیر میں خصوصاً جب یہ خیال کیجیئے کہ سالہا سال موت سے مقابلہ کرنا کتنا تکلیف دہ ثابت ہوا ہوگا لیکن جب یہ فریاد سنی گئی تو خوب سنی گئی ۱۸۱۸ء کا نظام محاصل اپنے زمانہ نفاذ کے اعتبار سے پروشیا کی صنعت کی تمام ضروریات کے عین مطابق تھا، اس نے نہ تو اصول تامین کو حد سے زیادہ بڑھایا تھا، نہ یہ دوسرے ملکوں سے مفید کاروبار میں حائل ہوتا تھا شرح محاصل انگریزی اور فرانسیسی نظام محاصل سے بہت کم تھی اور یہی ہونا چاہیئے بھی تھا، اس لیئے کہ یہاں امتناعی نظام کو رفتہ رفتہ تامینی بنانے کا سوال تو تھا نہیں، بلکہ نام نہاد آزاد تجارت کو تامینی طریق میں تبدیل کرنا تھا اس نظام محاصل کی، بہ حیثیت مجموعی، ایک اور خوبی یہ بھی تھی کہ محصول اکثر چیزوں کے وزن پر لگایا جاتا تھا نہ کہ قیمت پر، اس طرح چوری چھپے کی تجارت اور جان بوجھ کر قیمت کا کم تخمینہ بتلانا بھی رک گیا اور یہ بڑا مقصد بھی پورا ہو گیا کہ محصول تامین کا بار سب سے زیادہ عام استعمال کی چیزوں پر پڑنے لگا جنہیں ہر ملک فوراً آسانی سے تیار کر سکتا ہے اور جن کا خود تیار کرنا، ان کی مجموعی قیمت کے اعتبار سے ہر ملک کے لیئے نہایت اہم بھی ہے؛ اور نفیس اور قیمتی چیزوں پر جن کے بنانے

میں دشواریاں ہوتی ہیں اور جنہیں چوری چھپے لے جانے کو جی بھی چاہتا ہے اور ایسا کرنا ممکن بھی ہوتا ہے، ان پر محصولوں کا بار سب سے کم رہا۔

لیکن ظاہر ہے کہ محاصل کا وزن کے مطابق ہونا پردیسی ریاستوں سے زیادہ خود ہمسایہ جرمن ریاستوں کو کھلا، ان منجھولی اور چھوٹی جرمن ریاستوں کو آسٹریا، فرانسیسی اور انگریزی منڈیوں کے بند ہونے سے تو جو نقصان تھا سو تھا ہی اب پروشیا کی منڈیاں بھی تقریباً بالکل بند ہو گئیں اور اس کا اثر ان پر اس لئے اور بھی زیادہ ہوا کہ ان میں سے اکثر یا تو بالکل یا زیادہ تر پروشیا کے علاقہ سے گھری ہوئی تھیں۔

اس تدبیر سے پروشیا کے کارخانوں کو تو بہت اطمینان ہو گیا مگر دوسری جرمن ریاستوں کے کارخانوں پر مصیبت ٹوٹ پڑی ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ ہی دن پہلے آسٹریا نے اٹلی میں جرمن مصنوعات کی اور خصوصاً بالائی سدیتیا کے کپڑے کی درآمد میں دشواریاں پیدا کر دی تھیں ہر طرف سے بند، صرف اپنے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں اپنا مال بیچنے پر مجبور، اور ایک دوسرے سے یوں چنگی اور محاصل کی دیواروں سے جدا، ان بیچارہ کارخانہ والوں پر ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

اسی اشد ضرورت نے ۵ یا ۶ ہزار جرمن کارخانہ والوں اور تاجروں کی وہ انجمن بنوا دی جو ۱۸۱۹ء میں فرانکفرٹ (ریزمین) کے موسم بہار والے میلہ کے موقع پر قائم ہوئی اس غرض سے کہ مختلف جرمن ریاستوں کے جدا جدا محاصل بند کرا کے ان کی جگہ کل جرمنی کے لئے ایک مشترکہ تجارتی و محاصلی نظام قائم کرائے۔

اس جمعیت نے اپنے لئے ایک باضابطہ نظام ترتیب دیا۔ جمعیت کے مقاصد جرمن مجلس شوریٰ کے اور تمام ریاستوں کے بادشاہوں اور حکومتوں کے سامنے عمل کی غرض سے پیش کئے گئے۔ ہر جرمن شہر میں ایک مقامی نمائندہ اور ہر ریاست میں ایک صوبہ کا نمائندہ منتخب کیا گیا۔ جمعیت کے تمام اراکین اور تمام نمائندوں نے اپنے اوپر یہ فرض عائد کیا کہ حتی الوسع مقاصد جمعیت کے حصول کے لئے کوشش کریں۔ شہر نیورنبرگ جمعیت کا مرکزی مقام مقرر ہوا اور اسے مجاز کیا گیا کہ ایک مرکزی کمیٹی کا انتخاب کرکے ایک "مشیر" کے زیر ہدایت (جس کام کے لئے اس کتاب کے مصنف کو نامزد کیا گیا) جمعیت کی تمام کارروائی انجام دے۔

جمعیت کے ہفتہ وار پرچہ موسومہ بہ "Organ des deutschen Handels und Fabrikau tenstandes"[1]، میں مرکزی کمیٹی کی تمام کارروائی شائع کی جاتی، اور مقاصد جمعیت سے متعلق خیالات، تجاویز، مقالے اور اعداد وشمار درج کئے جاتے تھے۔ موسم بہار کے میلے کے موقع پر فرانکفرٹ میں جمعیت کا عام جلسہ ہوتا اور اس میں مرکزی کمیٹی اپنی روئداد پیش کرتی تھی۔

اس جمعیت نے پہلے تو جرمن مجلس شوریٰ کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی جس میں اپنی تجاویز کی ضرورت اور مصلحت بتلائی، اور اس کے بعد مرکزی کمیٹی نے اپنا کام شروع کردیا۔

تمام جرمن درباروں کو اور ویئنا کی مجلس وزراء (منعقدہ سنہ ۱۸۲۰ء) کو وفود بھیجے

---

[1] یعنے جرمن طبقہ تجار و اہل حرفہ کا آرگن

گئے، اس مجلس وزراء میں کم سے کم یہ نتیجہ تو نکلا کہ کئی چھوٹی اور منجھولی ریاستیں اس پر رضامند ہوگئیں کہ اس معاملہ کے متعلق ڈارمشٹاٹ میں ایک علیحدہ مجلس منعقد کریں۔ اس مجلس کے غور و فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو ورٹمبرگ اور بویریا میں، پھر پروشیا میں اور بعض اور جرمن ریاستوں میں، اس کے بعد وسطی جرمن ریاستوں میں، اتحاد قائم ہوئے اور آخر میں خاص فرائی حصر فان کوٹا کی کوشش سے یہ تینوں اتحاد ایک عام اتحادِ محاصل تجارتی میں شامل ہوگئے، چنانچہ اس وقت آسٹریا، دونوں میکلنبرگ، ہنوور اور ہنزا شہروں کو چھوڑ کر سارا جرمنی ایک اتحاد محاصلی میں شامل ہے سب نے اپنے اندرونی حدود محاصل کو اٹھا دیا ہے، اور سب پردیسیوں کے لئے ایک مشترک نظام محاصل مقرر کر کے اس سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ باعتبار آبادی متفرق ریاستوں میں تقسیم کر لیتے ہیں، اس اتحاد کی شرحِ محاصل عملاً وہی ۱۸۱۸ء کی پروشیا والی شرح ہے یعنی معتدل تامینی محصول اور اس اتحاد کے سبب سے متحدہ ریاستوں کی تجارت صنعت اور زراعت نے بے حساب ترقی کر لی ہے۔

باب (۸)

روسی

روس تمدن اور صنعت میں اپنی پہلی ترقی کے لئے یونان کے روابط کا مرہون منت ہے، پھر نووگروڈ اور ہنزا شہروں کی باہمی تجارت کا، اور جب نووگروڈ کو ایوان واصل بیوچے نے برباد کر ڈالا اور بحر ابیض کے ساحل تک بحری راستہ دریافت ہو گیا تو پھر انگریزوں اور ولندیزیوں سے جو تجارت شروع ہوئی، اس کا۔

لیکن اس کی صنعت کی بڑی توسیع اور اس کی ساری تہذیب و تمدن کی ترقی پیٹر اعظم کے دور حکومت سے شروع ہوئی ہے۔ پچھلے ایک سو چالیس برس میں روسی تاریخ اس عظیم بالشان اثر کا نہایت ہی بین ثبوت ہے جو اتحاد قومی اور حالات سیاسی سے قوم کی معاشی مرفہ الحالی پر مترتب ہوتا ہے۔

یہ اسی شاہی اقتدار کا طفیل ہے کہ ان لاتعداد غیر مہذب گلوں کا یہ متحدہ مجموعہ قائم ہو گیا اور برقرار رہا؛ روس نے اپنی صنعت کی بنیادیں استوار کر لیں؛ زراعت اور آبادی کے مقابلہ میں خوب ترقی کر لی، نہریں اور سڑکیں بنا کر اندرونی آمد و رفت کی سہولتیں فراہم کر لیں؛ بہت بڑی تجارت خارجہ قائم کر لی اور تجارتی انعامات میں اپنی

ایک حیثیت بنالی۔

لیکن پھر بھی روس کا اپنا نظام تجارتی ۱۸۲۱ء ہی سے شروع ہوتا ہے۔ ملکہ کیتھرین دوم نے اپنے عہدِ حکومت میں پردیسی صناعوں اور اہلِ حرفہ کو جو مراعات بخشیں ان سے تجارت اور صنعت نے ضرور ترقی کی تھی، لیکن ملک عام تمدنی اعتبار سے ابھی اس قدر پیچھے تھا کہ کپڑے، لوہے، شیشہ وغیرہ کی صنعت میں یا ان تمام صنعتوں میں جن میں کہ اسے اپنی زرعی اور معدنی دولت کی وجہ سے خاص مواقع حاصل تھے۔ بالکل ابتدائی مراحل سے آگے قدم بڑھانا مشکل ہی تھا۔

علاوہ بریں صنعت کی مزید ترقی اس زمانہ میں قوم کے معاشی اغراض کے موافق بھی نہ ہوتی۔ اگر باہر کی قومیں روس سے بجائے نقد کے پیداوار زرعی، اجناس خام اور وہ موٹا جھوٹا مال قبول کر لیتیں جو یہ بھیج سکتا تھا اور اگر جنگیں اور دوسرے خارجی موانعات حائل نہ ہو جاتے تو روس اپنے سے زیادہ متمدن اقوام سے رابطہ رکھ کر بہت زیادہ مرفہ الحال ہو جاتا، اور عام طور پر اس رابطہ کے باعث اس کی تہذیب کو اس سے زیادہ ترقی ہوتی ہوتی جتنی کہ نظام صنعتی کے ماتحت ہوئی۔ لیکن جنگوں اور بر اعظم کی ناکہ بندی نے نیز دوسری قوموں کے تجارتی قواعد نے اسے مجبور کیا کہ بہ خوشحالی کی اس راہ کے بجائے کہ اجناس خام باہر بھیجکر مصنوعات ملک میں منگائے کوئی دوسری راہ اختیار کرے۔ انہی وجوہ سے روس کے سابقہ بحری تجارتی تعلقات ختم ہو گئے، مغربی براعظم سے، خشکی کے راستہ، جو تعلق تھا اس سے اس نقصان کی تلافی ممکن نہ تھی، چنانچہ روس نے

ضرورت محسوس کی کہ اپنے اجناس خام کو خود ہی کام میں لائے۔

امن عام کے قیام کے بعد یہ خواہش پیدا ہوئی کہ پھر پرانا طریق قائم ہو جائے حکومت وقت اور خود بادشاہ آزاد تجارت کے حامی تھے، اسٹورچ صاحب کی تصانیف کی شہرت روس میں اس سے کچھ کم نہ تھی جتنی موسیو سے، کی تصانیف کی جرمنی میں ! ناکہ بندی کے زمانہ میں جو کارخانے قائم ہو گئے تھے وہ جب انگریزی منفا بلہ کے باعث نقصان اٹھانے لگے تو اس نقصان کے اولیں صدموں سے لوگوں کو تعجب تک نہ ہوا علمائے نظری کہتے تھے کہ یہ ابتدائی صدمے گذر جائیں تو تجارت آزاد کی برکتیں تو پھر اپنے آپ آئیں گی اور سچ تو یہ ہے کہ تجارتی دنیا کی حالت اس زمانہ میں اس تغیر کے لئے نہایت مناسب تھی۔ مغربی یورپ میں فصلیں ماری گئی تھیں اور اس کی وجہ سے زرعی پیداوار کی برآمد بہت ہوئی تھی، لہٰذا روس کو عرصہ دراز تک مصنوعات کی درآمد کے توازن کے لئے کافی وسائل ملتے رہے۔

لیکن جب روسی زرعی پیداوار کی یہ غیر معمولی مانگ ختم ہو گئی اور دوسری طرف انگلستان نے اپنے امراء کی خاطر درآمد غلہ پر اور کینیڈا کی خاطر لکڑی کی درآمد پر پابندیاں عائد کیں، تب ملک کے کارخانوں اور صنعت کی تباہی اور بیرونی مصنوعات کی بہت زیادہ درآمد کا اثر دوہرا محسوس ہونے لگا۔ پہلے جو لوگ اسٹورچ صاحب کی ہمنوائی میں توازن تجارت کو ایک خیالی ہوا گردانتے تھے جس کے وجود پر یقین رکھنا ایک سمجھدار اور روشن خیال آدمی کے لئے اس سے کچھ کم و جہ

ملامت اور مضحکہ خیز نہ تھا، جتنا کہ سترھویں صدی میں چڑیلوں پر عقیدہ رکھنا، ان لوگوں نے اب نہایت ہی صدمہ کے ساتھ دیکھا کہ خود مختار قوموں کے مابین توازن تجارت جیسی بھی کوئی چیز ہونی چاہیئے۔ روس کے سب سے روشن خیال اور صاحب بصیرت مدبر کاؤنٹ نسل رُوڈ کو اس عقیدہ کے اعلان میں ذرا جھجک نہ ہوئی، ایک سرکاری گشتی مؤرخہ ۱۸۲۱ء میں وہ لکھتا ہے کہ "حالات نے روس کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنا خود مختار نظام تجارتی اختیار کرے، ملک کی پیداوار کے لیے باہر کہیں کھپت نہیں۔ اندرون ملک میں یا تو کارخانے تباہ ہو گئے ہیں یا تباہی کے قریب ہیں، ملک کا سارا نقد زر پردیس کو بہا چلا جا رہا ہے اور موقر سے موقر تجارتی کاروبار تباہی کے قریب آن لگے ہیں" روسی نظام تامینی کے مفید اثرات، اور تجارت آزاد کے اجراء کے مضر نتائج دونوں نے علماء نظری کے دعاوی اور اصول سے بے اعتباری پیدا کی، بدیسی سرمایہ، صلاحیت اور محنت متمدن ممالک سے، خصوصاً انگلستان اور جرمنی سے، ملک میں آنا شروع ہوئی تاکہ ان فوائد میں شریک ہو سکے جو داخلی صنعت کو حاصل ہیں، طبقۂ امراء نے بھی سیاست ملکی کی نقالی کی، چونکہ زرعی پیداوار کے لئے باہر منڈی نہ ملتی تھی، لہٰذا اس نے کوشش کی کہ معاملہ کو بالکل پلٹ کر یہ کوشش کرے کہ منڈی ہی کو پیداوار کے پاس لے آئے، چنانچہ امراء نے اپنی جائدادوں پر کارخانے کھڑے کر دیئے۔ اُن کے نئے کارخانوں کے قیام سے جو باریک اُون کی مانگ بڑھی تو اس سے اس ملک میں بھیڑ پالنے کا کام بھی بہت ترقی پا گیا، ممالک خارجہ

سے تجارت گھٹنے کے بجائے بڑھنے لگی خصوصاً ایران چین اور دوسرے قریب کے ایشیائی ممالک سے تجارت کی کساد بازاری بالکل ختم ہوگئی اور روسی وزارت تجارتی کی جدید ترین رپورٹوں کو پڑھئے تو یقین ہوجائے گا کہ روسی اپنی خوشحالی کے موجودہ مدارج اعلیٰ کے لئے اسی نظام کا رہون منت ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنی دولتِ قومی اور قوت کے اضافہ کی طرف گامزن ہے، یہ محض حماقت ہے اگر جرمنی میں لوگ اس ترقی کو چھوٹا کرکے دکھائیں، اور اس سے جرمنی کے شمال مشرقی صوبوں کو جو نقصان پہنچے ہیں، بس ان پر شکوہ و گلہ کرتے رہیں، افراد کی طرح ہر قوم کو بھی اپنے ہی اغراض سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں، یہ روس کا کام نہیں ہے کہ جرمنی کی خوشحالی کی تدابیر اختیار کرے جرمنی کی فکر جرمنی کو کرنی چاہئے اور روس کو روس کی بجائے شکایت کرنے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور آزاد تجارت کے مسیح موعود کا انتظار کرنے کے، یہ سب بہتر ہوکہ اس تمام عالم پر حاوی نظامِ نظری کو بھاڑ میں جھونک کر روس کی مثال سے سبق حاصل کیا جائے۔

یہ بات کہ انگلستان روس کی اس سیاست تجارتی کو رقابت کی نظر سے دیکھتا ہے بالکل فطری ہے، اسی کے ذریعے تو روس نے اپنے کو انگلستان سے نجات دلائی ہے۔ اور اسی نے تو روس کو اس قابل بنایا ہے کہ انگلستان سے ایشیا میں مقابلہ کرسکے۔ اگر انگلستان سستا بھی پیدا کرے تو بھی اس کے مقابلہ میں یہ بات ہے کہ روس ان ممالک سے قریب ہے اور وہاں سیاسی اثر رکھتا ہے، مانا کہ یورپ کے مقابلہ میں روس ایک کم

متمدن ملک سہی، پھر بھی ایشیا کے مقابلہ میں ضرور متمدن ہے۔

تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تہذیب و تمدن کی کمی اور سیاسی اداروں کا فقدان روس کی آئندہ تجارتی اور صنعتی ترقی میں بہت حائل ہوگا، خصوصاً اگر حکومت شاہی اس میں کامیاب نہ ہوئی کہ حالات عامہ کو یوں ضروریات صنعت سے ہم آہنگ کر دے کہ عمدہ بلدی اور صوبہ وار دستور قائم کرے، غلامی کو رفتہ رفتہ کم کر کے بالآخر اسے بالکل منسوخ کر دے، ایک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ اور ایک آزاد کسانوں کا طبقہ تیار کرے اور خود اندرون ملک میں نیز وسط ایشیا کے ممالک سے ذرائع آمد و رفت کی تکمیل کرے۔ یہ ہیں وہ فتوحات جو روس کو موجودہ صدی میں کرنی ہیں، اور ان پر منحصر ہے صنعت و زراعت تجارت و جہازرانی اور بحری قوت میں اس کی آئندہ ترقی۔ لیکن اصلاحات کے ممکن بنانے کے لیے سب سے پہلی بات یہ ضروری ہے کہ روسی طبقہ امراء یہ محسوس کرنے لگے کہ ان اصلاحات سے خود اس کے مادی اغراض اور سب سے زیادہ پورے ہوں گے۔

باب ۹

شمالی امریکہ

ہم یورپی اقوام کی سیاست تجارتی پر تو تاریخی نظر ڈال چکے، سوائے ان کے جن سے کچھ زیادہ سبق حاصل نہیں ہو سکتا، اب ذرا اپنی نگاہ بحر اٹلانٹک کے پار ایک نوآباد خلقت پر ڈالیں، جس کی زندگی ابھی ہمارے سامنے تمام و کمال مادری قوم پر منحصر تھی، اور بہت سے جدا جدا نوآباد صدیوں کی سی حیثیت رکھتی تھی جن میں کوئی باہمی سیاسی تعلق نہ تھا، اور اب وہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک متحد منظم، آزاد، طاقتور، محنتی، دولتمند اور خودمختار قوم کی شکل اختیار کر رہی ہے اور شاید ہمارے پوتوں کے زمانہ میں دنیا کی سب سے اول بحری اور تجارتی قوت ہو جائے گی، ہمارے مقصد کے لئے کسی ملک کی تجارتی و صنعتی تاریخ اتنی سبق آموز نہیں ہے جتنی کہ شمالی امریکہ کی، اس لئے کہ یہاں رفتار ترقی تیز ہے، آزاد اور پابند تجارت کے عہد قریب قریب ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اور ان کے نتائج صاف اور بین طور پر سامنے آ جاتے ہیں، اور قومی صنعت اور نظام حکومت کے سارے کل پرزے دیکھنے والے کی آنکھوں کے سامنے حرکت کرتے ہیں۔

صنعت اور تجارت کے معاملہ میں شمالی امریکہ کی نوآبادیوں کو مادری قوم نے اس درجہ غلامی کی حالت میں رکھا تھا کہ انہیں سوائے گھریلو ساز و سامان بنانے اور معمولی دستکاریوں کے کسی اور قسم کی صنعت کی اجازت نہ تھی۔ ۱۷۵۰ء میں ریاست میساچوسٹ میں جو ایک ٹوپیوں کا کارخانہ قائم ہوا تو پارلیمنٹ کی توجہ اور رقابت کو اس درجہ حرکت ہوئی کہ اس نے ہر قسم کے کارخانوں کو جس میں لوہے کے کارخانے بھی شامل تھے، زحمت عام قرار دے دیا، حالانکہ ملک میں لوہے کی تیاری کی تمام ضروریات بہ افراط موجود تھیں، اس کے بعد یعنی ۱۷۷۰ء میں مشہور مدبر چیتھم نے امریکیوں کی پہلی صنعتی کوشش سے بے چین ہو کر یہ اعلان کیا (جس کے باور کرنے میں بھی تامل ہوتا ہے) کہ نوآبادیوں کو گھوڑے کے نال کی ایک کیل تک بنانے کی اجازت نہ ہونی چاہئیے!

اس سیاسی طرز عمل کی بے انصافی کی طرف سب سے پہلے متوجہ کرنے کا سہرا آدم اسمتھ کے سر ہے۔ امریکن انقلاب کا خاص سبب تمام صنعت پر مادری ملک کا یہی اجارہ تھا۔ چار کے محصول سے تو لبس پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ صنعت کے لئے تمام مادی وسائل پہلے سے موجود ہی تھے، لہٰذا جب ان پابندیوں سے رہائی ملی اور اس قوم سے پیچھا چھوٹا جو انہیں مصنوعات مہیا کرتی اور جس کے ہاتھ یہ اپنی زرعی پیداوار بیچتے تھے اور یوں تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جب اپنی ہی قوت پر بھروسا کرنا پڑا، تو جنگ انقلابی کے دوران میں ہر طرح کی صنعت نے شمالی امریکہ میں ترقی کی، اور اس کا اثر زراعت پر اتنا اچھا پڑا کہ باوجود جنگ کی بربادی اور تاخت کے ہر جگہ زمین کی قیمت

اور محنت کی اجرت میں معتدبہ اضافہ ہؤا لیکن صلح پیرس کے بعد ان آزاد ریاستوں کا جو دستور اساسی بنا اس میں ایک متحدہ نظام تجارتی کا امکان نہ تھا۔ چنانچہ انگریزی مصنوعات پھر بے روک ٹوک آنے لگیں جن کے مقابلہ کی تاب شمالی امریکہ کے ٹٹے کارخانے نہ لا سکتے تھے، لہٰذا زمانہ جنگ میں جو مرفہ الحالی تیزی کے ساتھ پیدا ہوگئی تھی وہ اب اس سے زیادہ سرعت سے غائب ہوگئی۔ اس تجارتی کسادبازاری کے متعلق کانگریس کے ایک مقرر نے بعد میں کہا کہ "نئے علماء نظری کے مشورہ کے مطابق ہم وہاں خریدتے تھے جہاں سب سے سستا مال ملتا تھا، لہٰذا ہماری منڈیاں پردیسی مال سے پٹ گئیں، لوگ انگریزی مصنوعات ہمارے بندرگاہوں میں لیورپول اور لنڈن سے سستی خریدتے تھے، ہمارے صناع تباہ ہوگئے، ہمارے تاجر جن میں وہ بھی شامل ہیں جو درآمد مصنوعات سے سمجھتے تھے کہ مالامال ہو جائیں گے سب کے سب دیوالیہ ہوگئے اور ان سب اسباب نے مل کر زراعت پر ایسا مضر اثر ڈالا کہ عام طور پر زمین کی بے قدری ہوگئی، جس کی وجہ سے اکثر مالکان زمین کا بھی دیوالہ نکل گیا" اور یہ حالت کچھ عارضی نہ تھی بلکہ صلح پیرس سے لے کر وفاقی دستور اساسی کے قیام تک برابر جاری رہی اور تمام دوسرے اسباب سے زیادہ اسی وجہ سے ان آزاد ریاستوں نے اپنے اتحاد سیاسی کو بہت مضبوط بنایا، اور کانگریس کو ایک مشترکہ تجارتی سیاست کے جاری کرنے کے لئے کافی اختیارات بخشے۔

تمام ریاستوں سے جن میں نیویارک اور جنوبی کرولینا بھی شامل تھیں، کانگریس

کے نام تامین صنعت کے لیے درخواستوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی، اپنی کرسی نشینی
کے دن واشنگٹن سودیشی کپڑے کا لباس پہنے تھا تاکہ بقول ایک نیویارک کے ایک معاصر
جریدہ کے "اس سادہ اور موثر طریقہ سے، جو اس بڑے انسان کا شیوہ ہے، یہ اس
عہدہ پر پہنچنے کے بعد تمام آنے والوں کو اور آئندہ واضعان قوانین کو اس بات کا ناقابل
فراموشی سبق دے کہ ملک کی خوشحالی کو کس طریقہ سے ترقی دی جاسکتی ہے۔" اور باوجودیکہ
پہلے امریکن نظام محاصل میں (۱۷۸۹ء) نہایت اہم مصنوعات کی درآمد پر بہت ہلکا
سا محصول لگایا گیا تھا، تاہم ابتدائی زمانہ میں ہی ان کا اثر اچھا پڑا کہ واشنگٹن اپنے ۱۷۹۱ء
والے پیغام میں قوم کو اس کی صنعت، زراعت اور تجارت کی عمدہ حالت پر مبارکباد دے سکا۔
لیکن یہ بات جلد ظاہر ہو گئی کہ یہ تامین ناکافی ہے کیونکہ ان ہلکے محاصل درآمد کا
جو اثر تھا اسے انگریزی اہل حرفہ نے بہتر طریقہ ہائے پیدائش سے جلد مغلوب کرلیا۔ کانگریس
نے بے شک سب سے اہم مصنوعات پر ۱۵ فیصدی محصول لگایا، لیکن اسی وقت جب کہ
ملکی اہل حرفہ مزید تامین کی موافقت میں اور ان کے مخالف، آزادی تجارت کی حمایت
اور محاصل درآمد کی مخالفت میں اپنے تمام دلائل کبھی کے ختم کر چکے تھے، اور جنگی کی آمدنی
کے کم ہونے کے باعث ریاست کو آمدنی بڑھانے کی ضرورت تھی۔ ملک کی صنعتوں نے
فی الجملہ جو خفیف سی ترقی کی تھی اس کے مقابلہ میں جہازرانی کی ترقی نہایت شاندار معلوم
ہوتی تھی، اس لیے کہ اسے جیمس میڈیسن کی تجویز پر ۱۷۸۹ء ہی سے کافی تامین نصیب
تھی ۱۷۸۹ء میں تجارتی بیڑہ بالکل ۲ لاکھ ٹن کا تھا اور ۱۸۰۱ء میں بڑھ کر ۱۰ لاکھ ٹن سے

زیادہ کا ہو چکا تھا۔

۱۸۰۴ء کے نظام محاصل کے ماتحت ریاست ہائے متحدہ کی صنعتیں بس اپنے آپ کو مشکل ہی سے انگریزی کارخانوں کے مقابلہ میں قائم رکھ سکتی تھیں کہ اُدھر برابر ترقی ہو رہی تھی، اور جبرت میں ڈالنے والی توسیع، اور اس میں ذرا شک شبہ نہیں کہ اگر ۱۸۱۲ء میں اعلان جنگ نہ ہو جاتا اور مال کی درآمد نہ رُک جاتی تو امریکن کارخانوں نے ایسی غیر معمولی ترقی کی کہ اب یہ صرف ملکی ضروریات ہی کو پورا نہ کرتے تھے بلکہ باہر بھی اپنا مال بھیجنے لگے۔ تجارت اور صنعت کی کمیٹی نے کانگریس کو ۱۸۱۵ء میں جو رپورٹ دی تھی اس کے مطابق صرف روئی اور اُون کے سامان کی صنعت میں ایک لاکھ آدمی مشغول تھے، اور ان کا بنایا ہوا مال ہر سال ۴ کروڑ ڈالر کا ہوتا تھا۔ جنگ آزادی کے زمانہ کی طرح قوت صنعتی میں اضافہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قیمتیں تیزی کے ساتھ چڑھ گئیں، اور صرف اجناس کی قیمتیں اور محنت کی اجرت ہی نہیں بلکہ جائداد غیر منقولہ کی قیمت بھی، چنانچہ مالکان اراضی، مزدور اور ملک کی اندرونی تجارت والے سب کے سب نہایت خوشحال تھے۔

صلح گھینٹ کے بعد ۱۷۸۶ء کے تجربہ سے متنبہ ہو کر، کانگریس نے حکم نافذ کیا کہ پہلے سال سابقہ محصول کو دوناکر دیا جائے، چنانچہ اس زمانہ میں ملک برابر ترقی کرتا رہا۔ لیکن ملک میں صنعت کے مخالف جو اغراض تھے ان کے دباؤ اور نظری علماء کی دلیلوں سے متاثر ہو کر کانگریس نے ۱۸۱۶ء کے لئے محاصل درآمد میں معقول تخفیف کا فیصلہ کیا، اور فوراً خارجی مقابلہ کے وہ اثرات پھر سامنے آئے، جو ۱۷۸۶ء سے ۱۷۸۹ء

تک تجربہ میں آ چکے تھے، یعنی کارخانوں کی تباہی، زرعی پیداوار کی کمی اور بے قدری غیر منقولہ جائداد کی قیمت میں کمی اور زراعت پیشہ لوگوں میں عام تباہ حالی۔ یوں گویا ملک نے دوسری مرتبہ جنگ میں امن کی برکتیں حاصل کیں۔ اور امن میں دوسری بار وہ نقصان اٹھائے جو تباہ کن سے تباہ کن جنگ میں بھی رونما نہ ہوتے، کہیں ۱۸۲۴ء میں جا کر جب انگریزی قانون غلّہ کے تمام اثرات پوری طرح امریکن زراعت پر پڑ چکے تو وسطی، شمالی اور مغربی ریاستوں کے زراعت والے صنعت والوں سے متحد ہوتے، اور کانگرس نے کچھ زیادہ محصول منظور کیا، لیکن چونکہ مسٹر ہسکسن نے فوراً ہی اس کی رد میں مناسب کارروائی کر لی تاکہ انگریزی مقابلہ پیداں محاصل کا اثر کالعدم ہو جائے لہذا یہ نئی شرح بھی بہت جلد نہایت ناکافی ثابت ہوئی اور اس کی تکمیل ۱۸۲۸ء کے نظام محاصل سے کی گئی، جو کانگرس میں نہایت گرم مباحثہ کے بعد منظور ہوا۔

میساچوسٹس کے متعلق حال کے شائع شدہ سرکاری اعداد[1] سے اس ترقی کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے جو ریاست ہائے متحدہ اور خصوصاً وسطی اور شمالی ریاستوں نے اس محصول تامینی کی وجہ سے (۱۸۲۸ء کی ترمیم سے قطع نظر) صنعت کے معاملہ میں کر لی ہے ۱۸۳۷ء میں اس ریاست کے اندر ۲۸۲ روئی کے کارخانے تھے، ۵۶۵۰۳۱ تکلے چلتے

[1] Statistical Table of Massachussets for the year ending 1, ل April, 1837, by J. P. Bygelon, Secretary of the Commonwealth. Boston, 1838.

تھے، اور ۹۹،۴ مرد اور ۱۴،۷۵۷ عورتیں ان پر کام کرتی تھیں، ۹۱۷،۲۷۵،۳۷ پونڈ روئی کام میں آتی تھی، اور ۰۰۰،۰۰۰،۱۲۶ گز کپڑا تیار ہوتا تھا، اس کی قیمت ۶۵۹، ۱۳۰،۵۶ ڈالر ہوتی تھی، اور اس میں ۱۹،۷۹۶،۳۴ ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔

اون کی صنعت میں ۹۲ کارخانے تھے، ۵۰۱ مشینیں تھیں اور ۲۶۱۲ مرد اور ۸۵،۴۳ عورتیں مصروف تھیں، یہ لوگ ۸۸،۹۸۵،۱۰ پونڈ اون کام میں لاتے، اور ۶۶،۱۳۱۳،۴۱ گز کپڑا تیار کرتے تھے جس کی قیمت ۸۰۷،۹۳۹،۱۰ ڈالر ہوتی تھی، اور اس میں ۵۰،۷۰۰،۵ ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔

بوٹ اور جوتوں کے ۸۷۷،۹۸۹،۱۶ جوڑے تیار ہوتے تھے، (جوتوں کی بڑی تعداد مغربی ریاستوں کو جاتی تھی) اور ان کی قیمت ۲۰،۵۴۲،۶۴ ڈالر ہوتی تھی۔

صنعت کی دوسری شاخیں بھی ان مذکورہ شاخوں کے تناسب سے تھیں، اس ریاست کی کل صنعتی پیداوار (جہاز سازی نکال کر) کوئی ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کی ہوتی تھی، اور تقریباً ۶ کروڑ ڈالر کا مستقل سرمایہ اس میں لگا ہوا تھا۔

مزدوروں کی تعداد ۳۵۲،۷۶۱ تھی اور ریاست کے کل باشندے (۱۸۳۷ء میں) ۷۰۱،۳۳۱، اس صنعتی آبادی میں فلاکت، بہیمیت اور جرائم کا پیشہ بھی نہیں، بلکہ اس کے برخلاف اکثر کام کرنے والے مرد اور عورتوں میں نہایت حسن اخلاق، حسن لباس اور صفائی پائی جاتی ہے، ان کے لئے مفید اور سبق آموز کتابیں مہیا کرنے کی غرض سے کتب خانے قائم ہیں، کام ایسا نہیں کہ شل کردے، اور غذا اچھی اور کافی ملتی ہے،

اکثر عورتیں خود پس انداز کر کے اپنے لئے اپنا جہیز فراہم کر لیتی ہیں۔[1]

یہ آخری بات بظاہر نتیجہ ہے ضروریاتِ زندگی کی سستی قیمتوں کا، ہلکے مصارف اور مساوی ٹیکس کا۔ انگلستان زرعی پیداوار پر سے درآمد کی پابندیاں اٹھا دے، صرف دولت پر ٹیکس آدھا یا ایک تہائی کر دے، اور اس سے جو کچھ نقصان ہو اس کی تلافی آمدنی پر ٹیکس لگا کر کرے تو اس کے کارخانوں کے مزدوروں کی بھی یہی حالت ہو جائے۔

کسی دوسری قوم کے مستقبل اور معیشت قومی کو لوگوں نے اس قدر غلط نہیں سمجھا ہے، نہ اس پر اتنے غلط حکم لگائے ہیں، جتنے کہ شمالی امریکہ پر، اور اس میں علماء نظری اور عملی لوگ دونوں شامل ہیں، آدم اسمتھ اور ج۔ب۔ سے نے تو کہہ دیا کہ ریاست ہائے متحدہ پولینڈ کی طرح زراعت کے لئے مقدر ہیں! درجنوں ترقی خواہ اور جوان جمہوریتوں کے اس اتحاد کے لئے یہ تشبیہ کچھ بہت دل خوش کن نہیں ہے، اور نہ مستقبل کی یہ امید کچھ بہت حوصلہ افزا، ان نظر بین نے تو ثابت کر دیا تھا کہ جب تک زرخیز سے زرخیز زمین یہاں تقریباً مفت ملتی ہے۔ اس وقت تک تو فطرت نے خود شمالی امریکنوں کے لئے ایک خالص زرعی قوم ہونا مقسوم کر دیا ہے، دوسرے لوگوں نے ان کی بڑی بڑی

---

[1] جولائی ۱۸۳۹ء کے امریکن اخبارات یہ خبر دیتے ہیں کہ لاول نامی صنعتی مقام میں کوئی سو سے اوپر مزدور عورتیں ہیں، جن کے ہر ایک کے نام پر "پس اندازی بنک" میں ایک ہزار سے اوپر ڈالر جمع ہیں۔

تعویضیں فرمائیں کہ ہیئتیت کے احکام کے سامنے تسلیم خوشی سے خم کرتے ہیں اور اس طرح آزاد تجارت کے شاندار نتائج کی ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہیں، لیکن اس مسلک والوں کے نصیب میں یہ تاسف انگیز تجربہ لکھا تھا کہ جلد ہی اپنے نظریوں کی صحت اور ان کے اطلاق کا براہِ ثبوت بھی ہاتھ سے دے بیٹھیں، اور یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ریاستہائے متحدہ نے اپنی قومی خوشحالی کے لئے آزاد تجارت سے بالکل مخالف راہ اختیار کی۔

اس مذہب والوں کے لئے جیسے یہ نوجوان قوم پہلے آنکھ کا تارا تھی، اب تمام یورپی اقوام کے نظر بین کے نزدیک اسی قدر مستوجب ملامت ہو گئی۔ کہا یہ جانے لگا کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی دنیا نے علوم سیاسی میں کتنی کم ترقی کی ہے، کیونکہ جب یورپی اقوام نہایت تندہی کے ساتھ تجارت کی آزادی عام کو ممکن بنانے میں کوشاں ہیں اور خصوصاً انگلستان اور فرانس تو واقعی ارادہ کر رہے ہیں کہ اس عظیم الشان جب انسانی کے مقصود کی طرف ایک بڑا قدم اٹھائیں، اس وقت شمالی امریکہ کی یہ متحدہ ریاستیں اپنی قومی مرفہ الحالی کو ترقی دینے کے لئے بھلا اس پرانے طریق استبداد کی طرف رجوع کرتی ہیں جسے علماء نظری نے نہایت وضاحت کے ساتھ غلط ثابت کر دیا ہے۔ ایک ایسا ملک جس میں ابھی بے حساب قطعے نہایت زرخیز زمین کے غیر مزروع پڑے ہیں اور جہاں مزدوری اتنی زیادہ ہے وہ تو اپنے مادی سرمایہ کو اور اپنی آبادی کے اضافہ کو زراعت سے بہتر اور کسی چیز میں نہیں لگا سکتا۔ ہاں زراعت ایک دفعہ پوری ترقی کر جائے تو صنعت اور کارخانہ تو خود بخود فطری طور پر بلا مصنوعی اکساؤ کے اٹھ کھڑے ہوں گے اور مصنوعی طریقہ سے اس وقت صنعت کو ابھار کر

ریاست ہائے متحدہ قدیم متمدن ممالک ہی کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہیں، بلکہ سب سے زیادہ خود اپنے کو۔

لیکن امریکہ میں عام معمول سوجھ بوجھ اور اپنی قوم کی ضرورت کا احساس ان نظریوں یا قدروں پر یقین سے زیادہ قوی تھا۔ ان نظریوں کے دلائل کی پوری پوری تحقیق کی گئی اور اس مسلک کے ناقابل عمل ہونے پر بہت سے شبہات پیدا ہو گئے، جیسے خود اس کے حامل عمل کے لانے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ کثرت سے غیر مزروع زرخیز زمین کے متعلق جو دلیل تھی اس کا جواب تو یہ دیا گیا کہ اس قسم کے قطعات زمین اس اتحاد کی آباد اور متمدن ریاستوں میں جو ابھی صنعت کے لئے تیار ہیں، اسی قدر نایاب ہیں جتنے کہ برطانیہ عظمیٰ میں۔ ان ریاستوں کی آبادی میں آدمیوں کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ مصارف کثیر برداشت کر کے مغرب میں جا کر آباد ہوتے ہیں اور وہاں جا کر ان زمینوں کو قابل کاشت بناتے ہیں۔ اس طرح ایک تو مشرقی ریاستوں کو ہر سال آدمی اور ذہنی سرمایہ کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، دوسرے اس ہجرت سے چونکہ کاشتکار مقابلہ کرنے والے بن جاتے ہیں اس سے زمین اور زرعی پیداوار کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ اس میں ریاست ہائے متحدہ کا فائدہ نہیں ہے کہ پرانی ریاستوں کی آبادی، تہذیب اور فوجی قوت کا پورا نشوونما اس وقت تک رکا رہے جب تک بحرالکاہل تک ان کی ساری بیکار زمین پر کاشت نہ ہونے لگے، بلکہ اس کے بالکل برخلاف دور دراز غیر مزروع زمینوں کو کاشت میں لانا مشرقی ریاستوں کے لئے اس وقت تک فائدہ مند نہیں ہو سکتا کہ یہ خود صنعت کی طرف متوجہ نہ ہوں اور اپنی مصنوعات کا مبادلہ مغرب کی

زرعی پیداوار سے کر سکیں۔ بلکہ لوگ تو اس سے بھی آگے بڑھے اور پوچھنے لگے کہ خود انگلستان کی کیا کم و بیش یہی حالت نہ تھی؟ کیا خود انگلستان کے زیر اقتدار کنیڈا اور آسٹریلیا میں اور دیگر اقطاع عالم میں زرخیز زمین کے غیر مزروع قطعے نہ تھے؟ اور کیا انگلستان کے لئے اپنی فاضل آبادی کا ان ممالک میں منتقل کرنا اسی قدر آسان نہ تھا جتنا کہ شمالی امریکہ والوں کے لئے سواحل اٹلانٹک سے مسوری کے کنارے پر جا بسنا؟ اگر ایسا ہے تو پھر کیا بات ہے کہ انگلستان برابر اپنی ملکی صنعتوں کے لئے تامین کا انتظام کرتا ہے اور انہیں بڑھانے کی پیہم سعی میں مشغول ہے۔

مسلک مذکور کے حامیوں کی دلیل تھی کہ جب زراعت میں مزدوری زیادہ ہو تو کارخانے اپنے آپ قدرتی طور پر ترقی نہیں کرتے بلکہ شیشہ گھر کے پودوں کی طرح پنپتے ہیں۔ سو یہ دلیل صرف جزوی طور پر صحیح مانی گئی یعنی صرف ان مصنوعات کے متعلق جو اپنی قیمت کے مقابلہ میں بہت کم حجم اور وزن رکھتے ہیں اور زیادہ تر دستی محنت سے تیار ہوتے ہیں۔ لیکن ان اشیاء کی بابت اسے تسلیم نہیں کیا گیا جن کی قیمت پر مزدوری کا کم اثر پڑتا ہے اور جہاں مشینوں کے استعمال سے، یا غیر مستعمل پانی کی قوت کو کام میں لا کر سستے اجناس خام اور سستی غذاء کی وجہ سے، یا کثرت سے سستا ایندھن اور تعمیر مکانات کا سامان مہیا کر کے تخفیف ٹیکس اور اضافہ کارکردگی کی مدد سے مزدوری کی زیادتی کے مضر اثرات کی تلافی ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ امریکیوں نے عرصہ ہوا تجربہ سے سیکھ لیا تھا کہ زراعت صرف اس

وقت خوش حالی کے مدارج اعلےٰ کو پہنچ سکتی ہے جب کہ اس بات کی ضمانت ہمیشہ کے لئے ہو جائے کہ زرعی پیداوار کا مبادلہ مصنوعات سے ہو جایا کرےگا۔ لیکن اگر زراعت والا شمالی امریکہ میں اور صنعت والا انگلستان میں رہتا ہو تو یہ ضمانت اکثر جنگوں سے، تجارتی کساد بازاری یا دوسروں کی تجارتی تدابیر سے ساقط ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ملک کی خوشحالی کو کسی اساس محکم پر قائم کرنا ہو تو بقول ہیملٹن ضروری ہے کہ صناع کاشتکار کے پہلو بہ پہلو آن کر بسے۔"

اور بالآخر شمالی امریکیوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک بڑی قوم صرف مستقبل قریب کے مادی فوائد پر اپنی نظر نہیں جما سکتی۔ اور تہذیب و طاقت، جو خود آدم اسمتھ کے نزدیک مادی دولت سے زیادہ اہم اور پسندیدہ چیزیں ہیں، صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہیں اور قائم رہتی ہیں جب کہ خود اپنی صنعت قائم ہو جاتی ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ جو قوم اپنے کو اس کا اہل سمجھتی ہے کہ دنیا کی مہذب ترین اور قوی ترین اقوام میں اپنی جگہ لے وہ پھر ان چیزوں کے حصول کے جو ذرائع ہیں ان کے لئے کسی قربانی سے منہ نہیں پھیرتی۔ اور ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ حالات موجودہ بحر اٹلانٹک کی ساحلی ریاستیں ان محاسن کا مسکن ہیں۔

اٹلانٹک کے ساحل ہی پر یورپی لوگ آکر پہلے بسے اور یہیں یورپی تہذیب نے پہلے جڑ پکڑی۔ پہلے یہیں آباد اور مالدار و متمدن ریاستیں بنیں۔ یہیں وطن اور پالنا ہے ان کے بحری ماہی گیری کا، ساحلی تجارت اور بحری قوت کا۔ اپنی خود مختاری انہوں نے یہیں حاصل کی اور یہیں ان کا اتحاد قائم ہوا۔ انہیں ساحلی ریاستوں کی وساطت سے ان

کی ساری تجارت خارجہ ہوتی ہے، انہیں کی معرفت متمدن دنیا سے ان کا تعلق ہے انہیں کے ذریعہ یہ اتحاد، یورپ کی فاضل آبادی، مادی سرمایہ اور ذہنی قوتیں اپنے لئے حاصل کرتا ہے، انہیں ساحلی ریاستوں کی تہذیب، قوت اور دولت پر کل قوم کی آئندہ تہذیب قوت اور دولت بلکہ دیگر متمدن اقوام پر ان کا آئندہ اثر منحصر ہے۔

فرض کیجئے کہ ان ساحلی ریاستوں کی آبادی بڑھنے کے بجائے گھٹے، ان کی ماہی گیری، ان کی ساحلی جہازرانی، ممالک غیر سے ان کی جہازرانی، ان کی تجارت خارجہ، الغرض ان کی خوشحالی بجائے بڑھنے کے کم ہو یا ایک جگہ پر رک جائے، تو پھر ہم دیکھیں گے کہ اسی نسبت سے کل قوم کے وسائل تمدن، ساری قوم کی خارجی قوت و خود مختاری کی ضمانتیں گھٹتی جائیں گی۔ بلکہ یہ تک سمجھ میں آسکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کا سارا علاقہ ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک، مزروعہ زرعی ریاستوں سے پٹا ہوا اور اندرون ملک میں خوب گھنا آباد ہو، لیکن باوجود اس کے کل قوم باعتبار تہذیب و تمدن، خود مختاری اور نفوذ خارجی کے بہت پست حالت میں ہو اور متعدد قومیں موجود ہیں جو اسی حال میں ہیں یعنی باوجود کثیر آبادی کے جہازرانی اور بحری قوت کے اعتبار سے بس صفر ہیں۔

اب اگر کوئی ایسی مخالف طاقت ہو جو امریکی قوم کی ترقی کو روکنے کا ارادہ کر لے اور اسے صنعتی، تجارتی اور سیاسی اعتبار سے ہمیشہ کے لئے اپنا خادم بنانا چاہے تو اس کا مقصد بس ایک اس تدبیر سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اتحاد کی ساحلی ریاستوں

کی آبادی کم ہو اور یہاں جس قدر فاضل آبادی، سرمایہ اور ذہنی قوت ہے وہ اندرون ملک کی طرف جائے۔ اس طرح یہی نہیں ہوگا کہ یہ دشمن لاانت قوم کی مستقبل بعید میں آنے والی بحری قوت کی نشوونما کو روک دے گی، بلکہ اپنے سینہ میں اس امید کو بھی جگہ دے سکے گی کہ وقت گذرنے پر ساحل اطلانتک پر، اور دریاؤں کے دھانوں پر خاص خاص دفاعی مورچے بھی اپنے قبضے میں لے آئے۔ اس مقصد کے وسائل دریافت کرنے کے لئے کچھ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، بس ضرورت اس کی ہے کہ اطلانتک والی ریاستوں میں صنعت کے فروغ کو روک دیا جائے، یعنی صرف اتنی سی بات درکار ہے کہ امریکہ میں تجارت خارجہ کی آزادی مطلق کا اصول تسلیم کرادیا جائے! اگر اطلانتک والی ریاستیں صنعت اختیار نہ کریں تو یہی نہیں کہ وہ اپنی تہذیب کے موجودہ درجہ کو قائم نہیں رکھ سکتیں، بلکہ لازم ہے کہ وہ گریں اور ہر اعتبار سے گریں۔ صنعت نہ ہوگی تو ساحل اطلانتک کے شہر کیسے ابھریں گے؟ ملک کی زرعی پیداوار کو یورپ بھیج بھیج کر اور انگریزی مصنوعات کو ملک کے اندر منگا منگا کر تو یہ نہیں پنپ سکتے کہ اس کام کے لئے تو چند ہزار آدمی بس کرتے ہیں۔ ماہی گیری کا کام کیسے بڑھیگا؟ آبادی کا بڑا حصّہ جو اندرون ملک میں جا بسا ہے وہ نمکین مچھلیوں پر تازہ گوشت اور میٹھے پانی کی مچھلی کو ترجیح دیتا ہے، اسے مچھلی کے تیل کی بھی ضرورت نہیں، اور اگر ہے بھی تو بہت کم۔ اطلانتک کی ریاستوں کے ساحل پر جہاز رانی کیسے فروغ پائیگی؟ ساحلی ریاستوں کے بڑے حصّے میں چونکہ زراعت کرنے والے آباد ہوں گے جو اپنی

کھانے پینے کی چیزیں، تعمیر مکانات کا سامان، اور ایندھن وغیرہ خود پیدا کرینگے، لہٰذا ساحل پر
کسی چیز کو ادھر سے اُدھر لے جانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ تجارت خارجہ اور دور دراز
ممالک کو جہازرانی کس طرح بڑھے گی؟ جو چیزیں یہ ملک متمدن اقوام کو دے سکیگا وہ تو
ان کے پاس خود بافراط موجود ہونگی اور جن صنعتی قوموں کے ہاتھ یہ اپنی زرعی پیداوار فروخت
کریگا وہ سب خود اپنی جہازرانی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہینگی، اور جب ماہی گیری، ساحلی
تجارت، جہازرانی اور تجارت خارجہ کو زوال ہوگا تو بحری قوت کہاں سے آئیگی؟ اور
بحری قوت کے بغیر یہ اطلانتک کی ریاستیں خارجی حملوں سے اپنے کو کیسے بچائیں گی؟
اور خود زراعت ان ریاستوں میں کیسے پنپے گی؟ جب مغربی ریاستوں کی زرخیز اور
سستی زمین کی پیداوار جس میں کھاد تک کی ضرورت نہیں، ریلوں، نہروں وغیرہ کے
ذریعہ مشرقی ریاستوں میں نہایت سستے داموں لائی جاسکتی ہے، اور یہاں کی مدت
کی جوتی ہوئی زمین پر ان کا پیدا کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے، تو پھر ان حالات میں مشرقی
ریاستوں کی تہذیب کیسے ترقی کریگی؟ ان کی آبادی کیسے بڑھے گی؟ اور یہ معلوم
ہی ہے کہ اگر انگلستان سے آزاد تجارت قائم ہوئی تو فاضل آبادی اور زرعی سرمایہ
مغرب کی طرف منتقل ہوگا۔ ورجینیا کی موجودہ حیثیت اس حالت کا ایک ہلکا سا نمونہ
ہے جو صنعت کے فقدان سے مشرقی امریکن ریاستوں کی ہوگی کیونکہ ساحل اطلانتک
کی دوسری تمام جنوبی ریاستوں کی طرح ورجینیا بھی آج کل ان صنعتی اطلانتکی ریاستوں
کو زرعی پیداوار فراہم کرنے میں خوب اچھا حصہ لیتی ہے۔

صنعت کے فروغ کی وجہ سے یہ تمام حالات بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں تمام یورپی ممالک سے آبادی، سرمایہ، صنعتی ہنرمندی اور ذہنی قوت یہاں بھی چلی آتی ہے۔ اب جوں جوں مغربی ریاستوں کے زرعی پیداوار کا صرف بڑھتا ہے۔ ویسے ہی مشرقی مصنوعات کی مانگ بڑھتی ہے؛ اب ان کی آبادی، ان کے شہروں کی تعداد، اور وسعت، اور ان کی دولت، مغربی ریاستوں کے غیر مزروع علاقوں کی کاشت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے؛ اور آبادی کے بڑھ جانے سے گوشت، مکھن، پنیر، دودھ، ترکاری، اناج، پھل وغیرہ کی مانگ بڑھتی ہے؛ نمک لگی ہوئی مچھلیوں اور مچھلی کے تیل کی مانگ بھی بڑھتی ہے؛ لہذا ماہی گیری کو فروغ ہوتا ہے؛ ساحل کے برابر برابر غذا، سامانِ تعمیر، پتھر کے کوئلہ وغیرہ کی بڑی مقداریں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی ہوتی ہیں، تاکہ صنعتی آبادی کی ضروریات پوری ہو سکیں؛ صنعتیں تجارتی مال کی بڑی مقدار پیدا کرتی ہیں جیسے دنیا کے تمام ممالک میں پہنچانا ہوتا ہے جس سے بحری کے سفر میں فائدہ اٹھانا بھی ممکن ہو جاتا ہے؛ چنانچہ ساحلی تجارت، ماہی گیری، دور دراز ممالک سے جہاز رانی، اور بحری قوت بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قومی خود مختاری کی ضمانت اور دوسرے ممالک پر اس کا اثر بڑھتا ہے خصوصاً جنوبی امریکہ کی اقوام پر؛ اب ان مشرقی ریاستوں میں علوم و فنون کو فروغ ہوتا ہے، تہذیب و ادب کو ترقی ہوتی ہے، اور یہاں سے ان کا فیض مغربی ریاستوں میں پھیلتا ہے۔

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے شمالی امریکہ کی ریاستوں کو اس پر آمادہ کیا کہ

خارجی مصنوعات کی درآمد پر پابندیاں عائد کریں اور اپنی صنعت کے لئے تامین کا انتظام کریں۔ یہ کام جس کامیابی کے ساتھ انجام پایا، وہ ہم اوپر بتا چکے۔ ان کے تجربہ سے، نیز دوسری اقوام کی صنعتی تاریخ سے، ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اس طرز عمل کے بغیر اطلانٹک کی ریاستوں میں قوت صنعتی کا کامیابی کے ساتھ قائم رکھنا ممکن نہ تھا۔

امریکہ میں آئے دن جو تجارتی کساد بازاری کے دورے ہوتے ہیں انہیں لوگوں نے اکثر مصنوعات خارجہ کی درآمد پر پابندیوں سے وابستہ کیا ہے، حالانکہ اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بلکہ شمالی امریکہ کا شروع کا اور خود ان دنوں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ کساد بازاری کے یہ دورے کبھی بھی اس قدر کثرت سے اور اتنی تباہ کن صورت میں رونما نہیں ہوئے جتنے اس وقت جبکہ انگلستان سے تجارتی لین دین پر بہت کم پابندیاں تھیں، ان زرعی ممالک میں جو کسی باہر کے بازار سے مصنوعات خریدتے ہیں۔ تجارتی کساد بازاری درآمد اور برآمد کے عدم تناسب سے پیدا ہوتی ہے صنعتی قومیں چونکہ زرعی اقوام سے زیادہ سرمایہ رکھتی ہیں، اور اپنی برآمد کی مقدار کو ہمیشہ بڑھانے کی کوشش کرتی ہیں اس لئے اپنا سامان ادھار اعتبار پر دے دیتی ہیں، اور صرف اشیا کو بڑھانا چاہتی ہیں۔ در اصل یہ آنے والی فصل کی قیمت پیشگی ادا کرتی ہیں لیکن اگر کہیں فصل ایسی خراب ہو جائے کہ اس کی قیمت سابقہ صرف سے بہت کم ہو، یا اتنی اچھی ہو جائے کہ پیداوار کے لئے کافی مانگ نہ ہو اور قیمتیں گر جائیں، تو پھر بازار میں پردیسی مصنوعات کی اور بھرمار ہوتی ہے۔ اس طرح وسائل ادائیگی اور سابقہ صرف میں نیز زرعی پیداوار اور

مصنوعات کی رسد و طلب میں، عدم تناسب پیدا ہو جاتا ہے، اور اسی سے عام تجارتی کساد بازاری پیدا ہوتی ہے۔ ملکی اور پردیسی بنک اپنے کاروبار سے اس کساد بازاری کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں لیکن اسے پیدا نہیں کر سکتے۔ کسی بعد کے باب میں ہم اس موضوع پر اور روشنی ڈالیں گے۔

باب (۱۰)

تاریخ کے سبق

ہر جگہ اور ہر زمانہ میں شہریوں کی ذہنیت، ان کا اخلاق، اور ان کی قوتِ عمل قومی مرفہ الحالی کے تناسب سے رہی ہیں، انہیں رجحانات کے ساتھ ساتھ دولت گھٹی یا بڑھی ہے؛ لیکن کہیں بھی محض افراد کی جفاکشی اور کفایت شعاری اور قوت اختراع اور حوصلہ مندی نے کوئی اہم نتیجہ پیدا نہیں کیا، اگر اس کے ساتھ ساتھ شہری آزادی، آئین، اور عام افادہ گاہوں کی مدد اور نظم حکومت اور سیاست خارجہ اور ان سے بڑھ کر قومی اتحاد و قوت کا سہارا بھی نہ ملا ہو۔

ہم تاریخ میں ہر جگہ جماعتی اور انفرادی حالتوں اور قوتوں میں ایک قومی رشتہ عمل اور ردعمل کا، پاتے ہیں، اطالوی اور ہنزا شہروں میں، ہالینڈ اور انگلستان میں، فرانس اور امریکہ میں، ہر جگہ ہم یہی دیکھتے ہیں کہ قوائے دولت آفریں، اور ان کی وجہ سے افراد کی دولت، آزادی اور سیاسی و جماعتی افادہ گاہوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے، اور خود یہ مؤخرالذکر چیزیں مادی دولت کی افزونی اور افراد کے قوائے دولت آفریں کی ترقی سے اپنی مزید تکمیل کا سامان فراہم کرتی ہیں، مثلاً انگریزی

صنعت و اقتدار کی واقعی ترقی اس زمانہ سے شروع ہوئی ہے جب سے انگلستان کی قومی آزادی کی بنیاد پڑی، ادھر اہل وینس، اہل ہنزا، اہل اسپین و پرتگال کی صنعت اور ان کا اقتدار، ان کی آزادی کے زوال کے ساتھ ساتھ رو بہ تنزل ہوتا ہے۔ افراد کیسے ہی محنتی، کفایت شعار، مخترع، اور ذہین ہوں، وہ آزاد افادہ گاہوں کی کمی کی تلافی نہیں کر سکتے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتلاتی ہے کہ افراد اپنے خواہ دولت آفرین کا بہت بڑا حصہ اجتماعی حالات اور افادہ گاہوں سے حاصل کرتے ہیں۔

کسی قوم کی قوت پیدا و راس طرح اس کی دولت اور اس کے قوائے دولت آفرین پر، آزادی ذہنیت اور روشن خیالی کا جو اثر پڑتا ہے وہ جہاز رانی کے معاملہ میں سب سے زیادہ واضح طور پر نظر آسکتا ہے۔ سارے صنعتی مشاغل میں یہ جہاز رانی سب سے زیادہ قوت، شخصی جرأت، حوصلہ مندی اور برداشت کی طالب ہوتی ہے، اور یہ وہ صفتیں ہیں جو صرف آزادی کی فضا میں پنپ سکتی ہیں۔ صنعت کی کسی اور شاخ میں جہل، توہم پرستی، تعصب، کاہلی، بزدلی، نساہیت، اور کمزوری کا اتنا خراب اثر نہیں پڑتا جتنا کہ اس میں۔ اور کوئی شاخ نہیں جس میں خود اعتقادی کا احساس اس درجہ ناگزیر ہو۔ چنانچہ تاریخ کسی ایک غلام قوم کی بھی مثال پیش نہیں کر سکتی جس نے جہاز رانی میں کوئی ممتاز حصہ لیا ہو، ہندوؤں چینیوں اور جاپانیوں کی کوششیں بس نہروں، اور دریاؤں میں اور ساحل پر کشتی رانی تک محدود رہی ہیں، مصر قدیم میں بھی بحری جہاز رانی سے لوگ سخت نفرت کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حکام اور پجاری ڈرتے تھے کہ کہیں جہاز رانی سے قوم میں

آزادی اور خود مختاری کے جذبہ کو پرورش نہ ہو۔ یونان قدیم کی سب سے آزاد اور سب سے روشن خیال ریاستیں ہی سمندر میں سب سے زیادہ قوی تھیں یا ان کی آزادی کے زوال کے ساتھ ان کی بحری قوت بھی ختم ہو گئی۔ اور تاریخ شاہانِ مقدونیہ کی بری فتوحات کے جتنے چاہیے افسانے کہے، لیکن ان کی بحری قوت کے متعلق یقیناً خاموش ہے۔

اہلِ روما کس زمانہ میں بحری قوت رکھتے تھے، اور پھر کب سے ان کے بیڑے کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔ اطالیہ کس زمانہ میں سمندروں کے لئے قانون بناتا تھا؟ اور پھر کب سے خود اس کی ساحلی جہاز رانی پردیسیوں کے ہاتھ میں آگئی؟ اسپینی بیڑے پر احتساب مذہبی کی عدالتوں نے مدتوں پہلے موت کا حکم لگا دیا تھا، اور کہیں بعد کو جا کر انگلستان اور ہالینڈ نے اس حکم کو نافذ کیا۔ ہنزا شہروں میں امیر تاجروں کے گروہوں کا برسر اقتدار آنا تھا کہ قوت و حوصلہ مندی نے جمعیت ہنزا کو خیرباد کہا۔ نیدرلینڈ کے ہسپانوی علاقوں میں سے صرف بحری صوبے اپنی آزادی حاصل کر سکے، اور جو حصے عدالت ہائے مذہبی کے زیرِ اقتدار رہتے تھے انہیں اپنے دریاؤں تک کے بند ہو جانے پر چپ رہنا پڑا۔ انگریزی بیڑے نے ولندیزی بیڑے پر دوبارہ برطانوی میں فتح بھی حاصل کر لی اور اس اقتدار بحری کا مالک بھی بن گیا، جو اس کی ذہنیت حریت و آزادی نے عرصہ سے اس کے لئے مقدر کر دیا تھا، مگر اس کے بعد بھی، خود ہمارے زمانہ تک، ہالینڈ والے اپنے تجارتی بیڑے کا بڑا حصہ قائم رکھ سکے، حالانکہ اسپینی اور پرتگیزی بیڑہ تقریباً فنا ہو گیا، فرانس کے استبدادی بادشاہوں کے زمانے میں کسی اکے دکے بڑے مدبر نے بیڑہ تیار کرانے کی

کوشش کی لیکن ہمیشہ لاحاصل، کیونکہ یہ بیڑہ ہمیشہ پھر تباہ ہو گیا۔ لیکن آخر ہمارے زمانہ میں کیا بات ہے کہ فرانس کا اقتدار بحری اور اس کی جہاز رانی برابر قوت پکڑ رہی ہے۔ شمالی امریکہ کی متحدہ ریاستوں کو اپنی آزادی حاصل کئے ابھی کتنے دن ہوئے ہیں لیکن وہ مادری ملک کے عظیم الشان بیڑہ سے ایسا مقابلہ کر رہی ہیں کہ صدآفریں ہے۔ لیکن وسطی اور جنوبی امریکہ کا کیا حال ہے۔ جب تک ان کا پھریرا سارے سمندروں میں نہ لہرائے اس وقت تک ان کے جمہوری انتظامات کی حقیقت بس معلوم۔ لیکن ٹکساس کو دیکھو، ابھی سیاسی زندگی مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے، لیکن یہ بحری دیوتا (نیپچون) کی مملکت میں اپنا حصہ طلب کرتی ہے۔

لیکن جہاز رانی قوم کی صنعتی قوت کا بس ایک جزو ہے جو صرف ایک کل کے اندر اور کل ہی کے ذریعہ پنپ سکتا اور اہمیت حاصل کر سکتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ہم یہی دیکھتے ہیں کہ جہاز رانی اندرونی و بیرونی تجارت، بلکہ خود زراعت تک بس وہیں پھلتی پھولتی ہے جہاں صنعت کو خوب فروغ ہو۔ اور جب آزادی جہاز رانی کی ترقی کے لئے شرط لازمی ہے تو پھر کل صنعتی قوت اور قوم کی کل دولت آفرینی کی ترقی کے لئے کس درجہ ضروری نہ ہوگی۔ تاریخ کسی ایسی دولت مند اور تجارت پیشہ اور صنعتی قوم سے واقف نہیں جو ساتھ ہی آزاد بھی نہ ہو۔

ہر جگہ یہی ہوا ہے کہ صنعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذرائع آمد و رفت بہتر ہوئے ہیں، دریائی کشتی رانی اور بندرگاہوں کو درست کیا گیا ہے، بہتر سڑکیں بنی ہیں، دخا(

جہاز رانی اور ریل گاڑی کا آغاز ہوا ہے، اور یہی بہتر زراعت اور بہتر تمدن کی لازمی شرطیں ہیں۔

تاریخ بتلاتی ہے کہ فنون اور صنعتیں ایک شہر سے دوسرے شہر کو اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اپنے وطن میں جب ان پر ظلم و تشدد ہوتا ہے تو یہ ان شہروں اور ملکوں میں جا بستی ہیں جہاں انہیں آزادی، امن اور سہارا ملتا ہے، چنانچہ یہ یونان اور ایشیا سے اطالیہ آئے، وہاں سے جرمنی، فلینڈرس اور برابان پہنچے اور پھر یہاں سے ہالینڈ اور انگلستان۔ ہر جگہ بے سمجھی اور استبداد نے انہیں بھگایا، اور حریت و آزادی کی روح نے انہیں اپنی طرف کھینچا۔ برّاعظم کی حکومتیں حماقتیں نہ کرتیں تو انگلستان کو مشکل ہی سے صنعتی اقتدار حاصل ہوتا۔ لیکن کیا عقلمندی اس میں ہے کہ ہم اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، جب تک دوسری قومیں حماقت سے اپنی صنعت کو نکال باہر کریں اور یہ مجبوراً ہمارے یہاں آکر پناہ لے؟ یا عقلمندی یہ ہے کہ اس قسم کے اتفاقات کا انتظار کئے بغیر ہم انہیں مراعات دے دے کر اپنے یہاں آبسنے پر آمادہ کریں؟ یہ سچ ہے کہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہوا ایک علاقہ کا بیج دوسرے علاقہ میں لے جاتی ہے اور اس طرح بنجر زمینوں پر بڑے بڑے جنگل کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن کیا اس وجہ سے یہ بات قرین عقل ہوگی کہ جنگل لگانے والا اس وقت تک بیٹھا انتظار کیا کرے جب تک کہیں صدیوں میں جا کر ہوا یہ تغیر خود پیدا کرے، اور کیا یہ کوئی بیوقوفی کی بات ہوگی کہ وہ بیج بو کر اور پودے لگا کر چند برس ہی میں اسی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے؟ "تاریخ

بتاتی ہے کہ جو یہ جنگل والا کرتا ہے وہی قوموں کی قوموں نے بھی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔
تنہا آزاد شہر یا چھوٹی چھوٹی محدود رقبہ اور کم آبادی والی جنگی قوت کے اعتبار سے غیر اہم جمہوریتیں، یا ایسے شہروں اور ریاستوں کی جمعیتیں، شباب حریت کی قوت سے مضبوط ہو کر، اپنے جغرافیائی موقع سے فائدہ اٹھا کر، اور مساعد حالات و واقعات زمانہ کی مدد سے صنعت اور تجارت میں بڑی بڑی شاہیوں سے بہت پہلے فروغ حاصل کر لیتی ہیں، اور ان موخر الذکر سے آزاد تجارتی تعلق کے ذریعہ یعنی انہیں مصنوعات دے کر اور ان کی زرعی پیداوار معاوضہ میں لے کر دولت اور قوت میں مدارج اعلیٰ تک پہنچ جاتی ہیں، مثلاً یہی حال وینس کا تھا، یہی اہل ہنزا کا، یہی بلجیم اور ہالینڈ والوں کا۔

اور پہلے پہل تو آزاد تجارت کا یہ طریقہ خود ان بڑی شاہی حکومتوں کے لئے بھی کچھ کم مفید نہ تھا جن سے چھوٹی جمعیتوں کے تجارتی روابط تھے، ان کے پاس قدرتی وسائل کی جو بہتات تھی، اور جماعتی حالت کی جو ابتدائی کیفیت تھی۔ اس میں تو بدیسی مصنوعات کی بے روک ٹوک درآمد اور دیسی پیداوار زرعی کی برآمد سب سے یقینی اور موثر طریقہ تھا اس بات کا کہ یہ اپنے قوائے دولت آفرین کو نشوونما دے لیں، اپنی رعایا کو جو کاہلی اور شورہ پشتی کی خوگر تھی محنت مشقت کا عادی بنا لیں، اپنے زمینداروں اور طبقہ اشراف میں صنعت سے وابستگی پیدا کر دیں، اپنے تاجروں کی خفتہ حوصلہ مندی کو بیدار کر دیں، اور فی الجملہ اپنی تہذیب، صنعت اور قوت کو فروغ دیں۔

اہل اطالیہ اور ہنزا اہل بلجیم و ہالینڈ کی تجارت اور صنعت سے اس قسم کا اثر

خاص طور سے انگلستان پر پڑا، لیکن آزادروابط تجارت سے ارتقاء کے ایک خاص درجہ تک پہنچنے کے بعد بڑی سلطنتوں نے معلوم کیا کہ تمدن، دولت اور قوت کے اعلیٰ ترین مدارج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں کہ صنعت و تجارت کو زراعت سے متحد کر دیا جائے، انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کی نئی قائم شدہ صنعت پرکسی کی قدیم صنعت سے آزاد مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، دیسی ماہی گیری کے مرکز اور ملکی تجارتی جہاز رانی یعنی بحری قوت کی اساس بلا خاص مراعات کے کبھی ترقی نہیں پا سکتی، اور ملکی تاجروں کی حوصلہ مندی پردیسیوں کی بے حد و نہایت قوت، سرمایہ، ان کے تجربہ، اور ہوشمندی سے ہمیشہ دبی رہے گی، چنانچہ انھوں نے پابندیاں عاید کر کے، مراعات دے کر اور ہر طرح ہمت افزائی کر کے اس بات کی کوشش کی کہ پردیسیوں کا سرمایہ، ان کی ہنرمندی اور حوصلہ مندی کو اپنی سرزمین پر لاجائیں، اس میں کبھی زیادہ کامیابی ہوئی، کبھی کم، کبھی جلد اور کبھی دیر میں، اور یہ اس بات پر منحصر تھا کہ اختیار کردہ ذرائع و وسائل اپنے مقصد کے لئے زیادہ صحت کے ساتھ منتخب کئے گئے یا کم اور ان پر زیادہ یا کم صحت اور قوت اور استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا گیا۔

اس طرز عمل کو سب سے زیادہ انگلستان نے اختیار کیا ہے لیکن کوتاہ بین یا جذباتی بادشاہوں کے باعث، اور اندرونی تحریکات اور بیرونی جنگوں کے سبب سے، اس میں اکثر خلل پڑتا رہا۔ اور کہیں جا کر شاہ ایڈورڈ ششم اور ملکہ الزبیتھ کی وساطت سے اور انقلاب کے ذریعہ اس نے ایک مستقل اور مناسب نظام کی صورت اختیار کی، کیونکہ ایڈورڈ سوم

کی کارروائیاں قابلِ اطمینان طور پر اپنا عمل کیسے دکھا سکتیں ؟ جبکہ کہیں ہنری ششم کے عہد میں جا کر اس بات کی اجازت ہوئی کہ ایک انگریزی تعلقہ کا غلہ دوسرے تعلقہ میں جا سکے یا پردیس کو بھیجا جا سکے ؟ جب ہنری ہفتم و ہشتم کے زمانہ تک روپیہ کا تمام سود حتیٰ کہ ہنڈیوں کی کٹوتی تک کے ربا سمجھا جاتا تھا ! اور جبکہ لوگ اس وقت تک یہ سمجھتے تھے کہ اصلی چیزوں کی قیمت اور شرح اجرت کو قانوناً گھٹا کر صنعت کو اور بڑے بڑے بھیڑوں کے گلوں پر پابندیاں لگا کر غلہ کی پیداوار کو فروغ دیا جا سکتا ہے ! اور اگر ہنری ہشتم نے بڑھتی ہوئی غلہ کی قیمت کو برا نہ سمجھا ہوتا، اور سب کے سب پردیسی مزدوروں کو ملک سے باہر نکالنے کے بجائے اس نے قدیم بادشاہوں کے نقش قدم پر چل کر انہیں ملک میں بلا کر ان کی تعداد اور بڑھائی ہوتی، اور اگر ہنری ہفتم نے پارلیمنٹ کا مجوزہ قانون جہازرانی مسترد نہ کر دیا ہوتا تو انگلستان کی اون کی صنعت اور جہازرانی کتنے پہلے خوشحالی کے ایک بلند درجہ کو پہنچ چکی ہوتی۔

فرانس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ملکی صنعتیں، اندرون ملک میں آزاد روابط، خارجی تجارت، ماہی گیری، جہازرانی اور بحری قوت، الغرض ایک دولتمند اور مالدار قوم کے جملہ صفات، جنہیں انگلستان نے کہیں صدیوں کی بہم کوشش کے بعد حاصل کیا تھا، ایک بڑے دماغ کے طفیل چند سال میں سب یوں حاصل ہو گئے، گویا جادو کا کھیل تھا ! لیکن پھر تعصب مذہبی اور استبداد کے پنجۂ آہنی نے انہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ مٹا بھی دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قوت کے ساتھ پابندیاں عائد کرنے کے مقابلہ میں غیر مساعد حالات میں آزاد تجارت کا اصول بیکار رہا ہے، اہلِ ہنزا نیست و نابود ہو گئے ! اور

انگلستان و فرانس کی حمایتوں تلے ہالینڈ زوال آمادہ ہو گیا!

یہ بات کہ پابندیاں عائد کرنے کی سیاستِ تجارتی اسی وقت تک موثر رہ سکتی ہے جب تک کہ اس کی پشت پر ترقی پذیر تمدن اور آزاد قومی افادہ گاہیں ہوں، اس کا سبق ہمیں ملتا ہے وینس، ہسپانیہ اور پرتگال کے زوال سے، اعلانِ نانٹس کی منسوخی پر فرانس کے رجعت قہقری سے، اور یہی انگلستان کی تاریخ سے، کہ اس مملکت میں ہمیشہ آزادی نے صنعت، تجارت اور قومی خوش حالی کے ساتھ ساتھ قدم بڑھایا ہے۔

اور اس کے برخلاف یہ بات کہ بہت ترقی یافتہ تمدن بھی خواہ اس میں آزاد افادہ گاہیں ہوں یا نہ ہوں، اگر اس کی مدد پر ایک صحیح سیاستِ تجارتی نہیں ہے تو وہ قوم کی معاشی ترقی کا ضامن نہیں ہو سکتا، ہمیں ایک طرف تو شمالی امریکہ کی آزاد ریاستوں کی تاریخ بتلاتی ہے اور دوسری طرف جرمنی کا تجربہ۔

جدید جرمنی کی چونکہ کوئی متحدہ اور مضبوط تجارتی سیاست نہیں ہے، خود اپنے ملکی بازار میں اسے ایک ایسی بیرونی صنعتی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو ہر حیثیت سے اس سے افضل ہے، اور چونکہ بیرونی منڈیوں سے اسے من مانی استبدانہ پابندیوں نے بند کر رکھا ہے اور اس نے خود بھی اپنی صنعت میں ایسی ترقی نہیں کی جو اس کے تمدن کا آئینہ ہے، لہٰذا یہ اس قابل بھی نہیں کہ اپنی سابقہ حیثیت کو ہی برقرار رکھ سکے اور اب یہ قوم اس سے نو آبادی کا سا بیجا فائدہ اٹھائے کی جس سے جرمن تاجروں نے کبھی پہلے بیجا فائدہ اٹھایا تھا، حتیٰ کہ جرمن ریاستیں متفقہ فیصلہ کر کے ایک مشترک

اور مضبوط تجارتی سیاست کے ذریعہ اپنے ملکی بازار کو جرمن صنعت کے لئے محفوظ کر دیں۔
شمالی امریکہ کی آزاد ریاستوں کو اور سب قوموں سے زیادہ آزادی تجارت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ اور ان پر خود مختاری کے پاتے ہی اس عالمی مسلک معاشی کا اثر بھی پڑا ہے، اس لئے یہ ریاستیں اور سب سے زیادہ اس اصول کے مطابق چلنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن برطانیہ عظمیٰ سے دو مرتبہ جنگوں کے باعث یہ قوم دو بار مجبور رہی کہ جو مصنوعات یہ دوسری قوموں سے حاصل کرتی تھی وہ خود اپنے یہاں تیار کرے، اور پھر دونوں مرتبہ صلح کے بعد پھر پیسی مقابلہ کی وجہ سے یہ تباہی کے کنارے آن لگی تب کہیں جا کر یہ متنبہ ہوئی کہ دنیا کی موجودہ حالت میں سب بڑی قوموں کو دوسری سب باتوں سے پہلے اپنی قوتوں کی خود اختیاری اور متناسب ترقی کا سامان کرنا چاہیئے تاکہ مستقل مرفہ الحالی اور آزادی کی ضمانت ہو جائے۔

چنانچہ تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ تجارت پر پابندیاں تخیلی دماغوں کا اختراع نہیں ہیں، بلکہ اغراض کے اختلاف کا، یا قوموں کی خود مختاری کی کوشش یا بیجا اقتدار حاصل کرنے کی سعی کا، یعنی قومی رقابتوں اور جنگوں کا قدرتی نتیجہ ہیں؛ اور اس لئے بس اسی وقت ختم بھی ہو سکتی ہیں جبکہ قومی اغراض کا تضاد مٹ جائے، اور سب قومیں ایک ہی نظام و آئین کے ماتحت آ جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں سوال گویا ایک ہی ہیں، یعنی یہ سوال کہ قومیں ایک جمعیت اقوام میں منضم ہو بھی سکتی ہیں اور ہو سکتی ہیں تو کیونکر، اور خود مختار قوموں کے اختلافات بجائے اسلحہ کی قوت کے آئینی فیصلہ سے کیونکر طے پا سکتے ہیں، اور یہ سوال

کہ قومی نظام ہائے تجارتی کے بجائے تمام دنیا میں آزاد تجارت کس طرح قائم کی جائے ؟

انفرادی قوموں کی یک طرفہ کوشش کرد۔ ایک ایسی قوم کے مقابلہ میں جو اپنی صنعت، دولت اور قوت کے سبب سے، نیز اپنے مضبوط تجارتی نظام کے باعث اور قوموں میں ممتاز ہے، آزاد تجارت جاری کریں (جیسا ۱۷۰۳ء میں پرتگال نے ۱۷۸۶ء میں فرانس نے ۱۷۸۶ء اور ۱۸۱۶ء میں شمالی امریکہ نے ۲۱-۱۸۱۵ء میں روس نے، اور جرمنی نے صدیوں تک کی ہے) سب کی سب بتاتی ہیں کہ اس طریقہ سے انفرادی اقوام کی خوش حالی کی بھینٹ چڑھتی ہے اور کل انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، صرف وہ قوت جو صنعت و تجارت میں اوروں سے ممتاز ہے وہ مالامال ہو جاتی ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم بعد میں بتلائیں گے سوئٹزرلینڈ اس سے مستثنیٰ ہے، کہ اس کی حالت سے جتنا ایک نظام کے موافق یا مخالف ثابت ہوتا ہے اتنا ہی دوسرے کے موافق یا مخالف۔

ہمارے نزدیک کالبیر اس نظام کا مخترع نہ تھا، جسے اطالوی لوگوں نے اس کے نام سے منسوب کر دیا ہے کیونکہ، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نظام کو تو مدتوں پہلے انگریز تکمیل کو پہنچا چکے تھے، کالبیر نے تو صرف اس چیز کو چالو کر دیا جسے فرانس اگر وہ اپنا قومی مقصد وجود پورا کرنا چاہتا تو کبھی نہ کبھی ضرور چلاتا، اور اگر کوئی الزام لگانے پر تلا ہی ہو تو کالبیر پر بس یہ الزام لگ سکتا ہے کہ اس نے ایک استبدادی حکومت کے ماتحت وہ کرنا چاہا جو صرف حالات سیاسی کی بنیادی اصلاح کے بعد ہی مستقل طور پر ہو سکتا تھا۔

لیکن اس الزام کے مقابلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کالبیر کے نظام کو دانشمند حکمرانوں

اور وزیِ ہوش وزراء نے جاری رکھا ہوتا، تو غالباً تدریجی اصلاح سے یہ اُن تمام روکوں کو ہٹا دیتا جو صنعت، زراعت اور تجارت کی ترقی کی راہ میں اور خود قومی آزادی کی راہ میں حائل تھیں۔ پھر تو فرانس میں کوئی انقلاب بھی نہ ہوتا، بلکہ صنعت و حریت کے باہمی عمل اور ردِعمل سے اس کی ترقی بڑھتی اور وہ اس وقت ڈیڑھ صدی سے صنعت میں اندرونی ذرائع آمد و رفت کی ترقی میں، تجارت خارجہ اور نو آبادیوں میں، اور ماہی گیری مرکنٹائل اور جہازرانی و بحری قوت کے معاملہ میں کامیابی کے ساتھ انگلستان کا مقابلہ کر رہا ہوتا۔

آخر میں تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ وہ قومیں جنہیں فطرت کی طرف سے دولت و قوت کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچنے کے وسائل دیئے گئے ہیں، وہ اس مقصد کو پسِ پشت ڈالے بغیر اپنے درجۂ ترقی کے اعتبار سے اپنے نظامِ تجارتی کو بدل سکتی ہیں، بلکہ بدلنے پر مجبور ہوتی ہیں، یعنی پہلے تو یہ زیادہ ترقی یافتہ قوموں سے آزاد تجارت کے ذریعہ اپنے کو بربریت سے آگے بڑھاتی ہیں، اور اپنی زراعت کو ترقی دیتی ہیں، اس کے بعد پابندیاں عائد کر کے اپنی صنعت، اپنی ماہی گیری، جہازرانی اور اپنی تجارت خارجہ کو فروغ بخشتی ہیں، اور آخر میں جب دولت اور قوت کی معراج کو پہنچ جاتی ہیں تو رفتہ رفتہ آزاد تجارت اور اپنے اور پرائے بازاروں میں آزاد مقابلہ کے اصول کی طرف رجعت کر کے اپنے ملاحوں، صناعوں اور تاجروں کو سستی و کاہلی سے بچاتی ہیں اور انہیں اکساتی ہیں کہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی فضیلت کو برقرار رکھ سکیں۔ پہلی منزل میں اسپین، پرتگال اور نیپلز ہیں، دوسری میں جرمنی اور شمالی امریکہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرانس آخری منزل کی سرحد سے بہت قریب آچکا ہے، اور فی الوقت یہ آخری منزل حاصل کی ہے صرف برطانیہ عظمیٰ نے۔

دوسری کتاب

نظریہ

باب (۱)

معیشتِ ریاست اور معیشتِ عالم

کینے اور فرانسیسی معاشیین سے پہلے بس ایک عملی علم المعیشت کا وجود تھا جس پر ریاست کے حکام کاربند ہوتے تھے۔ جو اہل کار اور مصنف انتظام ملکی کے معاملات پر کچھ لکھتے تھے، ان کی تمام تر توجہ خود اپنے ملک کی زراعت، صنعت، تجارت اور جہاز رانی پر ہوتی تھی، یہ نہ تو دولت کے اسباب کی تجزی کرتے تھے، نہ اتنے آگے بڑھتے تھے کہ

سارے عالم کے اغراض کو پیش نظر رکھیں۔

سب سے پہلے کینے نے، جس کے یہاں عام آزادی تجارت کا خیال پیدا ہوا، اپنی تحقیق کو تمام نوع انسانی پر وسعت دی، اور قوم کے تصور کا بالکل خیال نہ کیا، اس کتاب کا نام ہے حکومت طبیعی یا نوع انسانی کے لیے مفید ترین حکومت"[1] یہ چاہتا ہے کہ ہم یہ تصور کریں کہ "تمام قوموں کے تاجر مل کر ایک تجارتی جمہوریت بناتے ہیں" ظاہر ہے کہ کینے معاشیات عالم سے بحث کرتا ہے، یعنی اس علم سے جو یہ بتائے کہ کل نوع انسانی بحیثیت مجموعی کیونکر مرفہ الحالی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں معاشیات ریاست وہ علم ہے جو صرف یہ سکھانے پر اکتفا کرتا ہے کہ دنیا کے موجود، حالات میں کوئی مخصوص قوم زراعت صنعت اور تجارت کے ذریعہ کیونکر مرفہ الحالی تہذیب اور قوت حاصل کر سکتی ہے۔

آدم اسمتھ کا بھی یہی وسیع مسلک ہے، اس لئے کہ اس نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے کہ ساری دنیا میں تجارت کی آزادی مطلق کے تصور عالمی کو حق بجانب قرار دے۔ باوجود ان بدیہی غلطیوں کے جو طبعیین نے خود نفس فطرت اور منطق کے خلاف کی تھیں کینے کی طرح آدم اسمتھ نے بھی کبھی یہ مقصد پیش نظر نہ رکھا کہ ریاست کی معیشت سے بحث کرے، یعنی اس سیاست سے جس پر عامل ہو کر مخصوص قومیں اپنے معاشی حالات میں

[1] Physiocratie ou government le plus advantageax au genre humain"

ترقی کرسکیں، یہ اپنی کتاب کا نام رکھتا ہے" دولت اقوام کی ماہیت اور اس کے اسباب" یعنی نسلِ انسانی کی تمام قوموں کی دولت کے اسباب۔ یہ اپنی تصنیف کے ایک مخصوص حصہ میں معاشیات ریاست کے مختلف نظاموں کا ذکر صرف اس غرض سے کرتا ہے کہ ان کا بیکار ہونا ظاہر کرے، اور یہ ثابت کرسکے کہ اس معاشیات ریاست یا معاشیات قومی کی جگہ معاشیات عالم کو لے لینی چاہئے۔ اگر یہ کہیں کہیں جنگ کا ذکر کرتا ہے تو وہ بھی یوں ہی اتفاقیہ، اس کے تمام دلائل کی بنیاد امن دائم کے تصور پر ہے۔ خود اس کے سوانح نگار ڈوگالڈ اسٹورٹ کا قول ہے کہ اس کی تحقیق شروع ہی سے اس خیال پر مبنی تھی کہ "ریاست کی وہ کارروائیاں جو عام خوشحالی کو بڑھانے کے لئے کی جاتی ہیں" ان میں سے اکثر غیر ضروری ہیں اور پست سے پست بربریت کی حالت سے بلند سے بلند مرفہ الحالی کے مدارج تک پہنچنے کے لئے قوم کو سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہئے کہ اس کی مملکت میں محاصل (ٹیکس) قابل برداشت ہوں، اچھی طرح انصاف ہوتا ہو اور امن ہو"۔ ظاہر ہے کہ "امن" سے آدم اسمتھ کا مطلب وہی پادری سین پیئر کا "دائمی اور محیط عالم امن ہے"۔

ج۔ب۔ سے تو صاف لفظوں میں مطالبہ کرتا ہے کہ عام آزادی تجارت کے خیال کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایک جمہوریت عالم کے وجود کا تصور قائم کرنا چاہئے۔ یہ مصنف جس کی سعی بس اسی حد تک محدود تھی کہ آدم اسمتھ نے جو مسالہ فراہم کر دیا ہے اس سے ایک نظام مرتب کرے اپنی کتاب "Economie politique pratiqne

اچھی جلد میں، صفحہ ۱۸۲ پر کہتا ہے: "ہم ایک خاندان کے معاشی اغراض پر نظر ڈال سکتے ہیں جس کے سر پر گھر کا باپ ہوتا ہے اس کے متعلق جو اصول اور ملاحظات ہوں گے ان سے معاشیات شخصی مرتب ہو گی، لیکن جو اصول پوری کی پوری قوموں سے تعلق رکھتے ہیں (خواہ بجائے خود یا دوسری اقوام کے مقابلہ میں) وہ مل کر معاشیات عامہ Economiepublique بناتے ہیں، اور بالآخر معاشیات ریاست Economiepolitique سب قوموں کے اغراض سے بحث کرتی ہے، یعنی جماعت انسانی سے بحیثیت عمومی"۔

اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ سے معاشیات قومی یا معاشیات ریاست کے وجود کو معاشیات عامہ کے نام سے تسلیم کرتا ہے، لیکن اپنی کتاب میں کہیں اس سے بحث نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ ایک مسلک کو جو بظاہر عالمی ہے۔ یہ معاشیات ریاست (Economiepolitique) کا نام دیتا ہے، اور اس میں ہر جگہ صرف اس معاشیات کا ذکر کرتا ہے جو کل جماعت انسانی ہی کے اغراض کو پیش نظر رکھتی ہے اور منفرد اقوام کے جدا جدا اغراض کا بالکل خیال نہیں کرتی۔

ناموں کا یہ ادل بدل قابل چشم پوشی ہوتا، اگر سے ان اصولوں کی تشریح کے بعد جنہیں یہ معاشیات ریاست کہتا ہے (لیکن جو دراصل معاشیات عالم یا کل نسل انسانی کی معاشیات ہے) ہمیں اس علم کے اصول سے آگاہ کر دیتا جسے یہ معاشیات عامہ کہتا ہے لیکن جو دراصل مخصوص قوموں کی معاشیات یا معاشیات ریاست کے

علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں۔ اس مسلک کی تعریف و توضیح میں البتہ ایسے مشکل سے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ قوم کے تصور اور اس کی ماہیت سے شروع کرے اور بتائے کہ کل نوع انسانی کی معاشیات میں اس بات سے کیا کیا بنیادی تغیر پیدا ہو جاتے ہیں، کہ یہ نوع فی الوقت علیحدہ علیحدہ قوموں میں منقسم ہے جو مشترکہ توارے اور اغراض کی وحدت کے مرکز ہیں، اور اپنی فطری آزادی کے باعث اسی قسم کے دوسری جماعتوں کے مدمقابل لیکن چونکہ اس نے اپنی عالمی معاشیات کو معاشیات ریاست کا نام دے دیا اس لئے اس توضیح سے بچ نکلا اور الفاظ کے تغیر سے تغیر معنی کا مقصد بھی حاصل کر لیا، اور اس طرح بہت سی نہایت شدید نظری غلطیوں پر پردہ ڈال دیا۔

بعد کے سب مصنف بھی اس غلطی میں اس کے شریک ہیں۔ اسمانڈی بھی معاشیات ریاست کو بالتصریح وہ علم بتلاتا ہے جو "نوع انسان کی خوشحالی" سے متعلق ہے چنانچہ آدم سمتھ اور اس کے چیلے درحقیقت ہمیں کوئی دوسری چیز نہیں سکھاتے سوائے
Rev' اس کے جو کینے اور اس کے مقلدوں نے ہمیں بتائی تھی، کیونکہ
methodique کے اس مضمون میں جس میں "طبعیین" کا ذکر ہے کم و بیش انہیں الفاظ میں ہے کہ "افراد کی خوشحالی بالکل نسل انسانی کی خوشحالی پر منحصر ہے"۔ شمالی امریکہ میں تجارت آزاد کے سب سے پہلے حامی (آدم سمتھ کے سے معنی میں) کولمبیا کالج کے صدر ٹامس کوپر نے تو قومیت کے وجود ہی سے انکار کر دیا ہے، یہ قوم کو ایک "نحوی اختراع" سے تعبیر کرتا ہے" جو

صرف اس لئے کی گئی ہے کہ بیان میں ایرپھیر سے طوالت نہ ہو، ایک معدوم شے جس کا کوئی وجود سوائے سیاسیین کے دماغوں میں اور کہیں نہیں" کو پرکم سے کم اپنے مسلک پر آخر تک قائم تو ہے کیونکہ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جب کوئی قوموں کے وجود، ان کی ماہیت اور اغراض کو تسلیم کرلے تو یہ بھی لازم ہو جاتا ہے کہ کل جماعت انسانی کی معاشیات کو ان مخصوص اغراض کے مطابق تبدیل بھی کیا جائے اور جب آدمی کا ارادہ یہ ہو کہ ان تبدیلیوں کو غلط ثابت کرے تو یہ نہایت ہوشیاری کی بات ہے کہ سرے سے قوم کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے۔

رہا ہمارا معاملہ سو یہ بات ہم سے بہت بعید ہے کہ ہم معاشیات عالم کے اس نظریہ کو جسے مروجہ مذہب معاشی نے نیا دکیا ہے بالکل مسترد کر دیں۔ ہماری رائے صرف یہ ہے کہ معاشیات ریاست کی بھی (جسے تتے معاشیات عامہ کا نام دیتا ہے) علمی ترتیب ہو سکتی ہے، اور بہتر یہی ہے کہ چیزوں کو ان کے صحیح نام سے پکارا جائے، بجائے اس کے کہ انہیں کوئی ایسا نام دیا جائے جو الفاظ کے صحیح معنی سے مختلف ہو۔

اگر ہم قوانین منطق اور ماہیت اشیاء کی پابندی کریں تو ہمیں معاشیات شخصی کے مقابلہ میں معاشیات جماعتی کو رکھنا چاہیے، اور اس میں دو چیزوں کی تفریق کرنی چاہیے اول معاشیات ریاست یا معاشیات قومی جو قومیت کے تصور اور اس کی ماہیت سے شروع ہوتی ہے اور یہ بتلاتی ہے کہ کوئی قوم دنیا کی موجودہ حالت میں اور اپنے مخصوص قومی حالات میں اپنے معاشی معاملات کو کس طرح قائم رکھ سکتی اور کیونکر ترقی دے

سکتی ہے، دوسرے معاشیات عالم جو اس مفروضہ سے آگے چلتی ہے کہ دنیا کی ساری قومیں ایک واحد جماعت ہیں اور دائمی امن کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

اگر ہم مروجہ مذہب معاشی کے مطالبہ کے مطابق یہ فرض کرلیں کہ ایک عالمی اتحاد یا تمام اقوام کا عہد یہ دائمی امن کی ضمانت ہے تو پھر بین الاقوامی تجارت آزاد کا اصول بالکل حق بجانب معلوم ہوتا ہے، فرد یا اپنی بھلائی کی تلاش میں جس قدر کم پابندیاں ہوں گی۔ جن لوگوں سے اس کا بے روک ٹوک کاروبار ہے ان کی تعداد اور ان کی دولت جس قدر زیادہ ہوگی، اس کی انفرادی کوششوں کا میدان عمل جس قدر وسیع ہوگا، اسی قدر آسانی اسے اس بات میں ہوگی کہ قدرت نے جو صفات اسے عطا کی ہیں یا خود جو علم اور مہارت اس نے حاصل کیا ہے اور قدرت کی جو قوتیں اس کی دسترس میں ہیں، ان سب کو اپنی خوشحالی کے بڑھانے میں صرف کرے۔ اور جو حال افراد کا ہے وہی جماعتوں صوبوں اور علاقوں کا ہے صرف ایک بیوقوف یہ کہہ سکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا، یا فرانس کے صوبوں کا یا جرمنی کی ریاستوں کا اتحاد تجارتی ان کے لئے کم مفید ہے اور صوبہ دار محاصلی حدود سے ان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا زیادہ مفید۔

برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کی تینوں مملکتوں کے اتحاد میں دنیا کے لئے ایک عظیم الشان اور ناقابل تردید مثال موجود ہے ان بے حساب مفید اثرات کی جو متحدہ اقوام میں تجارت کی آزادی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر فرض کیجئے کہ دنیا کی تمام قومیں اسی طرح متحد ہوجائیں تو پھر قوی سے قوی قوت تخیل بھی خوشحالی اور خوش بختی کے اس مجموعہ کا تصور نہیں کرسکتی، جو

اس اتحاد کی وجہ سے نوع انسانی کے لئے لازماً پیدا ہوگی۔

بلاشبہ اتحاد عالم اور امن دائم کا تصور عقلاً اور مذہباً دونوں طرح قابل ستائش ہے[1] جبکہ خود افراد کے باہمی تنازعے خلاف عقل ہیں تو قوموں کے جھگڑے تو بہت ہی زیادہ خلاف عقل ہونے چاہئیں۔ تہذیب انسانی کی تاریخ سے معاشیات جماعتی جو ثبوت اس تجویز کی موافقت میں پیش کر سکتی ہے کہ سب قومیں ایک قانون حق کے ماتحت متحد ہو جائیں۔ وہ انسانی عقل سلیم کے لئے سب سے زیادہ قابل فہم ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جہاں افراد میں باہم حالت جنگ ہوتی ہے وہاں انسانی مرفہ الحالی پست ترین منزل پر ہوتی ہے، اور جس نسبت سے ان میں اتحاد بڑھتا ہے اسی نسبت سے یہ خوش حالی بھی ترقی کرتی ہے، نوع انسانی کی حالت ابتدائی میں خاندان کی جمعیت ہوتی، پھر شہر، پھر شہروں کی جمعیتیں، پھر بڑے بڑے علاقوں کے اتحاد اور آخر میں کئی کئی ریاستوں کے ایک ہی قانون کے ماتحت اتحاد۔ تو اگر تاریخ اشیاء اس قدر قوی ثابت ہوتی ہے کہ وہ اتحاد جس کا آغاز خاندان سے ہوا تھا اسے

---

[1] عیسائی مذہب امن دائم کی تلقین کرتا ہے لیکن جب تک یہ بشارت پوری نہیں ہوتی کہ "ایک گلہ ہوگا اور ایک گلہ بان" اس وقت تک کوئیکر Quaker لوگوں کے اصول پر خواہ وہ بجائے خود کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو مشکل ہی سے عمل ہو سکتا ہے۔ عیسائی مذہب کے الہٰی الاصل ہونے کا اس سے بہتر کوئی ثبوت نہیں کہ اس کے مسائل اور اس کے دعوے نسل انسانی کی مادی اور روحانی دونوں قسم کی خوشحالی کے عین مطابق ہیں۔ (مصنف)

کروڑوں انسانوں پر وسعت دے دے تو پھر یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی قوی بھی ثابت ہو سکے گی کہ تمام قوموں کا اتحاد عمل میں لے آئے۔ اگر ذہن انسانی میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اس قدر اتحاد کے فوائد کو سمجھ سکے تو اس میں یہ صلاحیت بھی ہو گی کہ کل نسل انسانی کے اتحاد کے فوائد کو بھی سمجھ سکے۔ اور ذہن عالم کے اس رجحان کا بہت سی نشانیاں دیتی ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں صرف علوم و فنون اختراعات صنعت اور نظام جماعتی کی ترقیوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ بات یقین کے ساتھ نظر آتی ہے کہ دس بیس سال گذرنے کے بعد ذرائع آمد و رفت کی تکمیل کے باعث دنیا کی مختلف قومیں مادی اور ذہنی تعلقات باہمی کے اعتبار سے اس سے زیادہ قریب ہو جائیں گی جتنی کہ ایک صدی پیشتر انگلستان کے مختلف اضلاع ایک دوسرے سے تھے، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ قریب۔ آج بھی بر اعظم کی حکومتوں کے ہاتھ میں آلہ دور نویسی کا ایسا ذریعہ موجود ہے کہ آپس میں اس طرح گفت و شنید کر لیں گویا سب ایک ہی جگہ پر ہیں۔ ایسی عظیم الشان قوتوں نے جن کا پہلے علم بھی نہ تھا صنعت کو آج تکمیل کے اس درجہ کو پہنچا دیا ہے کہ پہلے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، اور اس سے زیادہ عظیم الشان قوتوں نے اپنے ظہور کی خبر دے دی ہے۔ اور ظاہر ہے صنعت جس قدر بڑھے گی اور تمام عالم میں اس کی تقسیم جس قدر مساوی ہو گی اسی قدر جنگ کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

قومیں جو صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں وہ ایک ہفتہ کے اندر ایک دوسرے کو اتنا نقصان پہنچا سکتی ہیں کہ پوری ایک نسل میں اس کی تلافی ممکن نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی

ہے کہ یہ جدید قوتیں جنھوں نے اب تک دولت آفرینی میں مدد دی ہے وہ تباہی میں بھی مدد دینے سے دریغ نہ کریں گی۔ یہ قوتیں دفاع کی غرض سے خصوصاً یورپ کی براعظمی قوموں کو بہت ہی مفید پڑیں گی اور انگلستان کو اس فضیلت سے محروم کر دیں گی جو اسے اپنے علیحدہ جزیرہ ہونے کی وجہ سے دفاع کے معاملہ میں حاصل تھیں۔ یورپ کی دول عظمیٰ کی جو کانگرسیں ہوتی ہیں ان میں آئندہ جمعیت اقوام کا تخم موجود ہے اور قومی اختلافات کو طے کرنے کے لئے گفت و شنید کا طریقہ، اسلحہ کے ذریعہ انصاف کرنے کے طریقے پر بظاہر غالب آتا جاتا ہے۔ ماہیت دولت و صنعت کے متعلق صحیح خیالات نے تمام متمدن اقوام کے بہتر دماغوں کو یقین دلا دیا ہے کہ غیر متمدن یا نصف متمدن اقوام میں یا ان قوموں میں جو تمدن کے اعتبار سے پیچھے ہٹ گئی ہیں، تہذیب پھیلانے اور نو آبادیاں بسانے میں متمدن ممالک کے لئے اپنے قوائے دولت آفریں کے نشو و نما کا ایسا موقع ہے کہ اس کے ثمرات باہمی مخاصمت یا مخالفانہ تجارتی کارروائیوں سے زیادہ کثیر اور زیادہ یقینی ہیں۔ اس بات کا علم جس قدر ترقی کرتا جائے گا، ذرائع آمد و رفت کی ترقیوں کے باعث غیر متمدن ممالک جس قدر متمدن اقوام کی دسترس میں آتے جائیں گے، اسی قدر زیادہ ان متمدن قوموں میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جو قومیں غیر متمدن ہیں یا جو اندرونی مزاج کے باعث منتشر ہیں، یا جو خراب حکومت کے باعث مظلوم ہیں ان میں تہذیب و تمدن پھیلانا ایسا کام ہے جس سے سب کو برابر فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ ایک فرض ہے جو ان سب پر یکساں عائد ہوتا ہے، لیکن یہ پورا اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ان میں باہم اتحاد ہو۔

یہ بات کہ تمام قوموں میں تہذیب پھیلانا اور کل کرۂ ارض کو متمدن بنانا ایک فرض ہے جو کل نوع انسانی پر عائد ہوتا ہے قدرت کے ان اٹل قوانین سے ظاہر ہے جو متمدن اقوام کو مجبور کر کے اس طرف لے جاتے ہیں کہ اپنے تولئے دولت آفرین کو کم متمدن ممالک پر پھیلائیں تہذیب و تمدن کے اثر سے آبادی، قوائے دولت آفرین اور ذہنی اور مادی سرمایہ سب اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ لامحالہ کم متمدن ممالک تک یہ نکلتے ہیں جب ملک کی زمین اپنی آبادی کو غذا پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہوتی اور زرعی آبادی کے لئے شغل مہیا نہیں کر سکتی تو یہ فاضل آبادی دور دراز ممالک میں قابل کاشت زمین تلاش کرتی ہے جب صلاحیت کار اور صنعتی مہارت کی کسی قوم میں اس قدر بہتات ہو جاتی ہے کہ وہاں اسے کافی معاوضہ نہ مل سکے تو یہ ان ملکوں کی راہ لیتے ہیں جہاں ان کی پوچھ ہو جب مادی سرمایہ کی کثرت کی باعث شرح سود اس قدر گھٹ جاتی ہے کہ چھوٹے موٹے سرمایہ دار اس پر گذارہ نہیں کر سکتے تو پھر یہ کوشش کرتے ہیں کہ اسے کم دولت مند ممالک میں کام میں لگائیں۔

مذہب رائج کی تہ میں یوں تو ایک صحیح خیال ہے جس کو تسلیم کرنا اور ترقی دینا علم کا فرض ہے، اگر یہ علم اپنے اس مقصد وجود کو پورا کرنا چاہتا ہے کہ دنیائے عمل میں روشنی پہنچائے اور یہ ایسا خیال ہے کہ عملی دنیا میں اسے نظر انداز کرنے سے گمراہی لازمی ہے۔ البتہ مذہب رائج نے قوموں کی ماہیت ان کے مخصوص اغراض و حالات کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور نہ یہ کوشش کی ہے کہ ان اغراض و حالات کو اتحاد عالم اور امن دائم کے تصور سے مطابق کر دے۔

اس مذہب رائج نے ایک ایسی حالت کو موجود فرض کر لیا ہے جو آئندہ وجود میں آنی چاہیئے یعنی یہ اتحاد عالم اور امن دائم کا وجود فرض کر لیتا ہے، اور اس مفروضہ سے آزادی تجارت کے فوائد مشتق کرتا ہے اور اس طرح نتیجہ کو سبب سے بدل دیتا ہے۔ جو صوبے (یا ممالک) باہم متحد ہو چکے ہیں ان میں تو امن دائم قائم ہے، اور اسی اتحاد کی وجہ سے ان میں اتحاد تجارتی پیدا ہوا ہے، اور آپس میں دائمی امن کے باعث یہ تجارتی اتحاد ان کے لئے اتنا سود مند بھی ثابت ہوا ہے۔ اُن سب مثالوں میں جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے سیاسی اتحاد پہلے ہوا ہے، اور تجارتی اتحاد اس کے بعد، تاریخ ایک بھی ایسی مثال سے آشنا نہیں جہاں تجارتی اتحاد پہلے رونما ہوا ہو، اور سیاسی بعد میں۔ اس خیال کے لئے نہایت قوی اور ہماری رائے میں ناقابل تردید وجوہ ہیں کہ دنیا کی موجودہ حالت میں عام تجارتی آزادی سے جمہوریت عالم وجود میں نہیں آسکے گی بلکہ کم ترقی یافتہ ممالک کی عالمگیر پابندی اور صرف ایک ممتاز صنعتی تجارتی اور بحری قوت کا اقتدار اعلیٰ پیدا ہوگا۔

شاہ ہنری چہارم اور پادری سینٹ پیئر کے معنوں میں ایک جمہوریت عالم یا اقوام دنیا کی ایک ایسی جمعیت جس میں یہ قومیں باہم ایک قانون حق کو تسلیم کر لیں، اور تلافی مافات کے لئے خود کوئی کارروائی کرنے سے محترز رہیں، یہ جمہوریت تو صرف اسی وقت قائم ہو سکتی ہے کہ بہت سی قومیں صنعت و تہذیب، سیاسی تعلیم اور قوت، کے تقریباً مساوی درجہ پر پہنچ چکی ہوں۔ اس اتحاد اقوام کی تدریجی تعمیر کے ساتھ ساتھ ہی آزاد تجارت بڑھ سکتی ہے، صرف اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ تمام قوموں کو وہی عظیم الشان فوائد نصیب

ہوں جو ہم متحدہ صوبوں اور ریاستوں میں آج دیکھتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہی ہے کہ نظام تامین ان قوموں کو جو تہذیب و تمدن میں پیچھے رہ گئی ہیں۔ ایک ممتاز قوم کے برابر لانے کا تنہا ذریعہ ہے، کہ اس قوم کو قدرت سے صنعت کا کوئی اجارہ تو ملا ہے نہیں، بلکہ صرف اتنی بات ہے کہ اس نے اوروں سے پہلے اس میدان میں قدم اٹھایا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیو تو نظام تامین اس مطلوبہ اتحاد اقوام کو ترقی دینے، اور اس طرح حقیقی آزادی تجارت کے وجود میں لانے کا سب سے اہم ذریعہ ہے، اور اسی طرح معاشیات قومی وہ علم ہے جو قوموں کے موجودہ اغراض اور مخصوص حالات کا خیال رکھ کر یہ سکھاتا ہے کہ ہر ایک قوم کو اپنی اپنی جگہ کس طرح صنعتی ترقی کے اس درجہ پر پہنچایا جائے جہاں پہنچ کر دوسری برابر کی ترقی یافتہ قوموں سے اتحاد اور (بطور نتیجہ) آزادی تجارت ممکن اور مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن مذہب رائج نے ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے میں غلط ملط کر دیا ہے اور اس شدید غلطی میں مبتلا ہے کہ قوموں کے حالات پر بالکل عالمی اصولوں کے ماتحت حکم لگاتا ہے اور سیاسی وجوہ سے خود قوائے دولت آفریں کے عالمی رجحانات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

قوائے دولت آفریں کے عالمی رجحانات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی مالتھس اس غلطی میں پڑا کہ اضافہ آبادی کو روکا جائے، اسی وجہ سے حال میں چامرا ور ٹارنس کے یہاں یہ عجیب و غریب خیال پیدا ہوا کہ سرمائے کی زیادتی اور بے روک ٹوک پیداوار ایسی برائی ہے جس کا روکنا جماعتی خوش حالی کے لئے ضروری ہے، اور اسی وجہ سے سسمانڈی

کارخانوں کو ہیئت اجتماعی کے لئے مضر چیزیں سمجھتا تھا۔ ان کے نظریہ کی مثال رومی دیوتا زحل کی سی ہے جو اپنے بچے آپ نگل جاتا تھا، وہی نظریہ جو کہتا ہے کہ آبادی، سرمایہ اور مشینوں کے اضافہ سے تقسیم کار پیدا ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے جماعت کی خوشحالی، وہی آخر میں آکر ان قوی کو ایسے ہیبتناک ہوّے ثابت کرتا ہے، جو قوموں کی خوشحالی کو خطرہ میں ڈالے دیتے ہیں، اور یہ صرف اس لئے کہ ان لوگوں کے پیش نظر علیحدہ علیحدہ قوموں کے موجودہ حالات ہیں۔ اور یہ کل کرہ زمین کے حالات اور آئندہ انسانی ترقی کو نظر انداز کرتے ہیں۔

یہ صحیح نہیں کہ آبادی ذرائع بود و باش کے تناسب سے زیادہ بڑھتی ہے پس عدم تناسب کو فرض کرنا یا اسے مصنوعی حسابوں یا سفسطائی دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا اس وقت تک تو ضرور حماقت ہے، جب تک کہ کرہ ارض پر قدرتی قوتوں کا اتنا ذخیرہ بیکار پڑا ہے کہ اس کے ذریعہ موجودہ تعداد سے دس گنے بلکہ سو گنے آدمی پرورش پا سکتے ہیں۔

یہ تو بڑی تنگ نظری کی بات ہے کہ قوائے دولت آفریں کی موجودہ حالت کو اس کا معیار بنایا جائے کہ ایک مقررہ رقبہ زمین پر کتنے آدمی گذر کر سکتے ہیں۔ ایک وحشی انسان ایک شکاری، یا ایک ماہی گیر کے حساب کے مطابق تو دنیا میں مشکل سے دس لاکھ آدمیوں کے لئے جگہ ہوگی، ایک چرواہے کے حساب سے بمشکل ایک کروڑ، اور معمولی کسان کے نقطہ نظر سے کوئی ۱۰ کروڑ نفوس کے لئے لیکن آج صرف یورپ میں ۲۰ کروڑ انسان بستے ہیں

آلو اور جوہری کی کاشت، اور فن زراعت میں نت نئی ترقیوں نے انسانی قوائے دولت آفریں کو فراہمی غذا کے معاملہ میں دوچند بڑھا دیا ہے، قرون وسطیٰ میں ایک ایکڑ زمین پر گیہوں کی فصل کا حاصل چوگنا ہوتا تھا آج دس سے بیس گنے تک ہے، اور پھر پہلے سے ۵ گنی زیادہ زمین پر کاشت ہے۔ بہت سے یورپی ممالک میں، جن کی زمین قدرتی زرخیزی کے اعتبار سے انگلستان جیسی ہی ہے، آج بھی حاصل چار چند سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور پھر نسل انسانی کے انکشافات و اختراعات اور ترقیوں کی حد کون مقرر کر سکتا ہے؟ کیمیائے زرعی ابھی عالم طفولیت ہی میں ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ کل ایک نئے انکشاف یا اختراع سے زمین کی قوت دولت آفریں پانچ یا دس گنی نہ ہو جائے گی؟ آج بھی تو سوت دار کوؤں سے بنجر صحراؤں کو زرخیز کھیت بنانے کا ذریعہ ہمارے پاس موجود ہے، اور کون جانتا ہے کہ مادر گیتی کے بطن میں ابھی کیا کیا قوتیں پنہاں ہیں۔ یہی فرض کر لیجیے کہ کوئی نیا انکشاف ایسا ہو جائے کہ آج کل جو ایندھن معلوم ہیں ان کی مدد کے بغیر نہایت سستے داموں، ہر جگہ گرمی پہنچائی جا سکے، تو زمین کے کتنے بڑے بڑے رقبے قابل کاشت ہو جائیں گے اور ایک مقررہ رقبہ زمین کی موجودہ بار آوری کتنے بے حساب بڑھ جائیگی؟ چنانچہ مالتھس کا مسلک اگر اپنے رجحانات میں تنگ نظری پر مبنی معلوم ہوتا ہے تو اپنی مجوزہ تدابیر کے لحاظ سے ایک خلاف فطرت، مہلک اخلاق، مہلک قوی اور منفیانہ مسلک ہے۔ یہ ایک ایسی خواہش کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ جسے فطرت نے انسانوں کو جسمانی اور ذہنی محنت کے لئے آمادہ کرنے اور ان کے اعلیٰ جذبات اکسانے اور قائم رکھنے کا سبب

قوی ذریعہ بنایا ہے یعنی وہ خواہش کہ نسل انسانی کی ترقی کا بڑا حصہ جس کا رہین منت ہے۔ یہ مسلک چاہتا ہے کہ نہایت بے رحمانہ خود غرضی کو قانون کا درجہ دے دے۔ یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے دلوں کو بھوک پیاس کے ماروں کے خلاف سخت کر لیں کیونکہ اگر ہم نے آج روٹی پانی دیا تو بیس برس کے اندر اس کے بجائے کوئی اور بھوکا پیاسا ہوگا۔ یہ ہمدردی کی جگہ حساب کتاب کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ مسلک تو انسانوں کے دلوں کو پتھر بنا دینے کی فکر میں ہے لیکن آخر میں اس قوم سے کیا توقع کی جا سکتی ہے جس کے شہری اپنے سینوں میں دلوں کے بجائے پتھر لئے پھرتے ہوں؟ اس کے سوائے اور کیا کہ تمام اخلاق کا خاتمہ ہو جائے، اس کے ساتھ قوائے دولت آفریں کا خاتمہ، یعنی قوم کی ساری دولت، ساری تہذیب اور ساری قوت کا خاتمہ؛

اگر کسی قوم میں آبادی غذا سے زیادہ بڑھ جاتی ہے، اگر سرمایہ اس حد تک جمع ہو جاتا ہے کہ اس کے لگانے کا کوئی محل باقی نہیں رہتا، اگر مشینیں مزدوروں کو بیکار کر دیتی ہیں۔ تو یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ قدرت یہ نہیں چاہتی کہ صنعت، تہذیب، دولت و قوت بس ایک ہی قوم کے حصہ میں آئیں، قابل کاشت زمین کے بڑے حصہ پر وحوش و بہائم بستے ہوں، اور نسل انسانی کا بڑا حصہ وحشت جہل اور افلاس کی گہرائیوں میں ڈوبا پڑا رہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ نسل انسانی کے قوائے دولت آفریں پر سیاسی نقطہ نظر سے حکم لگانے کے باعث رائج الوقت مذہب معاشی کن غلطیوں میں مبتلا ہو گیا، اب ہمیں ان غلطیوں کو ظاہر کرنا ہے جو قوموں کے مخصوص اغراض کو عالمی نقطہ نظر سے

دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اگر تمام قوموں میں واقعی ایسا اتحاد ہوتا جیسا کہ شمالی امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں ہے تو جو فاضل آبادی یا صلاحیت اور مہارت اور مادی سرمایہ انگلستان میں ہے وہ براعظم کی ریاستوں میں اسی طرح آن پہنچتا، جس طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مشرقی ریاستوں سے مغربی ریاستوں میں پہنچتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ براعظم ممالک میں بھی ویسی ہی ذات اور املاک کی حفاظت ہو اور دستور اساسی، اور قانون ویسی ہوں۔ اور انگلستان کی حکومت اس عالمگیر اتحاد کی متفقہ مرضی کے ماتحت ہو۔ اگر یہ شرائط پوری ہوں تو پھر تمام ممالک کو دولت اور تہذیب کے اس درجہ پر لانے کے لئے جس پر انگلستان پہنچا ہوا ہے، آزاد تجارت سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔ یہ ہے مذہب رائج کی دلیل، لیکن دنیا کی موجودہ حالت میں آزاد تجارت کے آخر کیا اثرات ہوتے ہیں؟

اہل برطانیہ بہ حیثیت ایک علیحدہ خود مختار قوم کے خود اپنے قومی مفاد کو اپنی سیاست کے لئے مشعل راہ بنائیں گے۔ ایک انگلستان کا باشندہ اس تعلق کے باعث جو اسے اپنی زبان سے، اپنے قوانین، اپنی افادہ گاہوں، اور اپنے رسوم سے ہے جہاں تک ممکن ہوگا اپنی قوتوں اور اپنے سرمایہ کو خود اپنی ملکی صنعت میں لگائے گا۔ اور چونکہ آزاد تجارت کی وجہ سے انگریزی مصنوعات کا بازار تمام ملکوں میں پھیلا ہوگا۔ اس لئے اس کو کافی مواقع بھی اس بات کے میسر آئیں گے اور یہ خیال اس کے ذہن میں مشکل ہی سے آئے گا کہ یہ جا کہ فرانس یا جرمنی میں صنعتیں قائم کرے۔ جو کچھ فاضل سرمایہ ہوگا وہ سب

کا سب دور دراز ملکوں سے تجارت میں لگایا جائے گا، اور اگر کسی انگریز کو اپنے ملک سے ہجرت کرنا ہی ہوتی یا کہیں باہر اپنا سرمایہ لگانا ہی پڑا تو وہ اُن ممالک کو جہاں اس کی زبان، اس کے قوانین اور اس کے ادارے ہیں قریب کے یورپی ملکوں پر ترجیح دیگا یوں پورا انگلستان کا ملک گویا ایک بے پایاں صنعتی شہر بن جائے گا۔ ایشیا، افریقہ آسٹریلیا میں انگلستان تہذیب پھیلائے گا، اور انگریز نمونہ کی نئی ریاستوں کا بیج وہاں بوئے گا۔ یوں رفتہ رفتہ مادری ریاست کے زیر اثر انگریزی ریاستوں کی ایک الگ دنیا بن جائے گی، جس میں براعظم یورپ کی قومیں یوں گم ہو جائیں گی جیسے چند غیر اہم اور غیر پیدا آور قبیلے۔ فرانس بھی اسپین اور پرتگال کی اس قسمت کا شریک ہو جائے گا کہ اس انگریزی دنیا کو اچھی اچھی شرابیں بھیجے، اور خود پی بیٹھے، اور بہت ہوا تو فرانسیسیوں کے لئے، کچھ پوشاک و پوشش کے تکلفات وغیرہ کا کام رہ جائیگا، جرمنی اس انگریزی دنیا کو بس بچوں کے کھلونے، لکڑی کی گھڑیاں، اور کچھ لسانی تصانیف بھیج دیا کرے گا، اور کبھی کبھی ایک آدھ امدادی فوج جو انگریزی صنعتی اور تجارتی اقتدار اور انگریزی ادب و لسان کی اشاعت کی خاطر ایشیا یا افریقہ کے صحراؤں میں جان دینے کو تیار ہو! زیادہ صدیاں نہ گذرنے پائیں گی کہ اس انگریزی دنیا میں جرمن اور فرانسیسیوں کا ذکر اسی حقارت کے ہوگا جیسے آج کل ایشیائی قوموں کا ہوتا ہے۔

لیکن عام آزادیِ تجارت کے ذریعہ جو یہ صورت حال پیدا ہوگی وہ صحیح سیاست کی نظر میں بہت ہی خلاف فطرت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر جمعیت ہنزا کے زمانے

میں آزاد تجارت جاری کی جاتی تو بجائے انگریزی قوم کے جرمن قوم صنعت اور تجارت میں اور دوسری قوموں سے پیش پیش رہتی۔ اور یہ بات تو عالمی نقطہ نظر سے نہایت بعید از انصاف ہو گی کہ آج دنیا کی ساری قوت اور دولت انگلستان کے ہاتھ میں صرف اس لئے چھوڑ دی جائے کہ اس کے یہاں تجارت کا قومی نظام سب سے پہلے بنیا اور عالمی اصول سب سے زیادہ نظر انداز کئے گئے، اگر آزاد تجارت کے فطری اثرات حاصل کرنے ہیں تو ضروری ہے کہ ان قوموں کو جو کم ترقی یافتہ ہیں مصنوعی طریقوں سے اس درجہ تک ابھارا جائے جہاں انہی مصنوعی ذرائع سے انگلستان پہنچ چکا ہے۔ اگر یہ منظور ہو کہ قوائے دولت آفریں کے ان عالمی رجحانات کے مطابق، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، دور دراز ممالک قریبی یورپی ممالک سے پہلے بہرہ اندوز نہ ہوں تو ان قوموں کو جو اپنی اخلاقی، ذہنی، جماعتی اور سیاسی حالات کی بنا پر صنعتی قوت کے نشو و نما کی صلاحیت رکھتی ہیں، یہ چاہئے کہ اس غرض سے نظام تامین کو اختیار کریں کہ یہی اس کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ مذکورہ غرض کے لئے اس ذریعہ کے اثرات دو قسم کے ہیں، اول تو یہ کہ جب ہم اپنے بازاروں میں پردیسی مصنوعات کو بند کر دینگے تو ان قوموں کے فاضل کاریگر، صلاحیتیں اور سرمایا اپنے لئے کہیں باہر محل اور موقع تلاش کریں گے اور دوسرے یہ کہ ان کاریگروں، صلاحیتوں اور سرمایہ کو ہمارے نظام تامین کے تحت جو فوائد حاصل ہوں گے ان کی وجہ سے ان فاضل قوائے دولت آفریں کو تحریک ہو گی کہ بجائے دور دراز ممالک اور نو آبادیوں کو ہجرت کرنے کے یہ ہمارے ہاں آکر شغل تلاش کریں۔

سیاسیات تاریخ کا حوالہ دیتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ آیا قدیم زمانہ میں انگلستان نے اسی تدبیر کے ذریعہ جرمنی، اطالیہ، ہالینڈ، بلجیم، فرانس، اسپین اور پرتگال سے فوائے دولت آفرین کثرت سے اپنی طرف کھینچے تھے یا نہیں، وہ پوچھتی ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ جب معیشت کا یہ عالمی مذہب نظام تامین کے فوائد و نقصانات کی جانچ کرتا ہے تو اس کے اس عظیم الشان اثر کے متعلق یوں خاموش ہو جاتا ہے؟

باب (۱۲)

نظریہ قوائے دولت آفریں اور نظریہ اقدار

آدم سمتھ کی مشہور تصنیف کا عنوان ہے "دولت اقوام کی ماہیت اور اس کے اسباب" مذہب رائج کے بانی نے اس نام میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو ٹھیک ٹھیک ظاہر کر دیا ہے، جن سے علیحدہ علیحدہ افراد کی طرح قوموں کی معیشت پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ دولت کے اسباب خود دولت سے بالکل جدا چیز ہیں، یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے پاس دولت یعنی اقدار مبادلہ ہوں، لیکن اگر اس میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ جو کچھ صرف کرتا ہے اس سے گراں قدر اشیاء پیدا کر سکے، تو وہ غریب ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ ایک شخص غریب ہو، لیکن اگر اس میں یہ قوت ہے کہ جو کچھ صرف کرتا ہے اس سے زیادہ قدر کی چیزیں پیدا کر سکے تو وہ دولت مند ہو جائے گا۔

چنانچہ دولت پیدا کرنے کی قوت خود دولت سے کہیں زیادہ اہم چیز ہے۔ اس سے صرف اسی کی ضمانت نہیں ہوتی کہ جو کچھ حاصل کیا ہے وہ قائم رہے اور بڑھے، بلکہ اس کی بھی کہ جو کچھ ہاتھ سے نکل گیا ہے اس کی تلافی ہو جائے اور اشخاص کے مقابلہ میں یہ بات اقوام پر اور بھی زیادہ صادق آتی ہے، کہ یہ جائداد کی مقررہ بندھی ہوئی آمدنی سے

گذارا نہیں کر سکتیں۔ جرمنی کو ہر صدی میں وبا، قحط، یا خانہ جنگی اور خارجی جنگ نے تباہ کیا ہے، لیکن اس نے ہمیشہ اپنے قوائے دولت آفریں کا بڑا حصہ بچا لیا، اس لئے پھر جلد ہی کچھ نہ کچھ مرفہ الحالی حاصل کر سکا، حالانکہ دولت مند اور قوی اسپین، جو مستبدوں اور اہل کلیسا کا شکار تھا، اگرچہ اندرونی امن سے پوری طرح بہرہ یاب رہا، لیکن پھر بھی روز بروز فقر افلاس و ہلاکت میں گرتا گیا۔ آج بھی اسپین میں وہی آفتاب نکلتا ہے، آج بھی ان کے قبضہ میں وہی زمین ہے، آج بھی ان کی کانیں اسی قدر زرخیز ہیں، آج بھی تو وہ وہی قوم ہیں، جو امریکہ کے انکشاف اور مذہبی احتساب کے قیام سے پہلے تھے، لیکن یہ قوم رفتہ رفتہ اپنے قوائے دولت آفریں کھو بیٹھی، لہٰذا مفلس اور مفلوک الحال ہو گئی۔ شمالی امریکہ کی جنگ آزادی نے قوم پر کروڑوں کا بار ڈال دیا تھا، لیکن چونکہ قومی آزادی کے حصول نے ان کے قوائے دولت آفریں کو بے اندازہ قوت بخشی تھی، اس لئے امن کے بعد چند ہی سال میں انہوں نے اس قدر دولت حاصل کر لی کہ کبھی پہلے ان کے قبضہ میں نہ تھی۔ فرانس کا جو حال ۱۸۰۹ء میں تھا اس کا مقابلہ کوئی ۱۸۳۹ء کی حالت سے کرے، کیا کچھ فرق ہے حالانکہ اس عرصہ میں براعظم یورپ کے بڑے حصہ پر سے فرانس کا قبضہ اٹھ گیا تھا، خود ملک پر دو تباہ کن فوجی چڑھائیاں ہو گئی تھیں اور مصارف و تاوان جنگ کے سلسلہ میں اربوں روپیہ اٹھ گیا تھا۔

ناممکن ہے کہ آدم اسمتھ جیسی تیز سمجھ کا آدمی دولت اور اسباب دولت کے فرق کو نظر انداز کر سکتا اور ان اسباب کا جو غیر معمولی اثر قوموں کی حالت پر پڑتا ہے اس سے

یوں سراسر حیثیت پوری نہ کر سکتا۔ اپنی کتاب کے مقدمہ میں صاف الفاظ میں کہتا ہے "محنت وہ فنڈ ہے جس سے ہر قوم اپنی دولت حاصل کرتی ہے، اور دولت کا اضافہ اول تو محنت کی قوت دولت آفرینی پر منحصر ہوتا ہے یعنی اس کے درجہ کمال و مہارت اور قومی محنت کے عام طور سے صحیح استعمال پر اور دوسرے اس تناسب پر جو دولت آفریں طریقہ پر مشغول آدمیوں کی تعداد اور ان لوگوں کی تعداد میں ہو جو اس طرح مشغول نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم اسمتھ کتنے صاف طور پر اس عام حقیقت سے آگاہ تھا کہ قوموں کی حالت کا تعین خاص طور پر ان کے قوائے دولت آفریں کے مجموعہ سے ہوتا ہے۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات قدرت کے نظام کے مطابق نہیں کہ پورے پورے علوم ایک ہی سوچنے والے کے دماغ سے مکمل شکل میں نکل آئیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم اسمتھ طبعیین (Physiscrats) کے عالمی تصور "عام آزادی تجارت" اور خود اپنے عظیم الشان انکشاف یعنی اصول "تقسیم عمل" سے اس قدر مغلوب تھا کہ "قوت دولت آفریں" کے تصور پر مزید فکر کرنا ممکن نہ رہا۔ یوں تو علم المعیشت اپنے دوسرے اجزا کے لئے بھی اس شخص کا کتنا ہی رہین منت کیوں نہ ہو، لیکن خود اس کے نزدیک "تقسیم عمل" کا تصور اس کا سب سے درخشاں خیال تھا، اسی تصور نے اس کی کتاب کا نام کر دیا اور اس کے نام کو موت کے بعد شہرت بخشی۔ اس میں اتنی عقل و دنیاوی تو تھی ہی کہ یہ سمجھ سکتا کہ جسے کوئی قیمتی ہیرا ہاتھ آیا ہو تو اس کی سب سے اچھی صورت یہ نہیں ہوتی۔ کہ اس خزانہ کو گیہوں کے ایک بورے میں دفن کر کے لایا جائے، چاہے گیہوں کے بورا لانے

کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں، بلکہ اسے تو بالکل سامنے نمایاں کرنا چاہیے۔ وہ اتنا تجربہ ضرور رکھتا تھا کہ یہ جانتا ہو کہ اگر ایک ناٹک کا ایکٹ پہلی مرتبہ اسٹیج پہ آئے (اور اپنی کتاب کی اشاعت کے وقت آدم اسمتھ کی حیثیت معاشیات میں یہی تھی) اور پہلے ہی ایکٹ میں غیر معمولی اثر پیدا کر لے تو پھر بعد میں اگر وہ صرف کبھی کبھی ہی معمول سے کچھ بہتر دکھائے تو بھی لوگ چنداں خیال نہیں کرتے۔ لہٰذا وہ اس پہ مجبور رہا کہ تقسیم عمل کے مسئلہ سے اپنی کتاب کو شروع کرے اور اسمتھ نے اس اندازہ میں کوئی غلطی نہیں کی، اس کے باب اول نے اس کی کتاب کی قسمت بنادی اور اس کے اقتدار کی بنیاد رکھ دی۔

لیکن یقین ہے کہ ہم یہ ثابت کرسکیں گے کہ اس "تقسیم عمل" کے اہم ترین تصور کو بہترین روشنی میں پیش کرنے کی خواہش نے ہی آدم اسمتھ کو "قوت دولت آفرین" کی مزید تحقیق اور اپنے مسلک کو نہایت مکمل شکل میں پیش کرنے سے روکا، حالانکہ وہ اپنے مقدمہ میں اور بعد کو بھی، اگرچہ بعض ضمناً، اس کا ذکر کرتا ہے۔ یہ اپنے تصور "تقسیم عمل" کی بہت قدر کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے بھٹک کر خود "محنت" کو قوموں کی ساری دولت کے "فنڈ" سے تعبیر کرتا ہے حالانکہ جانتا ہے اور کہتا بھی ہے کہ محنت کی دولت آفرینی زیادہ تر اس کے درجہ مہارت و صیابت پر منحصر ہے جو اس محنت کے استعمال میں حاصل ہو۔ چنانچہ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بھی کوئی حکمی طریق استدلال ہے کہ ایک مظہر کا سبب یا علت ایسی چیز کو بتا دیا جائے جو خود بہت سے عمیق تر اسباب و علل کا نتیجہ ہو؟ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ساری دولت ذہنی و جسمانی مشقت "محنت" کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، لیکن اس سے کسی ایسے سبب

یا علت کا پتہ نہیں چلتا جس سے مفید نتائج استنباط کئے جا سکیں، کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں کی قومیں اپنے شہریوں کی مشقت اور کفایت شعاری کے باوجود افلاس و فلاکت میں مبتلا ہیں۔ جو شخص یہ جاننا اور تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ ایک قوم دولت اور مرفہ الحالی سے افلاس و فلاکت میں کیوں مبتلا ہو گئی اور دوسری افلاس و بربریت سے دولت و مرفہ الحالی تک کیسے پہنچ گئی، اسے جب یہ اطلاع دی جائے کہ محنت دولت کا سبب اور کاہلی افلاس کی وجہ ہے، (اور یہ بات حضرت سلیمانؑ نے آدم اسمتھ سے بہت پہلے کہہ دی تھی!) تو اسے لازمی یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ آخر محنت کے اسباب کیا ہیں اور کاہلی کے کیا؟ یوں تو یہ زیادہ صحیح ہوتا کہ انسان کے اعضاء جسم کو (یعنی سر، ہاتھ، پاؤں کو) دولت کی وجہ بتلایا جاتا، کہ ہم اس طرح حقیقت سے بہت قریب ہوتے، کیونکہ اس وقت فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان سروں، ہاتھوں، پاؤں کو چیزیں پیدا کرنے پر آمادہ کرتی اور ان کی کوششوں کو تاثیر بخشتی ہے؟ وہ چیز سوائے اس روح اور ذہنیت کے اور کیا ہو سکتی ہے، جو افراد میں ساری ہوتی ہے، یا وہ نظام جماعتی جو ان کی مساعی کو بارآور بناتا ہے یا وہ قدرتی قوتیں جن کا استعمال ان کی دسترس میں ہوتا ہے۔ انسان جس قدر اچھی طرح اس بات کو سمجھتا ہے کہ اسے مستقبل کی فکر کرنی چاہئے، اس کے جذبات و تخیلات جس قدر زیادہ اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ اپنے متعلقین کے مستقبل کو مستفیض بنائے، اور ان کی خوشحالی میں اضافہ کرے، اوائل عمر سے وہ پیش بینی اور عمل کا جس قدر عادی بنایا گیا ہے، اس کے جذبات عالیہ جس قدر ابھارے گئے ہیں اور اس کا جسم و ذہن جس قدر تربیت پا چکا ہے جس

قدر اچھی مثالیں اوائل عمر سے اس کے سامنے ہیں، جس قدر مواقع اُسے اِس بات کے ہیں کہ اپنی ذہنی اور بدنی قوتوں کو اپنی حالت کی بہتری کے لیے صرف کرے، اپنے جائز اعمال میں یہ جس قدر کم پابند ہے، اس کی مساعی جس قدر کامیاب اور اس کے نتائج جس قدر منتفق ہیں، اپنی کارگزاری اور حسنِ انتظام سے یہ جس قدر اعتراف خدمات اور عزت عامہ حاصل کر سکتا ہے، اس کا ذہن تعصب، توہم، غلط خیالات اور جہل کا جس قدر کم شکار ہے اسی قدر زیادہ یہ اپنے سر اور اعضاء کو پیدائش دولت کے کام میں لگائے گا، اسی قدر زیادہ اس کی کارگزاری ہوگی اور اسی قدر بہتر یہ اپنی محنت کے پھلوں میں اقتصاد سے کام لیگا۔ لیکن ان تمام باتوں میں بہت کچھ اس جماعت کے حالات پر منحصر ہوتا ہے جس میں فرد نے تربیت پائی ہے، اور جس میں وہ چلتا پھرتا ہے۔ اس پر منحصر ہے کہ آیا علوم و فنون پھل پھول رہے ہیں، اس پر کہ آیا عام افادہ کا اصول سے اور آئین و قوانین سے مذہبیت، اخلاق و ذکاوت، حفاظت جان و املاک حق و آزادی پیدا ہوتی ہے، اس پر کہ آیا قوم میں مادی مرفہ الحالی کے تمام عناصر (یعنی زراعت صنعت و تجارت) بیک وقت ترقی یافتہ اور متناسب ہیں، اس پر کہ آیا قوم کی قوت اتنی ہے کہ افراد مرفہ الحالی و تمدن میں جو ترقی کریں وہ نسلاً بعد نسلٍ ان کے لیے محفوظ رہے اور انہیں صرف اپنے ملک کی اندرونی قدرتی قوتوں کے استعمال کا موقع نہ ہو۔ بلکہ خارجی تجارت اور نوآبادیات کے ذریعہ دوسرے ممالک کی فطری قوتوں کو اپنے کام میں لانے کا موقع بھی ہو۔

آدم اسمتھ نے ان قوتوں کی ماہیت کو بہ حیثیت مجموعی اس قدر کم تسلیم کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذہنی کام کو جو قانون و نظام ملکی کی دیکھ بھال کرتے، یا تعلیم و مذہب علوم و فنون کی سیوا کرتے ہیں، دولت آفرینی کی صفت سے بھی متصف نہیں کرتا۔ اس کی تحقیقات صرف ان انسانی اعمال تک محدود ہے جن سے مادی قدریں ظہور میں آئیں۔ البتہ ان اعمال کے سلسلہ میں وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان کی قوت دولت آفرینی اس مہارت اور صیابت پر منحصر ہوتی ہے جو ان کے استعمال میں برتی جائے لیکن اس مہارت و صیابت کے اسباب کی تحقیق میں بس "تقسیم عمل" سے آگے نہیں بڑھتا، اور اس تقسیم عمل کی تشریح محض مبادلہ سے، ماضی سرمایہ کے اضافہ اور بازار کی توسیع سے کرتا ہے۔ چنانچہ فوراً ہی اس کا مسلک مادیت مخصوصیت اور انفرادیت کی گہرائیوں میں جا گرتا ہے۔ اگر اس نے "قوت دولت آفرین" کے تصور پر اور غور کیا ہوتا اور "قدر و قدر مبادلہ" کے خیال سے اس قدر مغلوب نہ ہو جاتا، تو لازم تھا کہ مظاہر معاشی کی تشریح کے لئے "نظریہ اقدار" کے پہلو بہ پہلو ایک "نظریہ قوائے دولت آفریں" بھی موجود ہوتا، لیکن اس نے بھٹک کر یہ غلط راہ اختیار کی کہ ذہنی قوتوں کی تشریح لگا مادی حالات سے کر لئے، اور اس طرح ان تمام حماقتوں اور اضداد کی بنیاد ڈال دی جن میں اس کا مذہب (جیسا کہ ہم ظاہر کریں گے) آج تک مبتلا ہے۔ اور صرف یہی وجہ ہے کہ معاشیات کے مسائل ذہین ترین دماغوں کی دسترس سے سب سے زیادہ باہر ہیں۔ یہ بات کہ آدم اسمتھ کا مذہب سوائے نظریہ اقدار کے اور کچھ نہیں سکھاتا، یہ صرف اسی بات سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا مسلک ہر جگہ قدر مبادلہ کے تصور پر

مبنی ہے، بلکہ خود اس تعریف سے جو یہ اپنے مسلک کی کرتا ہے۔ یہ بقول ج۔ ب۔ سے، وہ علم ہے جو بتاتا ہے کہ دولت یعنی تبادلہ پذیر قدریں کس طرح پیدا، تقسیم اور صرف ہوتی ہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ وہ علم نہیں جو بتاتا ہے کہ قوائے دولت آفریں کیونکر بیدار ہوتے اور نشو و نما پاتے ہیں اور کس طرح پژمردہ ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ میکلاک اسے بصراحت "علم اقدار" کہتا اور حال کے انگریزی مصنف اس کا نام علم مبادلہ لکھتے ہیں۔

شخصی معیشت کی مثالیں نظریہ قوائے دولت آفریں اور نظریہ اقدار کے فرق کو بہترین طریقہ سے واضح کر دیتی ہیں۔

فرض کیجئے دو خاندانوں کے باپ ہیں، دونوں مالک اراضی ہیں، دونوں سالانہ ایک ہزار ڈالر بچاتے ہیں اور دونوں کے پانچ پانچ لڑکے ہیں، لیکن ان میں سے ایک تو روپیہ سود پر لگا دیتا ہے اور اپنے لڑکوں کو عام دشوار کام کے لئے رکھتا ہے اور دوسرا اپنے دو لڑکوں کو اسی بچت سے اچھے اراضی دار و کاشتکار ہونے کی تعلیم دیتا ہے اور باقی تین لڑکوں کو اپنے اپنے مذاق کے مطابق کوئی صنعت یا حرفہ سکھواتا ہے۔ اول الذکر نظریۂ اقدار کے مطابق عمل پیرا ہے اور موخر الذکر نظریۂ قوائے دولت آفریں کے مطابق ممکن ہے کہ مرتے وقت پہلا دوسرے سے باعتبار اقدار مبادلہ بہت زیادہ مالدار ہو لیکن قوائے دولت آفریں کے لحاظ سے صورت بالکل دوسری ہوگی۔ اس دوسرے کی جائداد دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اب بہتر انتظام کے باعث آدھی جائداد سے اتنی پیداوار ہوتی ہے جتنی پہلے پوری سے ہوتی تھی، باقی تین بیٹوں نے اپنی مہارت سے ذرائع

کے وافر ذرائع پیدا کر لئے ہیں، پہلے کی جائداد ۵ حصوں میں تقسیم ہوتی ہے اور ہر حصہ پر اسی خراب طریقہ سے کام ہوتا ہے جیسا کہ پہلے کل پر ہوتا تھا۔ ایک خاندان میں تو طرح طرح کی مختلف مہارتیں اور صلاحتیں بیدار ہو کر نشو و نما پائیں گی اور نسلاً بعد نسل بڑھتی رہیں گی، ہر آنے والی نسل کے پاس مادی دولت پیدا کرنے کی قوت پہلے سے زیادہ ہوگی اور دوسرے خاندان میں حصہ اراضی کے کم ہونے کے ساتھ ساتھ حماقت و افلاس لازماً بڑھتے جائیں گے۔ غلاموں کا مالک غلام پیدا کر کے اقدار مبادلہ کے مجموعہ میں ضرور اضافہ کر لیتا ہے، لیکن آئندہ نسلوں کے قوائے دولت آفریں کو تباہ بھی کر ڈالتا ہے۔ نوجوانوں کی تعلیم، ترقی عدالت، تحفظ اقدام وغیرہ پر تمام صرف در اصل قوائے دولت آفریں کی خاطر اقدار مبادلہ کو ضائع کرنا ہے۔ ایک قوم کے صرف کا سب سے بڑا حصہ آئندہ نسل کی تعلیم پر صرف ہوتا ہے یعنی قوائے دولت آفریں کی نشو و نما پر۔

مذہب مسیحی، توحید ازدواج، غلامی اور دائمی جاگیرداری کا مٹ جانا، تاج و تخت کا توارث، چھاپہ اور کل کے حرفوں کی ایجاد، ڈاک، زر، وزن و پیمانہ، جنتری، گھڑیاں، پولیس، آزاد املاک اراضی کے اصول کا رواج اور ذرائع آمد و رفت، یہ سب قوت دولت آفریں کے سرچشمے ہیں۔ یورپی ریاستوں کا ایشیائی ریاستوں سے مقابلہ کیجیے تو اس بات کا یقین ہو جائے گا۔ تخیلات اور آزادی ضمیر کا اثر قوائے دولت آفریں پر دیکھنا ہو تو انگلستان کی تاریخ اور سپین کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ عدالتی کارروائیوں کا کھلے بندوں ہونا، جیوری کا طریقہ، پارلیمنٹ کی آئین سازی، انتظام ریاست پر عام نگرانی، بلدی اور دیہی جماعتوں

میں حکومت خود اختیاری، آزادی مطابع، مفید کاموں کے لئے شراکت کی آزادی، یہ سب چیزیں ایک دستوری ریاست کے شہریوں اور کارکنوں میں ایسی طاقت اور قوت پیدا کر دیتی ہیں کہ اور کسی طریقہ سے ممکن نہیں۔ چنانچہ کسی ایسے قانون یا عام عدالتی فیصلہ کا تصور بھی مشکل ہے جس کا تھوڑا بہت اثر قوم کے قوائے دولت آفریں کے گھٹانے یا بڑھانے پر نہ پڑتا ہو۔

اگر ہم صرف جسمانی محنت کو دولت کی وجہ قرار دیں تو پھر اس کی کیا توجیہ ہوگی کہ نئی قومیں پرانی قوموں کے مقابلہ میں بے حساب دولت مند، کثیر التعداد، طاقتور اور مرفہ الحال ہیں؟ کل آبادی کا تناسب پیش نظر رکھئے تو پرانی قومیں ہاتھوں سے کہیں زیادہ کام لیتی تھیں، کام کہیں زیادہ دشوار ہوتا تھا، ہر فرد کے پاس کہیں زیادہ زمین ہوتی تھی اور پھر بھی عوام کو کھانے اور پہننے کے لئے اس سے کہیں برا ملتا تھا، جتنا کہ آج کل۔ اس بات کی تشریح کرنے کے لئے ہمیں تمام ان ترقیوں کا حوالہ دینا پڑے گا، جو گذشتہ صدی میں علوم و فنون میں، ہیئتی اور عام انتظامات میں، تربیت ذہنی اور صلاحیت دولت آفریں میں ہوئی ہیں۔ قوموں کی موجودہ حالت نتیجہ ہے گذشتہ نسلوں کے اختراعات، اکتشافات، ترقیات، کمالات اور مساعی کے مجموعہ کا۔ یہ مجموعہ زندہ انسانیت کا ذہنی سرمایہ ہے۔ اور ہر ایک قوم اسی نسبت سے دولت پیدا کرتی ہے جس سے کہ وہ سابق نسلوں کی تحصیلات کو اپنے اندر لینا اور خود اپنی تحصیلات سے اس میں اضافہ کرنا جانتی ہو۔ اور جس نسبت سے کہ اس کے علاقہ کی فطری قوتیں، اس کا رقبہ، اور جغرافی موقع، اس

کی آبادی اور سیاسی قوت ایسے اس قابل بنائیں کہ اگر ہو سکے تو تمام ذرائع دولت کو اپنی حدود کے اندر کامل اور متناسب ترقی دے سکے، اور کم ترقی یافتہ قوموں پر بلکہ تمام دنیا پر اپنا اخلاقی، ذہنی، صنعتی، تمدنی اور سیاسی اثر ڈال سکے۔

معاشیات میں کا مذہب رائج ہمیں یقین دلانا چاہتا ہے کہ سیاست اور سیاسی قوت پر معاشیات میں غور نہیں کیا جا سکتا، جہاں تک کہ محض اقدار اور مبادلہ اس علم کا موضوع تحقیق ہیں، ممکن ہے یہ بات صحیح ہو، ہو سکتا ہے کہ آدمی قدر، سرمایہ، نفع، اجرت، لگان، کے تصورات متعین کرے، ان کی تجزی کرے، ان پر بیٹھا غور کیا کرے کہ ان کے گھٹنے بڑھنے پر کس چیز کا اثر ہو سکتا ہے وغیرہ، اور قوم کی سیاسی حالت کو بالکل پیش نظر نہ آنے دے لیکن یہ سب معاملات تو اشخاص کی معیشت میں بھی اسی طرح پائے جاتے ہیں جیسے کہ پوری اقوام کی معیشت میں بس وینس، جمعیت ہنزا، پرتگال، ہالینڈ اور انگلستان کی تاریخ کو دیکھنے کی ضرورت ہے اور آدمی فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ مادی دولت اور سیاسی قوت میں باہمی کیا تعلق ہے، جہاں کہیں اس تعلق کو پیش نظر رکھنے کا معاملہ آتا ہے رائج مذہب معاشی کچھ عجیب و غریب اضداد میں آپڑتا ہے، مثال کے طور پر ہم انگریزی قوانین جہازرانی پر آدم سمتھ کی عجیب و غریب رائے یاد دلاتے ہیں۔

مذہب رائج چونکہ قوائے دولت آفریں کی ماہیت پر غور نہیں کرتا اور قوموں کی حالت پر من حیثیت الکل نظر نہیں ڈالتا، اس لئے خاص طور پر زراعت، صنعت، تجارت، سیاسی قوت اور اندرونی دولت کی ہم آہنگ ترقی کی اہمیت کو نظرانداز کرتا ہے، اور

خصوصاً قوم کی اپنی صنعت کو جس کی ہر شاخ خوب ترقی یافتہ ہو، کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ غلطی ہے صنعت اور زراعت کو ایک ہی شق میں رکھتا ہے اور محنت قدرت اور سرمایہ وغیرہ کا ذکر عام الفاظ میں کرتا ہے اور ان کے فرق پر نگاہ نہیں ڈالتا۔ یہ نہیں دیکھتا کہ محض زرعی ریاست اور زرعی صنعتی ریاست میں اس سے کہیں زیادہ فرق ہے جتنا کہ چرواہوں کی ریاست اور زرعی ریاست میں ہوتا ہے۔ جب ریاست میں محض زراعت ہی زراعت ہو تو تلون اور غلامی، توہم اور جہل کا دور دورہ ہوتا ہے، ذرائع تمدن، آمد و رفت اور باربرداری کی کمی ہوتی ہے، افلاس اور سیاسی بےبسی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ محض زرعی ریاست میں قوم کے ذہنی و جسمانی قوائے مضمر کا بہت تھوڑا سا حصہ پیدا ہوتا اور نشو و نما پاتا ہے، اس کی دسترس میں قدرت کی جو قوتیں اور قدرت کے جو ذخائر ہیں۔ ان کا بہت ہی کم حصہ استعمال میں آسکتا ہے، اور سرمایہ یا تو بالکل ہی جمع نہیں ہوتا یا بہت کم۔ کوئی پولینڈ کا مقابلہ انگلستان سے کرے، یہ دونوں قومیں کبھی تمدن کی ایک ہی سطح پر تھیں، اور آج کیا فرق ہے؟ صنعت اور کارخانے ایک طرف حریت بلدی، ذہانت، علوم و فنون، خارجی و داخلی تجارت، جہاز رانی، وسائل آمد و رفت، تہذیب اور سیاسی قوت کی ماں ہیں اور دوسری طرف انہیں کے بچے بھی۔ یہی زراعت کو اس کی زنجیروں سے رہا کرنے اور اسے تجارتی رنگ دینے، اسے علم اور فن کے درجہ پر پہنچانے، لگان، زرعی منافع، اجرت اور زمین کی قیمت بڑھانے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ عام مذہب معاشی نے تہذیب تمدن پیدا کرنے کی اس صفت کو تجارت خارجہ کے ساتھ منسوب کیا ہے، لیکن اس میں

اس نے اصلی سبب اور محض بیچ کے رشتہ پیدا کرنے والے کو گڈمڈ کر دیا ہے، دوسرے ملکوں کی صنعت تجارت خارجہ کے لئے اشیاء مہیا کرتی ہے، یہ اشیاء تجارت خارجہ ہم تک پہنچاتی ہے اور ہمارے یہاں اجناس خام ومصنوعات اس لئے صرف میں آتی ہیں کہ ان چیزوں کے عوض بجائے روپیہ کے ہمیں چیزیں دینا پڑتی ہیں۔ پھر اگر دور دراز ملکوں کی صنعت مسلمہ طور پر ہماری زراعت پر اتنا نفع بخش اثر ڈالتی ہے تو پھر ان صنعتوں کا مفید اثر کس قدر زیادہ ہوگا جو ہم سے مقامی، تجارتی اور سیاسی ہر اعتبار سے وابستہ ہوں، جو اپنی غذاء اور اجناس خام کا تھوڑا بہت نہیں بلکہ بہت بڑا حصہ خود ہم سے لیتی ہوں جن کی مصنوعات بہت زیادہ مصارف باربرداری کے باعث ہمارے لئے گراں نہ پڑتی ہوں جن سے کاروبار میں اس وجہ سے رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے کہ کہیں پردیسی قوم خود اپنی ضروریات مہیا کرنا نہ سیکھ جائے اور نہ اس میں جنگ یا اقتناعی محاصل درآمد سے روک کا خدشہ ہو؟

ہم اب دیکھتے ہیں کہ مادی دولت یا قدر مبادلہ کو اپنی تحقیق کا تنہا موضوع بنا کر اور محض جسمانی محنت کو تنہا دولت آفریں قوت تسلیم کر کے رائج الوقت مذہب معاشی کس قدر غیر معمولی غلطیوں اور اضداد میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اس مذہب کی رائے میں جو شخص سور پالتا ہے وہ تو دولت آفریں ہے لیکن جو انسانوں کو تعلیم دیتا ہے وہ جماعت کا دولت آفریں رکن نہیں، جو بیچنے کے لئے پیں پیں کرنے والے کھلونے یا سارنگی بناتا ہے وہ تو دولت پیدا کرتا ہے، لیکن بڑے سے بڑے موسیقار

دولت آفریں نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ جو کچھ بچاتے ہیں وہ بکنے کے لئے بازار میں نہیں لایا جا سکتا۔ طبیب، جو اپنے مریضوں کی جان بچاتا ہے وہ دولت آفریں طبقہ میں شامل نہیں لیکن عطار کا لونڈا ہے، خواہ وہ اقدار مبادلہ (یعنی گولیاں) جو تیار کرتا ہے وہ چند ہی منٹ موجود رہیں، اور بعد میں بالکل بے قدر شکل اختیار کر لیں، ایک نیوٹن، ایک واٹ، ایک کیپلر یہ اس قدر دولت آفریں نہیں ہیں جتنے کہ ایک گدھا، ایک گھوڑا یا ہل کا بیل؛ یہ وہ کارگزار ہیں جنہیں حال ہی میں مسٹر میکلاک نے جماعت انسانی کے دولت آفریں ارکان کی صف میں جگہ دی ہے۔

کوئی یہ نہ جانے کہ ج۔ ب۔ سے۔ نے "اسمتھ" کے مسلک کا یہ عیب "غیر مادی اشیاء یا اجناس" کے افسانہ سے مٹا دیا ہے۔ سے۔ نے تو بس اس مسلک کے نتائج کی کھلی ہوئی حماقت پر تھوڑا سا رنگ پھیر دیا ہے، مسلک کو اس کی مادی پستی سے ابھارا نہیں ہے، اس کے نزدیک ذہنی (غیر مادی) چیزیں پیدا کرنے والے محض اس لئے دولت آفریں ہیں کہ ان کا معاوضہ اقدار مبادلہ کی شکل میں دیا جاتا ہے، اور خود انہوں نے بھی اپنا علم اقدار مبادلہ دے کر حاصل کیا ہے، نہ اس لئے کہ اس سے قوائے دولت آفریں تیار ہوتے ہیں۔[1]

[1] ج۔ ب۔ سے۔ متعدد مقامات پر اس خیال کا اظہار کرتا ہے۔ ہم یہاں ان میں سے سب سے جدید Economomiepolitique pratique کی چھٹی جلد کے صفحہ ۳۰۰ سے نقل کرتے ہیں: "وکیل اور طبیب کا ہنر دراصل ایک سرمایہ ہے جو وہ اپنے کو بعض چیزوں سے محروم کر کے حاصل کرتے ہیں اور پھر اس سے انہیں آمدنی حاصل ہوتی ہے، اگرچہ یہ سرمایہ ان کی ذات تک محدود رہتا ہے اور یہ اسے منتقل نہیں کر سکتے۔"

اس کے نزدیک تو یہ محض جمع شدہ سرمایہ ہیں، بلکہ میکلاک تو اس سے بھی آگے جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ خود انسان بھی اسی طرح "محنت" کا نتیجہ ہے، جیسے کہ وہ مشین جسے یہ بناتا ہے اور اس کے نزدیک تمام معاشی تحقیق میں انسان کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس کا خیال ہے کہ اسمتھ نے اس اصول کی صحت کو سمجھ لیا تھا، لیکن اس سے صحیح نتیجہ نہیں نکالا تھا منجملہ اور نتائج کے وہ یہ نتیجہ بھی نکالتا ہے کہ کھانا پینا دولت آفریں مشاغل ہیں ڈومس کوپر کے نزدیک ایک مستعد امریکن ماہر قانون کی قیمت کا تخمینہ کوئی ۳ ہزار ڈالر ہے یعنی ایک مستعد زرعی غلام سے کوئی تگنا!

مذہب رائج کی مذکورہ غلطیوں اور نقصون کی اصلاح نظریۂ قوائے دولت آفریں سے بآسانی ہو سکتی ہے، بے شک سؤر پالنے والے، بین باجا بنانے والے اور گولیاں تیار کرنے والے دولت آفریں ہیں، لیکن بچوں اور بڑوں کے استاد، اساتذۂ موسیقی، طبیب، منصف، نظام ملکی کو چلانے والے بیان سے بدرجہا اعلےٰ دولت آفریں ہیں۔ وہ اقدار مبادلہ تیار کرتے ہیں، اور یہ قوائے دولت آفریں۔ ان میں سے ایک آئندہ نسل میں دولت آفرینی کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، ایک موجودہ نسل میں اخلاق اور مذہبیت کو پھیلاتا ہے، تیسرا ذہن انسانی کو شریف تر اور بلند تر بناتا ہے، چوتھا اپنے مریض کی دولت آفریں قوتوں کی حفاظت کرتا ہے، پانچواں حقوق انسانی کی حفاظت کرتا ہے۔ اور چھٹا نظام عامہ پیدا کرتا ہے، ساتواں اپنے فن سے، اور اس کے ذریعہ جو حظ پیدا کرتا ہے اس سے، لوگوں کو اقدار مبادلہ پیدا کرنے والے صرف اس لئے معرض بحث

میں آتے ہیں کہ ان کی خدمات کا معاوضہ اقدار مبادلہ کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ ان کی خدمات کو اس طرح دیکھنے میں ممکن ہے بعض وقت کچھ عملی فائدہ ہو، مثلاً پبلک ٹیکسوں کے مسئلہ میں جہاں تک یہ اقدار مبادلہ سے چکائے جاتے ہوں لیکن جہاں کہیں بین الاقوامی یا من حیث الکل قومی حالات کا معاملہ ہو تو یہ ناکافی ہے اور بہت سے تنگ خیالات اور غلط رائیں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔

نہیں، تھے کا خیال درست نہیں ہے، قوم کی مرفہ الحالی اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ اس میں بہت سی دولت یا اقدار مبادلہ جمع ہوں بلکہ اس سے کہ اس کے قوائے دولت آفریں نے کہاں تک نشو و نما پائی ہے۔ اگرچہ قوانین اور عام افادہ گاہیں بلا واسطہ اقدار پیدا نہیں کرتیں، تاہم یہ قوائے دولت آفریں پیدا کرتی ہیں، اور تھے غلطی پر ہے، اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ قوموں ہر قسم کی حکومت میں دولت مند ہوتی ہیں، اور قوانین سے دولت پیدا نہیں ہوتی۔ قوم کی خارجی تجارت کا اندازہ اس طرح نہیں کرنا چاہئے جس طرح انفرادی تاجروں کی تجارت کا کیا جاتا ہے یعنی صرف نظر بہ اقدار کے ماتحت یا محض وقتی اور مالی فائدہ کے نقطۂ نظر سے۔ قوم کو تو وہ تمام باتیں نظر میں رکھنی چاہئیں جن پر اس کے موجودہ اور آئندہ وجود، مرفہ الحالی اور قوت کا انحصار ہے۔

ذہنی یا جماعتی قوتیں حاصل کرنے کے لیے قوم کو مادی اشیاء قربان کرنی پڑتی ہیں اور ان کے استعمال سے محروم رہنا پڑتا ہے، مستقبل کے فوائد کی خاطر قوم کو حال کے فوائد کی بھینٹ چڑھانی ہوتی ہے۔ تو اگر ہر قوم کی ترقی، تہذیب، مادی مرفہ الحالی اور

سیاسی قوت کے لئے بنیادی شرط ایک ایسی صنعتی قوت ہے جس کے تمام شعبے ترقی یافتہ ہوں؛ (اور یہ ہم نے تاریخ سے ظاہر کر دیا ہے) ! اگر یہ سچ ہے (جیسا کہ ہمیں یقین ہے کہ ہم ثابت کر چکے ہیں) کہ دنیا کی موجودہ حالت میں ایک نئی غیر مامون صنعتی قوت کے لئے ناممکن ہے کہ ایک ایسی قوت سے جو مدت سے مضبوط ہو رہی ہے اور اپنے علاقہ میں مامون ہے، آزاد مقابلہ کر کے ترقی پا سکے، تو پھر کوئی شخص محض نظریہ اقدار کے دلائل سے یہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ انفرادی تاجروں کی طرح ایک قوم کو بھی اپنا سامان اس جگہ خریدنا چاہئے جہاں سب سے سستا ملے اور جب ایک چیز پردیس میں سستی ملتی ہے تو اسے خود اپنے ملک میں تیار کرنا حماقت ہے! چاہئے یہ کہ قوم کی صنعت کو محض افراد کی توجہ کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اس لئے کہ تاملینی محاصل در اصل حق اجارہ ہیں جو قوم کا نقصان کر کے افراد کو دئے جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ تاملینی محاصل سے شروع شروع میں مصنوعات گراں ہو جاتی ہیں، لیکن یہ بھی تو سچ ہے، بلکہ خود مذہب رائج اسے تسلیم کرتا ہے، کہ اگر قوم میں پوری صنعتی قوت پیدا کرنے کی صلاحیت ہو تو کچھ وقت گذرنے پر یہی مصنوعات ملک کے اندر اس سے سستی تیار ہوتی ہیں، جتنا پردیس سے آنے والا مال۔ لہٰذا اگر تاملینی محاصل کے باعث قوموں کی کچھ قربانی ہوتی بھی ہے تو اس کی تلافی قوت دولت آفریں کے حصول سے ہو جاتی ہے، اور اس قوت سے قوم کے لئے آگے چل کر محض مادی اشیاء کی کہیں بڑی مقدار تلیقتن نہیں ہو جاتی؛ بلکہ جنگ کی صورت میں صنعتی خود مختاری کی ضمانت بھی ہو جاتی ہے۔

اس صنعتی خود مختاری سے، اور اس سے جو اندرونی خوشحالی پیدا ہوتی ہے اس کے ذریعہ، قوم کو تجارت خارجہ کے وسائل ہاتھ لگ جاتے ہیں، جہازرانی کو وسعت دینے کا موقع مل جاتا ہے، اس کی تہذیب بڑھتی ہے، ملک کے اندر افادہ گاہیں تکمیل کو پہنچتی ہیں اور باہر کے ملکوں کے مقابلہ میں اس کی قوت مضبوط ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جس قوم میں صنعتی قوت کے نشو و نما کی صلاحیت ہے، وہ اگر انتظام تامینی کا استعمال کرتی ہے تو گویا اسی زمیندار کی سی ذہنیت پر کاربند ہوتی ہے جس نے کچھ مادی دولت قربان کرکے اپنے بعض بچوں کو کوئی دولت آفریں کام سکھوایا تھا۔

مذہب رائج جن جن غلط راستوں پر محض اس لئے پڑ لیا ہے کہ جن حالات پر نظریۂ قوائے دولت آفریں کی روشنی میں حکم لگانا چاہیئے تھا، ان پر نظریہ اقدار کے ماتحت حکم لگاتا ہے وہ ج، ب، سے کی اس رائے سے نہایت واضح ہو جائیں گے جو اس نے ان انعامی رقوم کے متعلق دی ہے جو پردیسی قومیں اپنی برآمد کو بڑھانے کے لئے دیتی ہیں۔ سے کا خیال ہے کہ یہ رقمیں ہماری قوم کو بطور تحفہ دی جاتی ہیں، فرض کیجئے کہ فرانس اپنے کارخانوں کے لئے، جو ابھی کافی مضبوط نہیں ہوتے ہیں، ۲۵ فی صدی تامینی محصول کو کافی سمجھے لیکن انگلستان اپنے یہاں ہر برآمد پر ۳۰ فی صدی انعامی رقم ادا کرے تو اس طرح انگلستان فرانس کو جو تحفہ دیتا ہے اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ فرانس کے چیزیں استعمال کرنے والے بیشک چند سال تک اپنی ضرورت کے لئے مصنوعات پہلے سے بہت سستی حاصل کر سکیں گے، لیکن فرانسیسی کارخانے تباہ ہو جائیں گے، لاکھوں آدمی بھیک کے

ٹکڑوں سے لگ جائیں گے یا مجبور ہوں گے کہ اپنے ملک سے ہجرت کر جائیں یا زراعت کا پیشہ اختیار کریں۔ بہتر سے بہتر صورت میں یہ ہوگا کہ جو لوگ پہلے فرانسیسی زراعت پیشہ لوگوں سے ان کی پیداوار خرید کرتے تھے، اب ان کے مدمقابل بن جائینگے، زراعت کی پیداوار بڑھ جائے گی، اور صرف گھٹ جائے گا، لازمی نتیجہ ہوگا فرانس میں زرعی پیداوار کی بے قدری، قدر اشیاء میں کمی، قومی افلاس اور قومی کمزوری۔ انگریزوں کا تحفۂ اقدار قوتوں کے نقطۂ نظر سے نہایت گراں خرید ثابت ہوگا اس تحفہ کی مثال ان "قیمتی ریشمی ڈوریوں" کی سی ہے جو سلطان اپنے پاشاؤں کو بطور "تحفہ" بھیجا کرتے ہیں!۔

جس دن سے ٹرائے والوں نے یونانیوں سے لکڑی کا ایک گھوڑا تحفہ میں لیا اسی دن سے قوموں کو دوسری قوموں سے تحفے قبول کرنے میں ذرا تامل ہوتا ہے۔ انگریزوں نے، امدادی رقموں کی شکل میں، بڑی بڑی قیمت کے تحفے براعظم کی قوموں کو دیئے، لیکن ان کی قیمت براعظم والوں کو نقصان قوت کی صورت میں بہت گراں ادا کرنی پڑی۔ ان امدادی رقموں کا اثر انگلستان کے کارخانوں کے لیئے ویسا ہی مفید اور جرمن کارخانوں کے لیئے ویسا ہی مضر ہوا جیسا کہ انگریزوں کا اپنے مال کی برآمد پر کوئی انعامی رقم مقرر کر دینا ہوتا اگر آج انگلستان یہ تجویز پیش کرے کہ ہم برسوں تک جرمنی کو اس کی ضرورت کی تمام مصنوعات بالکل مفت دیا کرینگے تو ہم تو اس تجویز کے قبول کرنے کا مشورہ کبھی نہ دیں گے۔

اگر نئے اختراعات سے انگریز اپنا سستی کا کپڑا جرمنی کے پرانے طریقہ کے مقابلہ میں ۵۰ فیصدی سستا بنانے لگیں اور اس نئے طریقہ کے رواج میں انہیں چند سال بھی آگے ہونے کا

موقع مل جائے، تو بلا تامل بہی محصول کے جرمنی کی ایک سب سے پرانی صنعت کی شاخ بالکل تباہ ہو جاتی ہے، گویا جرمن قوم کے جسم سے ایک عضو کٹ کر الگ گر جائے، اور کون ہے جس کا ایک بازو کٹ گیا ہو اور وہ اپنے کو یہ کہہ کر تسکین دے سکے کہ جرمنی نے اپنی قمیصیں تو چالیس فیصدی کم داموں پر خرید لیں؟

اگر انگریزوں کو اکثر یہ موقع ملتا ہے کہ وہ پردیسی قوموں کو ایسے "تحفے" پیش کیا کریں، اور یہ تحفے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتے ہیں، اور اکثر تو ان قوموں کی مرضی کے خلاف یہ تحفے دئے جاتے ہیں، تو ہمیشہ ان پردیسی قوموں کا فرض ہے کہ وہ غور سے دیکھ لیں کہ یہ "تحفہ" قابل قبول بھی ہے یا نہیں۔ دنیا کی صنعت و تجارت کے اجارہ دار کی حیثیت سے انگریزوں کے کارخانوں میں وقتاً فوقتاً وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے یہ لوگ "Glut" کہتے ہیں اور جس کی وجہ ان کے خیال میں کثرت کاروبار ہوتی ہے، اس وقت ہر شخص اپنا ذخیرۂ مصنوعات دخانی جہازوں پر لا پھینکتا ہے، آٹھ دن بعد یہ چیزیں ہامبرگ، برلن اور فرانکفرٹ میں اصلی قیمت سے ۴۰ فی صدی کم پر پیش کی جاتی ہیں اور تین ہفتہ بعد نیویارک میں وقت کے وقت تو انگریزی کارخانہ والوں کو نقصان ہوتا ہے، لیکن یہ تباہی سے بچ جاتے ہیں، اور بعد کو اچھی قیمتیں وصول کر کے اس نقصان کی تلافی کر لیتے ہیں۔ جو ضرب انگریزوں پر پڑنی چاہیئے تھی وہ جرمن اور امریکی کارخانہ والوں پر پڑتی ہیں اور یہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ انگریز قوم بس آگ دہکتی ہے، اور گولا چھٹنے کی آواز سنتی ہے گولے کے ٹکڑے دوسرے ملکوں میں گرتے ہیں اور جب ان ملکوں کے باشندے سر پھوٹنے

کی شکایت کرتے ہیں تو بیچ کے تاجر اور دلال کہہ دیتے ہیں کہ "یہ تو سب بازار کے اُتار چڑھاؤ کا نتیجہ ہے"۔ جب آدمی غور کرتا ہے کہ اس اُتار چڑھاؤ سے کتنی مرتبہ انگلستان سے آزاد مقابلہ کرنے والی قوموں میں ساری صنعت، سارا ساہوکارہ، بلکہ زراعت اور ساری کی ساری معیشت تک کی بنیادیں متزلزل ہوتی رہتی ہیں اور انہیں قوموں کو بعد میں بڑھی ہوئی قیمتیں ادا کر کے انگریزی کارخانہ والوں کے نقصان کی تلافی کرنی پڑتی ہے، ہاں تو اگر آدمی ان باتوں کا خیال کرے تو کیا پھر قوموں کے تجارتی تعلقات کو نظریہ اقدار اور عالمی اصولوں کے مطابق قائم کرنے کی تجویز پر شبہات وارد نہیں ہوتے؟ مذہب رائج نے شاید اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ عام کساد بازاری کے ان دوروں کے اسباب و نتائج پر روشنی ڈالے۔

نئی قوموں کے تمام بڑے مدبروں نے بلا استثناء اس عظیم الشان اثر کو سمجھا ہے۔ جو صنعت اور کارخانے قوموں کی دولت، تہذیب اور قوت پر ڈالتے ہیں، اور ان کی تائید کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے، ایڈورڈ سوم نے اسی طرح جیسے الزبتھ نے، فریڈرک اعظم نے اور یوسف ثانی نے، واشنگٹن نے اور نپولین نے نظریات کی گہرائیوں میں جائے بغیر ان کی نگاہ ذہن نے بہ حیثیت کل صنعت کی ماہیت کو سمجھ لیا اور اس کی صحیح قدر کی، یہ بات مذہب طبیعیین ([illegible]) کے لئے رہ گئی تھی کہ سفسطائی دلیل بازی کی وجہ سے وہ اس کی ماہیت کو ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھیں اب تو ان کا ہوائی قلعہ غائب ہو چکا، بلکہ خود نئے مذہب کے حامیوں نے اسے مسمار کر ڈالا ہے، البتہ

خود یہ نیا مذہب بھی ان کی ابتدائی غلطیوں سے اپنے کو بالکل پاک نہیں کر سکا ہے۔ البس
ان سے کچھ کچھ ہٹ گیا ہے۔ چونکہ یہ قوت دولت آفریں اور اقدار مبادلہ کے فرق سے
واقف نہ تھا، اور چونکہ اس نے اول الذکر پر موخر الذکر سے الگ ہو کر کوئی غور و تحقیق
نہیں کی، بلکہ اسے نظریہ اقدار مبادلہ کی ماتحت شق سمجھا، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ اسے یہ بصیرت
حاصل ہوتی کہ زرعی قوت دولت آفریں کی ماہیت صنعتی قوت دولت آفریں سے کس
قدر مختلف ہے، اسے یہ نہیں سوجھا کہ ایک زرعی ریاست میں صنعت کے فروغ پانے
سے ایسی ذہنی اور جسمانی قوتوں، قدرتی قوتوں اور ذخیروں اور آلات کی قوتوں (جنہیں
مذہب رائج سرمایہ، یا اصل کہتا ہے) کو استعمال کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے، جو اس سے
پہلے بالکل بیکار پڑی تھیں، اور بلا صنعت کے ابھرے ہوئے کبھی کار آمد نہ ہو سکتیں۔ یہ
مذہب بس فرض کر لیتا ہے کہ صنعت کے قیام سے یہ قوتیں گویا لازمی طور پر زراعت سے
چھین کر صنعت کی طرف منتقل کی جاتی ہیں، حالانکہ یہ صنعت تو بڑی حد تک ایک بالکل
نئی قوت ہے، جو بجائے اس کے کہ زرعی قوت کو نقصان پہنچا کر حاصل ہو در اصل زراعت
کو ترقی کے درجہ اعلیٰ پر پہنچاتی ہے۔

باب (۱۳)

تجارتی کاروبار کی قومی تقسیم اور قومی قوائے دولت آفرین کا اتحاد

اس قانونِ قدرت کے اکتشاف کے لئے، جسے "تقسیم عمل" کے نام سے موسوم کرتا ہے، رائج مذہبِ معاشی اپنے مشہور ربانی کا رہینِ منت ہے، لیکن نہ تو آدم سمتھ نے، نہ اس کے کسی پیرو نے، اس قانون کی حقیقت کی پوری پوری تحقیق کی، نہ اس کے اہم ترین نتائج تک پہنچے۔

خود یہ ترکیب "تقسیم عمل" ناکافی سی ہے، اور لازمی طور پر ایک غلط یا کم از کم غیر متعین تصور اس سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ "تقسیم عمل" ہے کہ ایک وحشی ایک ہی دن شکار کو یا مچھلیاں مارنے جاتا ہے، لکڑی کاٹتا ہے اپنے خیمہ کی مرمت کرتا ہے اور تیر، جال اور کپڑے تیار کرتا ہے، لیکن یہ بھی "تقسیم عمل" ہے جیسا کہ آدم سمتھ نے مثال کے طور پر پیش کیا ہے، کہ دس مختلف شخص ان مختلف کاموں میں بٹ جائیں جو ایک سوئی کی تیاری میں پیش آتے ہیں۔ پہلی تقسیم ایک معروضی تقسیم ہے اور دوسری موضوعی تقسیم، پہلی پیدائشِ دولت میں حارج، دوسری اس میں ممد ہے۔ ان دونوں کا حقیقی فرق یہ ہے کہ پہلے میں ایک شخص اپنے کام کو تقسیم کرتا ہے تاکہ مختلف قسم کی چیزیں پیدا کر سکے، دوسرے میں

بہت سے شخص ایک چیز کی تیاری میں کام کے مختلف حصّے بانٹ لیتے ہیں۔

یہ دونوں طریقے مساوی صحت کے ساتھ "اتحادِ عمل" کے نام سے موسوم کئے جا سکتے ہیں، جو شخص آدمی مختلف کاموں کو اپنی ذات میں متحد کر لیتا ہے، اور سوئی کے بنانے میں مختلف اشخاص ایک مشترکہ پیدائش دولت کے لئے متحد ہو جاتے ہیں۔

جس قانونِ قدرت سے مذہب رائج معیشت جماعتی کے اس قدر اہم مظاہر کی تشریح کرتا ہے اس کی حقیقت ظاہر ہے کہ صرف تقسیم عمل نہیں ہے بلکہ مختلف افراد میں مختلف معاشی اعمال کی تقسیم ہے، لیکن ساتھ ہی مختلف قوتوں، بصیرتوں اور طاقتوں کا ایک مشترکہ پیدائش دولت کے لئے جمع ہوتا بھی۔ ان طریقوں کی دولت آفرینی کا سبب محض تقسیم نہیں بلکہ حقیقتاً یہ اتحاد ہے۔ آدم اسمتھ خود بھی اسے ضرور محسوس کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ "پست ترین افراد جماعت کی ضروریات زندگی متعدد افراد کی متحدہ محنت اور تعاون کا نتیجہ ہوتی ہیں" کس قدر افسوس ہے کہ آدم اسمتھ نے متحدہ جماعتی محنت کے جس تصور کا اس قدر صاف ذکر کیا ہے اس پر آگے اور بحث نہیں کی۔

اگر ہم سوئی بنانے کی اسی مثال پر قائم رہیں، جو آدم اسمتھ نے تقسیم عمل کے فائدوں کو واضح کرنے کے لئے پیش کی ہے، اور یہ معلوم کرنا چاہیں کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب دس آدمی ایک کارخانہ میں متحد ہو جاتے ہیں تو اس سے کہیں زیادہ سوئیاں تیار کر لیتے ہیں جتنی اس وقت ممکن نہیں کہ ہر ایک علیحدہ علیحدہ سوئی کی تیاری کے تمام مرحلے خود پورے کرے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلا اس کے کہ ایک مشترکہ مقصد کے لئے

قوائے دولت آفرینی کو متحد کیا جائے محض معاشی اعمال کی تقسیم دولت آفرینی کے لئے بہت کم مفید ہو سکتی ہے، اگر یہ مقصد حاصل کرنا ہے تو لازم ہے کہ یہ مختلف افراد ذہنی اور جسمانی طور پر بھی متحد ہوں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ جو شخص سوئی کے ناکے بناتا ہے اسے اس شخص کے کام کا یقین ہونا چاہیئے جو سوئی کے سرے بنا رہا ہے ورنہ اسے اندیشہ ہوگا کہ کہیں خواہ مخواہ بے سود ناکے تو تیار نہیں کیے جا رہے۔ ان سب کی محنت کی کارگذاری میں باہمی ایک صحیح تناسب ہونا چاہیئے۔ چاہیئے کہ کام کرنے والے حتیٰ الامکان ایک دوسرے کے قریب رہیں۔ اور ان میں تعاون باہمی کا یقین ہو۔ مثلاً فرض کیجئے یہ دسوں آدمی الگ الگ ملکوں میں رہتے ہوں تو جنگوں سے، آمد و رفت کی خرابیوں، بازار کے اتار چڑھاؤ (تجارتی بحرانوں) وغیرہ سے ان کے تعاون میں اکثر کیسا رخنہ پیدا ہوگا، چیز کی قیمت کس قدر گراں ہو جائے گی، اور تقسیم عمل کے فوائد کس قدر کم ہو جائیں گے؟ پھر اگر اس اتحاد میں سے کوئی ایک بھی نکل بھاگا یا جدا کر دیا گیا تو کیا اور سب کے سب بیکار نہ ہو جائیں گے؟

مذہب رائج چونکہ تقسیم کار ہی کو اس قانونِ قدرت کا حقیقی جزو سمجھتا ہے اس لئے اس نے یہ غلطی بھی کی ہے کہ اسے محض کسی ایک کارخانہ یا ایک زرعی کاروبار پر عائد کیا ہے اور یہ نہیں سمجھا کہ مذکورہ قانون کا اثر تو کل صنعتی اور زرعی قوت اور قوم کی پوری معیشت پر پڑتا ہے، جس طرح سوئی بنانے کا کارخانہ صرف افراد کے قوائے دولت آفریں کے اتحاد سے پنپتا ہے، اسی طرح کارخانوں کی ہر صنعت صرف اسی وقت فروغ پا سکتی

ہے جب باقی تمام اصناف کے قوائے دولت آفریں کا اتحاد اور اجتماع ہو۔ مثلاً ایک مشینوں کے کارخانہ کے فروغ پانے کے لئے ضروری ہے کہ کانیں اور دھاتوں کے کارخانے اسے ضروری مسالہ فراہم کریں، اور کارخانوں کی وہ سیکڑوں قسمیں جنہیں مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی مصنوعات خریدیں۔ مشینوں کے کارخانوں بغیر قوم کے لئے خطرہ ہے کہ جنگ کی حالت میں اس کی صنعتی قوت کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جائے۔

اسی طرح کل صنعت، کل زراعت کے مقابلہ میں اور زراعت صنعت کے مقابلہ میں اتنا ہی فروغ پاتی ہے جس قدر یہ ایک دوسرے سے قریب ہوں، اور ان کے باہمی تعلقات میں جس قدر کم رخنہ پڑے۔ جنگ کے زمانے میں، قومی اختلافات اور تجارتی اتار چڑھاؤ کی صورت میں فصل کی خرابی وغیرہ کی حالت میں ان دونوں شعبوں کے ایک ہی سیاسی طاقت کے ماتحت متحد ہونے سے جو فوائد پیدا ہوتے ہیں وہ اسی قدر بیّن ہیں جیسے کہ سوئی کے کارخانے میں مختلف اشخاص کے ایک چھت تلے متحد ہونے کے فوائد۔

اسمتھ کا بیان ہے کہ زراعت میں بمقابلہ صنعت کے تقسیم عمل کم ہو سکتی ہے! سچ یہ ہے کہ اسمتھ کے پیش نظر ایک ایک کارخانہ یا علیحدہ علیحدہ زرعی کاروبار ہیں اور اس نے اپنے اصول کو پورے ضلعوں اور صوبوں پر وسعت نہیں دی۔ تقسیم کار اور قوائے دولت آفریں کے اتحاد کا اصول کبھی بھی اس قدر عظیم الشان اثر نہیں دکھاتا، جتنا اس وقت جب ہر علاقہ اور ہر صوبہ اس قابل ہو کہ یا تو تمام تر یا زیادہ تر زراعت کی اس

شاخ کے لیے اپنے کو وقف کر سکے جس کے لئے فطرت نے اسے سب زیادہ موزوں بنایا ہے ، مثلاً ایک علاقہ میں گیہوں اور مٹر ، دوسرے میں انگور اور پھل ، تیسرے میں لکڑی اور مویشی پالنا وغیرہ اور جب ہر علاقہ ان سب چیزوں کے لئے کام میں آسکے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کی زمین اور ان کی صنعت اس حالت کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی دولت آفریں نہیں ہو سکتی ، جبکہ ہر ایک اس شاخ کے لئے مخصوص ہو جس کے لئے قدرت کی طرف سے اسے سب سے زیادہ شرف حاصل ہے اور اپنی مخصوص پیداوار کا فاضل حصہ ان دوسرے صوبوں کی فاضل پیداوار سے بدل لیا کرے ، جو اسی کی طرح دوسری ضروریات زندگی اور اشیاء خام کی پیدائش کے لئے خاص قسم کے فطری محاسن رکھتے ہوں ، یہ تقسیم کار اور زراعت کے قوائے دولت آفریں کا یہ اتحادِ عمل صرف اسی ملک میں ہو سکتا ہے جہاں بڑے کارخانہ والی صنعتوں کی تمام شاخیں کمال ترقی کو پہنچ چکی ہوں۔ کیونکہ ایسے ہی ملک میں ہر طرح کی پیداوار کی مانگ ایسی یقینی اور اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پیدا کرنے والا یقین رکھ سکتا ہے کہ اسی سال نہیں تو اگلے سال ہر قسم کی فاضل پیداوار کو مناسب قیمتوں پر بیچ سکے گا۔ ایسے ہی ملک میں یہ بھی ممکن ہے کہ بہت کچھ سرمایہ ملکی پیداوار کے سلسلہ میں صرف ہو ، یا اس کے ذخائر جمع کرنے میں ، یا ذرائع باربرداری میں فائدہ بخش ترقیاں کرنے پر مثلاً ریل اور نہروں ، دخانی جہازرانی ، بہتر سڑکوں وغیرہ پر۔ اس لئے کہ جب ذرائع آمدورفت و باربرداری نہایت اچھے ہوں اسی وقت ممکن ہے کہ ہر صوبہ یا ضلع اپنی مخصوص پیداوار کا فاضل حصہ تمام دوسرے صوبوں کو ، خواہ وہ کسی قدر دور ہوں ، بھیج سکے ، اور اس

کے عوض دوسرے علاقوں کی مخصوص پیداوار حاصل کر سکے۔ جہاں ہر شخص اپنی ضروریات آپ مہیا کرلے، وہاں تو مبادلہ کا کم ہی موقع ہوتا ہے اور وسائل آمد و رفت کی گرانقدر سہولتوں کی ضرورت ہی کب ہوتی ہے؟

ذرا دیکھیے کہ کاموں کی علیحدگی اور انفرادی قوتوں کے اتحاد سے قوائے دولت آفریں میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ ایک کارخانہ سے شروع ہو کر ساری قوم پر کس طرح پھیل جاتا ہے۔ کارخانہ اسی قدر فروغ پاتا ہے جس قدر اس میں کاموں کی تقسیم ہو، اس کے کام کرنے والے جس قدر زیادہ متحد ہوں، اور کل کے لئے ہر فرد کا تعاون جس قدر یقینی ہو۔ پھر ہر ایک کارخانہ کی قوت دولت آفریں اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے جس قدر کہ ملک کی صنعتی قوت تمام شاخوں میں نشو و نما پا چکی ہو، اور اس کا تعلق صنعت کی دوسری شاخوں سے جس قدر گہرا ہو۔ زراعت کی قوت دولت آفریں اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، جتنا گہرا کہ مقامی، تجارتی اور سیاسی اعتبار سے اس کا اتحاد ایک ایسی صنعت سے ہو جو تمام شاخوں میں پوری ترقی کر چکی ہے جس قدر یہ صنعت ترقی پا چکی ہو گی اسی قدر زراعت میں کاموں کی تقسیم اور قوائے دولت آفریں کا اتحاد زیادہ نشو و نما پائیگا، اور ایسے معراج کمال پر پہنچ پائیگا۔ چنانچہ سب سے زیادہ قوت دولت آفریں اس قوم کے پاس ہو گی اور اس لیے سب سے زیادہ دولت مند وہ قوم ہو گی جس نے اپنے حدود مملکت میں صنعت کی تمام شاخوں کو کمال ترقی تک پہنچا دیا ہو اور جس کا رقبہ اور زراعت اتنی ہو کہ صنعتی آبادی کی ضروریات زندگی اور ضروری اجناس خام کا بڑا حصہ یہ خود فراہم

کر سکے۔

اب ذرا اس دلیل کو پلٹ کر دیکھیں، اگر ایک قوم صرف زراعت کرتی ہے اور محض اشد ضروری صنعت کی مالک ہے تو اس کے باشندوں میں گویا پہلی اور اہم ترین تقسیم کار مفقود ہے، اور قوائے دولت آفریں کا اہم نصف غائب، بلکہ خود زراعت کی مختلف شاخوں تک میں اس کے یہاں تقسیم کار معدوم ہو گی۔ ایک ایسی ناقص قوم بھی نہیں کہ ایک کامل قوم کے مقابلہ میں نصف دولت آفریں ہو گی، بلکہ برابر نہیں زیادہ رقبہ زمین اور برابر نہیں زیادہ آبادی رکھنے کے باوجود اس مادی دولت کا پانچواں بلکہ مشکل سے دسواں حصہ پیدا کر سکے گی جو ایک کامل قوم حاصل کر سکتی ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جس کے باعث ایک پیچیدہ کارخانہ میں ۱۰ آدمی ایک تنہا آدمی سے دس گنا نہیں بلکہ شاید تیس گنا زیادہ پیدا کر سکتے ہیں، یا جس کے باعث ایک بازو رکھنے والا آدمی دو بازوؤں والے سے نصف نہیں بلکہ اس سے کہیں کم کام کرتا ہے۔ قوتِ دولت آفریں کا یہ نقصان اس لئے اور بھی زیادہ ہو گا کہ کارخانہ کے کام میں مشینوں کے استعمال سے مدد مل سکتی ہے اور زراعت میں مشینوں کے استعمال کا بہت کم امکان ہے۔ جو قوت دولت آفریں زرعی قوم کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اس کا ایک حصہ اس قوم کو مل جاتا ہے جو زرعی پیداوار کے بدلے مصنوعات بھیجتی ہے، لیکن یہ نقصان مثبت نقصان صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ یہ زرعی قوم تہذیب اور سیاسی نشوونما کے اس منزل پر پہنچ چکی ہو جو صنعت کے قیام کے لئے ضروری ہے، لیکن اگر وہ اس

منزل تک نہیں پہنچی ہے، اگر ابھی بربریت یا نیم تہذیب کے حال میں ہے، اس کی زرعی قوت ابھی ابتدائی حالت سے آگے نہیں بڑھی ہے تو پردیسی مصنوعات کی درآمد اور خام اجناس کی برآمد سے سال بہ سال اس کی خوشحالی میں معتد بہ اضافہ ہوتا رہے گا اور اس کی ذہنی اور جماعتی قوتوں کو بیدار کر کے نشو و نما بخشے گا۔ اور اگر اجناس خام کے بھیجنے میں درآمد کی ممانعت یا جنگ سے ہرج نہ پیدا ہو یا زرعی قوم کا رقبہ زمین منطقہ حارّہ میں ہو تو طرفین کو قدرتی طور پر ایک سا نفع ہوگا۔ کیونکہ دیسی پیداوار اور پردیسی مصنوعات کے مبادلہ کے اثر سے بر زرعی قوم کہیں زیادہ تیزی اور یقین کے ساتھ تہذیب اور قوائے دولت آفریں کا نشو و نما حاصل کر سکے گی، بہ نسبت اس کے کہ اسے خود اکیلے ترقی کی راہ طے کرنی ہوتی لیکن اگر زرعی قوم زراعت کے اس منتہائے کمال کو پہنچ چکی ہے، جہاں تک خارجی تجارت کا اثر اسے پہنچا سکتا ہے، یا اگر صنعت والی قوم اپنی مصنوعات کے بدلے زرعی قوم کی پیداوار کے لینے سے انکار کرتی ہے اور پھر بھی زرعی قوم کے بازاروں میں مقابلہ کے زور پر ان کی مصنوعات کھپ جاتی ہیں اور اس زرعی ملک میں کارخانے پنپنے نہیں پاتے تب خطرہ ہوتا ہے کہ زرعی قوم کی قوت دولت آفریں مفلوج ہو جائے گی۔

مفلوج زراعت اس کو کہتے ہیں جبکہ ایک مضبوط، رفتہ رفتہ بڑھنے والی صنعت کے نہ ہونے سے آبادی کا تمام اضافہ زراعت کے سر جا پڑتا ہے، زراعت کی ساری فاضل پیداوار ہضم کر لیتا ہے اور جب پل بلا کر کچھ عمر ہوئی تو یا تو کسی دوسرے ملک میں ہجرت کر جاتا ہے یا پھر زمین میں موجودہ اہل زراعت سے حصہ بٹاتا ہے؛ یہاں تک

کہ ہر خاندان کے حصہ میں زمین اتنی کم رہ جاتی ہے کہ بس اتنی ہی غذا اور اجناس خام پیدا ہو سکتی ہیں کہ ان کی اشد ضرورتوں کے لئے کافی ہوں، لیکن اس سے زیادہ کا ذکر نہیں ہوتا کہ اس فاضل پیداوار کو صناعوں کے سپرد کر کے ان سے ضروری مصنوعات بدلہ میں حاصل کر سکیں۔

اگر قوائے دولت آفریں کا صحیح نشو و نما ہو تو چاہیئے یہ کہ زرعی قوم کے اضافۂ آبادی کا بڑا حصہ مناسب تربیت کے بعد فوراً کارخانوں میں منتقل ہو جاتے اور جو فاضل زرعی پیداوار ہو وہ کچھ تو کارخانوں میں کام کرنے والوں کے لئے رزق اور اجناس خام فراہم کرنے کے کام آئے اور کچھ اس کام میں لگے کہ اہل زراعت کو اپنے صرف یا اپنی پیداوار کو بڑھانے کے لئے جن مصنوعات مشینوں اور اوزاروں وغیرہ کی ضرورت ہو، اس کے ذریعہ حاصل کئے جا سکیں۔

اگر یہ صورت حال ٹھیک وقت پر پیدا ہو جائے تو زرعی اور صنعتی قوت دولت آفریں باہم ایک دوسرے کو ابھاریں گی اور برابر اُبھارے جائیں گی۔ صنعتی آبادی کی طرف سے زرعی پیداوار کی مانگ اتنی ہو گی کہ زراعت میں بس اتنے ہی کام کرنے والے کھپیں گے اور موجودہ زمین کے ٹکڑے بس اسی حد تک ہوں گے کہ زیادہ سے زیادہ فاضل پیداوار حاصل ہو سکے جتنی یہ فاضل پیداوار زیادہ ہو گی، اسی قدر زرعی آبادی کارخانوں کی مصنوعات زیادہ استعمال کر سکے گی؛ گویا زراعت کی فاضل پیداوار میں اضافہ کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کارخانوں میں کام کرنے والوں کی مانگ بڑھے گی؛

زرعی آبادی کا جو فاضل حصہ ہوگا، وہ برابر کارخانوں میں کھپتا رہے گا، اور آخر میں کارخانوں کی آبادی یہی نہیں کہ زرعی آبادی کے برابر ہو جائے گی، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو جائے گی۔ یہ حالت انگلستان کی ہے اور وہ حالت (جس کا ذکر پہلے ہوا) فرانس کے بعض حصوں کی اور جرمنی کی۔ انگلستان کے اندر معاشی مشاغل کی ان دو شاخوں میں یہ قدرتی تقسیم زیادہ تر بھیڑوں کے گلوں اور اون کی صنعت سے پیدا ہوئی جن پر انگلستان میں فی الجملہ دوسرے ملکوں سے بہت پہلے توجہ کی گئی۔ دوسرے ملکوں میں زراعت منصب داری حکومت اور استبدادی قوت کی وجہ سے بے دست و پا رہی۔ زمین کی ملکیت سے قوت اور عزت حاصل ہوتی تھی، کہ اس پر متوسلین کی ایک تعداد پرورش پا سکتی تھی اور مالک کو اپنے معرکوں میں ان کی ضرورت پڑتی تھی، گویا جتنے متوسلین اتنے ہی جنگ آزما ساتھ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ زمانہ کی سادگی کچھ ایسی تھی کہ مالک زمین کے لئے اپنی آمدنی کے صرف کی اور کوئی صورت نہ تھی، سوائے اس کے کہ بہت سے خدمت گار رکھے، اور ان کو اجرت دینے اور اپنی ذات سے وابستہ رکھنے کا اس سے بہتر اور کیا ذریعہ تھا کہ کاشت کے لئے انہیں ایک قطعہ بے دست و پا رہی۔ زمین کی ملکیت سے قوت اور عزت حاصل ہوتی تھی، کہ اس پر متوسلین کی ایک تعداد پرورش پا سکتی تھی اور مالک کو اپنے معرکوں میں ان کی ضرورت پڑتی تھی، گویا جتنے متوسلین اتنے ہی جنگ آزما ساتھ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ زمانہ کی سادگی کچھ ایسی تھی کہ مالک زمین کے لئے اپنی آمدنی کے صرف کرنے

کی اور کوئی صورت نہ تھی، سوائے اس کے کہ بہت سے خدمت گار رکھے، اور ان کو اجرت دینے اور اپنی ذات سے وابستہ رکھنے کا اس سے بہتر اور کیا ذریعہ تھا کہ کاشت کے لئے انہیں ایک قطعہ زمین دے دے اور اس کے عوض تھوڑی سے اجناس کی ادائیگی اور خدمت ذاتی کی شرط ٹھہرا لے۔ اس طرح زمین کو ضرورت سے زیادہ تقسیم کرنے کی بنیاد مصنوعی طور پر پڑی اور اگر آج حکومت مصنوعی طریقوں سے اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے تو گویا اصلی حالت کو از سر نو قائم کرنے میں ساعی ہے اور بس۔

کسی قوم کی زرعی قوت کے بہم زوال کو روکنے اور (جہاں تک یہ زوال قدیم رسوم کا نتیجہ ہے) اس سے رفتہ رفتہ اسے نجات دلانے کا (ہجرت سے قطع نظر) سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اس قوم میں صنعتی قوت قائم کی جائے تاکہ اضافہ آبادی صنعت میں منتقل ہو جائے اور زرعی پیداوار کی مانگ بڑھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے پیمانہ پر زراعت زیادہ سود مند ثابت ہوگی اور اہل زراعت میں حوصلہ پیدا ہوگا کہ اپنی زمین سے زیادہ سے زیادہ فاضل پیداوار حاصل کریں۔

کاشتکار اور زرعی مزدور کی قوت دولت آفرینی اسی نسبت سے زیادہ یا کم ہو گئی جس نسبت سے کہ مصنوعات اور دیگر اشیاء کے ساتھ زرعی پیداوار کے مبادلہ میں زیادہ یا کم سہولت ہو۔ یہ تو ہم کسی دوسرے باب میں انگلستان کی مثال سے ظاہر کر چکے ہیں کہ ترقی یافتہ قوم کے لئے اس معاملہ میں تجارت خارجہ کس قدر مفید ہوتی ہے، لیکن جو قوم تہذیب، سرمایہ اور آبادی کے اعتبار سے کچھ ترقی کر چکی ہو اس کی زراعت

کے لئے خود اپنی صنعت، بے صنعت کی اچھی سے اچھی تجارت خارجہ سے، کہیں زیادہ سود بخش ثابت ہو گی۔ کیونکہ اول تو اس طریقہ سے یہ قوم اپنے کو بازار کے اس تمام اتار چڑھاؤ سے محفوظ کر لیتی ہے جو جنگ کی وجہ سے پردیس میں تجارتی قیود کے باعث یا تجارتی کساد بازاری کے سبب سے پیدا ہو سکتا ہے؛ دوم، یوں کہ اپنی پیداوار زرعی کو باہر بھیجنے اور بیرونی مصنوعات کے ملک کے اندر منگانے میں جو مصارف باربرداری ہوتے ہیں اور جو تجارتی بٹہ پڑتا ہے اس کا بڑا حصہ بچ رہتا ہے؛ تیسرے صنعت کی وجہ سے وسائل باربرداری میں جو ترقیاں ہوتی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس کے ذریعہ ذاتی اور قدرتی قوتوں کا بہت بڑا مجموعہ، جو ویسے بے کار پڑا رہتا، نشو و نما پاتا ہے؛ چوتھے یہ کہ زراعت اور صنعت کا باہمی اثر اسی قدر زیادہ ہوتا ہے جس قدر کہ کاشتکار اور صناع ایک دوسرے سے قریب ہوں اور ان کی مختلف النوع پیداوار کے مبادلہ میں ہر قسم کے اتفاقات سے ہرج واقع ہونے کا امکان جتنا کم ہو۔

فلیڈلفیا کی انجمن ترقی و فنون و حرفہ کے صدر مسٹر چارلس ج۔ انگرسول کے نام ۱۸۲۸ء میں جو خطوط میں نے لکھے تھے، (جن کا عنوان تھا "ایک جدید نظام معاشیات کا خاکہ") ان ہی میں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک ہی ملک اور ایک ہی سیاسی اقتدار کے ماتحت صنعت اور زراعت کے یکجا ہونے سے کیا کیا فوائد ہوتے ہیں: "فرض کیجئے آپ کو ہیں کہ آٹا تیار کرنے کا فن نہ آتا ہو، اور فرض کیجئے کہ روٹی پکانے کا فن آپ سے پوشیدہ ہو جیسا کہ بقول اینڈرسن ہیرنگ مچھلی کو نمک سار کرنے

کا اصلی فن انگریزوں کے لیے سترھویں صدی تک نامعلوم رہا یعنی فرض کیجئے کہ آپ کو اپنا غلہ انگلستان بھیجنا پڑتا ہے تاکہ آٹا پیس کر روٹی پکوائی جائے تو اس غلہ کا کس قدر حصہ اس پیسنے اور پکانے کی اجرت کے طور پر انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا۔ پھر اس میں سے کتنا بڑی باربرداری اور جہازرانی والے اور وہ تاجر جو غلہ کی برآمد اور روٹی کی درآمد کا کام کرتے ہیں اپنے صرف میں لے آئینگے، اور جنہوں نے غلہ پیدا کیا تھا ان کے ہاتھوں میں کتنا لوٹ کر آئے گا؛ اس میں شک نہیں کہ اس طرح تجارت خارجہ کو بہت فروغ ہو جائے گا لیکن یہ بہت مشتبہ بات ہے کہ آیا یہ روابط تجارتی قوم کی مرفہ الحالی اور اس کی فطرت کی خود مختاری کے لیے بھی زیادہ مناسب ہونگے یا نہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر اس ملک (شمالی امریکہ) اور برطانیہ عظمیٰ میں جنگ چھڑ جائے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو انگریزی چکیوں اور تنوروں کے لئے غلہ پیدا کرتے تھے، اور ان غریبوں کا جو انگریزی روٹی کے مزے کے عادی ہو گئے تھے؛ چنانچہ جس طرح غلہ پیدا کرنے والے کی خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ آٹا پیسنے والا اس کے پڑوس میں رہتا ہو بالکل اسی طرح ہر کاشتکار کی خوشحالی کا یہی تقاضا ہے کہ صناع اس کے قریب ہو یا دیہاتی علاقہ کی مرفہ الحالی چاہتی ہے کہ اس کے وسط میں ایک خوشحال اور صنعت رکھنے والا شہر ہو؛ اور سارے ملک کی زراعت کے لئے بہ حیثیت مجموعی یہ ضروری ہے، کہ ملک کی صنعتی قوت تا حد امکان نشو و نما پا چکی ہو۔

زراعت کا جو حال کسی آباد شہر کے قریب ہوتا ہے اس کا مقابلہ کسی دور افتادہ

صد بہ کی زراعت سے کیجئے، یہاں کاشتکار فروخت کے لئے صرف وہی چیزیں کاشت کرسکتا ہے جو طویل بار برداری برداشت کرسکتی ہوں اور جنہیں خریدنے والوں کے قریب علاقے اتنا اچھا یا اتنا سستا نہ پیدا کرسکتے ہوں، کاشتکار کے منافع کا بڑا حصہ مصارف بار برداری میں کھپ جاتا ہے، اپنے کھیت میں مفید طور پر لگانے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا اس کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ چونکہ اچھی مثالیں سامنے نہیں ہوتیں اور زرائع تعلیم معدوم ہوتے ہیں اس لئے جدید طریقوں، بہتر اوزاروں اور نئی چیزوں کی کاشت کے لئے آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ خود مزدوروں کے سامنے چونکہ کوئی اچھی مثال موجود نہیں، نہ محنت مشقت کے لئے کوئی تحریک ہوتی ہے، نہ دوسروں کی ریس کے لئے، اس لئے یہ بھی اپنی دولت آفریں قوتوں کو کچھ یونہی سی ترقی دے سکتے ہیں، اور کاہلی اور سرگشت میں وقت گزارتے ہیں۔

برخلاف اس کے شہر کے پاس کسان اس قابل ہوتا ہے کہ زمین کے ایک ایک چپہ کو اسی چیز کی کاشت کے کام میں لائے جس کے لئے موزوں ہے، یہ طرح طرح کی چیزیں فائدے کے ساتھ پیدا کرسکتا ہے، ترکاریاں، مرغ، انڈے، دودھ، مکھن، پھل، الغرض سب وہ چیزیں جنہیں دورافتادہ کاشتکار کم قیمت ضمنی چیزیں سمجھتا ہے۔ وہ یہاں معقول منافع دیتی ہیں۔ مویشیوں کے بارے میں دور کا کسان محض اس پر اکتفا کرتا ہے کہ ان کی نسل بڑھائے اور یہ قریب والا انہیں کھلا کھلا کر موٹا کرتا ہے اور ان سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے، اسی وجہ سے یہ چڑھائی کی کاشت کو تکمیل کو پہنچاتا ہے

بہت سی چیزیں جو دور کے کسانوں کے لئے بالکل یا قریب قریب بے سود سی ہوتی ہیں، انہیں یہ بہت نفع سے کام میں لاسکتا ہے مثلاً بیچ ریت اور آبی قوت وغیرہ ، اچھی اچھی مشینیں اور اوزار، نیز تعلیم کے تمام ذرائع ، اس کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اپنے کام کو ترقی دینے کے لئے جس سرمایہ کی ضرورت ہو اس کا فراہم کرلینا اس کے لئے سہل ہوتا ہے۔ شہر ہر نفر کچھ پیش کرتا ہے اور آپس میں مقابلہ کی جو روح پیدا کردیتا ہے اور اس کی وجہ سے نفع کمانے میں جو آسانیاں ہوجاتی ہیں ان سے زمینداروں اور مزدوروں دونوں کو تحریک ہوتی ہے کہ وہ اپنی حالت کو بہتر کرنے کے لئے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں سے کام لیں۔ بالکل یہی فرق ہوتا ہے ایک ایسی قوم میں جس کے یہاں زراعت اور صنعت ایک ہی علاقہ میں یکجا ہے اور اس قوم میں جو اپنی زرعی پیداوار کا پردیسی مصنوعات سے مبادلہ کرتی ہے۔

قوم کی پوری جماعتی حالت کی پستی اور بلندی کا مدار بھی اسی تقسیم مشاغل اور اتحاد قوائے دولت آفریں کے اصول پر ہوتا ہے۔ سوئی کے کارخانہ میں جو حیثیت سوئی کی ہے وہی حال قومی خوشحالی کا ہے اس بڑی جماعت میں جسے قوم کہتے ہیں۔ قوم کے مشاغل کی سب سے اہم تقسیم ذہنی اور مادی مشاغل میں ہے اور دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں، ذہنی دولت کی آفرینش کرنے والے، اخلاق، مذہبیت، روشن خیالی پیدا کرنے، تکثیر علم، توسیع حریت اور سیاسی افادہ گاہوں کی تکمیل میں، ملک کے اندر ذات و ملک کے تحفظ میں اور باہر والوں کے مقابلہ میں قومی قوت اور خودمختاری کو استوار

کرنے میں جس قدر کامیاب ہوں گے اسی قدر مادی دولت آفرینی زیادہ ہوگی اسی طرح مادی دولت پیدا کرنے والے جس قدر زیادہ چیزیں تیار کرینگے اسی قدر ذہنی دولت میں ترقی ہوگی۔

مادی دولت آفرینی میں مشاغل کی سب سے اہم تقسیم اور قوائے دولت آفرین کا سب سے اہم تعاون بھی زراعت و صنعت کی تقسیم اور ان کا تعاون ہے اور جیسا کہ ہم ظاہر کر چکے ہیں، دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔

سوئی کے کارخانہ کی طرح قوم میں بھی ہر فرد کی، ہر شاخ پیدائش کی اور بالآخر کل قوم کی دولت آفرینی اس پر منحصر ہے کہ تمام افراد کے کام میں باہم صحیح تعلق ہو۔ اس صحیح تعلق کو ہم قوائے دولت آفرین کا تناسب یا توازن کہتے ہیں، ایک قوم میں ہو سکتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ فلسفی، ماہر لسانیات، اور ادیب ہوں اور ضرورت سے کم ماہر کاریگر، تاجر اور جہاز راں یہ نتیجہ ہوتا ہے، ایسی ترقی یافتہ، اعلے التعلیم کا جس کے سہارے کے لئے ترقی یافتہ صنعت اور وسیع داخلی اور خارجی تجارت موجود نہ ہو اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے سوئی کے کارخانہ میں سوئیوں سے زیادہ سوئیوں کے انکھوے تیار ہو جائیں جس قوم کا ہم نے ذکر کیا اس کے فاضل انکھوے یہ ہوتے ہیں:۔ بیکار کتابوں کا ایک انبار، بال کی کھال اتارنے والے نظری نظام اور عالمانہ مناظرے جن سے ذہن قومی مہذب ہونے کی جگہ اور تاریکی میں پڑ جاتا ہے اور مفید مشاغل سے ہٹ کر اس کی قوت دولت آفرینی کی ترقی اسی طرح رک جاتی ہے، جیسے اس وقت رک جاتی کہ

اس میں ضرورت سے زیادہ پجاری ہوتے اور ضرورت سے کم بچوں کو پڑھانے والے، ضرورت سے زیادہ سپاہی ہوتے اور ضرورت سے کم مدبر، با ضرورت سے زائد حکام انتظامی ہوتے اور ضرورت سے کم انصاف کرنے والے اور انصاف کے حامی۔

وہ قوم جو محض زراعت کرتی ہے اس فرد کی طرح ہے جو دولت آفرینی کے لئے بس ایک بازو رکھتا ہو۔ اور تجارت تو زراعت اور صنعت اور ان کی مختلف شاخوں کے درمیان بس ذریعہ مبادلہ کا کام کرتی ہے۔ وہ قوم جو اپنی زرعی پیداوار کا مبادلہ پردیسی مصنوعات سے کرتی ہے۔ اس فرد کی طرح ہے جو ایک پرائے بازو کے سہارے سے کام کرتا ہے۔ یہ سہارا اس کے لئے ضرور مفید ہے لیکن نہ اتنا کہ خود اس کے پاس اپنے دو بازو ہوتے، اور کچھ نہیں تو اس لئے کہ اس کا کام دوسرے کی مرضی پر منحصر ہو جاتا ہے۔ اگر خود اس کی اپنی صنعت ہو تو یہ کھانے کی چیزیں اور اجناس خام اس مقدار میں پیدا کر سکے جتنی کہ خود اس کی صنعت میں صرف میں آئیں، لیکن جب پردیسی صنعت پر اس کا دارومدار ہے تو یہ اتنا ہی فاضل پیدا کرے گی جتنا کہ پردیسی قوم اپنے لئے خود پیدا نہیں کر سکی، اور مجبور ہے کہ اتنا باہر سے خریدے۔

ایک ملک کے مختلف علاقوں کی طرح کرۂ ارض کی مختلف قوموں میں بھی تقسیم کار اور تعاون قوائے دولت آفرین کا اصول قائم ہے۔ اول الذکر کا انتظام تجارت داخلی یا قومی سے اور مؤخر الذکر کا تجارت خارجی یا بین الاقوامی سے ہوتا ہے۔ لیکن قوائے دولت آفرین کا بین الاقوامی تعاون ہنوز بہت ناقص ہے، کیونکہ اس میں جنگ،

سیاسی قیود، تجارتی اتار چڑھاؤ وغیرہ سے اکثر روک پیدا ہوتی ہے۔ ہر چند کہ یہ اس معنی میں تو بہت اہم چیز ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا کی مختلف قومیں ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتی ہیں، تاہم کسی ایک قوم کی مرفہ الحالی کے لحاظ سے جو تہذیب میں خوب ترقی کر چکی ہو، یہ سب سے کم اہم چیز ہے، مذہب رائج کے مصنفین بھی اس بات کو بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قوم کا اپنا بازار پردیسی بازار سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ہر بڑی قوم کا فائدہ اسی میں ہے کہ قوائے دولت آفریں کے قومی تعاون کو اپنی مساعی کا موضوع اصلی بنائے اور بین الاقوامی تعاون کو اس کے ماتحت جگہ دے۔

بین الاقوامی اور قومی تقسیم کار دونوں کا فیصلہ بڑی حد تک آب و ہوا اور قدرت خود کر دیتی ہے۔ ہر ملک میں چین کی طرح چا پیدا نہیں ہو سکتی، نہ جاوا کی طرح گرم مصالحہ، نہ لوزیانا کی طرح روئی، نہ منطقہ معتدل کے ممالک کی طرح غلہ، اون، پھل یا مصنوعات۔ یہ بڑی حماقت ہو گی کہ کوئی قوم ایسی چیزیں اپنے یہاں پیدا کرنا چاہے جس کے لئے قدرت نے اسے اہل نہیں بنایا ہے۔ جو چیز وہ بین الاقوامی تقسیم کار کے ذریعہ اچھی اور سستی حاصل کر سکتی ہے اسے قومی تقسیم کار کے ذریعہ یعنی خود اندرون ملک پیدا کرنے کی کوشش کرنا بالکل اسی طرح قومی تمدن اور قومی قوت عمل کے فقدان کی علامت ہو گی، جیسے کہ قوم اندرونی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان تمام قوتوں کا استعمال نہ کرے جو قدرت نے اسے عطا کی ہیں۔ اور فاضل پیداوار کے ذریعہ ان احتیاجات کے رفع کرنے کے لئے چیزیں نہ حاصل کرے جس کا خود اپنی زمین پہ پیدا کرنا قدرت نے اس کے لئے ناممکن بنا دیا ہے۔

قومی اور بین الاقوامی تقسیم عمل کے اعتبار سے قدرت نے دنیا کے جن ملکوں پر سب سے زیادہ عنایت کی ہے وہ ظاہر ہے کہ وہ ملک ہیں جن کی زمین سے معمولی ضروریات زندگی بہتر سے بہتر قسم کے اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیدا ہو سکتے ہیں اور جن کی آب و ہوا جسمانی اور ذہنی مشقت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے یعنی منطقہ معتدل کے ممالک انہیں ممالک میں صنعتی قوت خوب فروغ پاتی ہے، اور اس کے ذریعہ قوم صرف ذہنی اور جماعتی ترقی اور سیاسی اقتدار ہی کے منازل اعلیٰ تک نہیں پہنچ جاتی، بلکہ ایک حد تک منطقہ حارہ کے ممالک اور کم متمدن اقوام کو اپنا باجگذار بھی بنا سکتی ہے۔ چنانچہ سب سے زیادہ منطقہ معتدل کے ممالک ہی کا فرض ہے کہ قومی تقسیم عمل کو تکمیل کو پہنچائیں اور بین الاقوامی تقسیم عمل سے اپنی دولت بڑھائیں۔

باب ۱۴

شخصی معیشت اور قومی معیشت

ہم نے تاریخ سے ثابت کر دیا ہے کہ قوم کا اتحاد اس کی مستقل مرفہ الحالی کی بنیادی شرط ہے، اور یہ بھی دکھا دیا ہے کہ جہاں افراد کی اغراض قومی مفاد کی تابع رہی ہیں، اور جہاں کئی نسلوں نے بہم ایک ہی مقصد کے لئے سعی کی ہے بس وہیں قوموں کو اپنے قوائے دولت آفریں کی متوازن نشوونما بھی نصیب ہوئی ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ معاصر افراد اور متصل نسلوں کے ایک مشترکہ مقصد کے لئے سعی کئے بغیر شخصی محنت و صنعت کو پنپنے کے کتنے کم مواقع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پچھلے باب میں ہم نے یہ ظاہر کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ اتحادِ قومی کا قانون تو الگ الگ کارخانوں تک میں اپنے مفید اثرات دکھاتا ہے اور پھر اسی شدت کے ساتھ پوری پوری قوموں کی صنعت میں۔ اب اس باب میں یہ دکھلانا ہے کہ مذہب رائج کو مفاد قومی اور قومی قوتوں کے اتحاد کے اثرات کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں انہیں معیشت شخصی اور معیشت قومی کے اصولوں میں گڈمڈ کر کے وہ کس طرح چھپانا چاہتا ہے۔ آدم اسمتھ کہتا ہے کہ[1] "معیشت شخصی میں جو چیز دانشمندی ہے وہ بڑی قوموں

---

[1] Wealth of Nations, Book IV ch. II.

کی معیشت میں ذرا مشکل ہی سے حماقت ہو سکتی ہے، ہر فرد جب اپنے اغراض کی فکر کرتا ہے تو لازمی طور پر جماعت کے اغراض کو بھی مدد دیتا ہے۔ چونکہ ہر فرد اپنے مقامی حالات کو سب سے بہتر جانتا اور اپنے کام پر سب سے زیادہ توجہ صرف کرتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ مدبر اور آئین ساز سے بہتر حکم لگا سکتا ہے کہ اس کا سرمایہ سب سے اچھی طرح کس کام میں لگایا جا سکتا ہے، جو جمہور کو یہ ہدایت دینا چاہتا ہے کہ اپنے سرمایہ کو کہاں لگائے۔ وہ یہی نہیں کہ ایک بے سود محنت اپنے سر لیتا ہے بلکہ ایسے اختیار کا دعویدار بنتا ہے جو صرف ان لوگوں کا حق ہے جو دولت آفرینی کے کام میں مصروف ہیں اور اس اختیار کی اہلیت سب سے کم انہی لوگوں میں ہوتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ ہم میں اس مشکل کام کے انجام دینے کی صلاحیت ہے۔" اس سے آدم سمتھ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ داخلی صنعت کو فروغ دینے کے لئے تجارت پر پابندیاں لگانا محض حماقت ہے۔ افراد کی طرح ہر قوم کو بھی چیزیں وہاں سے خریدنی چاہئیں جہاں سب سے سستی ملیں۔ قومی خوشحالی کو کمال پر پہنچانے کے لئے ہمیں بس اس اصول پر عمل پیرا ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو، جو کوئی کچھ کرتا ہے کرنے دو۔ اور سمتھ کے نزدیک اس قوم کی مثال جو اپنی صنعت کو ناملتی محاصل سے فروغ دینا چاہتی ہے اس درزی کی سی ہے جو اپنی خوشحالی بڑھانے کے لئے اپنے دروازہ میں داخل ہونے والوں پر خود ہی کوئی محصول لگا دے۔ طامس کوپر نے امریکن نظام تاملینی کے خلاف اپنی کتاب[1] میں مذہب رائج کی دوسری غلطیوں کی طرح اس

---

[1] Lectures on Political Economy صفحات ۱۰، ۱۵، ۱۹، ۱۱۷ ؎ -

غلطی کو بھی بس انتہا کو پہنچا دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ معیشت قومی اور تمام افراد کی معیشت شخصی کم و بیش مرادف ہیں اور سیاست معاشیات قومی کا لازمی جزو نہیں۔ یہ سمجھنا حماقت ہے کہ جماعت ان افراد سے کوئی جدا چیز ہے جن سے یہ مرکب ہوتی ہے۔ ہر فرد خود سب سے اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اپنی محنت اور سرمایہ کو کس طرح استعمال کرے۔ جماعت کی دولت افراد کی دولت کے مجموعہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں؛ اور جب ہر فرد خود سب سے بہتر اپنی فکر کر سکتا ہے تو سب سے دولت مند وہ قوم ہو گی جس میں ہر فرد کو سب سے زیادہ خود اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔" ملک میں چیزیں منگانے والے تاجروں نے آزاد تجارت کی حمایت میں جب یہ دلیلیں دی تھیں تو پہلے ہی امریکن نظام تامینی کے حامیوں نے اس کی یوں مخالفت کی تھی کہ امریکہ کے قوانین جہاز رانی نے دریائے متحدہ کی جہاز رانی، تجارت خارجہ اور ماہی گیری کو بہت کچھ ابھارا ہے اور ہر سال اسی جہاز رانی کی حفاظت کے لئے لاکھوں بیڑہ پر صرف ہوتے ہیں۔ تو نظریہ مذکورہ کے مطابق تو یہ قوانین اور یہ صرف بھی اتنا ہی قابل ملامت ہونا چاہئے جتنا کہ محصول تامینی۔

جناب کوپر جواب میں فرماتے ہیں "بلا شبہ کیسی ہی بحری تجارت ہو وہ اتنی گراں قدر نہیں ہو سکتی کہ اس کے لئے بحری جنگ کی جائے۔ تاجر لوگ بس خود اپنا تحفظ کر لیں۔"

گویا مذہب رائج نے قومیت اور اغراض قومی کو نظر انداز کر کے جو ابتدا کی تھی

اور خاتمہ پر اس کی ضرورت ہی سے انکار کر دیا۔ اور افراد کو اپنی حفاظت کے لئے بھی اپنی انفرادی قوتوں پر ہی چھوڑ دیا۔

آخر کیسے؟ جو بات شخصی معیشت کے لئے دانشمندی ہے کیا وہ معیشت قومی کے لئے بھی دانشمندی ہے؟ کیا فرد کی فطرت میں بھی یہ بات شامل ہے کہ آنے والی صدیوں کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھے، جس طرح کہ یہ بات اقوام اور ریاست کی فطرت میں داخل ہے۔ ذرا ایک امریکن شہر کی پہلی داغ بیل کا خیال کیجئے جہاں ہر فرد کو اگر اپنے پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بس اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے قریبی ورثا کی ضرورتوں کا خیال کرے گا، لیکن اگر یہی افراد ایک جماعت میں متحد ہو جائیں تو یہ جماعت بعید تر نسلوں کی ضرورتوں اور ان کی آسائش کو پیش نظر رکھے گی اور اس کی خاطر موجودہ نسل پر ایسی تکلیفیں اور قربانیاں عائد کرے گی، جس کی کوئی معقول آدمی افراد سے توقع نہیں کر سکتا۔ پھر کیا اپنی شخصی معیشت کو فروغ دینے میں فرد حفاظت ملک، امن عامہ اور ان ہزاروں باتوں کا خیال رکھ سکتا ہے جو صرف پوری جماعت کی مدد سے حاصل ہوتی ہیں؟ کیا قوم اپنے مقاصد کے مطابق افراد سے اپنی شخصی آزادی پر پابندیاں عائد کرنے کا مطالبہ نہیں کرتی؟ کیا یہ اس بات تک کا مطالبہ نہیں کر دیتی کہ افراد اپنی کمائی کا ایک حصہ، اپنے ذہنی و جسمانی محنت کا ایک جزو، بلکہ اس کی خاطر خود زندگی تک قربان کر دیں؟ آدمی پہلے کوپر کی طرح ریاست اور قوم کے تمام تصورات کو مٹا دے تو اس رائے کو مانے!

نہیں، معیشت قومی میں وہ چیز دانشمندی ہو سکتی ہے جو شخصی معیشت میں حماقت

ہے، نیز اس کے برعکس، اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ ایک انفرادی درزی قوم نہیں ہوتا، اور قوم درزی نہیں ہوتی؛ ایک خاندان اور ایک لاکھوں خاندان کی جماعت دو جدا جدا چیزیں ہیں، اور ایک گھر، وسیع قومی رقبہ زمین سے مختلف چیز ہے۔ نہ یہ ٹھیک ہے کہ ہر فرد اپنے اغراض کو بہتر سمجھتا ہے اور اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اپنے اغراض کو پورا کرنے کی کوشش میں یہ جماعت کے اغراض کو بھی پورا کرتا ہے۔ جو لوگ عدالت کی کرسیوں پر رونق افروز ہوتے ہیں، ان سے ہمارا سوال ہے۔ کہ کیا اکثر ایسا موقع نہیں آن پڑتا کہ بعض افراد کو ذہن اختراعی کی افراد یا ضرورت سے زیادہ محنت و مستعدی کے باعث جنگی کی مشقت کے لئے بھیجنا ہوتا ہے۔ قزاق، چور، چھپا چھپا کر مال لے جانے والے، دھوکہ باز بھی اپنے مقامی اور ذاتی اسباب حالات کو نہایت اچھی طرح جانتے ہیں، اور اپنے کام پر نہایت گہری توجہ صرف فرماتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ تو کسی طرح نہیں نکلتا کہ جماعت اس وقت بہترین حال میں ہوگی جب کہ ایسے افراد پر اپنے شخصی کام کے انجام دینے میں کم سے کم پابندیاں ہوں!

ہزاروں ایسی صورتیں ہوتی ہیں کہ ریاست مجبور ہوتی ہے کہ شخصی کاروبار پر پابندیاں عائد کرے؛ یہ جہاز کے مالک کو اس سے منع کرتی ہے کہ افریقہ کے مغربی ساحل سے غلام سوار کر کے امریکہ لے جائے؛ یہ جہازوں کی تعمیر کے قاعدے بناتی ہے اور سمندر میں جہاز رانی کے ضوابط، تاکہ کپتانوں کے لالچ یا تلوّن پر ملاح اور مسافر بھینٹ نہ چڑھیں۔ حال ہی میں انگلستان تک میں تعمیر جہازات کے متعلق کچھ قواعد نافذ ہوئے ہیں، کیونکہ

بیمہ کی کمپنیوں اور جہازرانوں میں ایک ایسی شیطانی سازش کا پتہ چلا ہے جس کی وجہ سے ہر سال چند اشخاص کی حرص کے باعث ہزاروں جانیں اور لاکھوں کی قیمت کا مال قربان کیا جاتا تھا۔ شمالی امریکہ میں پنہاروں پر پابندی ہے کہ ہر ظرف میں ۹۸، پونڈ سے کم عمدہ آٹا نہ بند کریں، ورنہ سزا کے مستوجب ہونگے، اور سارے بازاری سامان کے لیے نگران بازار مقرر ہیں، اگرچہ کسی اور ملک میں یہاں سے زیادہ شخصی آزادی کی قدر نہیں کی جاتی ہر جگہ ریاست اپنا فرض سمجھتی ہے کہ عامۃ الناس کو خطرہ اور نقصان سے بچائے، مثلاً ضروریات زندگی اور ادویہ وغیرہ کی فروخت ہیں۔

لیکن مذہب رائج کا جواب یہ ہوگا کہ "یہ جو مثالیں دی گئیں یہ سب کی سب املاک اور ذات کو خلاف قانون نقصان پہنچانے کی مثالیں ہیں، مفید اشیا کے بادیانت مبادلہ کی نہیں، یا افراد کے لیے ضرر اور مفید کاموں کی نہیں؛ ان پر پابندیاں عائد کرنے کا حق ریاست کو نہیں ہے"! ظاہر ہے کہ جب تک یہ بے ضرر اور مفید ہے وہ قومی کاروبار میں مضر اور خطرناک ہو سکتی ہے، اور اس کے برعکس بھی۔ زمانہ امن میں اور عالمی نقطہ نظر سے جہازوں کا لوٹنا ایک مضر کام ہے، لیکن جنگ کے زمانہ میں حکومتیں اس کی حمایت کرتی ہیں؛ کسی انسان کو بالارادہ مار ڈالنا زمانہ امن میں جرم ہے، حالت جنگ میں یہی فرض ہو جاتا ہے؛ زمانہ امن میں بارود، سیسہ اور اسلحہ کی تجارت کی اجازت ہوتی ہے لیکن زمانہ جنگ میں جو کوئی دشمن کو یہ چیزیں مہیا کرے اسے غدار کے نام سے سزا دی جاتی ہے۔ ایسے ہی وجوہ سے اگر ریاست قوم کے بہترین اغراض کے خیال سے تجارت پر

(جو بجائے خود بالکل بے ضرر ہو) کچھ پابندیاں عائد کرے اور اسے منضبط کرنا چاہے تو یہ صرف حق بجانب ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے۔ ریاست اپنی ممانعتوں سے یا اپنی محاصل کے ذریعہ افراد کو یہ حکم تو نہیں دیتی کہ وہ اپنے قوائے دولت آفریں اور سرمایہ کو اس اس طرح کام میں لائے، جیسا کہ اپنی سافسطائیت میں مذہب رائج بیان کیا کرتا ہے۔ ریاست کسی سے یہ نہیں کہتی کہ تم اپنا روپیہ جہاز کی تعمیر میں لگاؤ یا کسی صنعت کی بنیاد ڈالنے میں صرف کرو، نہ وہ کسی سے کہتی ہے کہ تم جہاز کے کپتان بن جاؤ یا انجنیر، یہ سب تو ریاست فرد کے فیصلہ پر چھوڑ دیتی ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو کہاں لگائے اور کیسے لگائے، یا کون سا پیشہ اختیار کرے۔ ریاست کہتی تو بس یہ ہے کہ "ہماری قوم کا فائدہ اس میں ہے کہ فلاں فلاں مال خود تیار کرے، لیکن اگر پردیسیں سے مقابلہ آزاد رہا تو ہم کبھی یہ فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔ اس لئے ہم نے اس مقابلہ کو بس اس حد تک محدود کر دیا ہے جتنا اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ ہم میں سے جو لوگ اپنا سرمایہ اس نئی صنعت کی شاخ میں لگانا چاہیں اور جو لوگ اس کے لئے اپنی ذہنی اور جسمانی محنت کو وقف کرنے کے خواہاں ہوں، انہیں اس بات کی ضمانت ہو جائے کہ ان کا سرمایہ ضائع نہ جائیگا اور وہ اپنے پیشہ سے محروم نہ ہو جائیں گے، نیز یہ کہ پردیسیوں کو ترغیب ہو کہ وہ اپنے قوائے دولت آفریں کے ساتھ ہمارے یہاں منتقل ہو آئیں، اس طریقہ سے ریاست شخصی کاروبار کو کسی طرح محدود نہیں کرتی، بلکہ اس کے بالکل برخلاف قوم کی شخصی، قدرتی اور سرمایہ کی قوتوں کے لئے بڑا وسیع

میدان عمل پیدا کرتی ہے، اور اس طرح جو کام یہ کرتی ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ افراد اسے بہتر جانتے یا کر سکتے ہوں بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ تو ایسا کام سرانجام دیتی ہے جسے افراد اگر جانتے بھی تو خود نہ کر سکتے۔

مذہب رائج کا یہ جو الزام ہے کہ نظام نامینی کے ذریعہ ریاست ناجائز اور غیر معاشی طریق پر اس بات میں دخل دیتی ہے کہ افراد اپنے سرمایہ اور محنت کو کس طرح کام میں لگاتے ہیں، یہ اس وقت بڑی بری روشنی میں ہمارے سامنے آتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دراصل پردیسیوں کے تجارتی قواعد و پابندیوں سے ہماری خانگی صنعت میں ہرج واقع ہوتا ہے، اور ہم لوگ صرف نظام نامینی کے ذریعہ سے ہی خارجی سیاست تجارتی کے مضر اثرات کا تدارک کر سکتے ہیں۔ اگر انگریز اپنے بازاروں سے ہمارے غلہ کو بند کر دیں تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کسان اتنا غلہ کم پیدا کریں، جتنا کہ آزاد درآمد کی حالت میں وہ انگلستان بھیجتے؟ اگر وہ ہمارے اون، شراب یا لکڑی پر اتنا زیادہ محصول لگا دیں کہ انگلستان سے ہماری تجارت برآمد بالکل یا بڑی حد تک بند ہو جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انگلستان کی حکومت نے اسی بندش کی نسبت سے ہمارے شعبہ ہائے دولت آفرینی کو محدود کر دیا؟ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ایک پردیسی ملک کے آئین و قوانین ہمارے سرمایہ اور ہمارے شخصی قوائے دولت آفرین کو ایسی راہ پر ڈال دیتے ہیں جن پر ان قوانین کے بغیر یہ مشکل ہی سے پڑے ہوتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر ہم اس سے باز بھی رہیں کہ اپنی

آئین سازی کے ذریعہ اپنی قومی صنعت کو اپنے حقیقی یا فرضی فوائد کے مطابق راہ دکھائیں۔ جو بہرصورت ہمارے نولائے دولت آفریں کے نشو ونما کے لئے مضر اثر رکھے گا، لیکن کیا یہ بات قرین عقل اور ہمارے افراد قوم کے فائدے کے زیادہ مطابق ہے کہ ہم پر دیسی قانون سازی کے ذریعہ، پردیسی قوموں کے اغراض کے مطابق، اپنی صنعت کو چلنے دیں، یا یہ کہ اسے خود اپنی قانون سازی سے اپنے قومی اغراض کے مطابق بنائیں؟ کیا جرمن اور امریکن کسان پر اس صورت میں کم پابندی ہے کہ اسے ہر سال انگریزی قوانین پارلیمنٹ کا اس لئے مطالعہ کرنا پڑے کہ غلہ اوران کی پیدائش بڑھانے میں فائدہ ہے یا گھٹانے میں یا اس صورت میں کم پابندی ہوگی کہ خود اپنی قانون سازی اس پر پردیسی مصنوعات کے معاملہ میں تو پابندیاں عائد کرے لیکن ساتھ ہی اس کی ساری پیداوار کے لئے بازار یقینی کردے، جس سے پردیسی قانون سازی اسے پھر کبھی محروم نہ کرسکے؟

مذہب رائج کا خیال ہے کہ تامینی محاصل سے دیسی صناعوں کو ایک اجارہ مل جاتا ہے جس سے اپنے دیس کے خریدنے والوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ بہت ہی کمزور قضیہ ہے، اس لئے کہ ہر فرد قوم کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اس دیسی بازار کے فوائد میں حصہ لے۔ جیسے دیسی محنت کے لئے یوں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح ایک خانگی اجارہ نہیں، بلکہ ایک رعایت ہے جو پردیسیوں کے مقابلہ میں ہر اس شخص کے لئے مقصود ہے جو ہماری قوم سے تعلق رکھتا ہو، اور یہ اس لئے بالکل حق بجانب بھی ہے کہ پردیسی قوموں والے بھی اپنے اپنے یہاں بھی اجارہ رکھتے ہیں اور اس طرح ہماری قوم والے صرف ان پردیسیوں کے مساوی

ہو جاتے ہیں، یہ رعایت نہ تو محض دولت پیدا کرنے والوں کے فائدے کے لئے ہے نہ محض صرف کرنے والوں کے نقصان کے لئے، کیونکہ اگر شروع میں چیزیں تیار کرنے والے زیادہ قیمت رکھ لیتے ہیں، تو وہ بہت خطرے بھی تو اٹھاتے ہیں، اور ان سب کثیر نقصانات اور قربانیوں سے بھی تو دوچار ہوتے ہیں، جو کسی صنعت کے شروع کرنے میں برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن صرف کرنے والوں کے لئے اس کی ضمانت موجود ہے کہ یہ غیر معمولی منافع ناجائز حد تک نہ پہنچ سکیں گے، نہ ہمیشہ کے لئے مقرر ہو جائینگے، کیونکہ بعد کو خود ملک کے اندر مقابلہ شروع ہو جاتا ہے، جس سے قیمتیں ہمیشہ اس سے بھی نیچے اتر جاتی ہیں، جتنی کہ بیرونی مقابلہ کی حالت میں ہوتیں، کسانوں کو بھی، کہ یہ اہلِ صنعت کے سب سے اہم گاہک ہوتے ہیں، اگر شروع میں زیادہ قیمتیں ادا کرنی پڑیں تو اس کی تلافی ضرورت سے زیادہ یوں ہو جاتی ہے کہ زرعی پیداوار کی مانگ بڑھ جاتی ہے اور ان کے لئے زیادہ قیمتیں ملنے لگتی ہیں۔

نظریہ اقدار اور نظریہ قومی کو گڈمڈ کر دینے کی وجہ سے ایک اور غلط دلیل پیدا ہوتی ہے جب مذہب رائج اس قضیہ سے کہ "قومی دولت صرف افراد کی دولت کا مجموعہ ہے۔ اور ہر فرد کا ذاتی مفاد ساری ریاست کی کارروائیوں سے بہتر دولت آفرینی کی ترقی اور دولت کی فراوانی کی طرف لے جاتا ہے" یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ قومی کاروبار اس وقت بہتر فروغ پا سکتا ہے کہ دولت جمع کرنے کا کام بے روک ٹوک ہر فرد پر چھوڑ دیا جائے۔ اس قضیہ کو مان بھی لیا جائے تو ضروری نہیں کہ اس سے وہی نتیجہ نکالا جائے جو "

مذہب رائج نکالتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ایک پچھلے باب میں بتا چکے ہیں، گفتگو اس پر نہیں ہے کہ تجارتی پابندیوں سے بلاواسطہ قوم کی اقدارِ مبادلہ کے مجموعہ کو بڑھا دیا جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اس کے قوائے دولت آفرین کے مجموعہ میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن قوم کے قوائے دولت آفرین کا مجموعہ علیحدہ علیحدہ تمام افراد کی قوتوں کے مجموعہ کا مترادف نہیں ہوتا۔ ان قوتوں کا مجموعہ بہت کچھ تو جماعتی اور سیاسی حالات پر، لیکن خصوصیت سے اس بات پر منحصر ہے کہ قوم کے اندر تقسیمِ کار اور قوائے دولت آفرین کا تعاون اور اتحاد کس درجہ تک پیدا ہو چکا ہے، اور یہ بات ہمارا خیال ہے کہ ہم سابقہ باب میں کافی طور پر ظاہر کر چکے ہیں۔

یہ مذہب ہر جگہ بس افراد ہی افراد دیکھتا ہے۔ جن میں باہم آزاد اور غیر محدود مبادلہ کا تعلق ہے۔ اور اگر ہر ایک کو قدرت کی ودیعت کی ہوئی اس جبلت پر کہ اپنی غرض آپ ڈھونڈے، چھوڑ دیا جائے، تو یہ افراد بس اپنے لئے کافی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی قوموں کی معیشت کا نظام تو ہے نہیں، بلکہ نسل انسانی کی ایسی شخصی معیشت کا نظام ہے جس میں نہ ریاست کی مداخلت ہے نہ جنگ اور نہ باہر سے کوئی مخالفانہ تجارتی پابندیاں ہیں۔ اس کا کہیں ذکر نہیں کہ آج جو قومیں خوشحال ہیں وہ دولت اور قوت کے اس درجہ پر جہاں ہم انہیں دیکھ رہے ہیں کس ذریعہ سے پہنچی ہیں، اور وہ کیا وجوہ تھے کہ دوسری قومیں وہ دولت اور قوت بھی جو کبھی ان کے پاس تھی کھو بیٹھیں، اس سے تو آدمی بس اتنا سیکھ سکتا ہے کہ خانگی کاروبار میں قدرت، محنت، اور سرمایہ باہم متحد ہو کر کیسے مبادلہ

کے لئے قیمتی اشیا پیدا کرسکتے ہیں اور یہ چیزیں نوع انسان میں کس طرح تقسیم ہوتی ہیں، اور کیسے صرف میں آتی ہیں، لیکن وہ ذرائع کیا ہیں جنہیں کام میں لاکر پوری قوم کے پاس جو قدرتی قوتیں ہیں انہیں عمل میں لایا جائے، اور کارآمد بنایا جائے، تاکہ ایک غریب اور بے بس قوم خوشحالی اور اقتدار تک پہنچ سکے، سو اس نظام میں اس بات کا کہیں پتہ نہیں، وجہ یہ ہے کہ مذہب رائج سیاسیات کو بالکل مستزد کرکے قوم کے مخصوص حالات کو نظر انداز کردیتا ہے اور ساری نوع کی خوش حالی کے ضبط میں مبتلا ہوجاتا ہے جہاں بین الاقوامی تجارت کا ذکر ہوتا ہے وہاں ہر جگہ اپنے ولیس کا ایک فرد دیرولیس کے ایک فرد کے مقابل پیش کیا جاتا ہے ہر جگہ صرف انفرادی تاجروں کے شخصی کاروبار کی مثالیں دی جاتی ہیں، ہر جگہ نہایت عام طور پر اشیا کا ذکر ہوجاتا ہے۔ اور ادھر توجہ نہیں کی جاتی، کہ یہ زرعی پیداوار ہیں، یا مصنوعات اور ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ قوم کی خوشحالی کے لئے یہ بالکل یکساں بات ہے کہ درآمد اور برآمد زر کی حیثیت میں ہو یا اجناس خام کی صورت میں یا مصنوعات کی شکل میں، اور پھر جا ہے ان دونوں میں توازن بھی ہو یا نہ ہو، مثلاً ان تجارتی بحرانات سے پریشان ہوکر جو شمالی امریکہ پر ایک وبا کی طرح مستولی ہیں، اگر ہم اس نظریہ کی طرف رخ کرتے ہیں، کہ اس سے انہیں دفع یا کچھ ہلکا کرنے کے ذرائع معلوم کریں، تو اس میں ہمیں کوئی سبق یا کوئی تسکین نصیب نہیں ہوتی۔ اور یہ کیا، یہاں تو اس مظہر پر علمی بحث کرنا بھی ناممکن ہے کیونکہ اگر "میزان تجارت" کا نام بھی لب پہ آیا تو سزا یہ ملتی ہے کہ آدمی کو کوڑ مغز اور جاہل سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہی لفظ تمام واضع قوانین جمعیتوں، تمام دفاتر حکومت، اور ہر

بازار مبادلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ فلاح انسانیت کا واسطہ دے دے کر یہ عقیدہ منوایا جاتا ہے کہ برآمد اور درآمد خود بخود باہم متوازن ہو جاتی ہیں، حالانکہ ہم عام رپورٹوں میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ انگلستان کا قومی بنک اس قدرتی "خود بخود" کی کیسے کیسے مدد کرتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قوانین غلہ بھی موجود ہوتے ہیں، جو انگلستان سے کاروبار کرنے والے ممالک کے کسانوں کے لیے دشوار کر دیتے ہیں، کہ وہ جو مصنوعات کام میں لاتے ہیں ان کی قیمت اپنی زرعی پیداوار کی شکل میں ادا کر سکیں۔

مذہب رائج ان قوموں میں جو معاشی ترقی کے مدارج اعلیٰ پر پہنچ چکی ہیں، اور ان قوموں میں کوئی فرق نہیں کرتا جو کہ ابھی نیچی ہی منزل پر کھڑی ہیں۔ یہ ہر جگہ ریاست کی مداخلت کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ریاست جس قدر کم فرد کی فکر کرے اتنا ہی زیادہ یہ فرد دولت پیدا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس مسلک کے مطابق تو دنیا کی وحشی قوموں کو دنیا میں سب سے زیادہ دولت آفریں اور دولت مند ہونا چاہیے تھا، کیونکہ حالتِ وحشت سے زیادہ تو فرد کہیں بھی اپنے اوپر نہیں چھوڑا جاتا نہ کہیں اور ریاست کی مداخلت اس سے کم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف علم الاعداد اور تاریخ ہمیں بتاتے ہیں کہ معیشتِ قومی جس قدر ترقی یافتہ ہوتی ہے اسی قدر قوتِ قانون ساز اور قوتِ نافذہ کو مداخلت کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔ جس طرح انفرادی آزادی بس اسی وقت تک اچھی چیز ہے جب تک وہ جماعت کے اغراض کے مخالف نہ ہو، اسی طرح شخصی معیشت کا بے روک ٹوک چلنے دینا بھی بس اسی وقت تک معقول بات ہے جب

تک کہ یہ قومی خوش حالی کے ساتھ ساتھ ممکن ہو۔ لیکن جب افراد کا حوصلہ اور افراد کا عمل اس غرض کے لئے کافی نہیں ہوتا، یا جب یہ امکان ہے کہ یہ قوم کے لئے مضر ثابت ہونگے، تو وہاں شخصی کاروبار کو جائز طور پر کل قوم کی قوت کی امداد درکار ہوتی ہے اور صنعت کو خود اپنی خاطر قانونی پابندیاں قبول کرنا ہوتی ہیں۔

اگر مذہب رائج تمام دولت آفرینوں کے آزاد مقابلہ کو نوع انسانی کی مرفہ الحالی بڑھانے کا سب سے یقینی ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ اس کے اپنے نقطہ نظر سے بالکل درست ہے۔ ایک عالمگیر اتحاد کے مفروضہ کے مطابق مختلف ممالک میں اشیاء کے باویانت مبادلہ پر ہر پابندی خلاف عقل اور مضر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب تک دوسری قومیں کل نوع انسانی کے اغراض کو اپنے خودی مفاد کے ماتحت نہ کرلیں، اس وقت تک مختلف اقوام کے افراد میں آزاد مقابلہ کا ذکر کرنا حماقت ہے۔ چنانچہ آزاد مقابلہ کی موافقت میں مذہب رائج کی دلیلیں صرف ان لوگوں کے مابین مبادلہ پر عائد ہوتی ہیں، جو ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ لہٰذا ہر بڑی قوم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ خود کو ایک "کل" بنائے جو اسی قسم کے دوسرے "کل" سے تجارتی روابط رکھے۔ جہاں تک کہ یہ ربط اس کی مخصوص جماعت کے اغراض کے مطابق ہو، لیکن اگر ان افراد کو محض علیحدہ اپنی اپنی جگہ پر سمجھا جائے اور جماعت قومی کا کوئی تصور نہ کیا جائے، یعنی اگر آدم اسمتھ اور سے کی طرح افراد کو محض دولت آفریں اور دولت صرف کرنے والا سمجھا جائے نہ کہ ریاست کے شہری اور رکن قوم، تو جماعت کے اغراض قوم کے جدا جدا افراد کی غرضوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں، کیونکہ اس حیثیت سے

افراد کبھی آئندہ نسلوں کی فکر نہیں کرتے اور جیسے کہ جناب کوئیر واقعی فرماتے ہیں، یہ افراد اسے حماقت سمجھتے ہیں، کہ حال میں یقینی قربانیاں اس لئے کی جائیں کہ کوئی ایسا غیر متیقن فائدہ حاصل ہوگا، جو ابھی استقبال کے وسیع دامن میں گم ہے، پھر چاہے یہ فائدہ کتنا ہی گراں بہا کیوں نہ ہو۔ ان افراد کو قوم کی بقا سے بہت کم سروکار ہوتا ہے۔ یہ اپنے تاجروں کے جہازوں کو بہادر بحری قزاقوں کا شکار ہونے دیتے ہیں۔ انہیں قوم کے اقتدار، اس کی عزت اور اس کی شہرت کا بہت کم خیال ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے یا انہیں کوئی حرفہ سکھانے کے لیے کچھ مادی اقدار قربان کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، وہ بھی اس شرط پر کہ یہ توسیکھے چند سال کے بعد ہی اپنی روزی کمانے کے قابل ہوسکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نظریۂ رائج کے مطابق قومی اور شخصی معیشت دونوں اس درجہ ایک ہیں کہ جے۔ بی۔ سے نے جب بطور استثنیٰ یہ اجازت دینا چاہی ہے کہ داخلی صنعت کو ریاست کی مدد ملے تو اس کے ساتھ یہ شرط ضرور لگا دیتا ہے کہ اس کا ظن غالب موجود ہونا چاہیئے کہ چند سال بعد ہی یہ صنعت اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو جائے گی جس طرح کسی موچی کے یہاں جو آدمی کام سیکھتا ہے اسے بھی چند ہی سال دیئے جاتے ہیں کہ اس میں اپنے حرفہ کو اس کمال تک پہنچالے کہ والدین کی امداد سے بے نیاز ہو سکے!

باب ۱۵

قومیت اور معیشت قومی

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بتا چکے ہیں مذہب رائج کے نظام میں تین خاص نقص ہیں۔(۱) اس کی بے بنیاد عالمیت جو نہ قومیت کی ماہیت کو تسلیم کرتی ہے، نہ قوم کے اغراض کی پاس داری کرتی ہے (۲) اس کی مردہ مادیت جو ہر جگہ بس چیزوں کی اقدار مبادلہ پر نظر رکھتی ہے۔ اور قوم کی موجودہ اور آئندہ اغراض اور قوم کے قوائے دولت آفرین کا ذرا خیال نہیں کرتی۔ (۳) اس کی انتشار آفریں تخصیصیت اور انفرادیت جو جماعتی کام کو اور قوتوں کے اتحاد و تعاون کے اعلیٰ اثرات کو نہیں سمجھتی، اور معیشت شخصی کا وہ نظام پیش کرتی ہے جو جماعت یعنی کل نوع انسانی کے آزاد مقابلہ سے اس وقت پیدا ہو سکے گا جب انسان علٰحدہ علٰحدہ قوموں میں تقسیم نہ رہیں گے لیکن فرد اور نوع انسانی کے بین بین قوم ہوتی ہے اور اس کی خاص زبان و ادب، اس کا مخصوص نسب اور تاریخ، اس کے مخصوص عادات و رسوم، آئین اور ادارے، بالیدگی وجود، بقا، خودمختاری، تکمیل، بقائے دائم کے دعادی، اس کا علٰحدہ ملک، یعنی ایک جماعت جو ذہن اور اغراض کے ہزاروں بندھنوں سے جکڑ کر ایک قائم بالذات کل بنتی ہے

جو اپنے لیے قانونِ حق کو تسلیم کرتی ہے اور اپنی تشکیلِ اجتماعی میں فطری آزادی کے لحاظ سے دوسری اس قسم کی جماعتوں کی مدمقابل ہوتی ہے اور دنیا کے موجودہ حالات میں صرف اپنی قوتوں اور اپنے وسائل سے اپنے وجود اور خودمختاری کو قائم رکھ سکتی ہے۔ جس طرح فرد زیادہ تر قوم کی وساطت سے اور قوم کے اندر اپنی ذہنی تربیت، قوت دولت آفرین، امن اور مرفہ الحالی حاصل کر سکتا ہے، اسی طرح نوعِ انسانی کی تہذیب قوموں کی تہذیب اور ترقی سے ممکن اور قابلِ تصور ہوتی ہے۔

پھر فی الحال مختلف اقوام کے حالات میں بے انتہا تفاوت ہے، ان میں دیو بھی ہیں اور بونے بھی، صحیح الجسم بھی ہیں اور اپاہج بھی، متمدن بھی اور نیم متمدن بھی اور وحشی بھی، لیکن انفرادی انسانوں کی طرح ان سب کو بھی قدرت کی طرف سے اپنے وجود کو قائم رکھنے کی خواہش اور تکمیل کی آرزو ودیعت کی گئی ہے۔ سیاست کا کام یہ ہے کہ وحشی قوموں کو متمدن بنائے، چھوٹی اور کمزور قوموں کو بڑا اور مضبوط بنائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے وجود اور بقا کی ضمانت پیدا کرے۔ معیشت قومی کا کام یہ ہے کہ قوم کی معاشی نشوونما کو مکمل کرے اور اسے مستقبل کی عالمی جمعیت میں داخل ہونے کے لئے تیار کرے۔

معمولاً قوم اپنی ایک مشترک زبان اور ادب رکھتی ہے، کافی وسیع رقبہ ہوتا ہے اور مناسب حدود، اس کے پاس ایک بڑی آبادی ہوتی ہے۔ اس میں زراعت، صنعت، حرفت، تجارت اور جہازرانی سب کی متناسب نشوونما ہوتی ہے، علوم وفنون

تعلیم اور عام تربیت، کو اس کے یہاں وہی جگہ حاصل ہوتی ہے، جو مادی دولت آفرینی کو؛ اس کا دستور، اس کے قوانین اور ادارے اس کے ارکان کو بدرجۂ اعلیٰ امن اور حریت دیتے ہیں اور مذہب، اخلاق اور مرفہ الحالی کو فروغ بخشتے ہیں۔ بلکہ لفظاً یہ کہ شہریوں کی خوش حالی ان کا مقصد ہوتا ہے۔ اس قوم کے پاس کافی بری اور بحری قوت ہوتی ہے تاکہ اپنے وجود، استقلال اور اپنی خودمختاری کا تحفظ کر سکے، اور اپنی خارجی تجارت کو پناہ دے سکے۔ اس میں یہ قوت ہوتی ہے کہ کم ترقی یافتہ قوموں کے تمدن پر اپنا اثر ڈالے اور اپنی فاضل آبادی اور اپنے ذہنی اور مادی سرمایہ سے نو آبادیاں قائم کرے اور نئی قومیں آباد کرے۔

معمولاً قومیت کی بنیادی ضرورتیں یہ ہیں کہ کثیر آبادی ہو اور ایسا رقبہ زمین جس میں طرح طرح کے قدرتی ذخیرے ہوں۔ یہی ذہنی تربیت کی بھی بنیادی شرطیں ہیں اور مادی ترقی اور سیاسی قوت کی بھی۔ کوئی قوم جس کی آبادی اور جس کا ملک بہت محدود ہے، اگر اس کی اپنی زبان ہو بھی تو وہ بس ایک ٹوٹا پھوٹا ادب اور علوم و فنون کی ترقی کے لیے ٹوٹے پھوٹے انتظامات رکھ سکتی ہے۔ ایک چھوٹی سی ریاست اپنی مملکت میں دولت آفرینی کے تمام شعبوں کو درجۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس میں تاہین محض شخصی اجارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی قوم تو صرف دوسری طاقتور قوموں سے اتحاد کر کے، قومیت کے فوائد کو کچھ کھو کر، اور بہت زیادہ محنت سے ابتشکل اپنی خود مختاری کو قائم رکھ سکتی ہے۔

جس قوم کے پاس ساحل نہ ہو، تجارتی بیڑہ یا بحری قوت نہ ہو یا جس کے قبضے اور تصرف میں اپنے دریاؤں کے دہانے نہ ہوں وہ اپنی تجارت خارجہ میں دوسری قوموں کی محتاج رہتی ہے۔ یہ نہ تو اپنی نوآبادیاں قائم کر سکتی ہے، نہ نئی قومیں پیدا کر سکتی ہے ساری فاضل آبادی اور وہ سب ذہنی اور مادی قوتیں جو ایسی قوم سے نکل کر دوسرے غیر متمدن ملکوں میں جاتی ہیں وہ خود اس کی ادب، اس کی تہذیب اور اس کی صنعت کے ہاتھ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور بس ضروری قوموں ہی کے کام آتی ہیں۔

جس قوم کی حد بندی سمندر اور سلسلہ کوہ سے نہیں ہوتی وہ پردیسی قوموں کے حملہ کے لیے کھلی ہوتی ہے اور نہایت کثیر قربانیاں کرنے کے بعد اور پھر بھی بہت غیر مکمل طریق پر اپنا نظام محاصل قائم کر سکتی ہے۔

جسم قومی میں رسائی کی جو خامیاں ہوتی ہیں، ان کی اصلاح یا تو تخت نشینی کے سلسلہ میں ہو جاتی ہے، جیسے انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کا معاملہ ہے۔ یا خریداری کے ذریعہ جیسا کہ (Florida) فلوریڈا اور لوئی زیانا (Louisiana) میں ہوا یا پھر ملک گیری سے جیسے برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کا معاملہ ہے۔

زمانہ حال میں ایک چوتھا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے جس سے کہ یہی غرض ایک ایسے طریقے سے حاصل ہو جاتی ہے جو فتوحات کی نسبت اور قوموں کے مفاد کے زیادہ موافق ہے۔ اور جس کا انحصار ایسے اتفاقات پر نہیں جیسے وراثت تخت وتاج۔ میرا مطلب ہے آزاد معاہدہ کے ذریعہ مختلف ریاستوں میں اتحاد سے ملینے اتحاد محاصل

ہی سے تو جرمن قوم نے کہیں جا کر قومیت کی ایک اہم ترین صفت حاصل کی ہے۔ پھر بھی اس کارروائی کو اس وقت تک مکمل نہ سمجھنا چاہیئے جب تک کہ یہ رہائن کے دہانہ سے پولینڈ کی سرحد تک کل ساحل پر حاوی نہ ہو، اور ہالینڈ اور ڈنمارک بھی اس میں شامل نہ ہوں۔ اس اتحاد کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ ان دونوں قوموں کو جرمن اتحاد میں بھی شامل کرنا ہوگا، اور اسی طرح جرمن قوم میں بھی، اور اس سے جرمن قوم کو وہ چیز مل جائے گی جس کی اسے ضرورت ہے، یعنی ماہی گیری کے علاقے، بحری قوت، بحری تجارت، اور نوآبادیاں، اس کے علاوہ یہ دونوں قومیں اپنے نسبت اور ساری سیرت کے اعتبار سے جرمن قوم سے یوں بھی تعلق رکھتی ہی ہیں۔ ان پر قرض کا جو شدید بار ہے وہ صرف اپنے کو مستقل قوموں کی طرح قائم رکھنے کی غیر فطری کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ اسی صورت حال کا فطری تقاضہ ہے کہ یہ برائی اس حد تک پہنچ جائے گی کہ پھر خود ان دونوں قوموں کے لئے قابلِ برداشت نہ رہے گی۔ اور کسی بڑی قوم کے ساتھ مل جانا خود انہیں ضروری اور پسندیدہ معلوم ہونے لگے گا۔

بلجیم میں بھی رقبہ اور آبادی کے محدود ہونے سے جو کمیاں ہیں وہ بس اسی طرح پوری ہو سکتی ہیں کہ کسی قریب کی بڑی قوم سے اتحاد کیا جائے۔ شمالی امریکہ اور کینیڈا کی آبادی جیسے جیسے بڑھے گی اور جوں جوں ریاست ہائے متحدہ کا نظام تامینی نشوونما پائے گا۔ اسی قدر یہ دونوں بھی ایک دوسرے کی طرف کھینچیں گے اور ان کے باہمی اتحاد کو روکنا انگلستان کے لئے اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔

جہاں تک معیشت کا تعلق ہے۔ قوموں کی ترقی کی مندرجہ ذیل منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے؛ ابتدائی وحشت، پھر چرواہوں کی حالت، پھر زراعت، پھر زراعت و صنعت، پھر زراعت و صنعت و تجارت۔

قوموں کی تاریخ صنعت، اور سب سے زیادہ وضاحت سے انگلستان کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ زمانہ وحشت سے چرواہوں کی حالت میں، چرواہوں کی حالت سے زراعت میں، اور زراعت سے صنعت اور جہاز رانی کے آغاز تک جو تغیر ہوتا ہے وہ نہایت اچھی طرح اور تیزی سے پیدا ہو جاتا ہے اگر زیادہ ترقی یافتہ قوموں اور شہروں سے آزاد تجارتی تعلق ہو۔ لیکن مکمل صنعت، بڑی جہاز رانی اور اعلیٰ پیمانہ پر تجارت رجہ صرف ریاست کی مداخلت سے ممکن ہوتی ہیں۔

زراعت جس قدر کم ترقی یافتہ ہو، تجارت خارجہ سے اس بات کا جتنا موقع ہو کہ اپنی فاضل زرعی پیداوار اور خام اجناس کا پردیسی مصنوعات سے مبادلہ کر لیا جائے، قوم وحشت و بربریت میں جس قدر مبتلا ہو اور استبدادی شاہی حکومت اور آئین سازی کی محتاج ہو، اسی قدر زیادہ آزاد تجارت یعنی زرعی پیداوار کی برآمد اور مصنوعات کی درآمد اس کی مرفہ الحالی اور اس کی تہذیب کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ لیکن برخلاف اس کے قوم کی زراعت و صنعت، اس کے جماعتی، سیاسی، اور تمدنی حالات جس قدر زیادہ ترقی پا چکے ہوں، اتنا ہی کم اس بات کا امکان ہوگا کہ وہ اپنی زرعی پیداوار اور اجناس خام کو پردیسی مصنوعات سے بدل کر اپنے جماعتی حالات کی بہتری کی صورت

نکال سکے۔ اور اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ صنعت کے کامیاب مقابلہ سے لٹنے نہ ہی زیادہ نقصان ہوں گے۔

صرف اسی دوسری قسم کی قوموں میں یعنی ان قوموں میں جن کے پاس خود اپنی صنعت کے قیام کے لئے تمام ضروری ذہنی اور مادی وسائل موجود ہیں، اور جو اس وجہ سے تہذیب کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے اور اپنی مادی مرفہ الحالی اور سیاسی قوت کو بڑھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن جن کی ترقی میں کسی پردیسی صنعتی قوت کے مقابلہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، جو پہلے ہی سے ان سے آگے بڑھ چکی ہے، ہاں تو صرف اسی قسم کی قوموں میں خود اپنی صنعت کو قائم کرنے اور بچانے کے لئے تجارتی پابندیوں کا عائد کرنا حق بجانب ہے اور پھر ان میں بھی اسی وقت تک جائز ہے جب تک کہ صنعت خود اتنی مضبوط ہو جائے کہ پردیسی مقابلہ سے خوف کی کوئی وجہ نہ باقی رہے اور اس کے بعد سے بس اتنی ہی پابندیاں ہونی چاہئیں جو اپنی دیسی صنعت کی جڑوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہوں۔

نظام تامین اگر پردیسی مقابلہ کو یکایک اور سرے سے خارج کرنا چاہے، اور اس طرح مامون قوموں کو دوسری قوموں سے بالکل الگ کرنے کی فکر کرے، تو یہ بات صرف عالمی معیشت کے اصولوں کے خلاف ہی نہ ہوگی بلکہ خود اپنی قوم کے حقیقی فوائد کے بھی منافی ہوگی جس صنعت کی تامین مقصود ہے وہ اگر ابھی ترقی کے پہلے درجہ میں ہے تو چاہیئے کہ تامینی محاصل بہت معتدل ہوں اور انہیں قوم کے مادی و ذہنی سرمایہ

حرفتی قابلیت، اور حوصلہ کے ساتھ ساتھ بڑھایا جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ صنعت کے تمام شعبوں کے لئے یکساں تامین کا انتظام کیا جائے بلکہ نہایت اہم شعبوں کے لئے خاص خاص تامین کی ضرورت ہوتی ہے یعنی وہ جن کے چلانے کے لئے تعمیر و انتظام میں بہت سا سرمایہ لگانا پڑتا ہے، بہت سی مشینوں یعنی بہت سے حرفتی علم کی ہنرمندی اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے، جن کے لئے بہت سے کام کرنے والے درکار ہوتے ہیں، اور جن کی پیداوار ضروریات زندگی کی صف اوّل میں جگہ پاتی ہے، اور جو اس وجہ سے بہ اعتبار اپنی کل قیمت کے قومی استقلال کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہیں مثلاً اون، روئی اور سن وغیرہ کے سامان کے کارخانے، اگر ان خاص خاص شاخوں کے لئے مناسب تامین اور نشوونما کا انتظام ہو جائے تو دوسری کم اہمیت کی صنعتیں تھوڑی سی تامین سے ابھر آتی ہیں۔ جن قوموں میں اجرت زیادہ ہو اور آبادی رقبۂ ملک کے تناسب سے ابھی زیادہ نہ ہو، مثلاً ریاست ہائے متحدہ شمالی امریکہ ان کا اپنا فائدہ اسی میں ہے کہ جن صنعتوں میں مشینوں کا معتد بہ استعمال نہ ہو ان کے لئے کم تامین کا انتظام کریں اور جن میں مشینیں اصلی کام انجام دیتی ہوں ان کے لئے زیادہ کا، بشرطیکہ جو قومیں انہیں اس قسم کی چیزیں بیچتی ہیں، وہ ان کی زرعی پیداوار کو آزادی سے اپنے ملک میں آنے دیں۔

مذہب رائج قومی معاشی حالات کے متعلق بڑی ہی غلط فہمیوں میں مبتلا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسی قومیں اپنی زرعی پیداوار کو مصنوعات سے بدل کر بھی اسی

طرح تہذیب، مرفہ الحالی اور عام جماعتی حالات میں ترقی حاصل کرسکتی ہیں جیسے کہ خود اپنی صنعتی قوت قائم کرکے۔ ایک نری زراعتی قوم اپنی ملکی اور پردیسی تجارت، اپنے اندرونی ذرائع آمدورفت، اپنی خارجی جہازرانی، میں کبھی بھی معقول ترقی نہیں کرسکتی۔ نہ اپنی مرفہ الحالی کے تناسب سے اپنی آبادی کو بڑھا سکتی ہے، نہ اخلاقی ذہنی، اجماعتی اور سیاسی نشوونما میں کوئی بڑی ترقی کرسکتی ہے۔ وہ کبھی بڑی سیاسی قوت حاصل نہ کرسکے گی۔ نہ اس قابل ہوسکے گی کہ دوسری کم متمدن قوموں کی تہذیب و ترقی پر اپنا اثر ڈال سکے، یا خود اپنی نوآبادیاں قائم کرسکے محض زراعتی ریاست ہونا ایک زراعتی، صنعتی ریاست کے مقابلہ میں بہت ہی غیر مکمل صورت ہے۔ اوّل الذکر ہمیشہ معاشی و سیاسی اعتبار سے کم و بیش ان پردیسی قوموں کی دست نگر ہوتی ہے جو اپنی مصنوعات کے بدلہ میں اس سے زرعی پیداوار لیتے ہیں۔ یہ قوم خود اپنے لئے طے نہیں کرسکتی کہ اسے کتنا پیدا کرنا ہے، بلکہ اسے اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے اس سے کتنا خریدنا چاہتے ہیں۔ اور موخرالذکر یعنی زراعتی صنعتی ریاستیں خود کثرت سے اجناس خام اور غذا پیدا کرتی ہیں، اور جو کمی رہتی ہے اسے زراعتی قوموں کے یہاں سے منگا لیتی ہیں۔ لہٰذا ان زراعتی قوموں کی بکری ایک تو اس اتفاق پر مبنی ہے کہ زراعتی صنعتی قوموں کے یہاں اچھی فصل ہوتی ہے یا بری، دوسرے پھر اس بکری میں انہیں دوسری خالص زراعتی قوموں سے بھی مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ غیر یقینی بکری اور بھی غیر یقینی ہو جاتی ہے اور بالآخر ان کے لئے یہ خطرہ ہے کہ جنگوں یا تجارتی کارروائیوں

کی وجہ سے پردیسی صنعتی قوموں کے ساتھ ان کے تاجرانہ تعلقات بالکل نہ ٹوٹ جائیں۔ جس سے انہیں یہ دوہرا نقصان پہنچتا ہے کہ ایک تو اپنی فاضل زرعی پیداوار کے لیے کوئی خریدار نہیں ملتا، اور دوسرے اپنے لیے ضروری مصنوعات فراہم نہیں ہو سکتیں۔ ایک زرعی قوم، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ایک فرد کی طرح ہے جس کی صرف ایک بازو ہو اور وہ کسی غیر کے ایک بازو سے کام لیتا ہو لیکن ہر حالت میں اس دوسرے بازو کی مدد کا یقین نہ ہو۔ اور صنعتی۔ زرعی قوم کی مثال اس فرد کی سی ہے جس کے تصرف میں خود اپنے دو بازو ہوں۔

مذہب رائج کی ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ نظام تامین کو سب اسپین کے تخیل کی غیر فطری پیداوار سے تعبیر کرتا ہے، اس بات کی شہادت کے لئے تو تاریخ موجود ہے کہ تامینی انتظامات یا تو اپنی مرفہ الحالی، استقلال اور قوت کے لئے قوموں کی فطری خواہش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یا جنگوں اور صنعتی حیثیت سے غالب اقوام کے مخاصمانہ تجارتی کارروائیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

استقلال اور قوت کا تصور قوم کے تصور کے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے۔

مذہب رائج نے اس بات پر یوں دھیان نہیں کیا کہ یہ علیحدہ علیحدہ اقوام کی معیشت کو اپنی تحقیق کا موضوع ہی نہیں بناتا۔ بلکہ کل جماعت انسانی کی معیشت کو، مثلاً اگر ہم یوں سمجھیں کہ سب قومیں ایک اتحاد عالم کے اندر متحد ہیں تو استقلال اور قوت کا خیال دور ہو جاتا ہے۔ ہر قوم کی خودمختاری کی ضمانت ایسی صورت میں اتحاد عالمی

کے آئین میں موجود ہوگی۔ جیسے کہ مثال کے طور پر جزیرہ رہوڈ اور دلاویر کی ریاستوں کی خودمختاری کی ضمانت تمام ریاست ہائے متحدہ کے اتحاد میں موجود رہی ہے۔ اس اتحاد کے قیام کے بعد ان چھوٹی ریاستوں میں سے کسی کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ اپنے سیاسی اقتدار کی توسیع کی فکر کریں، یا اپنی خودمختاری کو اس اتحاد کی بڑی سے بڑی ریاستوں سے کسی طرح بھی کم محفوظ نہ سمجھیں۔

لیکن اتحاد عالم کا خیال جس قدر معقول ہے اسی قدر یہ بات خلاف عقل ہوگی کہ کوئی قوم اس اتحاد اور امن دائم کے فوائد کثیر کی توقع پر اس طرح اپنی قومی سیاست کی بنیاد رکھے گویا یہ چیزیں ابھی سے موجود ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہر عاقل شخص اس حکومت کو پاگل نہ سمجھے گا جو امن دائم کے فوائد اور اس کی معقولیت کا خیال کرکے اپنی فوجیں برخاست کرنا اپنے جنگی جہاز توڑنا اور اپنے قلعوں کو مسمار کرنا شروع کردے۔ لیکن آخر کیوں، یہ حکومت کوئی اور بات تو نہیں کرتی اسوائے اس کے جو مذہب رائج حکومتوں سے چاہتا ہے، جب وہ آزاد تجارت کے فائدوں کا حوالہ دے کر ان سے کہتا ہے کہ وہ نظام تاجری کے فوائد سے درگذر کریں۔

قوموں کے مابین جو باہمی تجارتی تعلقات ہوتے ہیں، ان پر جنگ تباہ کن اثر ڈالتی ہے، اس کی وجہ سے ایک ملک میں رہنے والا کسان دوسرے ملک میں رہنے والے صناع سے بالجبر جدا کر دیا جاتا ہے، لیکن جہاں صناع کو خصوصاً اگر وہ بحری قوت رکھنے والے اور بڑی تجارت کرنے والی قوم سے تعلق رکھتا ہے، اس بات کا موقع ملا کہ

خود اپنے ملک کے کسانوں سے یا دوسرے زرعی ممالک سے جن تک ان کی پہنچ ہے، اپنے نقصان کی تلافی کرلے، وہاں زرعی ملک کے رہنے والے کو تعلقات کی اس تباہی سے دوہرا نقصان ہوتا ہے۔ اس کی زرعی پیداوار کی منڈی بالکل بند ہو جاتی ہے، اور اس لئے یہ استعداد بھی باقی نہیں رہتی کہ ان مصنوعات تک کی قیمت ادا کر سکے، جو سابقہ تجارتی تعلق کی وجہ سے ضروریات میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس کی دولت آفرینی اور صرف دولت دونوں میں کمی آجاتی ہے۔

اب اگر یہ زرعی قوم جس کی پیدائش و صرف دولت میں جنگ کے باعث سے کمی واقع ہوئی ہے، اپنی آبادی، تہذیب، اور زراعت میں خوب ترقی یافتہ ہے۔ تو جنگ کی ان تجارتی رکاوٹوں سے اس کے یہاں صنعتوں اور کارخانوں کی ابتدا ہو گی اس لئے کہ جنگ کا اثر اس پر ویسا ہی ہوگا، جیسا کہ تابین انتناعی کا ہے اس وجہ سے خود اپنی صنعت کے فوائد معلوم ہو جاتے ہیں اور رواجاً باور آجاتا ہے کہ جنگ کے تجارتی انتشار سے اسے بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہوا۔ اس میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے موقع ہے کہ محض زرعی ریاست کے درجہ سے بڑھ کر زرعی، صنعتی، ریاست کی منزل میں قدم رکھے اور یوں آگے بڑھ کر مرفہ الحالی، تہذیب اور قوت کے اعلیٰ ترین مدارج حاصل کرے۔ اب فرض کیجئے کہ اس جنگ کی وجہ سے صنعت کی جو راہ اس قوم پر یوں کھلتی ہے جب اس پر یہ خوب ترقی کرے اور اس وقت پھر امن قائم ہو جائے اور دونوں قومیں پھر سے اپنے پہلے تجارتی تعلقات کو قائم کرنا چاہیں

تو دونوں محسوس کر لیں گی کہ دوران جنگ میں نئے نئے اغراض پیدا ہو گئے ہیں، جو اب پچھلا تعلق قائم ہوا تو برباد ہو جائینگے۔ پہلے والی زرعی قوم اب محسوس کرتی ہے کہ پردیس میں اپنی زرعی پیداوار کی منڈی قائم کرنے کے لئے اسے اپنی نئی قائم کی ہوئی صنعتی قوت کو قربان کرنا ہوگا اور پہلے کی صنعتی قوم محسوس کرتی ہے کہ اگر درآمد کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو دوران جنگ میں جو زرعی پیداوار ہونا شروع ہوئی ہے وہ ختم ہو جائیگی چنانچہ دونوں قومیں ان اغراض کو محاصل درآمد کے ذریعہ بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ پچھلے پچاس سال کی سیاستِ تجارتی کی تاریخ بس یہ ہے۔

زمانہ حال کے تامینی نظام، جنگ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ہم یہ کہنے میں ذرا نہیں جھجکتے کہ دوسرے اور تیسرے درجہ کی صنعتی قوموں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ انہیں باقی رکھیں اور ترقی دیں۔ بلکہ انہیں تو یہ نظام اس وقت بھی قائم رکھنا چاہیے تھا کہ امن قائم ہونے کے بعد انگلستان کی طرف سے اجناس خام اور اجناس خوردونوش کی درآمد پر پابندیاں لگانے کی بہت غلطی سرزد نہ بھی ہوتی۔ اور اب تو امن کی حالت میں بھی چونکہ یہ پابندیاں ہیں اس لئے تامین کے محرکات برابر موجود ہی ہیں۔ جس طرح ایک بالکل ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ زراعت والی قوم صرف مہذب صنعتی اقوام سے تجارت کر کے ترقی کر سکتی ہے اسی طرح جب وہ تہذیب کے ایک خاص معیار تک پہنچ چکے تو پھر مرفہ الحالی، تہذیب اور قوت کے مدارج اعلیٰ خود اپنی صنعتی قوت کے ذریعہ ہی حاصل کر سکتی ہے۔ وہ جنگ جو زرعی ریاست کو زرعی،

صنعتی ریاست کی منزل میں لے جانے میں مدد دے وہ قوم کے لئے ایک برکت ہے
جس طرح کہ شمالی امریکہ کی جنگ آزادی باوجود بے شمار قتل و غارت (؟) باشیوں کے تمام آئندہ
نسلوں کے لئے برکت ثابت ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے وہ امن جو ایک قوم کو،
جس میں صنعتی قوت کے نشوونما کی صلاحیت ہے محض زرعی منزل میں لا ڈالے، اس
کے لئے ایک عذاب ہے، اور جنگ سے بمراتب زیادہ مضر اور نقصان دہ۔

دوسرے اور تیسرے درجہ کی صنعتی طاقتوں کی خوش قسمتی ہے کہ امن عام کے قیام
کے بعد انگلستان نے تمام دنیا کی صنعتی منڈی پر اجارہ حاصل کرنے کے میلان پر خود
ہی حدود لگا دی ہیں، وہ یوں کہ پردیسی اشیا خورد و نوش اور اجناس خام کی درآمد
پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی زراعت والوں کو جنہیں جنگ کے
زمانہ میں انگریزی زرعی پیداوار کی منڈی کا اجارہ مل گیا تھا، پردیسی مقابلہ بہت
تکلیف دہ معلوم ہوتا، لیکن بس شروع شروع ہی میں دلبعد کو، جیسا کہ ہم ایک اور
موقع پر زیادہ تفصیل سے واضح کریں گے، ان کے نقصان کی دس گنی تلافی اس طرح
ہو جاتی کہ انگلستان کو دنیا کے مصنوعات کی ساری منڈی کا اجارہ حاصل ہو جاتا۔

لیکن دوسرے اور تیسرے درجہ کی جو صنعتی قومیں ۲۵ سالہ حالتِ جنگ
میں ایک صنعتی قوت پیدا کر چکی ہیں، اور پھر ۲۵ سال تک ان کی زرعی پیداوار کا انگلستان
میں جانا بند رہ چکا ہے، اور جو اس وجہ سے اپنی صنعت کو اس درجہ پر پہنچا چکی ہیں
کہ اب بس دس پندرہ سال کی تامین اور درکار ہے۔ اس کے بعد یہ انگریزی صنعت

سے آزاد مقابلہ میں بھی قائم رہ سکتی ہیں، ہاں تو اگر یہ قومیں اب نصف صدی کی قربانیوں کے بعد خود اپنی صنعتی قوت کے بے شمار فوائد سے دستکش ہو جائیں، اور مرفہ الحالی، تمدن، اور استقلال کے ان مدارج اعلےٰ سے (جو زرعی صنعتی ممالک کی خصوصیات میں سے ہے) اتر کر پھر دست نگر زرعی اقوام کے پست درجہ پر آنا چاہیں تو یہ بالکل سمجھ میں آنے کی بات نہیں۔ اور آخر کیوں، کیا صرف اس لئے کہ انگریزی قوم نے اب اپنی غلطی کو محسوس کر لیا ہے اور اپنے مقابلہ میں آنے والی براعظم کی قوموں کی اس ترقی کو سمجھ لیا ہے جو عنقریب انہیں نصیب ہونے والی ہے!

اگر فرض بھی کر لیجئے کہ انگلستان کے صنعتی اغراض اس قدر اثر حاصل کر لیں کہ دارالامراء کو جس میں تمام بڑے بڑے مالکان اراضی شامل ہیں اور دارالعوام کو جو بڑی حد تک دیہاتی اسکوائرڈوں پر مشتمل ہے اس بات پر مجبور بھی کر لیں کہ وہ زرعی پیداوار کی درآمد کے معاملہ میں رعایتیں کرے تو بھلا اس بات کی ضمانت کون کریگا کہ چند سال بعد ایک ٹوری وزارت دوسرے حالات میں پھر ایک نیا "غلہ کا قانون" نافذ نہ کر دے گی؛ اور اس کا ضامن کون ہے، کہ ایک نئی بحری جنگ یا نیا براعظمی التحاق براعظم کے کاشتکاروں اور اس جزائری سلطنت کے صناعوں کو پھر جدا نہ کر دیگا؟ اور براعظم کی قوموں کو پھر اس بات کی ضرورت نہ پڑے گی کہ وہ اپنی صنعتی ترقی کی راہ پر از سر نو گامزن ہونا شروع کریں اور اپنی بہترین قوتیں پھر ایک مرتبہ ابتدائی مشکلات کے سر کرنے میں صرف کریں اور بعد کو جب امن ہو جائے تو یہ سب کچھ پھر

قربان کر دیں ؟

اس طرح مذہب رائج بہ اعظم کی قوموں کو ہمیشہ کے لئے کسی قسم والے پتھر کو لڑھکانے کے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے یعنی وہ ہمیشہ جنگ کے زمانہ میں کارخانے بنائیں اور امن کے زمانہ میں انہیں گر جانے دیں۔

مذہب رائج اس قسم کے احمقانہ نتائج پر صرف اس لئے پہنچا ہے کہ باوجود اس نام کے جو وہ اپنے علم کے لئے استعمال کرتا ہے[1] اس نے سیاست کو اس سے یک قلم باہر کر دیا ہے قوم کی ماہیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، اور قوموں کے تجارتی تعلقات پر جنگ کے جو اثرات پڑتے ہیں ان پر مطلق دھیان نہیں دیا ہے۔

لیکن اگر اہلِ زراعت اور اہلِ صنعت ایک ہی ملک میں رہتے ہوں اور یوں گویا دائمی امن کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ ہوں تو ان کا تعلق کس قدر مختلف ہوگا ؛ ہر موجودہ کارخانہ کی توسیع یا ترقی سے زرعی پیداوار کی مانگ بڑھے گی۔ اور یہ مانگ غیر یقینی نہ ہوگی، نہ اس کا دارومدار پردیسی تجارتی کارروائیوں یا تجارتی اتار چڑھاؤ پر ہوگا، نہ پردیسی سیاسی تحریکوں اور جنگوں پر، نہ پردیسی اختراعات و ترقیات پر، نہ پردیس کی فصلوں پر۔ اس مانگ میں دیسی اہلِ زراعت کی اور کوئی قوم ساجھی بھی نہیں۔ پھر یہ مانگ ان کے لئے ہر سال یقینی ہے۔ دوسری قوموں کی فصلیں کیسی ہی ہوں، سیاسی دنیا میں چاہے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوں، یہ یقین

[1] یعنی " Political Economy "

رکھ سکتے ہیں کہ ان کی پیداوار کی بکری ہو جائے گی اور جن مصنوعات کی انہیں ضرورت ہے وہ پہلے کی سی مناسب قیمتوں پر انہیں مل جائیں گی۔ دوسری طرف یہ بات کہ دیسی زراعت کی ہر ترقی، ہر نیا طریقۂ کاشت، ملک کے کارخانوں کے لئے محرک کا کام کرتا ہے کیونکہ ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ صنعتی پیداوار میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہونا لازمی ہے۔ اس باہمی تعلق کی وجہ سے قومی نشو ونما کی ان دونوں شاخوں کی ترقی ہمیشہ کے لئے یقینی ہو جاتی ہے۔

سیاسی اقتدار سے یہی نہیں ہوتا کہ تجارتِ خارجہ اور بیرونی نوآبادیوں کے ذریعہ قوم کی مرفہ الحالی کی ضمانت ہو جاتی ہے بلکہ اس سے تو خود اندرونی مرفہ الحالی بلکہ اپنے کل وجود تک کی ضمانت ہوتی ہے، اور یہ چیز مادی دولت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ انگلستان نے اپنے قوانین جہازرانی کی وجہ سے سیاسی قوت حاصل کی اور اس سیاسی قوت کے باعث وہ اس قابل ہوا کہ اپنی صنعت کو دوسری قوموں پر پھیلائے (اس کے مقابلہ میں) پولینڈ کا نام قوموں کی فہرست ہی سے اس لئے خارج کر دیا گیا کہ اس کے یہاں کوئی مستعد بیچ کا طبقہ نہ تھا کہ یہ تو صرف ملکی صنعت کے قیام سے وجود میں لایا جا سکتا تھا۔

مذہب رائج اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ اگر تجارت خارجہ بہت اچھے حال میں ہو تب بھی قوم کے لئے اس کی داخلی منڈی اس پر دیسی تجارت سے دس گنی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن مذہب رائج نے اس حقیقت سے یہ بدیہی نتیجہ نہیں

نکالا کہ اندرونی منڈی کو ترقی دینا اور اس کو محفوظ کرنا اس سے دس گنا زیادہ اہم ہے کہ پردیس میں جا کر دولت ڈھونڈی جائے اور نہ یہ نتیجہ نکالا کہ جن قوموں میں دیسی صنعت ترقی کے اعلیٰ درجوں تک پہنچ چکی ہو صرف وہی تجارت خارجہ میں فروغ اور اہمیت حاصل کر سکتی ہیں۔

مذہب رائج نے منڈی کی حقیقت کا اندازہ محض عالمی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ ملکی و سیاسی حیثیت سے نہیں کیا۔ براعظم یورپ کے اکثر ساحلی ممالک لندن، لیورپول یا مانچسٹر کی منڈی کے قدرتی علاقہ میں آتے ہیں۔ اور اس لئے اگر لین دین آزاد ہو تو خود اپنے بندرگاہوں میں ان قوموں کے بہت کم صناع انگریزوں کے برابر قیمتیں رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس زیادہ سرمایہ ہے اور خود اپنی ان سے بڑی دیسی منڈی ہے جس کی وجہ سے یہ بڑے پیمانہ پر اور سستی چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر خود صنعت کی ترقیاں اور سستی بحری باربرداری سے بھی فی الحال ان انگریزوں کو دوسری قوموں کے صناعوں پر وہ فوقیت حاصل ہے جو اپنی دیسی منڈیوں میں عرصہ تک اور مسلسل تامین رکھنے سے اور اندرونی ذرائع آمدورفت کی تکمیل سے ہی دوسری قوموں کو منتقل ہو سکتی ہیں۔ اپنے ساحلی علاقوں کی منڈی، دیسی اور خارجی تجارت دونوں کے اعتبار سے ہر قوم کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جس قوم کی ساحلی منڈی اپنے سے زیادہ کسی دوسری قوم کے قبضہ میں ہو وہ قوم معاشی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی ایک منقسم قوم ہے۔ نہیں معاشی اور سیاسی اعتبار سے ایک قوم کے

لئے اس سے زیادہ مضر کوئی صورتِ حال نہیں ہو سکتی کہ اس کے بندرگاہ اس کے مقابلہ میں پردیس والوں سے زیادہ ہمدردی رکھیں۔

علم کا منصب یہ نہیں ہے کہ عالمی مقاصد کو ترقی دینے کی خاطر حالات قومی کی ماہیت سے انکار کر بیٹھے، یا انہیں نظر انداز کر دے، یا انہیں غلط طور پہ پیش کرے۔ یہ مقاصد عالمی بھی اسی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں کہ ہم فطرت کا اتباع کریں، اور اس کے مطابق علیحدہ علیحدہ قوموں کو ایک اعلیٰ منزل کی طرف لے جانے کی کوشش کریں۔ کوئی دیکھے کہ میدان عمل میں مذہب رائج کی تعلیم کو کتنی کامیابی ہوئی ہے اور اس میں عملی لوگوں کا کچھ ایسا قصور نہیں کہ انھوں نے تو حالاتِ قومی کی نوعیت کو کم و بیش صحیح سمجھا ہے۔ ہاں، قصور ہے خود ان نظریوں کا جو ہر قسم کے تجربہ کے خلاف ہیں، اور جن کی پیروی میں عمل کی گمراہی لازمی ہے۔ کیا اس تعلیم نے ایسی قوموں تک کو (جیسے جنوبی امریکہ کی قومیں) نظام تامین کے جاری کرنے سے روکا ہے تامین جن کے حالات کے مخالف ہے؟ کیا اس تعلیم سے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی کہ تامین کو بڑھا کر کھانے کی چیزیں اور اجناس خام کی پیدائش تک پہ عائد کر دیا جائے۔ حالانکہ انہیں کسی تامین کی ضرورت نہیں اور ان پہ قیود کا عائد کرنا ہر حالت میں دونوں قوموں کے لئے مضر ہوتا ہے، قید لگانے والی قوم پہ بھی اور جس پہ قید لگائی گئی ہے اس پہ بھی۔ کیا یہ تعلیم اس بات کو روک سکی کہ لوگوں نے نفیس مصنوعات کو بھی، جو دراصل اسباب تعیش سے ہیں، ان چیزوں میں شامل کر لیا جن کو تامین کی ضرورت ہے، حالانکہ صاف بات ہے کہ اگر

انہیں مقابلہ کے لئے چھوڑ دیا جائے تو قومی مرفہ الحالی کو ذرا سے بھی نقصان کا اندیشہ نہیں۔ نہیں اس نظریہ نے (مذہب رائج نے) اب تک کوئی دوررس اصلاح نہیں پیدا کی اور جب تک یہ ماہیت اشیاء کے مخالف ہے کوئی اصلاح کر بھی نہ سکے گا۔ لیکن اگر یہ اپنی بنیاد ماہیت اشیاء پر رکھے تو پھر اس میں بڑی اصلاحی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بڑا احسان کرے، ایسا احسان جو تمام قوموں اور کل نوع انسانی کی مرفہ الحالی اور ترقی پر حاوی ہوگا، اگر یہ ثابت کر دے کہ زمین کی پیداوار اور اجناس خام کی آزاد تجارت پر پابندیاں لگانے سے خود پابندی لگانے والی قوم کو سخت نقصان ہوتا ہے اور نظام تامینی کی موافقت محض قوم کی صنعتی تعلیم کے مقصد سے کی جا سکتی ہے۔ پھر جب یہ نظام تامین کو اس طرح صحیح بنیاد پر قائم کر لے تو یہ ان قوموں کو جو آج کل سخت بے لوچ امتناعی نظام اختیار کئے ہوئے ہیں (مثلاً فرانسیسیوں کو) اس بات پر آمادہ کر سکے گا کہ اس امتناعی نظام کو رفتہ رفتہ چھوڑ دیں خود صناع بھی اس تغیر کی مخالفت نہ کرینگے اگر انہیں یقین ہو جائے کہ نظریے بجائے موجودہ صنعتوں کی تباہی کی تدبیریں کرنے کے ان کے قیام و ترقی کو ہر معقول تجارتی سیاست کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

اگر یہ نظریہ جرمنوں کو اتنا سکھا دے کہ وہ اپنی صنعتی قوت کو صرف اسی طرح یعنی پہلے رفتہ رفتہ بڑھتے ہوئے اور بعد کو آہستہ آہستہ گھٹتے ہوئے، لیکن

ہمیشہ پہلے سے متعین، محاصل تامینی کے ذریعہ ترقی دے سکتے ہیں، اور تھوڑا سا پردیس کا مقابلہ (اگرچہ بہت محدود) ہر حالت میں ان کی صنعتوں کی ترقی کے لئے مفید ہے، تو یہ روئے زمین پر آزادلین دین کے لئے زیادہ بہتر خدمات انجام دیگا بہ نسبت اس کے کہ ہر جدید صنعت کا گلا گھونٹنے میں مدد دے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے نظری معاشیات کا یہ مطالبہ نہ ہونا چاہیئے کہ اپنی ان صنعتوں کو پردیسی مقابلہ کے لئے چھوڑ دو جن میں سستی اجناس خام، کھانے پینے کے لئے سستے سامان اور اچھی مشینوں کی وجہ سے انہیں آسانیاں ہیں لیکن اگر نظریہ یہ کہے تو سب مان لینگے کہ جب تک ان متحدہ ریاستوں میں مزدوری دوسری متمدن ریاستوں سے بہت زیادہ ہے، اس وقت تک یہ اپنے قوائے دولت آفریں کو ترقی اور اپنی تہذیب اور سیاسی قوت کو بہترین نشو ونما اسی طرح دے سکتی ہیں کہ جن اشیا میں مزدوری قیمت کا جزو غالب ہے انہیں حتی الوسع آزادی سے ملک میں آنے دیں بشرطیکہ دوسری اپنے ملک میں ان کی اجناس خام اور سامان خوراک کی درآمد نہ روکیں۔

تب جا کر آزاد تجارت کا یہ نظریہ اسپین، پرتگال، نیپلز، ٹرکی، مصر اور دوسرے غیر متمدن یا نصف متمدن یا گرم ممالک میں قبولیت حاصل کرے گا۔ اور پھر ان ممالک میں کسی کو یہ احمقانہ خیال نہ آئے گا کہ موجودہ حالت تمدن میں نظامِ تامین کے ذریعہ خود اپنی صنعت قائم کرے۔

پھر انگلستان بھی اس خیال کو ترک کر دے گا کہ ساری دنیا کی صنعت کا اجارہ دار بننا اس کا حق ہے پھر فرانس، جرمنی اور شمالی امریکہ سے انگلستان یہ مطالبہ بھی نہ کریگا کہ اس رعایت کے بدلہ میں کہ ان کی زرعی پیداوار اور اجناس خام انگلستان میں جا سکتی ہیں یہ ملک اپنی دیسی صنعت کو بالکل قربان ہی کر دیں۔ انگلستان ان ممالک میں تامین کے جواز کو تسلیم کر لے گا چاہے اپنے یہاں آزاد تجارت کی رفتہ رفتہ زیادہ موافقت ہی کرے۔ کیونکہ نظری معاشیات اسے بتائے گی کہ جو قوم صنعتی اقتدار حاصل کر چکی ہو وہ اپنے یہاں صناعوں اور تاجروں کو تنزل اور کاہلی سے صرف اس طرح بچا سکتی ہے کہ زرعی پیداوار اور اجناس خام کو بے روک ٹوک ملک میں آنے دے، اور بدیسی مصنوعات کو بھی مقابلہ کا موقع دے۔

اب تک انگلستان کی جو تجارتی سیاست رہی ہے اب وہ اس سے بالکل مختلف طریق پر عمل پیرا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ دوسری قوموں کو تو تجارت کے آزاد چھوڑنے کی ترغیب دے اور خود اپنے یہاں نہایت سخت نظام امتناعی قائم رکھے، اب یہ بدیسی تامینی نظاموں کا ذرا خیال نہ کرے گا اور اپنے یہاں آزاد مقابلہ کی اجازت دے گا۔ دوسرے ملکوں میں آزاد تجارت کے قیام کی امید کو ذرا اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دے گا کہ اس آزاد مقابلہ سے دوسری قوموں کو اپنے کارخانوں کی تباہی کا اندیشہ نہ رہے۔

اور اس زمانہ میں اپنے یہاں کی عام ضرورت کی مصنوعات کو باہر بھیجنے میں دوسر

ملکوں کی نامین سے جو روک ہو گی اور اس سے انگلستان کو جو کچھ نقصان ہو گا اس کی تلافی بہ نفس نفیس مصنوعات کی برآمد بڑھا کر اور نئی نئی منڈیاں نکال کر اور ان میں نشو و نما دے کر کر سکے گا۔

یہ اسپین، ممالک مشرق اور وسطی و جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں امن قائم کرانے کی کوشش کرے گا اور وسطی و جنوبی امریکہ، ایشیا اور افریقہ کی تمام غیر مہذب اور نیم متمدن قوموں میں اپنا اثر اس لئے کام میں لائے گا کہ ان کے یہاں مضبوط اور روشن خیال حکومتیں قائم ہوں جو جان و مال کی حفاظت کر سکیں، سڑکیں اور نہریں بنوائیں، تعلیم و روشن خیالی، اخلاق اور صنعت کو فروغ دیں اور جنون مذہبی، توہم پرستی اور کاہلی کا قلع قمع کر دیں۔ پھر ان کوششوں کے ساتھ ساتھ اگر وہ اپنے یہاں اجناس خام اور زرعی پیداوار کی درآمد پر سے تمام قیود مٹا دے تو یہ اپنی مصنوعات کی برآمد کو نہایت کامیابی کے ساتھ اور اس سے کہیں زیادہ بڑھا سکے گا۔ کہ بس ہمیشہ بر اعظم یورپ کے کارخانوں کے زوال تخیل پکارتا رہے۔

ہاں، اگر یہ خواہش ہے کہ انگلستان کی یہ تمدنی کارروائیاں غیر متمدن اور نیم متمدن ممالک میں کامیاب ہوں تو ضروری ہے کہ وہ اس میں اوروں کی شرکت سے اغماض نہ کرے۔ اسے یہ نہیں چاہئے کہ برازیل کی طرح مخصوص تجارتی رعایتیں لے کر یہ ان منڈیوں پر اجارہ حاصل کرنا چاہے اور دوسری قوموں کو ان سے باہر رکھنے کی تدبیریں کرے۔

اس قسم کی سیاست سے دوسری قوموں کو جائز رشک پیدا ہوگا اور وہ انگلستان کوششوں کی مخالفت کریں گی اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اسی خود غرضانہ سیاست کی وجہ سے متمدن ممالک کا اثر اب تک ان (غیر متمدن) قوموں کی تہذیب پر اتنا کم پڑا ہے۔ انگلستان کو چاہیئے کہ بین الاقوامی قانون میں یہ اصول شامل کرائے کہ ان ملکوں میں تمام صنعتی قوموں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ اس سے یہی نہ ہوگا کہ انگلستان کو شائستگی و تہذیب پھیلانے کے کام میں تمام متمدن دول کی امداد حاصل ہو جائے گی بلکہ اس میں انگلستان کی تجارت کا بھی کچھ نقصان نہ ہوگا کہ دوسری صنعتی قومیں بھی اسی قسم کے تہذیبی تجربے اپنے ذمہ لیں۔ تجارت و صنعت کی تمام شاخوں میں انگلستان کو جو فضیلت حاصل ہے اس کی وجہ سے ان نئی منڈیوں کو جو برآمد ہوگی اس کا بڑا حصّہ تو بہر حال انگریزوں ہی کے حصّہ میں آئے گا۔

انگلستان دوسری قوموں کی صنعتوں کے خلاف جو کوشش اور پیہم سازش کرتا رہتا ہے ہم تو اسے بھی حق بجانب مان لیں اگر ساری دنیا کی صنعت کا اجارہ خود انگلستان کی مرفہ الحالی کے لیے لازمی ہوا اور یہ بات بالکل ظاہر طور پر نہ دکھائی جا سکے کہ جو قومیں انگلستان کے دوش بدوش بڑی صنعتی قوت حاصل کرنا چاہتی ہیں وہ انگلستان کو نیچا دکھائے بغیر بھی اپنے مقصد تک پہنچ سکتی ہیں۔ اگر دوسرے ملک مالدار ہوں تو ضروری نہیں کہ انگلستان غریب ہو جائے کیونکہ فطرت نے تو اتنے وافر وسائل پیدا کئے ہیں کہ انگلستان کی مرفہ الحالی کو ذرا نقصان پہنچائے بغیر فرانس،

جرمنی اور شمالی امریکہ میں انگریزوں کے برابر کی صنعتی قوت ترقی پاسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی مصنوعات کی دیسی منڈی پر قابض ہو جائے تو ملک کے اندر پیدائش مصنوعات اور صرف کے لحاظ سے اس کا فائدہ اس نقصان کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اپنے مال کی برآمد بند ہونے سے پہنچتا ہے۔ کیونکہ قوم خود اپنی مصنوعات تیار کرتی ہے اور اپنے معاشی حالات میں پوری ترقی حاصل کر سکتی ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ مالدار ہوتی ہے اور کہیں زیادہ آباد، اور دوسری پردیسی قوم پر انحصار کی صورت میں جتنی مصنوعات منگاتی تھی اب اس سے کہیں زیادہ کام میں لا سکتی ہے۔

مصنوعات کی برآمد کا جہاں تک تعلق ہے تو منطقہ معتدل کے ممالک کو صنعت کے لئے قدرت نے خاص طور پر موزوں بنایا ہے یہ اپنے مال کی کھپت کے لئے منطقہ حارہ کے ممالک کے دستِ نگر ہیں جو ان سے مصنوعات لے کر معاوضہ میں زرعی پیداوار دیتے ہیں۔

لیکن منطقہ حارہ کے ممالک میں مصنوعات کا صرف ایک تو اس بات پر منحصر ہے کہ جو چیزیں ان کے یہاں مخصوص طور پر پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک فاضل مقدار پیدا کرنے کی صلاحیت ان میں ہو اور دوسرے اس پر کہ منطقہ معتدل کے ممالک میں منطقہ حارہ کی پیداوار کی مانگ بڑھے۔

اب اگر یہ ثابت ہو سکے کہ زمانہ گذرنے پر منطقہ حارہ کے ممالک شکر، چاول،

کافی، روئی وغیرہ کی اس وقت سے پانچ سے دس گنی مقدار تک پیدا کر سکتے ہیں۔ اور منطقہ معتدل کے ممالک ان چیزوں کی موجودہ مقدار سے پانچ سے دس گنی زیادہ صرف میں لاسکتے ہیں تو ساتھ ہی گویا یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ منطقہ معتدل کے ملک منطقہ حارہ کو جو مصنوعات بھیجتے ہیں اس کی موجودہ مقدار میں پانچ سے دس گنا تک اضافہ ہو سکتا ہے۔

نو آبادیوں کی پیداوار کے صرف میں یہ اعظم یورپ کی قومیں جتنا اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اس کا پتہ اس سے ملتا ہے کہ پچھلے پچاس سال میں انگلستان میں ان کا صرف کتنا بڑھ گیا۔ پھر اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئیے کہ اگر ان چیزوں کے صرف پر بہت زیادہ محصل نہ ہوتے تو یہ اضافہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا۔

منطقہ حارہ میں پیداوار بڑھانے کے جو امکانات ہیں اس کے ناقابل تردید ثبوت پچھلے پانچ سال میں ہالینڈ نے ساٹرا اور جاوا میں اور انگلستان نے ہندوستان میں پیش کر دیئے ہیں۔ انگلستان نے ہندوستان سے اپنی شکر کی درآمد کو بمقابلہ ۱۸۳۵ء کے ۱۸۳۹ء میں چار گنا کر لیا ہے۔ کافی کی درآمد اس سے بھی زیادہ بڑھی ہے اور روئی کی درآمد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے مختصر یہ کہ تازہ ترین انگریزی جرائد (فروری ۱۸۴۰ء) نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کر رہے ہیں کہ اجناس کے مقابلہ میں ہندوستان کی صلاحیت پیدائش کی کوئی حد ہی نہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں کہ ان چیزوں کے لئے انگلستان اپنے کو امریکہ اور جزائر غرب الہند سے بے نیاز کر سکے گا ادھر

ہالینڈ تنگ ہے کہ اپنی نوآبادیوں کی پیداوار کو کہاں کھپائے اور بڑی مستعدی سے نئی منڈیاں تلاش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ شمالی امریکہ اپنی روئی کی پیداوار کو برابر بڑھائے جاتا ہے۔ ٹکساس کی ریاست اُٹھ رہی ہے جو بلاشبہ کل میکسیکو پر قابض ہو جائے گی۔ اور اس زرخیز علاقہ سے وہ کچھ بنائے گی جو اس وقت ریاست ہائے متحدہ کی جنوبی ریاستوں میں ہو رہا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ نظم و آئین، محنت اور ذہانت رفتہ رفتہ پناما سے لے کر راس ہارن تک تمام جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں، پھر کل افریقہ اور ایشیاء میں پھیلیں گے اور ہر جگہ پیداوار اور فراوانی اجناس میں اضافہ کرینگے۔ اگر یہ سب پیش نظر ہو تو اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی کہ اس میدان میں مصنوعات کی بکری کے لئے ایک قوم سے زیادہ کے لئے جگہ ہے۔

اگر نوآبادیوں میں پیدا ہونے والی اجناس کی کاشت میں اس وقت جو رقبۂ زمین کام میں آتا ہے اس کا اندازہ کیا جائے اور اس کا مقابلہ اس رقبہ سے کیا جائے جسے قدرت نے ان چیزوں کی پیدائش کے لئے موزوں بنایا ہے تو معلوم ہو گا کہ جو زمینیں اس کی صلاحیت رکھتی ہیں مشکل سے ان کا پچاسواں حصہ استعمال ہو رہا ہے۔ آخر انگلستان ان تمام ملکوں میں مصنوعات کی منڈیوں پر کس طرح اجارہ حاصل کر لیگا۔ جبکہ یہ منطقہ حارہ میں پیدا ہونے والی چیزوں کی ضرورت کو صرف ہندوستان سے پورا کر سکتا ہے۔ انگلستان ان ممالک میں اپنی مصنوعات بھیجنے کی امید کیسے رکھتا

ہے جن کی زرعی پیداوار کو یہ خود بدلہ میں نہیں لے سکتا۔ پھر یورپ میں ان نوآبادیوں کی پیداوار کی مانگ کیسے بڑھے گی۔ اگر یہ براعظم اپنی مصنوعات کے ذریعہ اس قابل نہ بنے کہ ان کی قیمت ادا کرسکے اور انہیں صرف میں لا سکے۔

لہٰذا یہ بات ظاہر ہے کہ براعظم کی صنعت کو دبانے سے اگرچہ براعظم کے ممالک کی ترقی تو رک سکتی ہے مگر انگلستان کی مرفہ الحالی کو کسی طرح ترقی نہیں ہو سکتی۔

علاوہ بریں، یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اس وقت اور آگے بھی عرصہ تک منطقہ حارہ کے ممالک صنعت کی اہلیت رکھنے والے ملکوں کو مبادلہ کے لئے کافی چیزیں بھیج سکتے ہیں۔

آخر میں یہ بات بھی بالکل صاف ہے کہ ساری دنیا کی صنعت کا وہ اجارہ جو انگلستان آزاد مقابلہ سے براعظم یورپ اور امریکہ میں قایم کیا چاہتا ہے وہ نوع انسانی کے لئے کسی طرح اس نظام تامین سے زیادہ مفید نہیں ہے جو کل منطقہ معتدلہ کی صنعتی قوت کو نشو ونما دیتا اور کل منطقہ حارہ کی زرعی ترقی چاہتا ہے۔

ہر چند کہ انگلستان کو صنعت، جہازرانی اور تجارت میں فوقیت حاصل ہے لیکن جس قوم کے پاس کافی اور مناسب رقبہ زمین، قومی طاقت اور ذہانت ہے اور جو ان وجوہ سے صنعتی دولت آفرینی کی صلاحیت رکھتی ہے اسے اس سے نہ جھجکنا چاہئے کہ انگلستان کے صنعتی اقتدار سے مقابلہ کرے صنعت، تجارت اور جہازرانی کے لئے ایک ایسا مستقبل آرہا ہے جو زمانہ حال سے اسی قدر افضل ہو گا جتنا کہ حال ماضی سے ہے۔ ہم

ہیں بس ایک عظیم الشان قومی مستقبل پر یقین رکھنے کی جرأت ہونی چاہیے اور بس اس یقین کے ساتھ چل کھڑا ہونا چاہیے۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم میں اس کام کے لئے کافی قومی روح ہو کہ اس درخت کو لگائیں اور اس کی حفاظت کریں جس کے اچھے اچھے پھل کہیں آنے والی نسلوں کو نصیب ہونگے۔ سب سے پہلے یہ چاہیے کہ کم سے کم عام ضرورت کی چیزوں میں اپنی دیسی منڈی پر اپنا قبضہ ہو، اور پھر کوشش کرنی چاہیے کہ منطقۂ حارہ کی پیداوار براہِ راست ان ملکوں سے حاصل کریں۔ جو ہم سے ان کی قیمت مصنوعات کی شکل میں لے لیا کریں۔ اور اگر جرمن قوم چاہتی ہے کہ وہ فرانسیسیوں، شمالی امریکنوں، نہیں خود روسیوں تک سے مراتب میں پیچھے نہ رہے تو یہی وہ خاص مسئلہ ہے جو اس کے اتحاد تجارتی کو حل کرتا ہے۔

باب ۱۶

قوم اور ریاست کی معیشت اور سیاسی اور قومی معاشیات

کسی جماعت کی حکومت کے مادی ذرائع کی فراہمی اور ان وسائل کا صرف اور تنظیم یعنی مالیات ریاست اور چیز ہے اور وہ ادارے باقاعدے قانون جن کے ذریعے ریاست کے شہریوں کی معیشت منظم و متعین ہوتی ہے یعنی لوگوں کی معیشت دوسری چیز ہے۔ اس تفریق کی ضرورت تمام ریاستی جماعتوں میں ہوتی ہے، چاہے یہ کل قوم پر حاوی ہوں یا اس کے ایک جزو پر، چاہے بڑی ہوں یا چھوٹی۔

وفاقی ریاست میں مالیات کی دو تقسیمیں ہوتی ہیں:۔

ایک علیحدہ علیحدہ ریاستوں کی مالیات اور دوسرے وفاق کی۔

لوگوں کی معیشت اس وقت قومی معیشت بن جاتی ہے جب ریاست یا وفاق ایک پوری قوم پر حاوی ہو جو آبادی، رقبہ زمین، سیاسی اداروں، تہذیب، دولت اور قوت کے لحاظ سے خود مختاری کی مستحق اور دوام و اقتدار سیاسی کی صلاحیت

رکھتی ہو۔ یہاں لوگوں کی اور قوم کی معیشت ایک ہو جاتی ہے۔ اور یہ مالیات ریاست سے مل کر قوم کی معیشت سیاسی کہلاتی ہے۔

جن ریاستوں کی آبادی قوم کا ایک جزو اور جن کا رقبہ قومی علاقہ کا صرف ایک حصہ ہوتا ہے جب یہ نہ تو کوئی ریاست براہِ راست حاوی ہو نہ وفاق کے ذریعہ یہ دوسرے حصوں سے مل کر ایک کل بناتے تو ایسی صورت میں لوگوں کی معیشت کا ذکر محض افراد کی معیشت یا ریاست کی مالیات کے مقابلہ میں کیا جا سکتا ہے۔ اس نامکمل حالت میں ایک بڑی قومیت کے مقاصد و ضروریات کو پیش نظر نہیں رکھا جا سکتا۔ اور نہ ایک مکمل قومیت اور اس کی خود مختاری، قیام و اقتدار کے نقطہ نظر سے اسے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں معیشت سے سیاست خارج ہو جاتی ہے اس حالت میں تو محض سماج کی معیشت کے ان قدرتی قوانین کا خیال کیا جا سکتا ہے۔ جو اس وقت اپنا عمل دکھاتے ہیں جب کسی بڑی متحدہ قوم یا معیشت قومی کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔

جرمنی میں اب تک اس علم کی تدوین اسی نقطہ نظر پر ہوئی ہے۔ جیسے پہلے ریاست کی معیشت (Staats wirtschaft) پھر قومی معیشت (Nationalo konomie) پھر سیاسی معیشت (politische O konomie) اور اس کے بعد جماعت کی معیشت (Volkswir schaft) سے موسوم کیا جاتا رہا ہے لیکن کسی نے ان نظاموں کی اس بنیادی غلطی کو نہیں دیکھا۔

معیشت قومی کے مفہوم و ماہیت کو کیسے سمجھا جاتا جب کہ معاشی حیثیت سے متحدہ قوم ہی کا وجود نہ تھا چنانچہ لوگ قوم کے مخصوص اور متعین تصور کے بجائے ایک عام اور غیر متعین تصور جماعت کا رکھتے تھے۔ اور یہ ایسا تصور ہے جو کل نوع انسانی پر، ایک چھوٹے سے ملک پر، یا اکیلے شہر پر اسی طرح عائد ہو سکتا ہے جیسے کہ قوم پر۔

باب ۱۷

صنعتی قوت اور قوم کے شخصی، جماعتی اور سیاسی فوائد ـ دولت آفرین

جس ملک کا گزر معمولی زراعت پر ہو وہاں ذہنی تعطل اور جسمانی بے بسی کا دور دورہ ہوتا ہے قدیم خیالات، عادات، رسوم اور طریق ہائے کار پر اصرار ہوتا ہے، تہذیب، فارغ البالی اور آزادی کی کمی ہوتی ہے۔ بر خلاف اس کے صنعتی تجارتی ریاست کی خصوصیت ہے ذہنی و مادی اجناس میں باہم اضافہ کی کوشش، مقابلہ اور آزادی کی امنگ۔

اس فرق کی وجہ کچھ تو قوم کے ان دونوں طبقوں کے رہنے سہنے کے طریقوں اور تعلیم کا اختلاف ہے اور کچھ ان کے شغل اور اس کے مناسب حال ذرائع کا اختلاف زراعت پیشہ آبادی ملک کے سارے رقبہ پر پھیلی ہوتی ہے، چنانچہ ذہنی و مادی ربط ضبط کے معاملہ میں بھی اہل زراعت ایک دوسرے سے دور ہی دور رہتے ہیں ان میں سے ہر ایک تھوڑے بہت فرق سے وہی کرتا ہے جو دوسرا کرتا ہے، عموماً

وہی چیز پیدا کرتا ہے جو دوسرا کرتا ہے، سب کی فراوانی اور احتیاج کی حالت کم و بیش ایک سی ہوتی ہے ہر ایک اپنی پیداوار کا بہترین صرف کرنے والا خود ہی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ذہنی و مادی روابط کا بہت کم موقع ہے۔ کسان کو انسانوں سے کم سروکار ہوتا ہے، اور بے جان فطرت سے زیادہ۔ اسے چونکہ عادت پڑی ہوتی ہے کہ جہاں بویا ہے وہاں کہیں عرصہ کے بعد جا کر کاٹے اور اپنی کوششوں کی کامیابی ایک بالاتر طاقت کی مرضی پر چھوڑ دے، اس لئے قناعت، صبر و رضا لیکن ساتھ ساتھ سہل انگاری اور کند ذہنی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اس کا کام ہی کچھ ایسا ہے کہ ایک طرف اسے انسانوں سے دور رکھتا ہے تو دوسری طرف اس کے معمولی طور پر انجام دینے میں بہت کم ذہنی کاوش اور نہایت خفیف سی جسمانی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے جس خاندان میں پیدا ہوتا ہے بس اسی کے تنگ حلقہ میں نقالی کر کے اس کام کو سیکھ لیتا ہے یہ خیال شاذ ہی اس کے ذہن میں آتا ہے کہ اس کام کو دوسری طرح اور بہتر طریقہ سے بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ پالنے سے لے کر قبر تک اس کا میدانِ عمل انسانوں اور کیفیتوں کا وہی محدود حلقہ ہوتا ہے۔ غیر معمولی ذہنی و جسمانی محنت سے خاص ترقی کی مثالیں اس کی نظروں کے شاذ ہی آتی ہیں۔ املاک بھی نسلاً بعد نسل چلتی ہے اور افلاس بھی۔ جذبۂ مسابقت سے جو قدرت پیدا ہوتی ہے وہ تقریباً سب کی سب مردہ پڑی رہتی ہے۔

ادھر صنعت کی ماہیت زراعت سے اصولاً مختلف ہے۔ اپنے کاروبار کی

کشش سے اہلِ صنعت مل جل کر ہی رہتے ہیں۔ اور جماعت ہی کے ذریعہ اپنا کام چلاتے ہیں۔ باہمی ربط رکھتے ہیں اور اسی ربط سے اپنا مقصد پاتے ہیں۔ کھانے پینے کی تمام اجناس خام صنعت والا منڈی ہی سے لیتا ہے اور اپنی پیداوار کا بس بہت ہی تھوڑا سا حصہ خود اس کے اپنے استعمال کے لئے ہوتا ہے۔ زراعت پیشہ جہاں قدرت سے برکت کا متوقع ہوتا ہے وہاں صنعت کا پھلنا پھولنا کلیتًا اس کا وجود زیادہ تر کاروبار پر منحصر ہے۔ زراعت پیشہ جہاں اپنے مال کے خریداروں کو جانتا تک نہیں یا کم سے کم اسے اپنے مال کی بکری کی بہت کم فکر کرنا پڑتی ہے۔ وہاں اہلِ صنعت کا وجود ہی اپنے گاہکوں پر منحصر ہے۔ اجناس خام، ضروریات زندگی، اجرت مصنوعات، زر، سب کی قیمت میں برابر ہر گھڑی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اور صنعت والے کو کبھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے منافع کا کیا حال رہے گا۔ قدرت اور معمولی مشقت سے اس کے وجود و خوش حالی کی ضمانت نہیں ہوتی، دونوں کا دارو مدار تمام و کمال خود اس کی سمجھ اور محنت پر ہوتا ہے اسے زیادہ کے حصول کی کوشش کرنی پڑتی ہے تاکہ محتاج کا یقین ہو جائے۔ اسے مالدار بننے کی فکر کرنی پڑتی ہے تاکہ غریب نہ رہنا پڑے۔ دوسروں سے کچھ تیز چلتا ہے تب ابھرتا ہے جہاں ذرا سست پڑا کہ گرنا یقینی ہے۔ اسے ہمیشہ خریدنا پڑتا ہے اور بیچنا، مبادلہ کرنا، اور لین دین۔ اسے ہر طرف انسانوں سے، ہر دم بدلنے والے حالات سے، قوانین و ضوابط سے سابقہ پڑتا ہے، اور زراعت والوں کے مقابلہ

میں اپنی عقل کے نشو و نما کے بہت سے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اپنے کاروبار کی اہلیت حاصل کرنے کے لئے پرائے آدمیوں اور دوسرے ملکوں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اپنے کاروبار کو مستقل کرنے کے لئے اسے غیر معمولی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ جہاں زراعت والے کو محض اپنے قریبی ماحول سے واسطہ ہوتا ہے وہاں صنعت والے کا کاروبار پورے پورے ملکوں، بلکہ تمام روئے زمین پر پھیلا ہوتا ہے۔ اپنے ساتھیوں میں عزت پانے اور اسے برقرار رکھنے کی خواہش اور مقابلہ کرنے والوں کی دائمی مسابقت جو اس کے وجود اور خوش حالی کو ہمیشہ خطرہ میں رکھتی ہے اس کے لئے ان تھک مشقت اور مسلسل ترقی کی نہایت تیز مہمیز ثابت ہوتی ہیں۔ ہزاروں مثالوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ غیر معمولی کوشش اور کارکردگی کے ذریعہ آدمی عزت اور خوش حالی کے سب سے نیچے نقطہ سے ابھر کر جماعت کے اعلیٰ ترین طبقہ میں پہنچ سکتا ہے اور اس کے خلاف تعطلِ ذہنی اور بے پرواہی کے ہاتھوں سب سے زیادہ قابلِ عزت طبقہ سے پست ترین حالت میں بھی جا سکتا ہے۔ یہ حالات اہلِ صنعت میں ایسی قوت پیدا کر دیتے ہیں جو معمولی زراعت والوں میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

صنعت کے کاموں پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالو تو پہلی نگاہ میں واضح ہو جائے گا کہ ان میں زراعت سے کہیں زیادہ ذہنی صفات اور ہنرمندی کی نشو و نما ہوتی ہے اور قوتِ عمل کو جنبش۔

آدم اسمتھ نے جب یہ دعویٰ کیا تھا کہ زراعت میں صنعت سے زیادہ ہنرمندی درکار ہے تو یقیناً اس نے اسی قسم کا ایک بیان پیش کیا تھا جس کا کہ بقول اس کے سوانح نگار ڈوگالڈ اسٹورٹ، وہ بہت ہی شائق تھا۔ اس بات کی تحقیق کو چھوڑ یئے کہ ایک گھڑی کے پرزوں کو یکجا کرنے میں زیادہ ہنرمندی کی ضرورت ہے یا کھیتی باڑی کے انتظام میں ہم تو بس اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ زراعت میں جو کام پیش آتے ہیں وہ سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں، حالانکہ صنعت میں ہزار قسم طرح کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس موازنہ میں زراعت کی معمولی حالت کو سامنے رکھنا چاہیئے، نہ کہ اس حالت کو جو صنعت کے زیر اثر نشوونما پاکر پیدا ہوتی ہے۔ اگر آدم اسمتھ کو انگریزی کسانوں کا حال انگریزی صناعوں سے بہت بہتر نظر آتا ہے تو شاید یہ بات سامنے نہیں رہتی کہ زراعت کی حالت صنعت اور تجارت کی وجہ سے اتنی اچھی ہو گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ زراعت میں ایک ہی طرح کی اور ایسی شخصیتیں کام میں آتی ہیں۔ جن میں تھوڑے سے احساس ترتیب کے ساتھ جسمانی قوت اور روحانی کام کرنے کی صلاحیت ہو۔ حالانکہ صنعت میں ہزاروں قسم کی مختلف ذہنی استعداد، ہنرمندی اور مشق درکار ہوتی ہے۔ اس قدر مختلف قسم کی صلاحیتوں کی وجہ سے صنعتی ریاست میں ہر فرد کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ اپنی طبیعت کے موافق کوئی شغل اور پیشہ نکال لے۔ زرعی ریاست میں انتخاب کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ وہاں ذہنی صلاحیتوں

کی یہاں سے بہت زیادہ قدر ہوتی ہے، کہ یہاں آدمی کی وقعت کا معیار عموماً اس کی بدنی قوت ہوتا ہے۔ اکثر تو وہاں کے کمزور اور اپاہج کا کام یہاں کے مضبوط سے مضبوط آدمی سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی قوت کو، مثلاً بچوں اور عورتوں کی قوت کو، اپاہجوں اور بوڑھوں کی قوت کو صنعت میں کام بھی مل جاتا ہے اور معاوضہ بھی۔

صنعتیں علوم و فنون کی اولاد بھی ہیں، اور اُن کی نگہداشت اور پرورش کرنے والی بھی۔ کوئی دیکھے کہ معمولی زراعت پیشہ طبقہ کو علوم و فنون کی کس درجہ کم ضرورت پڑتی ہے اور ان اوزاروں کی تیاری جن سے اس میں کام پڑتا ہے کیسی سہل ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ زراعت ہی نے زمین پر لگان ڈال کر یہ بات ممکن کی کہ لوگ اپنے کو علوم و فنون کے لئے وقف کر سکیں لیکن صنعتوں کے بغیر یہ ہمیشہ مخصوص ذاتوں کی ملک رہے اور ان کا مفید اثر عام لوگوں تک بہت ہی غیر محسوس طریقوں سے پہنچا۔ برخلاف اس کے صنعتی ریاست میں صنعت پر علوم سے روشنی پڑتی ہے اور صنعت سے علوم و فنون کی پرورش ہوتی ہے۔ صنعت کا کوئی کام مشکل ہی سے ایسا ہوگا۔ جو طبعیات، جر ثقیل، علم کیمیا، ریاضی یا فن نقاشی وغیرہ سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ ان علوم میں کوئی ترقی، کوئی اکتشاف، کوئی اختراع، ایسی نہیں جس سے سیکڑوں صنعتوں اور طریق ہائے کار میں تبدیلی یا ترقی پیدا نہ ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی ریاست میں علوم و فنون عام ہوتے ہیں۔ جب بہت سے لوگ علمی تحقیقات کے نتائج کو

استعمال میں لانے والے ٹھہرے تو تحریر و تقریر کے ذریعہ تعلیم و تدریس کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ خاص صلاحیت کے لوگ تدریس و تصنیف کے کام کے لئے اپنے کو وقف کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے کام کی مانگ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ صلاحیت والوں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ علمی کام میں تقسیم عمل و تعاون پیدا ہو جاتے ہیں، اور اس سے علم کی ترقی پر ہی نہیں بلکہ فنون و صنعت کی تکمیل پر بھی نہایت مفید اثر پڑتا ہے۔ پھر اس تکمیل کے نتائج جلد خود زراعت تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس ملک میں صنعت پھیلی پھولتی ہو اس سے زیادہ مکمل زرعی مشینیں اور اوزار آپ کو کہیں اور نہ ملینگے۔ نہ کہیں اس سے زیادہ سمجھ کے ساتھ زراعت کا کام کیا جاتا ہوگا۔ صنعت کے اثر سے خود زراعت ایک صنعت، ایک فن، ایک علم بن جاتی ہے۔

علوم اور صنعت نے مل کر وہ عظیم الشان مادی قوت پیدا کر دی ہے جس سے نئی سوسائٹی کے لئے قدیم زمانہ کے غلاموں کی مشقت کی تلافی دس گنے سے زیادہ ہو گئی اور اس نے عوام کی حالت پر، غیر متمدن ملکوں کے مہذب بنانے پر، غیر آباد ملکوں کے آباد کرنے پر اور قدیم متمدن اقوام کی قوت پر بے انداز اثر ڈالا ہے: یہ قوت مشین کی قوت ہے۔

زرعی قوم کے مقابلہ میں صنعتی قوم کو مشین کی قوت کے استعمال کے سو گنے مواقع ہوتے ہیں۔ ایک لولا لنگڑا آدمی و خالی مشین کو چلا کر اس سے زیادہ کام کر سکتا ہے جتنا کہ مضبوط سے مضبوط آدمی خالی ہاتھ سے۔

مشین کی قوت اور ذرائع آمدورفت کی جدید ترین تکمیل سے صنعتی ریاست کو محض زرعی ریاست پر بے حد فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ نہریں، ریلیں، دخانی جہاز رانی سب صرف صنعت کے ذریعہ ترقی پاتی ہیں۔ اور صرف اسی کی وجہ سے تمام رقبہ ملک میں پھیل سکتی ہیں۔ محض زرعی ریاست میں جہاں ہر ایک اپنی ضروریات کا بڑا حصہ خود پیدا کرتا ہے اور اپنی پیداوار کا زیادہ حصہ خود ہی صرف کر لیتا ہے، جہاں افراد میں اجناس کا آتنا لین دین ہو سکتا ہے نہ اشخاص کا اتنا میل جول کہ ان مشینوں کے لگانے اور انہیں چلتا رکھنے کے مصارف پورے پڑ جائیں۔

خالص زرعی ریاست میں نئی اختراعیں اور ترمیمیں بہت کم قیمت رکھتی ہیں جن لوگوں کو اس کی دھن ہوتی ہے وہ عموماً اپنی تحقیق و سعی کے لئے اپنے کو قربان کرتے ہیں، حالانکہ صنعتی ریاست میں کوئی دوسرا راستہ انکشاف و اختراع کے رستہ سے جلد دولت اور عزت تک نہیں پہنچا سکتا۔ چنانچہ صنعتی ریاست میں غیر معمولی جینیس کی قدر عام صلاحیت ذہنی سے زیادہ ہوتی ہے اور اس کا زیادہ انعام بھی ملتا ہے اور صلاحیت عامہ کی قدر قوت جسمانی سے زیادہ ہوتی۔ اس کے خلاف زرعی ریاست میں، ایک سرکاری ملازمت کو چھوڑ کر، صورت حال بالکل برعکس ہوتی ہے۔

صنعت سے جس طرح قوم کی ذہنی قوتوں پر اثر پڑتا ہے، اسی طرح کام کرنے

کی جسمانی قوت بھی اس سے نشو و نما پاتی ہیں۔ اور وہ یوں کہ یہ کام کرنے والوں کے لئے حفظ النفس کے نت نئے وسیلے اور قوت کو بروئے کار لانے کے طرح طرح کے محرک فراہم کرتی ہے اور پھر یوں کہ ان قوتوں کو کام میں لانے کے مواقع پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جن ریاستوں میں صنعت کو فروغ ہے وہاں قطع نظر اس مدد کے جو مزدور کو بہتر مشینوں اور آلات سے پہنچتی ہے، ہر مزدور زرعی ممالک کے مقابلہ میں دن بھر میں کہیں زیادہ کام انجام دے لیتا ہے۔

ایک یہی بات ہے کہ صنعتی ریاستوں میں وقت کی قدر زرعی ممالک سے کہیں زیادہ تسلیم کی جاتی ہے اس کا ثبوت ہے کہ اس حالت میں قوت کار کا معیار بلند ہوتا ہے کسی قوم کے درجہ تہذیب اور اس کے کام کی قدر کا اندازہ کرنا ہو تو اس سے زیادہ یقینی معیار اور کوئی نہیں کہ وہ اپنے یہاں وقت کی کیا قدر کرتی ہے وحشی آدمی دنوں اپنی جھونپڑی میں بیکار پڑا رہتا ہے گلہ بان وقت کی قیمت کیسے جانے کہ یہ تو اس پر ایک عذاب ہے جسے بس اس کی بانسری یا نیند کچھ قابل برداشت بنا دیتی ہیں۔ ایک غلام، ایک زرخرید، ایک بیگاری وقت کا اقتضا دیکھے سیکھے کہ اسے تو کام سزا ہے اور بیکاری انعام۔ وقت کی قدر تو قومیں صنعت سے سیکھتی ہیں کہ یہاں وقت بچانے سے منافع میں زیادتی ہوتی ہے، وقت گنوانے سے نفع گھٹتا ہے۔ اہل صنعت جب اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ کام میں لاتے ہیں تو اس کا فائدہ زراعت والے بھی اٹھاتے ہیں یعنی صنعت کی وجہ سے زرعی

پیداوار کی جو مانگ بڑھتی ہے اس سے لگان اراضی اور زمین کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ زراعت میں زیادہ سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ زندگی کے لطف بڑھتے ہیں۔ اور اس مزید لگان، سرمایہ کے مزید سود، اور مزید صرفِ اجناس کو پورا کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ زمین سے حاصل بڑھایا جائے۔ اس کا بھی موقع ہوتا ہے کہ مزدوریاں بڑھائی جائیں، لیکن ساتھ ہی زیادہ کارکردگی کا بھی مطالبہ ہوتا ہے۔ مزدور کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کے قوائے جسمانی اور ان کے استعمال کی خوبی اس کی حالت کو بہتر بنانے کا ایک ذریعہ ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ انگریز کیوں کہتے ہیں کہ 'وقت روپیہ ہے'۔

زراعت والا اپنی زندگی تنہائی میں کاٹتا ہے، اس کی تربیت بہت محدود سی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس میں صلاحیت بھی کم ہوتی ہے کہ عام تہذیب میں کچھ حصہ لے یا سیاسی اداروں کی قدر و قیمت سمجھ سکے۔ اور اس سے بھی کم یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ امورِ عامہ کے نظم اور عدالت و انصاف کے معاملات میں کوئی عملی حصہ لے سکے یا اپنی آزادی اور اپنے حقوق کی حفاظت کر سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ اکثر مالکان زمین کا پابند ہوتا ہے۔ چنانچہ زرعی قومیں آج تک یا تو غلامی میں ہیں یا مستبد زمینداروں اور پجاریوں کی حکومت کے دباؤ تلے۔ بادشاہ، زمیندار، یا پجاریوں کو زمین کی بے شرکت ملکیت کا جو حق تھا اس نے انہیں عام زرعی آبادی پر ایسا اقتدارِ مطلق دے دیا تھا کہ یہ خود کسی طرح اس سے نجات نہ حاصل کر سکتے تھے۔

خالص زرعی قوموں کی گردن پر جو جُوا جبر، توہم پرستی، یا پجاریوں کے اقتدار نے رکھا تھا وہ عادت کے قوی اثر سے ان کے گوشت پوست میں اس طرح پیوست ہو گیا ہے کہ یہ اسے اپنے جسم کا جزو اور اپنے وجود کی شرط سمجھنے لگے ہیں۔ برخلاف اس کے تقسیم کار اور دولت آفریں قوتوں کے اتحاد کا قانون اس شدت کے ساتھ صناعوں کو قریب کرتا ہے کہ کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ رگڑ سے قدرتی آگ کی طرح ذہنی چنگاریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ذہنی رگڑ وہیں ہوتی ہے جہاں قریب قریب رہنا سہنا ہو، جہاں کثرت سے کاروباری، علمی، اجتماعی، شہری اور سیاسی تعلقات ہوں، جہاں اجناس کا لین دین اور خیالات کا تبادلہ اچھی طرح ہوتا ہے جتنے زیادہ آدمی ایک ہی جگہ پر متحدہ زندگی گذاریں گے، ان میں سے ہر ایک کو اپنے کاروبار میں دوسرے کی مدد کی جس قدر زیادہ ضرورت ہو گی، ان میں سے ہر ایک کے کام میں جس قدر واقفیت ضروری ہو گی، وسعت نظر اور تہذیب دماغی درکار ہو گی، ان کے کام اور ان کے مفاصد مقیدہ سے تلوّن، بے قاعدگی، ظلم اور خلاف قانون کارروائیوں کو جس قدر کم واسطہ ہو گا، اسی قدر مکمل تمام شہری ادارے ہوں گے، اسی قدر زیادہ ان کی آزادی ہو گی، اسی قدر زیادہ مواقع اس بات کے ہوں گے کہ اپنی دماغی تہذیب کا سامان کریں۔ اور دوسروں کی تہذیب میں معاون ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں آزادی اور تہذیب شہروں سے شروع ہوئی ہے۔ قدیم زمانہ میں یونان، و اٹلی میں قرونِ وسطےٰ

میں اٹلی، جرمنی، بلجیم اور ہالینڈ ہیں، اس کے بعد انگلستان میں اور سب سے آخر کو فرانس اور شمالی امریکہ میں۔

لیکن شہر بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک قسم کو ہم دولت آفرین اور دوسری کو صرف کرنے والے شہروں سے موسوم کرینگے۔ ایسے شہر بھی ہوتے ہیں جو اجناس خام پر کام کرتے ہیں اور ان اجناس خام کے اور اپنے گذارہ کے سامان کے عوض دیہات کو صنعتی چیزیں ادا کرتے ہیں۔ یہی شہر صنعتی یا دولت آفرین شہر ہوتے ہیں۔ یہ جس قدر پھلیں پھولیں اسی قدر ملک کی زراعت کو فروغ ہوتا ہے۔ جوں جوں زراعت کی قوت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ صنعتی شہر بڑھتے جاتے ہیں لیکن ایسے شہر بھی ہوتے ہیں جن میں وہ لوگ آباد ہیں جو زمین کا لگان اپنے کام میں لاتے ہیں۔ سب کم و بیش متمدن ممالک میں قومی آمدنی کا بڑا حصہ لگان کی شکل میں شہروں میں جا کر صرف ہوتا ہے۔ اگر کوئی عام طور پر یہ کہہ دے کہ یہ صرف دولت آفرینی کے لئے مضر ہے یا کم سے کم یہ کہ مفید نہیں تو یہ بات غلط ہوگی۔ کیونکہ لگان کے ذریعہ ایک خود مختار زندگی کے تیقن کا امکان کرنا بیت (؟) بھی بڑا قوی محرک ہے اور اس میں سے جو کچھ بچتا ہے اس کو پھر زراعت میں لگا کر زراعت کو ترقی دینے کی ضرورت بھی نکلتی ہے۔ علاوہ اس کے اپنے ساتھیوں میں امتیاز حاصل کرنے کی خاطر، نیز اپنی تعلیم اور خود مختاری کی وجہ سے یہ لگان حاصل کرنے والے تہذیب و تمدن، عام اداروں کی کارکردگی، نظم

حکومت اور علوم و فنون کی ترقی کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن قومی صنعت، مرفہ الحالی اور تہذیب پر لگان کا یہ اثر کم یا زیادہ اس سے ہوتا ہے کہ قوم آزادی و حریت کے کن مدارج تک پہنچ چکی ہے۔ خود اپنے آزاد عمل سے ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ثابت ہونے اور اپنے ساتھی شہریوں میں امتیاز حاصل کرنے کا یہ رجحان صرف ان ممالک میں نشو و نما پاتا ہے جہاں اس قسم کے کاموں کی قدرت کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہو اور ان سے عزت اور اچھے عہدوں کا راستہ کھلتا ہو۔ یہ ان ملکوں میں نہیں پنپتا جہاں لوگوں میں عزت حاصل کرنے کی ہر کوشش اور ہر قسم کی خود مختاری کو ارباب اقتدار رشک کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ ان ملکوں کے لگان حاصل کرنے والے تو عیش اور کاہلی میں پڑ جاتے ہیں اور جب اس وجہ سے مفید کاموں کو ذلیل سمجھا جانے لگتا ہے اور قوم کا اخلاق اور اس کی قوت عمل مجروح ہو جاتی ہے تو قوم کے قوائے دولت آفریں کی جڑیں خطرہ میں پڑ جاتی ہیں۔ ہر چند کہ ان حالات میں بھی ان لگان حاصل کرنے والوں کے خرچ کی وجہ سے شہروں کی صنعت کو تھوڑا بہت فروغ ہوتا ہے لیکن ان صنعتوں کی مثال غیر صحیح اور بیمار پھلوں کی سی ہوتی ہے۔ قوم کی تہذیب، مرفہ الحالی اور آزادی پر ان کا بہت ہی کم اثر ہوتا ہے کہ آزادی اور تہذیب تو صحیح صنعتی قوت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ صنعت ... لگان کی آمدنی کو کاہلی، تعیش اور بد اخلاقی کا سرمایہ بننے کی جگہ ذہنی دولت ... کے سامان میں تبدیل کر دیتی ہے اور اسی

کی وجہ سے دولت صرف کرنے والے شہر دولت آفریں شہر بن جاتے ہیں۔ دولت صرف کرنے والے شہروں کی پرورش کی ایک اور صورت سرکاری ملازموں اور نظم ریاست کے کارکنوں کے اخراجات و مصارف ہیں۔ ان سے بھی شہر میں کچھ ظاہری مرفہ الحالی پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ بات کہ ان مصارف سے قوم کی قوت دولت آفریں، اس کی مرفہ الحالی اور اس کی افادہ گاہوں کو فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان اس کا تمام تر دارومدار اس پر ہے کہ ان صرف کرنے والوں کے کام اور ان کی خدمت سے ان قوتوں کو مدد ملتی ہے یا نقصان پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خالی زرعی ممالک میں بھی بڑے بڑے شہر ہو سکتے ہیں، جن میں بہت سے مال دار لوگ بھی ہوں اور طرح طرح کی صنعتیں بھی، لیکن قوم کی تہذیب آزادی اور دولت آفریں قوت پر جن کا بہت ہی کم اثر ہو۔ اس قسم کی صنعتوں والے ضرور ہے کہ اپنے گاہکوں کے ہم خیال بھی ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت بس لگان حاصل کرنے والوں اور سرکاری اہل کاروں کے خانگی نوکروں کی سی ہوتی ہے۔ ان شہروں میں ایک طرف تعیش ہوتا ہے تو ساتھ ساتھ گرد و نواح کی دیہی آبادی میں افلاس فلاکت، تنگ نظری اور غلامانہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔ قومی تہذیب، قومی آزادی اور قوم کی عام افادہ گاہوں کی اصلاح پر صنعت کا اچھا اثر تو بس اس وقت محسوس ہوتا ہے جب ملک میں وہ صنعتی قوت فروغ پاتی ہے جو لگان حاصل کرنے والوں اور سرکاری ملازموں سے بے تعلق یا تو کثیر زرعی آبادی کے لئے

کام کرتی ہے یا برآمد کے لئے، اور اس آبادی کی پیداوار کو بڑی مقدار میں صنعت کے اندر کام میں لاتی ہے یا غذا کے لئے۔ یہ تندرست صنعتی قوت جتنی مضبوط ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس صنعت کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے جو لگان حاصل کرنے والوں اور سرکاری ملازموں کی ضروریات کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی اور عام افادہ گاہیں بھی پھر اسی نسبت سے مفاد عامہ کے لئے ترقی پاتی ہیں۔

ایک بڑے شہر کی حالت پر نظر کیجئے جہاں صنعت والے کثیر التعداد، خود مختار، آزادی پسند، تعلیم یافتہ اور خوش حال ہیں۔ جہاں کے تاجر اپنی اغراض اور حیثیت میں اہل صنعت کے شریک ہیں۔ لگان حاصل کرنے والے مجبور سے ہیں کہ عام عزت حاصل کرنے کی تدبیریں کریں، سرکاری ملازم رائے عامہ کے پابند ہیں۔ جہاں اہل فن اور اہل علم عام جمہور کے لئے کام کرتے اور ان سے اپنا گذارہ حاصل کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ذہنی اور مادی وسائل کی کیسی کثرت ہے جو ایک چھوٹے سے رقبہ میں مجتمع ہو گئی ہے۔ سوچئے کہ قوتوں کی یہ کثرت تقسیم کار اور اتحاد قویٰ کے ماتحت کس طرح متحد ہے۔ اندازہ کیجئے کہ عام افادہ گاہوں اور جماعتی و معاشی حالات کی ہر اصلاح اور ترقی کو اور دوسری طرف مفاد عامہ کے ہر نقصان اور کمی کو جمہور کس قدر جلد محسوس کرینگے، سوچئے کہ یہ سب اسی ایک ہی جگہ پر رہنے والے لوگ جماعتی مقاصد اور قواعد پر کس آسانی سے متفق ہو سکتے ہیں اور ان مقاصد کے لئے وہیں کے وہیں کس قدر ذرائع و وسائل یک جا کر سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی خیال فرمایئے

کہ ایسی طاقتور، روشن خیال، آزادی دوست جماعت دوسری اسی قسم کی جماعتوں کے ساتھ کس قدر قریبی اتحاد رکھے گی۔ اگر ان سب چیزوں کو دیکھئے تو یہ آسانی یقین آجائے گا کہ جو زرعی آبادی سارے ملک میں منتشر ہے، چاہے اس کی مجموعی تعداد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، اس کا اثر قوم کی مرفہ الحالی کے قیام و ترقی پر ان شہروں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہوگا۔ اور ان شہروں کی تمام قوت جیسا کہ ہم ظاہر کر چکے ہیں، صنعتوں کی ترقی اور ان سے متعلق اور وابستہ تجارت کے فروغ پر منحصر ہے۔

دیہی آبادی کے نقصان کا تو ذکر ہی کیا، شہروں کا یہ مہتم بالشان اثر قوم کے سیاسی اور بلدی حالات کے لئے بھی بے شمار فوائد رکھتا ہے۔ خود شہروں کا فائدہ ان کے لئے اس بات کو فرض بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی آزادی، تمدن اور مرفہ الحالی میں اہل زراعت کو اپنا شریک بنائیں۔ کیونکہ ان محاسن ذہنی کا جس قدر بڑا سرمایہ دیہی باشندوں کے پاس ہوگا۔ اسی قدر زیادہ وہ زرعی پیداوار اور اجناس خام ہوں گی جو یہ شہروں کو مہیا کریں گے، اور اتنا ہی زیادہ مصنوعات کا وہ مجموعہ ہوگا جو وہ شہروں سے لینگے۔ اور اس طرح اتنا ہی فروغ شہروں کی مرفہ الحالی کو ہوگا۔ دیہات کو شہروں سے قوت، مرفہ الحالی، روشن خیالی، آزادی اور عام افادہ گاہیں حاصل ہوں گی، تو شہر اپنی آزادی اور اپنی افادہ گاہوں کی ضمانت اسی طرح کرینگے۔ کہ دیہی آبادی کو ان خوبیوں میں اپنا شریک بنائیں۔ جو زراعت اب تک محض زمینداری

اور ان کے نوکروں کی پرورش کرتی تھی اب ہیئت اجتماعی کے لئے آزادی کے سبب
سے بے لوث اور جری مہیا غلہ فراہم کرے گی۔ خود زراعت کے اندر اب ہر قوت
اپنے کو ترقی دے سکے گی۔ معمولی مزدور، کاشتکار اور کاشتکار بڑھ کر زمیندار
بن سکے گا۔ صنعت سے جو روپیہ پیدا ہوگا اور وسائل آمد و رفت کے جو ادارے
پیدا ہوں گے، وہ ہر جگہ زراعت کے کام بھی آئیں گے۔ غلامی، منصب داری،
پنشنیں، آزادی اور محنت کو نقصان پہنچانے والے آئین و قوانین سب ختم ہو
جائیں گے، زمیندار کو پہلے شکار سے جو ملتا تھا اب اس سے کوئی سوگنی آمدنی تو
جنگل کی لکڑی سے ہو جایا کرے گی۔ وہ زمیندار جنہیں پہلے غلاموں کی مشقت
کے حاصل سے بمشکل اتنا مل جاتا تھا کہ معمولی دیہی زندگی بسر کر سکیں، جن کی تفریح
لے دے کر بس یہ تھی کہ گھوڑے اور کتنے پال لئے اور جنگل کے جانوروں کا شکار
کر لیا اور اگر ان تفریحوں میں کوئی ذرا بھی حائل ہوا تو اسے اپنے اقتدار زمینداری
کے خلاف سمجھ کر اس کا بدلہ لیا، ان کے لگان کی آمدنی اب آزاد محنت کے طفیل
بڑھے گی اور انہیں بھی موقع ملے گا کہ سال کا ایک حصہ جا کر شہروں میں گزار لیں
جہاں پہنچیں گے تو ناٹک اور موسیقی فنون لطیفہ اور مطالعہ سے ان کی عادات
میں نرمی پیدا ہوگی۔ بڑے بڑے صناعوں اور عالموں سے میل جول ہوگا تو ذہنیت
اور دماغی صلاحیت کی قدر کرنا سیکھیں گے۔ مغرور نمرودوں کی جگہ اب یہ اچھے
بھلے آدمی بن جائیں گے۔ ایک ایسی ہیئت اجتماعی کا نظارہ جہاں سب مشقت کرتے

ہیں اور ہر ایک اپنی حالت کو بہتر بنانے میں کوشاں ہے، خود ان میں بھی اصلاح و ترقی کی ذہنیت کو بیدار کریگا۔ اب ہرنوں اور خرگوشوں کے پیچھے پیچھے دوڑنے کی جگہ یہ علم اور خیالات کے پیچھے دوڑینگے۔ اور جب دیہات کو واپس جائینگے تو متوسط اور چھوٹے زمینداروں کے لیے قابل تقلید مثال پیش کرسکیں گے اور بجائے لعنت کے عزت کے مستحق قرار پائیں گے۔

صنعت اور زراعت کو جتنا فروغ ہوتا ہے اتنا ہی ذہن انسانی کو زنجیر (؟) میں جکڑنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور اسی قدر ضرورت ہوتی ہے کہ رواداری برتی جائے تو ہر جگہ صنعت ہی نے پیدا کی ہے۔ اسی نے ہر جگہ بچاریوں کو قوم کا معلم اور سچے معنوں میں عالم بنا دیا ہے۔ ہر جگہ اسی صنعت و تجارت کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ ہی قومی زبان، ادب اور فنون تہذیب نے ترقی کی ہے اور علمی افادہ گاہوں کی تکمیل ہوئی ہے۔

صنعت ہی سے قوم میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ کم متمدن قوموں سے تجارت کرے، جہازرانی کو بڑھائے، بحری قوت قائم کرے اور اپنی فاضل آبادی کو نوآبادیاں بسا یا کر، قومی مرفہ الحالی اور قومی قوت کے بڑھانے کے لئے کام میں لائے۔

اعداد و شمار کے مقابلہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس قوم کے پاس کافی بڑا اور زرخیز رقبۂ زمین ہو اور اس میں صنعت اور زراعت کی پوری اور مساوی ترقی ہو

تو وہ ایک خالص زرعی ریاست کے مقابلہ میں دگنی یا تگنی آبادی کی پرورش کر سکتی ہے۔ اور پرورش بھی اس سے کہیں بہتر۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کی تمام ذہنی قوتیں، ریاست کی آمدنی، تحفظ کے مادی و ذہنی ذرائع اور قومی خود مختاری کی ضمانت، یہ سب چیزیں صنعتی قوت کے قیام کے ساتھ ساتھ ہی بڑھتی ہیں۔

ایسے زمانہ میں جبکہ طریق جنگ پر صنعت اور جر ثقیل کا اتنا زیادہ اثر ہے جبکہ ساری جنگی کارروائیوں کی شرط اوّل ریاست کی آمدنی کی حالت ہے، جبکہ حفاظت ملک کے معاملہ میں بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ قوم کے جمہور غریب ہیں یا مالدار، ذکی ہیں یا غبی، حسیت وچالاک ہیں یا غفلت شعار، ان کی ہمدردی کلیتاً اپنے وطن کے ساتھ وابستہ ہے، یا کچھ کچھ پردیسیوں کے ساتھ بھی ہے، ملک اپنی حفاظت کے لئے بہت سے آدمی جمع کر سکتا ہے یا کم، ہاں، تو ایسے زمانہ میں تو صنعت کی قدر و قیمت کا اندازہ معمول سے زیادہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی کرنا چاہیئے۔

باب ۱۸

قوتِ صنعتی اور قوم کے قدرتی قوائے دولت آفریں

آدمی اور جماعت جیسے جیسے ترقی کرتے ہیں اور تکمیل کو پہنچتے ہیں، ویسے ویسے ان کے اندر ان قدرتی قوتوں کو اپنی غرض کے واسطے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی جاتی ہے جو ان کے حلقۂ اثر میں پائی جاتی ہیں۔ اور خود یہ حلقۂ اثر بھی اس کے ساتھ ساتھ پھیلتا جاتا ہے۔ شکاری اپنے اس پاس کے وسائلِ قدرت کا ہزارواں اور گلہ بان اس کا سوواں حصہ بھی تو استعمال نہیں کرتا۔ سمندر سے، یا طرح طرح کی آب و ہوا کے مختلف علاقوں سے اور دوسرے ملکوں سے یہ نہ تو اپنے خوراک کے لئے کچھ حاصل کر سکتا ہے نہ اپنے کام میں مددگار نہ اپنے عمل کے لئے محرک، اور اگر کر سکتا ہے تو بہت ہی کم۔

ابتدائی قسم کی زراعت والے ملک میں جو قوتیں ہوتی ہیں خود ان کا بڑا حصہ غیر مستعمل پڑا رہتا ہے۔ اس لئے کہ انسان بس اپنے قریبی ماحول میں محدود رہتا ہے۔ پانی یا ہوا کی جو قوت موجود ہوتی ہے یا پیدا کی جا سکتی ہے اس کا بہت بڑا حصہ بیکار رہ جاتا ہے۔ معدنیات اور زمین کی مختلف قسموں کی صلاحیتیں خود بخود

استعمال کر سکتی ہے مردہ پڑی رہتی ہیں۔ اور طرح طرح کے ایندھن یا تو بے کار جلاتے ہیں یا انہیں تمدن کے لئے سدِّ راہ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً: پتھر، ریت اور چونا بہت کم عمارتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دریا بجائے اس کے کہ انسان کے بار بردار ہوں یا آس پاس کی زمین کو سیراب کریں، الٹے ملک کو طغیانی سے تباہ و برباد کرتے ہیں۔ گرم ملک اور سمندر اس زرعی ملک کو اپنی پیداوار میں سے بہت کم چیزیں دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زرعی ریاست میں قدرت کی وہ قوت جس پر دولت آفرینی کا سارا دارومدار ہے یعنی خود زمین کی زرخیزی، اس وقت تک بہت کم کام میں آتی ہے جب تک کہ زراعت کو صنعت کا سہارا نہیں ملتا۔

زرعی ریاست کے ہر حصہ کو جو جو چیز درکار ہوتی ہے اور اس کی جتنی مقدار چاہئے ہوتی ہے سب خود اپنے ہی یہاں پیدا کرنا ہوتی ہے اس لئے کہ یہ نہ تو اپنی فاضل پیداوار کو دوسرے حصوں میں کھپا سکتا ہے؛ اور نہ جو کچھ اس کے پاس نہیں ہے اسے وہ دوسرے حصوں سے منگا ہی سکتا ہے۔ ایک علاقہ کیسا ہی زرخیز اور تیل اور رنگ کے پودوں کے لئے کتنا ہی موزوں کیوں نہ ہو، لازم ہے وہ اپنے لئے لکڑی بھی پیدا کرے کیونکہ دور دراز پہاڑی علاقوں سے اگر ایندھن منگایا جائے تو خراب دیہاتی سڑکوں کی وجہ سے بہت گراں آکر پڑتا ہے۔ وہ زمین جسے انگور یا سبزی ترکاری کی کاشت کے کام میں لایا جائے تو تگنی چوگنی پیداوار دے وہ غلہ اور چارے کے پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے جسے جانوروں کی نسل کشی

میں بہت فائدہ ہے اسے کاٹنے سے جانوروں کو پال پال کر موٹا کرنے کا کام بھی کرنا پڑتا ہے جو محض جانور موٹا کرنے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا اسے ان کی نسل کشی بھی کرنی پڑتی ہے۔ بھلا کتنا فائدہ ہو اگر معدنی کھاد مثلاً جپسم، چونہ Mergel استعمال کئے جائیں۔ یا لکڑی جلانے کے بجائے کپا اور پکا کوئلہ جلایا جائے، یا جنگلوں کو زیرِ کاشت لایا جائے۔ لیکن ان کے پاس ذرائع باربرداری کہاں، بس تھوڑی دور لے جا سکتے ہیں، زیادہ دور لے جائیں تو نفع ختم۔ وادیوں کی چراگاہوں میں کیا کچھ نہ پیدا ہو اگر بڑے پیمانہ پہ آب پاشی کا انتظام کیا جائے، مگر یہاں تو دریا کے دھارے بس اس کام آتے ہیں، کہ زرخیز زمین کو کاٹ کاٹ کر بہا لے جائیں۔

زرعی ریاست میں جب صنعت قائم ہوتی ہے تو سڑکیں بنتی ہیں، ریلیں چلتی ہیں، نہریں کھدتی ہیں دریا کشتی رانی کے قابل بنائے جاتے ہیں اور دخانی جہازوں کی لائنیں چالو ہوتی ہیں، اس طرح زرعی ملک کی فاضل پیداوار یہی نہیں کہ آمدنی دینے والی مشینوں میں بدل جاتی ہے، یہی نہیں کہ اس پہ جو لوگ کام میں لگتے ہیں۔ ان کی قوتِ عمل کو حرکت ہوتی ہے؛ یہی نہیں کہ زرعی آبادی اپنے قدرتی وسائل سے بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے؛ بلکہ اب تمام معدنیات، تمام دھاتیں جو اب تک بیکار زمین میں دبی پڑی تھیں کارآمد اور قیمتی ہو جاتی ہیں۔ جو چیزیں پہلے بس چند میل کی باربرداری کی متحمل ہو سکتی تھیں۔ (مثلاً نمک، پکا کوئلہ، پتھر، سنگ مرمر، سلیٹ، جپسم، چونا، لکڑی، چھال وغیرہ)

اب یہ پوری سلطنت میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ پہلے جو چیزیں بالکل بے قدر تھیں ان کو اب قومی دولت آفرینی کی فہرست میں پہلی زراعت کی پوری کی پوری پیداوار سے زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب کسی آبشار کا ایک مکعب انچ بھی ایسا باقی نہیں رہتا جو اپنا کام نہ کرتا ہو۔ صنعتی ممالک کے دور افتادہ سے دور افتادہ علاقہ میں بھی اس لکڑی اور ایندھن کی قیمت لگ جاتی ہے جسے پہلے کوئی استعمال بھی نہ کرتا تھا۔

صنعت کی ترقی کی وجہ سے ایسے کھانے پینے کے سامان اور خام اجناس کی مانگ بھی پیدا ہو جاتی ہے جن کے لئے زمین کے بعض حصے غلہ کی پیدائش سے زیادہ موزوں ہوتے ہیں اور زرعی حالت میں تو محصول بس غلہ پیدا کرنا ہی ہے۔ دودھ مکھن اور گوشت کی جو مانگ پیدا ہوتی ہے اس سے چراگاہوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ بنجر زمینوں پر کاشت ہونے لگتی ہے۔ آب پاشی کے سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ پھل پھلواری اور ترکاریوں کی مانگ کی وجہ سے کھیت اب کھیت نہیں رہتے باغ بن جاتے ہیں۔

قدرت کے ان وسائل کو استعمال نہ کرنے سے زرعی ریاست کو جو نقصان ہوتا ہے وہ اس حالت میں اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ قدرت نے اسے صنعت کے لئے بھی موزوں بنایا ہو اور اس کا علاقہ صنعت کی ضروری اجناس خام اور قدرتی قوتوں کی پیدائش کے لئے خاص طور پر مناسب ہو۔ چنانچہ یہ نقصان پہاڑی

علاقوں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جو زراعت کے لئے تو فی الجملہ کم موزوں سمجھتے ہیں لیکن یہاں صنعت کے لئے پانی کی طاقت، معدنیات، لکڑی اور پتھر کی افراط ہوتی ہے، اور کسانوں کو ایسی چیزیں پیدا کرنے کا موقع ہوتا ہے جنہیں صنعت والے بہت پسند کرتے ہیں۔

اور منطقہ معتدلہ تو بس کارخانوں اور صنعتوں کی ترقی ہی کے لئے موزوں ہے قوت کی نشو و نما اور اس کو کام میں لگانے کے لئے معتدل آب و ہوا گرم آب ہوا سے بمراتب بہتر اور مفید ہے۔ اور سال کا وہ سخت زمانہ جو سطحی دیکھنے والے کو فطرت کا عذاب معلوم ہوتا ہے دراصل سخت محنت، پیش بینی، کفایت شعاری، کی عادتیں پیدا کرنے میں بہت زیادہ مدد دیتا ہے جس آدمی کے سامنے چھ مہینے ایسے ہوں کہ وہ ایک تو زمین سے کچھ پیدا نہیں کر سکتا دوسرے خود اپنے اور اپنے جانوروں کو سردی سے بچانے اور پرورش دینے کے لئے کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کا اور انتظام رکھنا پڑتا ہے، وہ لازمی ہے کہ اس آدمی سے کہیں زیادہ محنتی اور کفایت شعار ہوگا جسے اپنے آپ کو بس بارش سے بچانا ہو اور باقی سال بھر یا ہر اس کے منہ میں پھل خود آآ کر ٹپکتے ہوں محنت، کفایت شعاری، نظم اور پیش بینی ضرورت سے پیدا ہوتے ہیں، اور پھر عادت اور تعلیم انہیں فطرت ثانیہ بنا دیتی ہے۔ قوت کے استعمال اور کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی پیدا ہوتا ہے اور کاہلی و اسراف کے ساتھ بداخلاقی اور یہ دونوں اخلاق و بداخلاقی

بالترتیب طاقت اور کمزوری کے نہایت موثر ذریعے ہیں۔

منطقہ معتدلہ میں رہنے والی زرعی قوم گویا اپنے قدرتی سرمایہ کا سب سے قیمتی حصہ بیکار پڑا رہنے دیتی ہے۔

معاشیین کے مذہب رائج نے دولت آفرینی پر آب و ہوا کے اثر کی بحث کرتے ہوئے زراعت و صنعت میں فرق نہیں کیا ہے اور اس وجہ سے تامینی کاروائیوں کے فائدوں اور نقصانوں پر حکم لگانے میں نہایت سخت غلطیاں کی ہیں۔ ان غلطیوں کا ذکر عام طور پر تو پہلے بھی ہو چکا ہے، مگر اس جگہ انہیں خاص طور پر ظاہر کرنا ضروری ہے۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہر چیز کو ایک ہی ملک میں پیدا کرنے کی کوشش حماقت ہے مذہب رائج پوچھتا ہے کہ کیا یہ بات معقول ہو گی کہ ہم انگلستان اور اسکاٹستان کے سبزی گھروں میں انگور پیدا کر کے شراب تیار کریں؟ شراب یوں بھی تیار ضرور ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس سے بہت بری اور مہنگی شراب ہو گی جو انگلستان اور اسکاٹستان والے اپنی مصنوعات کے عوض حاصل کر سکتے ہیں۔ جو شخص ماہیت اشیاء پر زیادہ گہری نظر نہیں ڈالنا چاہتا یا نہیں ڈال سکتا اسے تو یہ دلیل بالکل فیصلہ کن معلوم ہو گی اور بات بھی یہ ہے کہ فرانس کے انگور پیدا کرنے والوں اور صابون سازوں[۱] میں اور شمالی امریکہ کے روئی بونے اور روئی کا سامان بیچنے والوں

۱؎ اشارہ صاف نہیں۔ صابون [illegible] لفظ [illegible] ہے اور [illegible] کیلئے [illegible] غالباً [illegible] میں [illegible] چھپ گیا ہے۔ (مترجم)

میں تو اس مذہب کی ہر دلعزیزی کا دارومدار اسی دلیل پر ہے! لیکن اگر غور اور روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ کیونکہ تجارتی لین دین پر پابندیاں عائد کرنے کا اثر زراعت اور صنعت کی قوت دولت آفرینی پر بالکل مختلف طریقوں سے پڑتا ہے۔

آئیے، پہلے دیکھیں کہ زراعت پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اگر فرانس اپنے حدود ملک کے اندر جرمنی کے ذبح کرنے کے جانور یا شراب کو نہ آنے دے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ سب سے پہلے تو یہ کہ جرمنی اس قابل نہ رہے گا کہ فرانس سے شرابیں خریدے، یعنی تعلق تجارتی میں خارج ہو کہ فرانس جتنا نقصان اپنی شراب کی برآمد کو پہنچائے گا۔ گویا اسی قدر اس کی وہ زمینیں جو انگور کی کاشت کے لئے موزوں ہیں، کم فائدہ مند طریق پر استعمال ہونگی۔ اسی حساب سے صرف انگور کی کاشت میں اب کم آدمی مشغول ہونگے۔ اور صرف انگور کی کاشت کرنے کی صورت میں ان لوگوں کو جن دوسری زرعی چیزوں کی ضرورت پڑتی ان کی مانگ میں بھی کمی ہو جائے گی۔ شراب ہی کی طرح تیل کی پیداوار پر اثر پڑے گا۔ یعنی فرانس دوسری جگہوں پر اس سے زیادہ نقصان اٹھا جائے گا جتنا کہ وہ ایک جگہ پہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ جرمن مویشیوں کو خارج کر کے وہ جانوروں کی نسل کشی اور پالنے کے جس کام کی بابت کی فکر کر رہا ہے وہ خود بخود پیدا نہیں ہوا ہے اور شاید جن اضلاع میں اس کام کو مصنوعی طریق پر جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ان اضلاع

کی زراعت اس کام کے لئے خاص طور پر موزوں بھی نہیں۔ اور یہ صورت تو اس وقت ہوگی کہ اگر فرانس زرعی ریاست ہو تو اس کے مقابلہ میں جرمنی بھی ایک خالص زرعی ریاست مانی جائے اور یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ جرمنی اس کا ترکی بہ ترکی جواب نہ دیگا۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جرمنی نے بھی اپنے اغراض سے مجبور ہو کر کہیں ایسی ہی پابندیاں عائد کردیں، اور یہ بات بھی پیش نظر ہو کہ فرانس محض زرعی ملک ہی نہیں بلکہ ایک صنعتی ملک بھی ہے تو پھر اس طرزِ عمل کا نقصان کتنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ صرف فرانس کی شرابوں پر ہی نہیں، بلکہ تمام ان چیزوں پر جرمنی خوب محصول لگائے گا جو وہ خود تیار کرسکتا ہے یا جن کا استعمال کم و بیش ترک کرسکتا ہے۔ یا جنہیں کہیں اور سے منگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مصنوعات یہ خود تو نفع سے تیار نہیں کرسکتا لیکن کہیں اور سے خرید سکتا ہے۔ ان کی درآمد میں رکاوٹیں ڈالیگا اس طرح فرانس کو جو نقصان پہنچیگا وہ اس فائدہ سے دو چند سہ چند ہوگا جو اس پابندی سے اس نے حاصل کرنا چاہا تھا۔ ظاہر ہے کہ فرانس میں زیتون اور انگور کی کاشت اور صنعت میں اتنے ہی اشخاص تو مشغول رہ سکتے ہیں جتنے کہ اس سامان خورد و نوش سے پرورش پا سکتے ہیں یا ان اجناس خام پر کام کرسکتے ہیں جو یا تو فرانس میں خود پیدا ہوتی ہوں یا کہیں باہر سے منگائی جائیں۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ درآمد کی روک سے زرعی پیداوار میں اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ صرف ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اگر پیداوار زرعی کے لین دین کو

آزاد رکھا جاتا تو زرعی اور خام اجناس کی درآمد بڑھتی اور اس کے ساتھ ہی شراب
تیل اور مصنوعات کی بکری میں برابر اضافہ ہوتا یعنی وہ آبادی بھی بڑھتی جو انگور
کی کاشت، زیتون کی کاشت اور صنعت میں مشغول ہے۔ لیکن لین دین کے فروغ کے
ساتھ ایک طرف ذرائع بود و باش اور اجناس خام میں اضافہ ہوتا اور دوسری
طرف مصنوعات کی مانگ میں۔ آبادی کے اضافہ سے ان چیزوں اور خام جنسوں
کی مانگ بڑھتی جو آسانی کے ساتھ پردیس سے نہیں منگائی جا سکتی اور جن پر
دیسی زراعت کو فطری اجارہ حاصل ہوتا ہے۔ اور دیسی زراعت کو اس
طرح بہت فائدہ ہوتا۔ اگر لین دین کی آزادی ہوتی تو ان زرعی اجناس کی
مانگ جن کے لئے فرانسیسی زمین فطرةً زیادہ موزوں ہے۔ اس سے کہیں
زیادہ ہوتی جتنی کہ پابندیوں والی مصنوعی صورت میں۔ ایک کسان کا فائدہ
اور دوسرے کا نقصان نہ ہوتا بلکہ ملک کی پوری زراعت کو فائدہ پہنچتا۔ اور
اس سے بھی زیادہ صنعت کو۔ یعنی پابندی عاید کرنے سے ملک کی زرعی قوت
بڑھتی نہیں بلکہ الٹی محدود ہوتی ہے۔ اور مزید برآں یہ کہ وہ صنعتی قوت جو ملکی
زراعت کی ترقی اور پردیس سے کھانے پینے کے سامان اور اجناس خام کی
درآمد سے پیدا ہو سکتی وہ بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔ اس روک سے جو کچھ حاصل
ہوتا ہے وہ یہ کہ قیمتیں بڑھ کر ایک علاقے کے کسانوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ تو
دوسرے علاقہ والوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے

ملک کی مجموعی قوت دولت آفرین کو۔

زرعی پیداوار کے لین دین پر پابندیاں عائد کرنے کے نقصانات فرانس سے زیادہ انگلستان کے معاملہ میں روشن ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قوانین غلہ کی وجہ سے بہت سی غیر زرخیز زمینیں زیر کاشت آ گئی ہیں لیکن یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا قوانین کے بغیر بھی یہ زمینیں زیر کاشت آتیں یا نہ آتیں انگلستان میں جتنا زیادہ اون، جتنی زیادہ لکڑی، جتنا زیادہ غلہ، جتنے زیادہ مویشی آتے، اتنے ہی زیادہ مصنوعات بکتیں، اتنے ہی زیادہ کاریگر انگلستان میں رہ سکتے، اسی قدر زیادہ مزدور طبقہ کی خوشحالی بڑھتی۔ غالباً انگلستان میں کام کرنے والوں کی تعداد دگنی ہو جاتی۔ ہر کارخانہ کا کاریگر بہتر طریقہ سے رہتا، اپنی تفریح اور اپنے باورچی خانہ کی ضروریات کے لئے ایک باغ لگا سکتا۔ اور خود اپنے اور اپنے خاندان کے لئے بہت بہتر غذا فراہم کر سکتا۔ صاف ظاہر ہے کہ کام کرنے والی آبادی کا یہ اضافہ اور ان کی خوشحالی اور فزونی سے ان اجناس کی بے حساب مانگ پیدا ہو جاتی جن کا فطری اجارہ ملک کے پاس ہے اور اغلب ہے کہ جتنی زمین غیر فطری پابندیاں لگانے سے زیر کاشت آئی ہے اس سے دگنی چوگنی زمین پر کاشت ہونے لگتی۔ ثبوت اس کا ہر بڑے شہر کے قریب مل سکتا ہے۔ اگر شہر میں چاہے باہر سے کتنی ہی کثیر مقدار زرعی پیداوار کی آتی ہو، اس کے چاروں طرف میلوں تک زمین کا ایک چپہ

بھی بے کاشت نہ ملے گا، ہر چند کہ فطرت نے اس زمین سے کتنی ہی بیلے اعتنائی برتی ہو۔ اگر آپ ایسے شہر میں غلہ کی درآمد بند کر دیں۔ تو آپ بس اس کی آبادی کو گھٹاتے ہیں اور اس کی صنعت اور خوشحالی کو کم کرتے ہیں اور شہر کے پاس رہنے والے کسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کم نفع والی کاشت اختیار کرے۔

آپ نے دیکھا کہ اس حد تک تو ہم مذہب رائج سے بالکل متفق ہیں جہاں تک زرعی پیداوار کے لین دین کا تعلق ہے۔ مذہب رائج اس خیال میں بالکل حق بجانب ہے کہ تجارت کی زیادہ سے زیادہ آزادی افراد کے اور ریاستوں کے سب کے لئے ہر حالت میں بہت مفید ہوتی ہے۔ اس کی پیداوار کو پابندیوں سے بڑھایا ضرور جا سکتا ہے لیکن جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ محض ظاہری ہوتا ہے۔ اور بقول مذہب رائج سرمایہ اور محنت کو ہم اس طریقے سے بس دوسری کم مفید چیزوں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں لیکن صنعت کی قوت دولت آفریں بالکل دوسرے قوانین کی پابند ہے اور افسوس کہ اُن پہ مذہب رائج نے بالکل نظر نہیں ڈالی۔

یہ تو ہم دیکھ چکے کہ اجناس خام کی درآمد پر روک ٹوک قوم کے قدرتی سرمایہ اور قدرتی قوتوں کے استعمال میں حایل ہوتی ہے، لیکن مصنوعات کی درآمد پہ پابندیاں، ایک آباد اور تہذیب و زراعت میں ترقی یافتہ ملک کے اندر بہت سی قدرتی قوتوں کو زندگی بخشتی اور آمادہ عمل کر دیتی ہیں یعنی بلا شبہ

ان تمام قدرتی قوتوں کا نصف سے کچھ زیادہ ہی حصّہ بروئے کار آجاتا ہے جو زرعی ریاست میں ہمیشہ ہمیشہ بیکار اور مردہ پڑی رہتی ہیں۔ زرعی پیداوار کے لین دین پر پابندیاں لگانے سے صرف صنعتی ترقی کی راہ ہی میں رکاوٹیں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ خود زراعت کی قوت دولت آفرین کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اور مصنوعات کی روک ٹوک کرنے سے جو صنعتی قوت پیدا ہوتی ہے وہ زرعی دولت آفرینی کو بھی ایسا فروغ دیتی ہے کہ اچھّی سے اچھّی خارجی تجارت بھی نہیں دے سکتی۔

زرعی پیداوار کی درآمد سے اگر پردیس والے ہمارے دست نگر ہو جاتے ہیں اور اُن کے ہاتھ سے وہ ذرائع نکل جاتے ہیں جیسے وہ خود صنعتی چیزیں پیدا کر سکتے، تو مصنوعات کی درآمد سے ہم پردیس کے دستِ نگر ہو جاتے ہیں، اور ہمارے ہاتھ سے صنعت کے وسائل نکل جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار اور اجناس خام کی درآمد پردیس والوں سے ان کا کام اور اُن کا کھانا پینا چھین لیتی اور ہماری قوم کے ہاتھ میں پہنچا دیتی ہے۔ مصنوعات کی درآمد کے باعث ہمارے ہاتھ سے خود اپنی آبادی بڑھانے یا اسے کام دینے کا موقع نکل جاتا ہے۔ زرعی پیداوار اور اجناس خام کی درآمد سے معاملات عالم میں ہماری قوم کا اثر بڑھتا ہے اور ہمیں تمام دوسری قوموں اور ملکوں سے تجارت کرنے کے ذرائع ہاتھ لگتے ہیں، لیکن مصنوعات کی درآمد ہمیں صنعت میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم کا پابند کر دیتی ہے، پھر وہ ہم پر جس طرح چاہے حکم چلا سکتی ہے، جیسے انگلستان پرتگال پر حکم چلاتا ہے۔

مختصر یہ کہ تاریخ اور اعداد و شمار دونوں سے جارج اوّل کے وزراء کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ قومیں جتنی زیادہ مصنوعات باہر بھیجیں اور جس قدر اجناس خام اور کھانے پینے کا سامان ملک میں منگوائیں اتنی ہی دولت مند اور قوی ہوتی ہیں۔ ہاں؛ یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قوموں کی قومیں صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئی ہیں کہ اُن کے ہاں صرف اسباب خورد و نوش اور اجناس خام کی برآمد اور مصنوعات کی درآمد ہوتی تھی۔ ماننٹیکو، جس سے پہلے یا بعد کسی شخص نے تاریخ کے ان سبقوں کو نہیں سمجھا ہے جو یہ قانون بنانے والوں اور اہلِ سیاست کے لئے اپنے اندر رکھتی ہے، اس نے اس بات کو خوب سمجھا تھا، مگر چونکہ اس زمانے میں معاشیات کی تدوین بہت کم ہوئی تھی۔ اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی وجوہ کو صاف طور پر پیش کرتا۔ مذہب ہنوکلین کے لئے بے بنیاد نظام کی مخالفت میں اس کی یہ رائے تھی۔ کہ اگر پولینڈ خارجی تجارت سے بالکل دست بردار ہو جائے اور خود اپنی صنعت قائم کر کے اپنی اجناس خام کو خود صنعتی مال کی تیاری میں کام میں لائے اور خود ان میں صرف کرے تو وہ زیادہ فائدہ میں رہیگا۔ اندرونی صنعتی قوت کو ترقی دے کر ہی، اور آزاد، آباد صنعتی شہروں کے ذریعہ، پولینڈ اپنے داخلی نظام کو مضبوط بنا سکتا اور قومی صنعت، آزادی اور دولت حاصل کر سکتا ہے، اور اپنی خود مختاری کو اور کم متمدّن پڑوسیوں پر اپنے اقتدار کو قائم رکھ سکتا تھا۔ پردیسی مصنوعات منگوانے کی جگہ اسے انگلستان کی طرح (جب یہ بھی پولینڈ ہی کی سی تمدّنی حالت میں تھا) پردیسی صنّاع اور پردیس

کا صنعتی سرمایہ اپنے ملک میں بڑھانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے امرا نے اس بات کو ترجیح دی کہ غلامانہ محنت کے تھوڑے بہت ثمرات کو پردیسی منڈیوں میں بھیجیں اور پردیسی سستے اور خوب صورت کپڑے پہنے پھریں۔ اب ان کی اولاد اس بات کا جواب دے کہ جب تک ملکی صنعت اتنی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ قیمت اور خوبی میں پردیسی مال سے مقابلہ کر سکے۔ کیا اس وقت پردیسی مصنوعات کا منگوانا قوم کیلئے قرین مصلحت تھا یا نہیں؟ دوسری قوموں کے امرا کے سر میں جب تک منصب داری کا سودا سمایا رہے اس وقت تک چاہئے کہ یہ اپنی آنکھوں کے سامنے ان پولینڈ والوں کی مثال کو بھی رکھیں اور ایک نظر انگریزی امرا پر بھی ڈال لیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ بڑے زمینداروں کے لئے صنعت کی مضبوطی، آزاد شہروں کا طبقہ اور دولت مند شہر کیا کچھ قیمت رکھتے ہیں۔

یہاں ہم اس سوال سے قطع نظر کرتے ہیں کہ پولینڈ کے انتخابی بادشاہوں کے لئے اپنے مخصوص حالات میں یہ ممکن بھی تھا یا نہیں کہ انگلستان کے موروثی بادشاہوں کا سا تجارتی نظام قائم کر سکیں۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہو سکتا تھا تو کیا صاف دکھائی نہیں دیتا کہ اس نظام سے پولی قوم کو کیسے کیسے ثمرات حاصل ہوتے؟ بڑے بڑے صنعتی شہروں کی مدد سے تاج و تخت موروثی ہو جاتا، امرا کو آمادہ ہونا پڑتا کہ دارالامرا میں بیٹھ کر قانون سازی میں حصہ لیں اور اپنے بندوں کو آزاد کریں، زراعت کو ترقی ہوتی جیسے کہ انگلستان میں ہوئی، پولی امرا آج دولت مند اور معزز ہوتے اور

پولی قوم معاملاتِ عالم میں اگر ایسا اثر و وقار بھی نہ رکھتی جیسا کہ انگلستان کو حاصل ہے تو اتنی متمدن اور مضبوط تو کبھی کی ہوچکی ہوتی کہ مشرق کی کم مہذب قوموں پر اپنا اثر ڈال سکتی۔ صنعت بغیر وہ تباہ و منتشر ہے؛ اور اگر پہلے تباہ نہ ہوچکی ہوتی تو اب ہوجاتی۔ صنعتی قوت نے اُس کے یہاں خود بخود تو ترقی کی نہیں، اور یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ دوسری ترقی یافتہ قوموں نے ایسی کوششوں کو ہمیشہ روکا۔ ترقی یافتہ قوموں سے آزاد تجارت رکھ کر اور تابین کی مدد کے بغیر اگر یہ اپنی خودمختاری آج تک قائم بھی رکھ سکتا تو بھی بس ٹوٹی پھوٹی زراعت کے درجہ سے آگے تو کبھی نہ بڑھ پاتا۔ یہ ہرگز نہ دولت مند ہوتا، نہ مضبوط، نہ باہر اس کا کچھ اثر ہوتا۔

چونکہ صنعت کی وجہ سے اتنے قدرتی ذخیرے اور اتنی قدرتی قوتیں دولت آفرین سرمایہ کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اسی لئے تابینی قوانین قومی دولت پر اتنا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ زرعی پیداوار پر روک ٹوک کرنے سے جو ہوتا ہے۔ اس کی طرح یہ مرفہ الحالی خالی دکھاوا نہیں ہوتی بلکہ حقیقت ہوتی ہے۔ ایک زرعی قوم جب صنعت قائم کرتی ہے تو گویا اپنی مردہ قدرتی قوتوں اور بے قدر قدرتی ذخیروں کو زندہ کرتی اور قدر و قیمت بخشتی ہے۔

پرانا مشاہدہ ہے کہ جوڑ ملانے سے آدمی اور جانور دونوں ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بہتر ہوجاتے ہیں۔ جیسے پودا انحطاط پذیر ہوجاتا ہے۔ اگر بیج ہمیشہ اسی زمین میں بویا جائے اسی طرح جب تھوڑے سے خاندان آپس میں ہی شادی بیاہ کریں تو انسان بھی

انحطاط پذیر ہوجاتا ہے۔ غالباً اسی قانون قدرت کے مشاہدہ کا نتیجہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا میں اکثر چھوٹے چھوٹے وحشی یا نیم وحشی قبیلے اپنی عورتیں دوسرے قبیلوں میں سے لاتے ہیں۔ اسی طرح یہ تجربہ بھی اسی قانون قدرت کی شہادت دیتا ہے کہ جن چھوٹی چھوٹی بلدی جمہوریتوں کی حکمران جماعت والے آپس ہی میں شادیاں کرتے ہیں ان کے خصائص یا تو رفتہ رفتہ ختم ہوجاتے ہیں یا صاف طور پر رو بہ انحطاط ہوجاتے ہیں۔ یہ بات ناقابل تردید ہے کہ تقریباً ہمیشہ دو مختلف نسلوں کے ملانے کا نتیجہ حسین اور تندرست اولاد ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ مشاہدہ تیسری اور چوتھی پشت تک سفید اور سیاہ نسلوں کی آمیزش کے معاملہ میں بھی صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس مشاہدہ سے سب سے زیادہ تصدیق اس بات کی ہوتی ہے۔ کہ جو قومیں وسیع پیمانہ پر نسلی میل جول کا نتیجہ ہیں وہ قوت ذہنی و خوبی سیرت، ذہانت و جسمانی طاقت اور حسن صورت کے اعتبار سے اور سب پر فوقیت رکھتی ہیں[1]۔

---

[1] لفنول شاروین گبر قدیم فارسی اصل کا ایک خالص و بے میل قبیلہ ہے اور یہ نہایت بدصورت، بھونڈے اور ساری منگولی اصل کے لوگوں کی طرح بدقطع لوگ ہوتے ہیں، حالانکہ فارسی شرفا جن میں صدیوں سے جارجی اور سرکیشی عورتوں کا میل ہوتا گیا ہے۔ وہ حسن و قوت میں نہایت ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر پریچارڈ کا بیان ہے کہ قد و قامت، قوت جسمانی اور حسن صورت کے لحاظ سے بالائی اسکاٹستان کے میل کلٹ زیرین اسکاٹستان کے لوگوں سے جو سکسنوں اور کلٹوں کے میل کا نتیجہ ہیں بہت پیچھے ہیں۔ (بقیہ عبارت صفحہ ۳۲۶ پر ملاحظہ ہو) ؞

ہمارے خیال میں اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ کچھ ضروری بات نہیں کہ انسان ایسے ہی کند، بے بس اور غبی ہوں جیسے کہ ٹوٹی پھوٹی زراعت کی حالت میں ہمیں چھوٹے چھوٹے گاؤں میں دکھائی دیتے ہیں، جہاں تھوڑے سے خاندان ہزارہا سال سے آپس میں شادیاں کرتے ہیں، جہاں صدیوں سے کسی ذہن میں یہ نہیں آیا کہ کوئی نئی قسم کا آلہ استعمال کرے، کوئی نیا طریق کار اختیار کرے، لباس کی تراش میں کوئی تبدیلی کرے، یا کسی نئے خیال کو قبول کرے۔ جہاں کمال یہ نہیں کہ اپنی ذہنی اور جسمانی قوتیں

(بقیہ صفحہ ۳۲۵) پلاس نے بھی اس قسم کا مشاہدہ روسی اور تاتاری قوم کے مخلوط اخلاف کے متعلق غیر مخلوط نسل سے مقابلہ کر کے بیان کیا ہے۔ ازآرا بیان کرتا ہے کہ پراگوئے کے دیسی باشندوں اور ہسپانیوں کی مخلوط نسل جانبین کے اجداد سے کہیں زیادہ حسین اور طاقت ور ہے نسلوں کے اختلاط کے فوائد صرف قوموں کے میل تک محدود نہیں، بلکہ اس کا اثر قوم کے مختلف قبیلوں کی آمیزش میں بھی رونما ہوتا ہے۔ مثلاً کریولی حبشی ذہنی و بدنی اعتبار سے ان خالص حبشیوں پر فوقیت رکھتے ہیں، جو افریقہ سے امریکہ آتے ہیں۔ کوہتی قبیلہ جو (امریکی) ہندی قبائل میں تنہا قبیلہ ہے جو ہمیشہ دوسرے قبیلوں میں سے عورتیں لیتا ہے ہر لحاظ سے دوسرے امریکی قبیلوں سے افضل ہے۔ اگر یہ قانون فطرت ہے تو اسی سے اس عروج و ترقی کی تشریح بھی ہوتی ہے جو قرون وسطیٰ میں شہروں کو اپنے قیام کے بہت جلد بعد نصیب ہوئی۔ امریکن قوم کی حسن و سیرت و قوت کی تشریح بھی اسی سے ہو سکتی ہے۔ (مصنّف)

سے کام لے کر اپنے لئے زیادہ سے زیادہ لذّت و آرام فراہم کیا جائے بلکہ کمال یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان سے اجتناب کیا جائے"!

صنعت سے اس صورتِ حال میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس سے ساری قوم کی نسلی ترقی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ زرعی آبادی کے اضافہ کا بڑا حصہ صنعت میں کھپ جاتا ہے اور مختلف حصّوں کی زرعی آبادی خود آپس میں نیز صنعتی آبادی کے ساتھ رشتہ کر کے مخلوط ہو جاتی ہے۔ اس لئے آبادی کا ذہنی، اخلاقی اور جسمانی جمود ٹوٹ جاتا ہے۔ صنعت اور پھر مختلف قوموں اور ملکوں سے تجارت، جس کا دارومدار صنعت پر ہے، ان سے جو باہمی ربط ضبط پیدا ہوتا ہے وہ ساری قوم میں، چھوٹی جماعتوں اور خاندانوں سب میں، نیا خون پہنچاتا رہتا ہے۔

جانوروں کی نسل کے بہتر بنانے میں بھی صنعت کا اثر کچھ کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر جگہ جہاں اون کی صنعت کو فروغ ہوا ہے بھیڑوں کی نسل بہت بہتر ہو گئی ہے جب اچھے گوشت کی مانگ بڑھتی ہے (جیسا کہ صنّاعوں کی کثرت سے اس کا بڑھنا لازمی ہے) تو زراعت والے کوشش کرتے ہیں کہ مویشیوں کی بہتر نسلیں لائیں۔ اچھے گھوڑوں کی مانگ جب بڑھتی ہے تو گھوڑوں کی نسلیں بہتر کی جاتی ہیں۔ اور پھر مویشی، گھوڑوں اور بھیڑوں کی وہ پہلی سی سوکھی مریل نسلیں دکھائی نہیں دیتیں جو اختلاطِ نسل نہ ہونے کے باعث گھٹیا زراعت کی حالت میں پیدا ہو جاتی ہیں اور اپنے بےکس اور بےبس مالکوں کے شایانِ حال منظر پیش کرتی رہتی ہیں۔

قوموں کے قوائے دولت آفرین پر جانوروں کی اچھی پر ویسی نسلوں اور خود دیسی نسلوں کو بہتر بنانے کا کتنا کچھ احسان نہیں ہے۔ اور اس ضمن میں ابھی کتنا کچھ اور کیا جا سکتا ہے ، یورپ کے تمام ریشم کے کیڑے ان چند انڈوں سے پیدا ہوئے ہیں جو قسطنطین کے عہد میں بعض یونانی راہب کھوکھلی چھڑیوں میں چھپا کر چین (جہاں سے اُن کی برآمد سخت ممنوع تھی) سے قسطنطنیہ لائے۔ فرانس کی ایک نہایت خوبصورت صنعت تبتی بکری کے ملک میں آنے سے پیدا ہوئی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اب تک جانور لانے اور ان کی نسلیں بہتر کرنے میں تعیش کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے اور عام جمہور کی خوشحالی پیش نظر نہیں رہی۔ سیاحوں نے ایشیا کے بعض ملکوں میں مویشیوں کی ایک نسل دیکھنا بیان کی ہے جس میں کھینچنے کی طاقت کے ساتھ ساتھ تیزی بھی ہوتی ہے ، ایسی کہ تقریباً گھوڑے کی طرح اُسے بھی سواری اور بگھی کے لیئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس جانور کی نسل سے یورپ کے چھوٹے اہل زراعت کو بے شمار فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ اور قوم کے کام کرنے والے طبقوں کی قوت دولت آفرینی ، ان کے آرام اور کھانے پینے کی چیزوں میں اس کی وجہ سے کتنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

جانوروں کی نئی نسلیں چلانے یا پرانی نسلوں کو بہتر کرنے سے کہیں زیادہ نئے پودوں کے پھیلانے اور بہتر کرنے سے انسان کی قوت دولت آفرین میں اضافہ ہوتا ہے۔

اگر ہم ان اصلی پودوں کو جیسے کہ وہ دھرتی کے پیٹ سے پیدا ہوئے لیکر اُن کی ترقی یافتہ شکل سے مقابلہ کریں تو بات بالکل صاف سامنے آجاتی ہے۔ غلّہ اور پھل، ترکاریوں اور تیل کے پودوں کی اصلی حالت، شکل صورت اور مادہ کے لحاظ سے اپنے ترقی یافتہ پودے سے کس قدر مختلف ہے۔ ان سے کتنی کھانے پینے کی چیزیں، کیسی لذّت، کتنے آرام اور انسانی قوت کے استعمال سے کتنے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ آلو، چقندر، اور دوسری جڑوں کی کاشت نے بہتر کھاد اور مشینوں کی مدد سے ایشیائی قوموں کے مقابلہ میں زراعت کی پیداوار کو دس گنا کر دیا ہے۔

علم نے تو نئے پودوں کی دریافت اور ان کی ترقی کے بارہ میں بہت کچھ کیا ہے لیکن حکومتوں نے اس پر وہ توجہ نہیں کی جس کی کہ یہ چیز اغراض معاشی کے اعتبار سے مستحق تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حال ہی میں شمالی امریکہ کے میدانوں میں ایک گھاس ملی ہے جو خراب سے خراب زمین سے اس سے زیادہ حاصل ملتا ہے۔ جتنا کہ موجودہ چارہ کی فصلیں بہتر سے بہتر زمین سے دیتی ہیں۔ ظن غالب یہ ہے کہ امریکہ، ایشیاء، افریقہ اور آسٹریلیا کے جنگلی علاقوں میں بہتیرے ایسے پودے بیکار اُگتے ہونگے جنہیں منتقل کر کے اور ترقی دے کر منطقہ معتدلہ کے باشندوں کی خوشحالی میں بے شمار اضافہ کیا جا سکیگا۔

اور ظاہر ہے کہ جانوروں اور پودوں کے منتقل کرنے اور ترقی دینے سے اور ان انکشافات سے جو اس ضمن میں ہوں، نیز تمام دوسری ترقیوں، اختراعوں اور انکشافوں سے بیشتر منطقہ معتدلہ کے ممالک کو اور ان میں بھی سب سے زیادہ صنعتی ممالک ہی کو فائدہ پہنچے گا۔

باب ۱۹

قوم کی صنعتی قوتیں اور آلاتی قوتیں (یعنی مادی سرمایہ)

قوم کی دولت آفرین قوت یا تو افراد کی ذہنی وجسمانی قوتوں سے پیدا ہوتی ہے، یا جماعتی، بلدی اور سیاسی حالات وافادہ گاہوں سے، یا ان قدرتی وسائل سے جو اُس کی دسترس میں ہیں، یا ان آلات سے جو اُس کے قبضہ میں ہیں، یعنے سابقہ ذہنی اور جسمانی محنت کے مادی ثمرات سے (گویا زراعت، صنعت وتجارت کے مادی سرمایہ سے)

پچھلے دو ابواب میں ہم نے اثر سے بحث کی ہے جو قومی دولت آفرینی کے پہلے تین ذریعوں پر صنعت سے پڑتا ہے، اب اس باب میں اور اس کے بعد کے باب میں اس اثر کی توضیح کرینگے جو صنعت سے آخر الذکر یعنے نمبرے ذریعہ پڑتا ہے۔

ہم جس چیز کو قوت آلات کہتے ہیں مذہب رائج اسے سرمایہ سے موسوم کرتا ہے۔

اس میں تو کوئی بات نہیں کہ ایک چیز کو کس نام سے موسوم کیا جائے، البتہ یہ ضروری ہے، اور خصوصاً حکمی مباحث میں کہ جب لفظ چن لیا جائے تو اس سے وہی ایک معنی لئے جائیں، نہ کم نہ زیادہ۔ جب ایک ہی چیز کی مختلف انواع کا ذکر ہو تو پھر تفریق کی

ضرورت ہوتی ہے مثلاً مذہب رائج لفظ سرمایہ میں دولت آفرینی کے صرف مادی وسائل ہی نہیں، بلکہ ذہنی اور اجتماعی وسائل کو بھی شامل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ جہاں سرمایہ کا ذکر آئے یہ بتانا چاہیئے کہ آیا دولت آفرینی کے مادی آلات مراد ہیں، یا ذہنی سرمایہ، وہ اخلاقی اور جسمانی قوتیں جو شخصیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں، یا وہ جنہیں افراد جماعتی، ملکی اور سیاسی حالات سے حاصل کرتے ہیں جس جگہ یہ تفریق ضروری ہو وہاں اس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دلیل غلط ہو جاتی ہے۔ یا غلط دلیل کی پردہ پوشی ہوتی ہے۔ اس وقت تو چونکہ ہماری غرض کسی اصطلاح کا بنانا نہیں ہے بلکہ ایک غیر صحیح اور ناکافی اصطلاح کے پردہ میں جو غلطیاں ہوتی ہیں۔ ان کا اظہار مقصود ہے، اس لئے ہم لفظ سرمایہ کو قبول کئے لیتے ہیں، لیکن ذہنی اور مادی سرمایہ میں، زراعت صنعت و تجارت کے مادی سرمایہ میں، اور شخصی اور قومی سرمایہ میں فرق ضرور کرینگے۔

اس عام لفظ "سرمایہ" کو استعمال کرکے آدم سمتھ نے تجارت کی تامینی سیاست کے خلاف مندرجہ ذیل دلیل دی ہے، جسے اس کے تمام چیلوں نے آج تک اختیار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "بے شک ان تامینی کارروائیوں سے ایک ملک خاص قسم کی صنعتیں اس سے پہلے قائم کر لیتا ہے جیسے کہ بلا ان کے کر سکتا۔ اور یہ خاص صنعتیں تھوڑے عرصہ میں اس قابل بھی ہو جاتی ہیں کہ پردیس جیسی یا اس سے بھی سستی چیزیں تیار کر دیں۔ لیکن ہر چند اس طریقہ سے قومی محنت اس راہ پر پہلے پڑ لیتی ہے، جس پر بعد کو خود آ جاتی، تاہم یہ نتیجہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ ان کارروائیوں سے صنعت یا جماعتی

آمدنی کی کل میزان بھی بڑھائی جاسکتی ہے۔ جماعت کی صنعت اسی نسبت سے بڑھائی جاسکتی ہے، جس نسبت سے اُس کا سرمایہ بڑھے، اور جماعت کا سرمایہ بس بقدر اس بچت کے بڑھ سکتا ہے، جو وہ رفتہ رفتہ اپنی آمدنی میں سے کرے، لیکن جن کارروائیوں کا ذکر اوپر ہوا، یعنے تامینی کارروائیاں، ان کا بلاواسطہ نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ جماعت کی آمدنی کم ہوجاتی ہے۔ یقینی بات ہے کہ جو چیز آمدنی کو گھٹائے وہ سرمایہ کو اس سے زیادہ تیزی سے نہیں بڑھا سکتی جیسے کہ وہ خود صنعت کو بالکل آزاد چھوڑ دینے کی[1] حالت میں بڑھتا۔"

اِس دلیل کے ثبوت میں مذہب رائج کا بانی اسکاٹستان میں کاشت انگور کی حماقت کی مثال پیش کرتا ہے، جس کی تردید ہم خود گزشتہ باب میں کر چکے ہیں اسی باب میں وہ کہتا ہے کہ قوم کی سالانہ آمدنی ان اشیاء کی قدر مبادلہ کے سوا اور کچھ نہیں جسے قوم کی صنعت نے سال بھر میں پیدا کیا ہے۔

یہ دلیل تامینی سیاست کے خلاف مذہب رائج کا خاص ثبوت ہے۔ اسمیں تسلیم کیا گیا ہے کہ تامینی کارروائیوں سے صنعتیں قائم ہوسکتی ہیں، اور پردیس کی بہ نسبت دیس میں اس سے سستی چیزیں تیار ہوسکتی ہیں، لیکن دعویٰ یہ ہے کہ ان کارروائیوں کا بلاواسطہ نتیجہ یہ ہے کہ جماعتی آمدنی (یعنے ان اشیاء کی قدر مبادلہ جو قومی صنعت نے سال بھر میں پیدا کی ہیں)، گھٹ جاتی ہیں، اِس طرح قوم میں سرمایہ حاصل کرنے کی قوت کم ہوجاتی

[1] Wealth of Nations کتاب ۴ ۔ باب ۲ "

ہے۔ کیونکہ سرمایہ اس بچت سے پیدا ہوتا ہے جو قوم اپنی سالانہ آمدنی میں سے کرتی ہے سرمایہ کی میزان سے قومی صنعت کی میزان متعین ہوتی ہے۔ اور مؤخر الذکر اول الذکر ہی کی نسبت سے بڑھ سکتی ہے۔ لہٰذا تامینی کارروائیوں سے ایسی صنعت کو ابھار کر جو اگر آزاد چھوڑ دی جاتی تو خود بخود پیدا ہو جاتی، ملک خود اپنی صنعت ہی کو کمزور کرتا ہے۔

اس دلیل کی مخالفت میں پہلے تو یہ بات کہنی ہے کہ آدم سمتھ نے یہاں لفظ سرمایہ کو اس معنے میں لیا ہے جس میں کہ بندھی ہوئی آمدنی حاصل کرنے والے، یا تاجر لوگ اپنے بہی کھاتوں میں، یا اپنے میزانیوں میں استعمال کرتے ہیں یعنی اقدار مبادلہ کی کل میزان جو اس آمدنی سے جدا چیز ہے، جو ان اقدار مبادلہ سے حاصل ہوتی ہے۔

وہ بھول گیا ہے کہ خود اس نے "سرمایہ" کی تعریف میں دولت پیدا کرنے والوں کی ذہنی، اور جسمانی صلاحیتوں کو بھی شامل کیا ہے۔

اس کا یہ دعوےٰ غلط ہے کہ قوم کی آمدنی کا انحصار صرف اس کے مادی سرمایہ کی میزان پر ہے، خود اس کی تصنیف میں اس کے خلاف ہزاروں ثبوت ملتے ہیں، یعنے اس کے ثبوت کہ بس آمدنی پر ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں، اور جماعتی اور سیاسی ترقیوں کا (خصوصاً مکمل تقسیم کار اور قوم کے قوائے دولت آفرین کے اتحاد کا) بہت اثر ہوتا ہے۔ اور اگر تامینی کارروائیوں سے کچھ عرصہ کے لیئے مادی اشیاء کی قربانی بھی کرنی پڑے تو اس قربانی کا بدل ان طاقتوں، صلاحیتوں اور اقدار مبادلہ سے سو گنا ہو جاتا ہے جو اس سے پیدا ہوتی ہیں؛ اور اس طرح اُن کو قوم کا نہایت مفید اور

نفع بخش سرمایہ سمجھنا چاہیئے۔

وہ بھول گیا ہے کہ قوم میں اپنے مادی سرمایہ کو بڑھانے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ زیادہ تر اس پر منحصر ہے کہ وہ غیر مستعمل قدرتی قوتوں کو مادی سرمایہ اور آمدنی دینے والے آلات کی شکل میں تبدیل کر سکے، اور یہ بھی بھول گیا ہے کہ زرعی قوموں میں قدرتی قوتوں کا بڑا حصہ اس وقت تک بیکار اور مُردہ پڑا رہتا ہے جب تک کہ صنعت ان میں جان نہ ڈالے۔ اُس نے اِس اثر کا بالکل لحاظ نہیں کیا ہے جو صنعت سے خارجی، داخلی تجارت پر، قوم کی تہذیب اور قوت پر، اور اس کے استقلال و خود مختاری پر، نیز مادی اشیاء پیدا کرنے کی اس صلاحیت پر پڑتا ہے، جو اس کی وجہ سے رُونما ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر اُس نے اِس بات پر دھیان نہیں کیا کہ انگریزوں نے نوآبادیات کے ذریعہ کتنا سرمایہ حاصل کر لیا ہے (مارٹن نے اس کا تخمینہ ½ ۲ ملیارڈ پونڈ سے زائد کیا ہے)۔

وہ جس نے دوسری جگہ اس قدر وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ درمیانی تجارت میں لگا ہوا سرمایہ کسی خاص قوم کا نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک کہ وہ اس کی زمین کا جز نہ بن گیا ہو، وہ اس جگہ اس بات کا ذرا خیال نہیں کرتا کہ اس سرمایہ کو جزو زمین بنانے کے لیئے بہترین صورت یہی ہے کہ ملک کی اندرونی صنعت کو فروغ دیا جائے۔ اس نے اس بات کو بھی پیش نظر نہیں رکھا کہ دیسی صنعت کے فروغ دینے سے بیرونی

کے ذہنی و مادی سرمایہ کی بڑی مقدار ملک کے اندر کھنچ آتی ہے۔

وہ یہ غلط دعوےٰ کرتا ہے کہ صنعتیں خود فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہیں، حالانکہ ہر قوم میں سیاسی قوت بیچ میں پڑ کر اس فطری رجحان کو ایک مصنوعی شکل دیتی اور اسے اپنے خاص فوائد کے مطابق بناتی ہے۔

اس نے اپنی دلیل کی جو اصولاً بالکل غلط ہے اور صرف ایک ذومعنی لفظ پر موقوف ہے ویسی ہی غلط مثال دے کر تشریح کی ہے یعنے یہ کہکر کہ اسکاٹستان میں مصنوعی طریقوں سے انگور پیدا کرنا حماقت ہے، وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ مصنوعی طریقوں سے صنعت کا قیام بھی حماقت ہے۔

وہ قوم میں سرمایہ جمع ہونے کے عمل کو بس اس بندھی ہوئی آمدنی والے شخص پر قیاس کرتا ہے جس کی آمدنی کا انحصار اس کے سرمایہ کی قدر پر ہے، اور جو آمدنی کو بس اسی طرح بڑھا سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ بچا کر سرمایہ میں شامل کر دے۔

وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ بچانے کا نظریہ ہر چند ایک تاجر کے بہی کھاتہ کیلئے ٹھیک سہی، لیکن اگر قوم اس پر چلے تو اس کا نتیجہ افلاس، بربریت، بے بسی اور قومی انتشار ہوگا۔ جہاں ہر شخص اتنا بچائے جتنا بچا سکتا ہے اور اتنی چیزوں سے پرہیز کرے جتنی سے پرہیز ممکن ہے تو پھر دولت پیدا کرنے کے لئے تو کوئی محرک ہی نہ رہے اگر ہر شخص بس مادی اقدار مبادلہ کے انبار لگانے کی فکر میں پڑ جائے تو دولت آفرینی کے لیے جس ذہنی قوت کی ضرورت ہے وہ ختم ہو جائے۔ ان پاگل، کنجوسوں کی قوم تو

اخراجاتِ جنگ کے ڈر سے قومی مدافعت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور جب ان کی ساری پونجی پر ولیسی دباؤ کے بھینٹ چڑھ جائے۔ اس وقت ان کی سمجھ میں آئے کہ قوموں کی دولت ان طریقوں سے حاصل نہیں ہوا کرتی جن سے بندھی ہوئی آمدنی والے لوگ اسے حاصل کیا کرتے ہیں۔

خود بندھی ہوئی آمدنی والا آدمی اپنے خاندان کے سردار کی حیثیت سے اقدار مبادلہ کے تاجرانہ نظریہ عمل نہیں کرتا بلکہ ایک دوسرے نظریہ پر۔ اسے اپنے وارثوں کی تعلیم پر کم سے کم اتنی اقدار مبادلہ صرف کرنی پڑتی ہیں کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ جو آمدنی ان کے حصہ آئے اس کا معقول انتظام تو کرسکیں۔

قوم کا مادی سرمایہ بندھی ہوئی آمدنی والے شخص کی طرح صرف بچت سے پیدا نہیں ہوتا، وہ تو اس طریق سے پیدا ہوتا ہے جس سے تمام دولت آفریں قوتیں پیدا ہوتی ہیں، یعنی قوم کے ذہنی و مادی سرمایہ کے باہمی عمل اور ردِّ عمل سے اور زراعتی اور صنعتی و تجارتی سرمایہ کے باہمی تعلّق سے۔

قوم کے مادی سرمایہ کا بڑھنا منحصر ہے اس کے ذہنی سرمایہ کے بڑھنے پر اور ذہنی سرمایہ کا بڑھنا منحصر ہے مادی سرمایہ کے بڑھنے پر، زراعت کے مادی سرمایہ کا پیدا ہونا منحصر ہے صنعت کے مادی سرمایہ کے پیدا ہونے پر اور صنعتی سرمایہ کا پیدا ہونا زراعتی سرمایہ پر، ان کے بیچ میں تجارت کا مادی سرمایہ ہوتا ہے جو ہر جگہ ان دونوں کی مدد کرتا ہے اور ان میں تعلّق و تناسب پیدا کرتا ہے۔

ابتدائی حالت میں، یعنے شکار اور ماہی گیری کے عہد میں قدرت تقریباً سب کچھ خود دیتی ہے، سرمایہ بمنزلہ صفر کے ہوتا ہے۔ تجارت خارجہ دوسرے کو بڑھاتی ہے اور پہلے کی دولت آفرینی کو برباد کرتی ہے (اسلحہ، بارود، سیسہ، کے ذریعہ) یہ بچانے کا نظریہ شکاری کو راس نہیں آسکتا۔ وہ یا تو تباہ ہو جائے یا چرواہا بنے۔

چرواہے والی منزل میں مادی سرمایہ تیزی سے بڑھتا ہے لیکن بس اسی حد تک کہ قدرت مویشی کے لئے مفت غذا دیتی رہے، لیکن مویشیوں میں اور غذا میں اضافہ کے ساتھ ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک طرف مویشی اور چراگاہیں منقسم ہوتی جاتی ہیں، دوسری طرف خارجی تجارت صرف کی چاٹ ڈالتی ہے۔ اس چرواہوں کی قوم کے سامنے اس بچت کے نظریہ کی تلقین بے سود ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ یا تو افلاس میں مبتلا ہو جائے، یا زراعت اختیار کرے۔

اب زرعی قوم کے لئے قدرت کی مُردہ قوتوں کے استعمال کی وجہ سے دولت کمانے کا ایک وسیع میدان کھل جاتا ہے، لیکن وہ بھی محدود ہی ہوتا ہے۔

خود اپنے لئے تو زراعت والا کچھ کھانے کی چیزیں بچا سکتا ہے یا اپنے کھیت درست کر سکتا ہے، اپنے مویشی بڑھا سکتا ہے، لیکن کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ آبادی بھی بڑھتی ہے، مادی سرمایہ یعنے کھیت اور مویشی جوں جوں بالترتیب زیادہ زرخیز اور زیادہ کثیر التعداد ہوتے جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے اُن کی تقسیم بھی تو زیادہ افراد میں ہوتی ہے، لیکن محنت سے کھیت کا رقبہ تو بڑھ نہیں سکتا۔ اور چونکہ

ذرائع آمد ورفت کی کمی ہوتی ہے (اور ہم سابقہ باب میں بتا چکے ہیں کہ اس عہد میں لین دین کی کمی کیوجہ سے ان کا غیر مکمل ہونا ضروری ہے) لہذا زمینوں کو ان کی قدرتی حالت کے مطابق استعمال نہیں کیا جاتا۔ چونکہ محض زرعی قوم میں بڑی حد تک وہ آلات اور خیالات، محرکات اور وہ قوت اور سماجی ترقی نہیں ہوتی جو قوم میں صنعت اور اس کے لازمہ تجارت، سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیئے خالص زرعی قوم جلد اس مقام پر پہنچ جاتی ہے، جہاں زراعت کا مادی سرمایہ اضافہ آبادی کے ساتھ ساتھ نہیں بڑھ سکتا۔ اور ہر چند قوم کا مجموعی سرمایہ بڑھتا ہی کیوں نہ رہے افراد میں روز بروز افلاس بڑھتا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں قوم کی سب سے اہم پیداوار اس کے آدمی ہوتے ہیں کہ انہیں جب ملک میں کافی گزارہ نہیں ملتا تو یہ دوسرے ملکوں کو ہجرت کر جاتے ہیں۔ ایسے ملک کو مذہب رائج کے اس خیال سے کیا تسکین حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان گویا سرمایہ کا ایک انبار ہے۔ کیونکہ آدمیوں کی برآمد میں کوئی بھیری کا مال تو ملتا نہیں بلکہ آلات، اوزار وغیرہ کی شکل میں اقدار مادی کی بڑی مقداریں الٹی ہاتھ سے یوں جاتی ہیں کہ دولت آفرینی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

ظاہر ہے کہ اگر قوم میں تقسیم کار نے اچھی ترقی نہیں کی ہے تو مادی سرمایہ میں اضافہ نہ تو محنت سے ممکن ہے نہ کفایت شعاری سے (یعنے افراد کی مادی ثروت میں اضافہ)۔

یہ ضرور ہے کہ زرعی ملک شاذ ہی کوئی ایسا ہوتا ہے کہ جس … … میں خارجی تجارت بالکل ہی نہ ہو، اور یہ بھی سچ ہے کہ تجارت خارجہ، جہاں تک … روپیہ میں اضافہ کا تعلق ہے، ایک حد تک دیسی صنعت کی قائم مقامی کرتی ہے، کیونکہ … اپنے ملک کے اہل زراعت کو پردیس کے اہل صنعت سے ملا دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بات نہایت جزوی طور پر ہوتی ہے، اور بہت نامکمل طریق سے۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ یہ تعلق صرف خاص خاص پیداواروں کی بابت ہوتا ہے، اور صرف ان زمینوں کو متاثر کرتا ہے جو یا تو سمندر کے کنارہ پر ہیں، یا جہاز رانی کے قابل دریاؤں سے ملحق ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ تعلق دائمی نہیں ہوتا۔ اور جنگ اور تجارتی اتار چڑھاؤ سے، مختلف تجارتی کارروائیوں سے، اچھی فصلوں، یا پردیسی مال کی درآمد سے، ٹوٹ بھی جاتا ہے۔

زراعت کے سرمایہ میں بڑے پیمانہ پر باضابطہ اور بے حساب اضافہ تو اُس وقت ہوتا ہے جبکہ زرعی قوت کے ساتھ ساتھ صنعتی قوت بھی ترقی کرے۔

کسی قوم کے سرمایہ مادی کا بہت بڑا حصہ ہمیشہ زمین سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہر قوم میں زمین کی قیمت، دیہی اور شہری مکانات، چھوٹے بڑے کارخانوں اور نہروں کانوں وغیرہ کی قیمت قوم کے سارے سرمایہ کا ¼ سے ½ تک ہوتی ہے، چنانچہ ہم یہ قاعدہ تسلیم کر سکتے ہیں، کہ ہر چیز جو غیر منقولہ ملک کو بڑھاتی ہے وہ قوم کے مادی سرمایہ میں اضافہ کرتی ہے، ہر چیز جو اس سے گھٹاتی ہے اس کے مادی سرمایہ میں کمی …

باعث ہے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک سی زرخیزی والی زمینوں میں سے اگر بعض کسی چھوٹے سے شہر کے قریب ہیں تو ان کی قیمت ان زمینوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو کسی دور افتادہ مقام پر ہوں، پھر جو زمینیں کسی بڑے شہر کے قریب ہوں تو وہ ان سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ اور صنعتی قوموں کے ہاں یہ قیمت زرعی اقوام سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ شہروں کے مکانوں اور صنعتی عمارتوں اور عمارتوں کی زمینوں کی قیمت اسی نسبت سے گھٹتی بڑھتی ہے، جس سے کہ شہروں کا لین دین زراعت والوں سے بڑھتا یا گھٹتا ہے یا جس نسبت سے ان اہل زراعت کی خوش حالی میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زرعی سرمایہ صنعتی سرمایہ کے بڑھنے سے بڑھتا ہے، اور صنعتی سرمایہ زرعی سرمایہ کے بڑھنے سے۔

یہ باہمی عمل اور ردعمل صنعت کی طرف سے اس وقت بہت قوی ہوتا ہے جبکہ ملک زرعی حالت سے صنعتی حالت میں بدل رہا ہو، کیونکہ جیسے سرمایہ کا وہ اضافہ جو محض شکار کی منزل سے گلہ بانی میں تبدیلی کے وقت اس طرح رونما ہوتا ہے کہ گلے جلد بڑھ جاتے ہیں، اور جس طرح گلہ بانی کی منزل سے زراعت میں تبدیلی کے وقت سرمایہ کا اضافہ زمین اور فاضل پیداوار کے تیزی سے بڑھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح زراعت سے صنعت میں تبدیلی کے وقت سرمایہ کا اضافہ ان قدروں اور قوتوں کے بڑھنے سے رونما ہوتا ہے جو صنعت کے قائم کرنے کے کام

میں آتی ہیں۔ کیونکہ اس طریقہ سے بہت سی ذہنی اور قدرتی قوتیں جو پہلے غیر مستعمل پڑی تھیں، وہ ذہنی و مادی سرمایہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ مادی سرمایہ کے جمع ہونے میں حارج ہونا کجا صنعتوں کے قیام سے تو قوم کو موقع ملتا ہے کہ اپنی زراعت کی بچت کو معاشی طریق پر کام میں لگا سکے اور سچ یہ ہے کہ اس طرح جا کر اسے زراعت میں بچت کی ترغیب ہوتی ہے۔

شمالی امریکہ کی قانون ساز مجلس میں بار ہا کہا گیا ہے کہ بکری نہ ہونے کی وجہ سے غلہ کھیتوں ہی میں پڑا سڑ جاتا ہے۔ کیونکہ جو قیمت ملتی ہے اس سے فصل کاٹنے کے مصارف بھی پورے نہیں ہوتے۔ ہنگری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں کے زراعت والے فراوانی میں دب کر مرے جاتے ہیں۔ حالانکہ مصنوعات وہاں انگلستان کے مقابلہ میں تگنی چوگنی مہنگی ہیں۔ خود جرمنی میں بھی ابھی ایسے زمانہ کی یاد تازہ ہے گویا زرعی ریاستوں میں تمام فاضل زرعی پیداوار مادی سرمایہ نہیں بن جاتی۔ یہ تو صنعت کی وجہ سے جمع کی جاتی ہے تب کہیں تجارتی سرمایہ بنتی ہے، اور جب صنعت والوں کے ہاتھ بک جاتی ہے تو صنعتی سرمایہ کی حیثیت اختیار کرتی ہے زراعت والے کے ہاتھ میں جو چیز بے کار ذخیرہ ہوتی وہ اہل صنعت کے ہاتھ میں دولت آفریں سرمایہ بن جاتی ہے، اور اس کے برعکس برعکس۔

دولت آفرینی ہی سے صرف دولت ممکن ہوتا ہے، اور صرف ہی سے دولت آفرینی کی ترغیب ہوتی ہے محض زراعت والی قوم اپنے صرف دولت میں غیر ملکوں

کے حالات کی پابند ہوتی ہے۔ اس لیئے اگر حالات موافق نہیں ہوتے تو دولت آفرینی کی وہ شاخ ختم ہو جاتی ہے جو اس خواہش صرف سے پیدا ہوتی۔ لیکن جو قوم اپنے علاقہ میں صنعت اور زراعت دونوں کو ملا لے اس میں ہمیشہ یہ باہمی ترغیب موجود رہتی ہے اور اسی لیئے اس کے یہاں دولت آفرینی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور کاروبار کے ان دونوں شعبوں میں سرمایہ بڑھتا جاتا ہے۔

ہم نے اوپر جو وجوہ بیان کیئے ہیں۔ اُن کی بنا پر چونکہ زرعی صنعتی قوم محض زرعی قوم سے کہیں زیادہ مادی سرمایہ رکھتی ہے (اور ظاہرہ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے) اس لئے اس کے ہاں شرح سود ہمیشہ کم ہوتی ہے اور سرمایہ آسان شرائط پر مل سکتا ہے۔ اس لیئے وہ زرعی قوم کے نئے ابھرتے ہوئے کارخانوں سے کامیابی کیساتھ مقابلہ کر سکتی ہے، چنانچہ زرعی قوم کے یہاں برابر اس کی مصنوعات جاتی ہیں نتیجہ یہ کہ صنعتی قوم کے مقابلہ میں یہ قوم روز بروز زیادہ مقروض ہوتی جاتی ہے اور اس کے بازار میں اجناس خام، مصنوعات، اور زر کی قیمت میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے جہاں اس زرعی قوم کے اخلاق اور اقتصاد پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہاں مادی سرمایہ کے جمع کرنے پر بھی اس سے کچھ کم بُرا اثر نہیں پڑتا۔

مذہب رائج اصل قائم اور اصل دائر میں فرق کرتا ہے، اور عجیب طرح سے اس میں بہت سی وہ چیزیں شامل کر لیتا ہے، جو دور میں رہتی ہیں لیکن اس تفریق سے کوئی عملی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ صرف ایک مسئلہ مقامات میں اس تفریق سے

کوئی فائدہ ہو سکتا تھا اور اسی پر سے یہ مذہب خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ مادی اور ذہنی سرمایہ دونوں کے دونوں زیادہ تر یا تو زراعت سے یا صنعت سے یا تجارت سے یا ان کی شاخوں سے اور اکثر مخصوص مقامات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ پھل کے درختوں کو اگر کاٹ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ صنعت والے کے لئے، جو ان کی لکڑی کی چیزیں بنائے گا، ان کی وہ قیمت نہیں جو باغبان کے لئے تھی۔ جو ان سے پھل پیدا کرتا تھا۔ بھیڑوں کے گلے کو اگر ذبح کر ڈالا جائے، جیسا کہ جرمنی اور امریکہ میں بارہا ہوا ہے، تو ان کی وہ قدر نہیں رہتی جو کہ اُون کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے تھی۔ جن پہاڑیوں پر انگور کی کاشت ہوتی ہے انہیں معمولی کھیتوں کی طرح استعمال کیا جائے تو ان کی پہلی قدر ضائع ہو جاتی ہے۔ جہازوں کی جو قدر بار برداری کے لئے ہے اگر انہیں جلانے یا مکان بنانے کی لکڑی کی طرح استعمال کیجئے، تو وہ اس سے کہیں کم ہو جاتی ہے، جب سوت کاتنے کی صنعت ہی زوال پذیر ہو تو کارخانوں کی عمارتیں، پانی کی قوت اور مشینوں سے کوئی کیا کام لے۔

اسی طرح افراد بھی جب اپنی جگہ سے ہٹا دیئے جاتے ہیں تو ان کی مشق، عادت اور ہنرمندی کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ مذہب رائج ان تمام چیزوں کو سرمایہ کے عام نام سے موسوم کرتا ہے اور اپنی اس اصطلاح کے زور پر اسے ایک شاخ سے دوسری شاخ میں لگا دیتا ہے، مثلاً سے انگلستان والوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اپنی صنعتی دولت کو زراعت میں لگائیں، لیکن یہ معجزہ کس طرح ظہور میں

آئے؟ اس کی تفصیل اس نے نہیں بتائی اور آج تک یہ ترکیب مدبرینِ انگلستان کے لئے راز سربستہ ہی رہی۔ ظاہر ہے کہ یہاں تسے نے شخصی اور قومی سرمایہ کو ایک سمجھ لیا ہے، ایک صناع یا تاجر اپنے سرمایہ کو صنعت یا تجارت سے یوں نکال سکتا ہے کہ اپنے کارخانوں اور جہازوں کو بیچ ڈالے اور جو روپیہ ملے اس سے زمین خرید لے لیکن پوری قوم تو اس عمل کو اسی وقت کر سکتی ہے کہ اپنے ذہنی و مادی سرمایہ کے بہت بڑے حصہ کو قربان کر ڈالے، مذہب رائج، جو ایسی صاف صاف باتوں کو اپنی بناوٹ سے اتنا تاریک کر دیتا ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے، یعنی اگر چیزوں کو اُن کا ٹھیک ٹھیک نام دے دیا جائے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ قوم کی دولت آفریں قوتوں کو ایک کام سے دوسرے میں لگانے میں بہت سی مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور یہ بات ہمیشہ "آزاد تجارت" کے موافق نہیں پڑتی بلکہ اکثر اس سے قومی تامین ہی کے اصول کی ہی تائید ہوتی ہے۔

باب ۲۰

صنعت اور زراعت

دیسی مصنوعات کی موافقت میں جو تاہینی محصول لگائے جاتے ہیں۔ان سے اگر مصنوعات کے استعمال کرنے والوں کو نقصان ہو اور صرف صنعت والے مالامال ہوں تو اس نقصان کا بوجھ سب سے زیادہ زمینداروں اور کاشتکاروں پر پڑے گا کہ ان استعمال کرنے والوں میں سب سے زیادہ تعداد انہی کی ہوتی ہیں لیکن یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اس طبقہ کو صنعت کے فروغ سے بہ نسبت خود صنعت والوں کے بہت زیادہ فائدے ہوتے ہیں۔اس لئے کہ صنعتوں کی وجہ سے طرح طرح کی اور بہت سی زرعی پیداوار کی مانگ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس پیداوار کی قدر مبادلہ بڑھ جاتی ہے اور کاشتکار اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی زمین اور محنت کو بہتر طور پر استعمال کرے۔اس کی وجہ سے زمین کا لگان بڑھتا ہے، نفع اور مزدوری بڑھتی ہے اور لگان اور سرمایہ کے بڑھنے سے زمین کی قدر مبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

جائداد غیر منقولہ کی قدر مبادلہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ لگان کو سرمایہ میں

تحویل کر لیا جاتا ہے۔ اس طرف ایک تو لگان کی کمیت اور قدر کا اثر پڑتا ہے دوسری طرف مادی اور ذہنی سرمایہ کی اس مقدار کا جو قوم کے پاس موجود ہو۔

ہر انفرادی اور اجتماعی تکمیل، قوم کی دولت آفرینی میں ہر اضافہ، خصوصًا قوتِ صنعتی میں ہر اضافہ لگان کی مقدار کو بڑھاتا ہے، اگرچہ کل پیداوار سے اُس کی نسبت مقابلتًا کم ہو جاتی ہو۔ ایک کم ترقی یافتہ اور کم آباد ملک میں مثلاً پولینڈ میں، لگان کل پیداوار کا آدھا یا تہائی حصّہ ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ، آباد، اور مالدار قوموں میں، مثلاً انگلستان میں صرف چوتھائی یا پانچواں حصّہ۔ اگرچہ اس کم تر حصّہ کی مجموعی مقدار اس زیادہ حصّہ سے کہیں افزوں ہوتی ہے خصوصًا اگر اس کا حساب زر پر لگایا جائے اور اور بھی زیادہ اگر مصنوعات میں کیا جائے۔ اس لئے کہ انگلستان کی اوسط پیداوار ۲۵ بُشل کا پانچواں حصّہ ۵ بُشل ہوتا ہے اور پولینڈ کی اوسط پیداوار ۹ بُشل کا ایک تہائی حصہ ۳ بُشل۔ پھر اُن ۵ بُشل کی قدر انگلستان میں اوسطًا ۲۵ تا ۳۰ شلنگ اور ان تین بُشل کی قدر اندرون پولینڈ میں زیادہ سے زیادہ ۸ تا ۹ شلنگ ہوتی ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ مصنوعات کی قیمت انگلستان میں بہ تناسب پولینڈ کے کوئی آدھی ہو گی۔ لہٰذا انگریز زمیندار اپنے ۳۰ شلنگ لگان سے ۶۰ گز کپڑا خرید سکتا ہے اور پولینڈ کا زمیندار اپنے ۹ شلنگ لگان سے صرف ۹ گز۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز زمیندار جو کل حاصل کا پانچواں حصّہ پاتا ہے بہ نسبت پولینڈ کے کسان کے جسے کل حاصل کا تہائی ملتا ہے لگان کے اعتبار سے تگنا اور مصنوعات کے خرچ کے اعتبار سے پانچ گنا فائدہ میں رہا۔ یہ بات کہ انگلستان میں پٹہ دار اور زرعی

مزدور مصنوعات کے استعمال کرنے والوں کی حیثیت سے بہ نسبت پولینڈ کے کہیں بہتر حال میں ہونے چاہئیں۔ اس سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ انگلستان میں ۲۵ بُشل کے حاصل میں سے ۲۰ بُشل بیج، جتائی بوائی، مزدوری اور منافع میں نکل جاتے ہیں اور اس میں سے اگر آدھا یعنی ۱۰ بُشل آخری دو مدوں کے حساب میں لگایا جائے تو اوسطاً کوئی ۲۰ شلنگ یا ۲۰ گز کپڑا (در ۲ شلنگ فی گز) انکے حصّہ میں آتا ہے۔ حالانکہ پولینڈ میں ۹ بُشل کے حاصل میں سے صرف ۶ بُشل بیج، جتائی بوائی، مزدوری اور منافع پر پڑتے ہیں جن میں سے نصف یعنی ۳ بُشل آخری دو مدوں کے حساب میں لگائے جائیں تو اُن میں ۱۰ سے ۱۲ شلنگ یا ۲ ½ گز کپڑا ملتا ہے۔

لگان مادی سرمایہ کو مفید طور پر لگانے کا خاص ذریعہ ہے۔ لہذا اس کی قیمت پر ایک تو اس سرمایہ کی مقدار کا اثر پڑتا ہے جو قوم میں موجود ہو اور دوسرے طلب و رسد کے تعلق کا۔ دیسی اور پردیسی تجارت وغیرہ کی وجہ سے صنعتی قوم میں افراط سے سرمایہ جمع ہو جاتا ہے، شرح سود کم ہوتی ہے اور صنعتی۔ تجارتی قوم میں ہمیشہ بہتیرے مالدار افراد ہوتے ہیں جو اپنا فاضل مادی سرمایہ زمین میں لگانا چاہتے ہیں، ان سب چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسی قوم میں لگان اراضی کی ایک مقررہ رقم کی قیمت اس قوم کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتی ہے جس میں صرف زراعت کا شغل ہوتا ہو۔ پولینڈ میں لگان اراضی دس یا بیس گنی رقم دے کر خریدا جا سکتا ہے، انگلستان میں ۳۰ سے ۴۰ گنی میں۔ زرعی قوم کے مقابلہ صنعتی تجارتی قوم میں جس نسبت سے لگان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اسی طرح

اراضی کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ دو قطعات اراضی کے ہوں جنہیں قدرت نے ایک سی زرخیزی دی ہو تو انگلستان والے قطعہ کی قیمت پولینڈ کے قطعہ سے ۱۰ یا ۲۰ گنی زیادہ ہوگی۔

یہ بات کہ صنعت سے شرح لگان پہ اور اس وجہ سے زمین کی قدر مبادلہ پر اثر پڑتا ہے خود آدم اسمتھ بھی اپنی پہلی کتاب کے نویں باب کے آخر میں تسلیم کرتا ہے لیکن یوں ہی رواداری میں اور اس باب میں صنعت کی بے حد و حساب اہمیت پر مناسب روشنی ڈالے بغیر۔ اس جگہ وہ ان اسباب میں جو اضافہ لگان پر بلاواسطہ اثر ڈالتے ہیں (مثلاً اراضی کی درستی اور ترقی، مویشیوں کی تعداد اور قیمت میں اضافہ) اور ان میں جو بالواسطہ اثر ڈالتے ہیں، فرق کرتا ہے اور ان موخرالذکر میں صنعت کو شامل کرتا ہے۔ اور یوں وہ اضافہ لگان اور اضافہ قیمت اراضیات کے خاص سبب یعنی صنعت کو اتنا پیچھے لا ڈالتا ہے کہ اس کا دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ادھر اس کے مقابلہ میں اراضیات کی درستی اور مویشیوں کی زیادتی کو، جو خود بڑی حد تک صنعت اور اس سے پیدا ہونے والی تجارت کے نتیجے ہیں، ان اضافوں کا خاص سبب بتاتا ہے۔ آدم اسمتھ اور اس کے شاگردوں نے اس باب میں صنعت کی پوری اہمیت کو نہیں تسلیم کیا ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ صنعت کی وجہ سے اور اس تجارت کی وجہ سے جو اس صنعت سے وابستہ ہے انگلستان میں پولینڈ کے مقابلہ میں ایک سی زرخیزی کی زمین کی قیمت ۱۰ سے ۲۰ گنی زیادہ ہوتی ہے۔ اب اگر ہم انگریزی صنعت کی مجموعی پیداوار اور انگریزی صنعت

کے کل سرمایہ کا مقابلہ انگریزی زراعت کی کل پیداوار اور انگریزی زراعت کے کل سرمایہ سے کریں تو معلوم ہوگا کہ قومی دولت کا سب سے بڑا حصہ ملکیت اراضی کی قیمت کے اضافہ ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔

میکس کوہن نے انگلستان کی قومی دولت اور قومی آمدنی کا مندرجہ ذیل تخمینہ تیار کیا ہے:-

(۱) قومی سرمایہ:

(۱) زراعت، اراضیات، کالونی اور ماہی گیری کے علاقوں میں لگا ہوا سرمایہ	۲۶۰۴ ملین
مویشی، آلات، ذخائر اور زر کی شکل میں	۶۵۵ "
کاشتکاروں کے گھر کے ساز و سامان اور برتن بھانڈے	۵۲
میزان	۳۳۱۱ ملین

(۲) صنعت و تجارت میں لگا ہوا:

صنعت اور مصنوعات کی اندرونی تجارت میں	۱۷۸½ ملین
نوآبادیاتی سامان کی تجارت میں	۱۱
مصنوعات کی پردیسی تجارت میں	۱۶½
	۲۰۶ ملین
۱۸۳۵ء کے بعد سے اضافہ (جس سال یہ تخمینہ کیا گیا تھا)	۱۲ "
میزان	۲۱۸ ملین

مختلف قسم کی شہری عمارات میں اور صنعت کی عمارتوں میں	۶۰۵ ملین
جہازوں میں	۳۳½ 〃
پُل، نہروں اور ریلوں میں	۱۱۸ 〃
گھوڑوں میں جو زراعت کے کام نہیں آتے	۲۰ 〃
میزان	۷۷۶½ ملین
کل سرمایۂ قومی کی میزان (جس میں وہ سرمایہ شامل نہیں جو نوآبادیوں میں، دوسرے ملکوں کو قرض دینے میں اور خود انگریزی سرکاری قرضوں میں لگا ہوا ہے)	۴۳۰۵½ ملین

(ب) کل قومی حاصل (خام)

(۱) زراعت، کانوں اور ماہی گیری سے	۵۳۹ ملین
(۲) صنعت سے	۲۵۹½ 〃
میزان	۷۹۸½ ملین

ان تخمینوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ :-

(۱) اس زمین کی قیمت جو زراعت کے کام آتی ہے انگلستان کی کل جائداد کا ۲۶/۴۳ حصہ ہے اور جو سرمایہ صنعت اور تجارت میں لگا ہوا ہے۔ اس سے بارہ گنی ہے۔

(۲) زراعت میں جو سرمایہ لگا ہوا ہے وہ انگلستان کے تمام قومی سرمایہ کے تین چوتھائی سے زیادہ ہے۔

(۳) انگلستان کی کل جائداد غیر منقولہ کی قیمت یعنی

اراضیات کی	۲۶۰۴ ملین
شہری اور صنعتی عمارات کی	۶۰۵ "
نہروں اور ریلوں کی	۱۱۸ "
کل میزان	۳۳۲۷ ملین ہے

یعنی کل سرمایہ انگریزی کے تین چوتھائی سے زیادہ۔

(۴) صنعت اور تجارت میں لگا ہوا سرمایہ جس میں جہاز بھی شامل ہیں، ۲۴۱½ ملین سے زیادہ نہیں۔ یعنی انگریزی دولت قومی کا صرف ۱/۱۸ حصہ ہے۔

(۵) انگلستان کا تمام زراعتی سرمایہ یعنی (۳۳۱۱) ملین کل (۵۳۹) ملین کا خام حاصل دیتا ہے یعنی (۱۶) فیصدی۔ حالانکہ صنعتی اور تجارتی سرمایہ سے جو (۲۱۸) ملین ہے سالانہ حاصل خام ۲۵۹½ ملین ہوتا ہے یعنی (۱۲۰) فی صدی۔

اس سلسلہ میں یہ بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے کہ (۲۱۸) ملین کا صنعتی سرمایہ ہی جس سے سالانہ حاصل ۲۵۹½ ملین ہوتا ہے۔ وہ خاص وجہ ہے جس کے سبب سے انگریزی زراعتی سرمایہ ۳۳۱۱ ملین کی خطیر رقم کو پہنچ کر (۵۳۹) ملین سالانہ حاصل دے سکا۔ زرعی سرمایہ کا بڑا حصہ اراضیات اور مویشی کی قیمت پر مشتمل

ہوتا ہے صنعت نے ملک کی آبادی کو دُگنا اور تگنا کرکے بے پایاں تجارت کے ذرائع پیدا کرکے، بہتیری نوآبادیاں حاصل کرلے اور اُن سے مستفید ہونے کے وسائل فراہم کرکے، بڑے پیمانہ پر جہازرانی کے مواقع نکال کر، اسی نسبت سے کھانے پینے کی چیزوں اور خاص اجناس کی مانگ کو بڑھایا، اور کاشتکاروں کے لیئے اس مانگ کو پورا کرنے کے واسطے محرک بھی فراہم کیئے اور وسائل بھی، ان کی پیداوار کی قدر مبادلہ میں اضافہ کیا، اور اسی نسبت سے لگان کی مقدار اور قدر مبادلہ میں اضافہ کرکے اراضیات کی قیمت کو چڑھا دیا۔ اس ۲۱۸ ملین صنعتی اور تجارتی سرمایہ کو ختم کردو تو اس سے صرف یہی نہیں کہ ۲۵۹½ ملین کی صنعتی پیداوار ختم ہو جائے گی بلکہ اس ۳۲۱۱ ملین زرعی سرمایہ اور اس ۵۳۹ ملین زرعی پیداوار کا بہت بڑا حصہ بھی غائب ہو جاتے گا۔ انگریزی قومی پیداوار میں صرف ۲۵۹½ ملین صنعتی پیداوار کی قیمت، کی کمی نہ ہو گی۔ بلکہ زمین کی قدر مبادلہ اتر کر اس درجہ پہ پہنچ جائے گی جہاں پولینڈ میں ہے یعنی اپنی موجودہ حالت کا دسواں یا بیسواں حصہ رہ جائے گی۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ زرعی قوم اپنا جس قدر سرمایہ مفید طور پر صنعت میں لگاتی ہے امتدادِ زمانہ کے ساتھ اُس کی زمین کی قیمت میں اس سے دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے اس بیان کی تصدیق ہر جگہ تجربہ اور اعداد و شمار سے ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہم نے دیکھا ہے کہ صنعت کی ترقی کی وجہ سے یہ قدریں اور مویشیوں کی قیمت بڑھتی ہے۔ ذرا کوئی ان قیمتوں کو فرانس میں مقابلہ کرے ۱۷۸۹ء اور ۱۸۳۰ء میں، جرمنی میں مقابلہ کرے ۱۸۳۰ء اور

سنہ ۱۸۴۳ء میں، شمالی امریکہ میں مقابلہ کرے سنہ ۱۸۲۰ء اور سنہ ۱۸۳۰ء میں کہ صنعت جب پستی میں تھی تو یہ کیا تھیں اور صنعت کو جب عروج ہوا تب کیا ہو گئیں۔ ہر جگہ ہمارے مشاہدہ کی تصدیق ہی ہوگی۔

اس کی وجہ قوم کی قوت دولت آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے جو پیدا ہوتا ہے تقسیم عمل، اور قوائے قومی کے صحیح تعاون سے، نیز ان ذہنی اور قدرتی قوتوں کے بہتر استعمال سے، جو قوم کے تصرف میں ہوتی ہیں۔ اور تجارت خارجہ سے اور یہی اسباب و نتائج ہمیں ترقی یافتہ وسائل حمل و نقل میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وسائل نہ صرف خود آمدنی دیتے اور اس طرح اس سرمایہ کا بدل کرتے رہتے ہیں جو ان پر لگتا ہے بلکہ اس کے علاوہ صنعت اور زراعت کی ترقی میں بڑی مدد دیتے ہیں اور کچھ عرصہ میں اپنے حلقہ کی ملکیت زمین کی قیمت میں اس مادی سرمایہ سے دس گنا اضافہ کر دیتے ہیں جو ان پر لگایا گیا تھا۔ ان وسائل میں سرمایہ لگانے والوں کے مقابلہ میں زراعت والے اس قسم کی چیزوں سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے اصل قائم میں یہ دس گنا فائدہ تو یقینی ہے اور یہ سارا فائدہ اسے بلا کسی قربانی کے ملتا ہے، حالانکہ ان میں سرمایہ لگانے والے کو اپنے تمام سرمایہ سے کھیل جانا پڑتا ہے۔ زراعت والے کی حالت نئے کارخانے قائم کرنے والوں کے مقابلہ میں بھی اسی حیثیت سے بہتر ہے۔

لیکن اگر صنعت کا اثر زرعی پیداوار پر، لگان پر، اور اس لئے زمین کی قیمت پر اتنا اہم اور ان لوگوں کے لئے اتنا مفید ہوتا ہے جو زراعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو پھر یہ

کس طرح کہا جاتا ہے کہ تاجرانہ کارروائیوں سے زراعت کو نقصان پہنچا کر صنعت کی حمایت کی جاتی ہے ؟

کاشتکار کی مادی خوشحالی، اور تمام نجی اشخاص کی خوشحالی کی طرح، اس پر منحصر ہے کہ وہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اس کی مصنوعات اس سے زیادہ ہو جو وہ صرف میں لاتا ہے اس لئے اس کے واسطے یہ بات اتنی ہی اہم ہے کہ مصنوعات سستے ہیں جتنا کہ یہ بات ہے کہ طرح طرح کی زرعی پیداوار کی خوب مانگ ہے اور ان کی قدر مبادلہ زیادہ ہے۔ اگر تاجرانہ کارروائیوں کا اثر یہ ہو کہ کاشتکار اپنے مال کی منڈی کے بہتر ہو جانے کے باعث اس سے زیادہ فائدہ حاصل کرلے جتنا کہ اپنی ضرورت کی مصنوعات کی قیمت بڑھنے سے اُسے نقصان ہوتا ہے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے صنعت والوں کی خاطر کوئی قربانی کی۔ اور یہ اثر تمام اُن قوموں میں لازمی ہے جن میں خود اپنی صنعت کو ترقی دینے کی صلاحیت ہے اور ان قوموں میں یہ اثر ملکی صنعت کو ترقی کے پہلے ہی عہد میں صاف صاف سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں صنعت میں جو کچھ سرمایہ لگتا ہے وہ اکثر رہنے سہنے اور کارخانہ کی عمارتوں، آب رسانی کے انتظامات وغیرہ میں صرف ہوتا ہے اور یہ استعمال ایسے ہیں کہ ان کا فائدہ بیشتر زراعت والوں کو ہی پہنچتا ہے اور جب شروع ہی میں اپنے مال کی زیادہ نکاسی اور زیادہ قیمت کے فوائد مصنوعات کی گرانی کے نقصان سے زیادہ ہوتے ہیں تو آگے چل کر تو یہ مفید نسبت کاشتکار کے حق میں اور بھی ترقی پاتی ہے، اس لئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے کارخانوں کی ترقی کا بھی اثر ہوتا ہے

کہ زرعی پیداوار کی قیمتیں بڑھیں اور مصنوعات کی گھٹیں۔

علاوہ بریں کاشتکار اور زمیندار کی خوش حالی کا خاص طور سے اس پر انحصار ہے کہ اس کے آلہ کار کی، یعنے اُس کی زمین کی قیمت کم سے کم اپنے حال پر قائم رہے یہ اس کی خوش حالی ہی کی شرط اوّل نہیں بلکہ اکثر تو اس کے کل معاشی وجود کی شرط ہے مثلاً کوئی نادر بات نہیں ہے کہ کاشتکار کی سال بھر کی پیداوار خود اُس کے صرف سے زیادہ ہو اور پھر بھی وہ تباہ و برباد ہو جائیں۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ اس کی زمین پر لو قرض کا بار ہے، اُدھر عام اعتبار کے کاروبار میں ذرا تنزل پیدا ہوا، ایک طرف تو سرمایہ بشکل زر کی طلب اُس کی رسد سے بڑھی، دوسری طرف اراضیات کی رسد اُن کی طلب سے بڑھی۔ ایسے حالات میں زر کے قرض عام طور پر واپس مانگے جاتے ہیں اور لوگ عام طور پر زمین بیچنے لگتے ہیں، لہٰذا زمین کی قیمت گر جاتی ہے اور بہت سے نہایت حوصلہ مند، مستعد اور کفایت شعار کاشتکار تباہ ہو جاتے ہیں۔ اِس وجہ سے نہیں کہ ان کا صرف اُن کی پیداوار سے زیادہ ہے بلکہ اُن کے آلۂ دولت آفرینی یعنے ان کی زمین کی قدر مبادلہ ایسے اسباب کے اثر سے جن پر اُن کا کوئی قابو نہیں، دیکھتے دیکھتے کم ہو گئی، ان کی ساکھ اُس کی وجہ سے مٹ گئی، اور ان کی جائداد پر جو رقم قرض تھی اس کو جائداد کی اِس تخفیف شدہ قیمت سے وہ پہلی سی نسبت نہ رہی۔ اس قسم کی کساد بازاری جرمنی اور امریکہ میں پچھلے پچاس سال کے اندر چند بار ظاہر ہو چکی ہے اور اس سے جرمن امراء کا ایک بڑا حصہ اپنی زمین اور جائداد ہاتھ سے کھو چکا ہے اور یہ لوگ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ان کی

اس مصیبت کی ذمہ داری انگلستان میں ان کے بھائیوں، یعنے نیک نیت قدامت پسندوں کی سیاست پر ہے ۔

لیکن جن ملکوں میں صنعت خوب ترقی کرتی ہوتی ہے وہاں کاشتکاروں اور زمینداروں کی حالت بالکل اور ہوتی ہے۔ یہاں چونکہ زمین کی معدن آفرینی اور پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے اس کا نفع بس اسی قدر نہیں ہوتا جس قدر کہ اس کی پیداوار کی قیمت اس کے صرف کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے بطور بحیثیت مالک زمین اسے صرف اضافہ لگان ہی سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اسے بقدر اس سرمایہ کے نفع ہوتا ہے جس پر یہ اضافہ لگان بطور سود مل سکتا۔ اس کی جائداد کی قدرِ مبادلہ دگنی چوگنی ہو جاتی ہے، اس لئے نہیں کہ وہ زیادہ کام کرتا ہے، یا اپنے کھیتوں کو درست کرتا ہے یا زیادہ پس انداز کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ صنعت کے باعث اس کے مقبوضات کی قدرِ مبادلہ بڑھ گئی ہے۔ اس اضافہ سے اسے زیادہ ذہنی اور جسمانی محنت کی، اپنے کھیتوں کو درست کرنے کی، اپنے مویشی بڑھانے کی، زیادہ خرچ کرکے بھی زیادہ پس انداز کرسکنے کی تحریک ہوتی ہے اور ایسا کرنے کرنے کے ذرائع فراہم ہو جاتے ہیں۔ زمین کی قیمت بڑھنے سے اس کی ساکھ بھی بڑھ جاتی ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان ترقیوں کے لئے جو مادی سرمایہ درکار ہے وہ فراہم کرلے۔

زمین کی قدرِ مبادلہ کے ان اعتبارات پر سے سمتھ خاموش گزر جاتا ہے برخلاف اس کے سے کا خیال ہے کہ اراضیات کی قدرِ مبادلہ چنداں اہم چیز نہیں اس لئے یہ

کم ہو یا زیادہ دولت آفرینی کے کام میں تو ایک سی ہی خدمت انجام دیتی ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسے مصنف سے، جسے اس کے جرمن مترجم معلم الملل بنا چکا دیتے ہیں، ایک ایسے معاملہ میں یوں سراسر غلط رائیں سننے میں آئیں جس کا نہایت گہرا اثر قوموں کی خوش حالی پر پڑتا ہے۔ اس کے خلاف ہم یہ دعوے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی خوشحالی کا اس سے زیادہ یقینی اور کوئی معیار نہیں ہے کہ زمین کی قدر مبادلہ چڑھ رہی ہے یا اتر رہی ہے اور اس قدرِ مبادلہ میں تزلزل اور کمی مہلک ترین بلاؤں میں سے ہے جو کسی ملک پر نازل ہو سکتی ہیں۔

مذہب رائج کو اس غلط نتیجہ تک بھی اسی آزاد تجارت کے نظریہ کی بیجا پاسداری نے پہنچایا، (جس حیثیت سے کہ یہ اس نظریہ کو منوانا چاہتے ہیں) کہ زمین کی قدر میں تزلزل اور کمی کے دورے کہیں بھی اتنے زیادہ نہیں ہونے جتنے ان زرعی قوموں میں جو مالدار اور طاقت ور صنعتی اور تجارتی قوموں سے بلا روک ٹوک کے تجارتی تعلق رکھتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ تجارت خارجہ کا اثر بھی یہ ہوتا ہے کہ زمین کے لگان اور اس کی قیمت میں اضافہ ہو لیکن اپنی ہمہ گیری، یکسانیت اور پائیداری میں اس اثر کا اس اثر سے کوئی مقابلہ نہیں جو دیسی صنعت کے فروغ، مصنوعات کی قیمت میں مسلسل اضافہ، اور دیسی مصنوعات کے دیسی زرعی پیداوار سے مبادلہ کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔

جب تک قوم کے پاس بہت سی زمین بے کاشت پڑی ہے یا اچھی طرح استعمال

میں نہیں آتی جب تک قوم خاص خاص چیزیں پیدا کرتی ہے جنہیں کوئی زیادہ مال دار صنعتی قوم مصنوعات کے بدلے میں لے لیتی ہو، جہاں تک یہ چیز آسانی سے نقل پذیر ہوں اور جب تک اِن چیزوں کی مانگ ہو اور اس مانگ میں ہر سال اس زرعی قوم کی قوت دولت آفرینی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ مناسب اضافہ بھی ہو سکے، اور اس میں جنگوں سے یا پردیسی تجارتی تدبیروں سے رکاوٹ پیدا نہ ہو، اگر یہ سب کچھ ہو تو تجارت خارجہ سے بھی زمین کے لگان اور قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے لیکن جہاں ایک شرط کی بھی کمی ہو یا کوئی شرط ساقط ہو جائے تو پھر یہ جمود کا بلکہ اکثر سخت اور مسلسل تنزّل کا سبب بن سکتی ہے۔

پردیسی طلب کی تغیّر پذیری کا سب سے مُضر اثر اس وقت ہوتا ہے کہ جب کسی جنگ یا قحط یا دوسری جگہوں سے درآمد کی کمی اور دوسرے حالات و واقعات کے سبب سے صنعتی قوم کو کھانے پینے کی چیزوں اور عام طور پر اجناس خام کی یا خاص خاص چیزوں کی بہت بڑی بڑی مقداریں درکار ہوتی ہیں اور پھر امن قائم ہو جانے سے، بہتر فصلوں کی وجہ سے، یا دوسرے علاقوں سے درآمد کے بڑھنے سے، یا سیاسی کارروائیوں کے باعث یہ طلب پھر بالکل بند ہو جاتی ہے۔ اگر یہ طلب تھوڑے ہی عرصہ تک رہی ہو، تو ممکن ہے اس سے زرعی قوم کو تھوڑا بہت فائدہ ہی ہو، لیکن اگر چند سال یا سالہا سال تک قائم رہی ہے تو تو زرعی قوم کے تمام حالات پر، اس کی ساری شخصی معیشت پر اسی کا اثر ہوگا کاشتکار ایسی چیزوں کے استعمال کا عادی ہو جائے گا،

ایسے خطرات کے لئے ضرورت بن جائینگے جو دوسرے حالات میں تعیش شمار کئے جاتے اپنی زمین کی چڑھی ہوئی قیمت اور بڑھے ہوئے حاصل کی بنا پر وہ طریق کاشت میں ایسی ترقیاں رائج کرتا ہے، ایسی عمارتیں بناتا ہے، ایسی چیزیں خریدتا ہے جو وہ پہلے کبھی نہ کرتا۔ خرید و فروخت کے معاہدے، پٹے، قرضے سب اسی بڑھے ہوئے لگان اور قیمت کی بنا پر کئے جاتے ہیں۔ ریاست کو اس میں تامل نہیں ہوتا کہ افراد کی خوش حالی کے معیار سے اپنے اخراجات بھی بڑھا دے۔ اب اگر یکایک یہ طلب بند ہو جاتی ہے، تو پیدائش اور صرف دولت میں نسبت بگڑ جاتی ہے؛ گرتی ہوئی قدروں میں اور ان قرضوں میں جو ان پر لئے گئے ہیں اور جو بشکل زر اپنی پرانی حالت پر قائم ہیں نسبت بگڑ بدل جاتی ہے؛ پٹے کی رقم بشکل زر اور حاصل کی صلاحیت بشکل زر میں نسبت بگڑ جاتی ہے قومی آمدنی اور قومی صرف میں نسبت بگڑ جاتی ہے؛ اور نسبتوں کے اس بگاڑ سے دیوالے نکلتے ہیں۔ پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں ہمتیں پست ہوتی ہیں اور معاشی اور ذہنی ترقی مبدل بہ تنزل ہو جاتی ہے۔ گویا زرعی خوشحالی نے افیون یا تیز شراب کی طرح تھوڑی دیر کے لئے محرک کا اثر دکھایا لیکن ساری عمر کے لئے کمزوری پیدا کر دی۔ اس کی مثال فرینکلن کی بجلی کی چمک کی سی ہے کہ جس نے ایک لمحہ کے لئے تو چیزوں کو نہایت چمکتی ہوئی روشنی میں دکھا دیا لیکن پھر پہلے سے بھی زیادہ تاریک اندھیرے میں واپس کر دیا۔

زراعت میں عارضی خوش حالی، یہاں تک کہ مستقل افلاس سے بھی بڑی مصیبت ہے

اگر خوش حالی کے افراد اور اقوام کو واقعی فائدہ پہنچانا مقصود ہو تو اسے مستقل ہونا چاہیئے لیکن
مستقل وہ اس وقت ہو سکتی ہے کہ اس میں ترقی رفتہ رفتہ ہو اور قوم کے ہاتھ اس ترقی
اور اس استقلال کی ضمانتیں ہوں۔ زمین کی قیمت کا کم ہونا اس کی قدر مبادلہ میں تنزل
سے بدرجہا بہتر ہے، قوم کو مستقل خوش حالی جب ہی نصیب ہوتی ہے کہ اس میں آہستہ
آہستہ مگر پائدار اضافہ ہو، اور ترقی یافتہ قوموں میں اس اضافہ کے یکساں اور مستقل
ہونے کی ضمانت بس یہی ہے کہ اس کے پاس خود اپنی صنعت ہو۔

تجارتِ خارجہ سے جو اثر شرح لگان اور زمین کی قیمت پر پڑتا ہے اس کے
مقابلہ میں ملکی صنعت کے اثر کے متعلق خیالات میں وضاحت کی جو کمی ہے اس کا صاف
نتیجہ اس سے چلتا ہے کہ فرانس میں عنبستانوں کے مالک اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ فرانسیسی
نظامِ تامینی سے ان کا نقصان ہے اور اپنے لگان میں اضافہ کی امید پر یہ انگلستان
سے جہاں تک ہو سکے آزاد تجارت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر بورنگ نے انگلستان اور فرانس کے درمیان تجارتی تعلقات پر ایک رپورٹ
دی ہے جس کی تہ میں یہ رجحان ہے کہ انگریزی مصنوعات کی فرانس میں زیادہ درآمد
سے اور اس سے فرانس سے شراب کی برآمد میں جو اضافہ ہوگا اس سے جو فائدہ فرانس
کو ہوگا اسے ذرا ابھار کر جتلایا جائے۔ لیکن اسی رپورٹ میں ڈاکٹر بورنگ نے ایسے واقعات
پیش کیے ہیں جن سے خود ان کے دلائل کے خلاف نہایت صاف ثبوت پیش کیا
جا سکتا ہے۔

انگلستان میں فرانسیسی شراب کی جو سالانہ درآمد ہے (یعنی ۴۳۱۵۰۹ گیلن) اس کے مقابلہ میں ڈاکٹر بورنگ، ندرلینڈ کی برآمد رکھتے ہیں (یعنی ۱۸۲۹ء میں ۲۵۱۵۱۹۳ گیلن) اور اس سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر تجارت آزاد ہو تو انگلستان میں فرانسیسی شراب کی کھپت کتنی کچھ بڑھ سکتی ہے۔

اب اگر فرض کرلیا جائے (اگرچہ ظن غالب اس کے خلاف ہے) کہ انگلستان میں فرانسیسی شراب کی بکری میں اس بات سے رکاوٹیں نہ ہوں گی کہ وہاں لوگوں کو برانڈی، تیز بٹیر، پرتگال، اسپین، سسلی، تین ریف، مدیرا، اور کیپ کی تیز اور سستی شرابیں زیادہ پسند ہیں، اگر فرض کرلیا جائے کہ انگلستان میں واقعی شراب کا صرف ندرلینڈ کی نسبت ہی سے بڑھ جائے گا تب یہ آبادی کے حساب سے ۵ یا ۶ ملین گیلن تک پہنچ سکے گا یعنی اس وقت کی مقدار کا دسواں سے پندرہ گنا ہو سکے گا، اور اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو بظاہر اس سے فرانس کو اور فرانس کے عنبستانوں کے مالکوں کو بہت فائدہ کی امید ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر ذرا تہ پر نظر ڈالیے تو بالکل مختلف نتیجہ نکلتا ہے جتنی آزادی تجارت ممکن ہے (ہم کامل آزادی تجارت نہیں کہتے اگرچہ اصول کے اعتبار سے ڈاکٹر بورنگ کی دلیل کے مطابق تو یہی فرض کرنا چاہیے) اس میں تقریباً بلاشبہ انگریز فرانس کے مصنوعات کی منڈی کا بڑا حصہ خصوصاً اون، روئی، سنی، لوہے اور پتھر کے مال کی منڈی کا بڑا حصہ اپنے قبضہ میں لے لیگا۔ کم سے کم تخمینہ لگائیے تو ماننا ہوگا کہ صنعتی پیداوار میں اس

کمی کے باعث فرانسیسی شہروں میں ایک ملین آدمی کم ہو جائیں گے اور دیہات میں جو آدمی شہریوں کے لئے خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرتے ہیں اُن میں بھی کوئی ایک ہی ملین آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ خود ڈاکٹر لورنگ نے حساب لگایا ہے کہ فرانس میں دیہات کے رہنے والے فی کس ۱۶ ۱/۲ گیلن اور شہر کے رہنے والے اس سے دوگنی یعنی ۳۳ گیلن شراب فی کس کام میں لاتے ہیں۔ لہٰذا آزاد تجارت سے اندرونی صنعت میں جو کمی ہوئی اس سے ملک کے اندر شراب کا صرف ۵۰ ملین گیلن کم ہو جائیگا۔ اور برآمد میں کل پانچ سے چھ ملین گیلن کا اضافہ ہو سکے گا۔ اب جس کارروائی سے فرانسیسی شراب کی پردیسی مانگ میں جو اضافہ ممکن ہے خود ملکی مانگ میں اس سے دس گنی تخفیف یقینی ہو۔ اس کارروائی کو مشکل ہی سے فرانسیسی عنبستانوں کے مالکوں کے لئے مفید کہہ سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ چاہے شراب کی پیداوار کا معاملہ ہو چاہے گوشت کی، چاہے غلّہ کا معاملہ چاہے عام طور پر سب اجناس خام اور کھانے پینے کی چیزوں کا، یہ بات بالکل صاف ہے کہ ایک بڑی قوم میں جس میں خود اپنی صنعت کے قیام کی اہلیت ہو، ملکی صنعت کی اندرونی پیداوار سے منطقہ معتدلہ کی زرعی پیداوار کی طلب میں اور زمین کے لگان اور قیمت میں اس سے دس سے بیس گنا تک اضافہ ہوتا ہے۔ جتنا کہ ان مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ برآمد سے ممکن ہے۔ اس سلسلہ میں بھی سب سے اچھا ثبوت بڑے شہروں کے قریب کی اراضیات کے لگان اور قیمت سے ملتا ہے اگر ان

کا مقابلہ دور افتادہ صوبوں سے کیا جائے ہر چند کہ یہ صوبے تجارتی مواقع کے اعتبار سے اور سڑکوں کے ذریعہ سے مرکزی شہر سے متعلق ہی کیوں نہ ہوں۔

لگان کے مسئلہ پر یا تو قدروں کے نقطۂ نظر سے غور ہو سکتا ہے، یا قوائے دولت آفرین کے نقطۂ نظر سے یا پھر محض شخصی حالات کے اعتبار سے یعنے زمیندار، پٹہ دار اور مزدور کے باہمی تعلقات کے اعتبار سے، یا زیادہ تر جماعتی اور قومی حالات کے لحاظ سے، مذہب رائج نے اس مسئلہ کو زیادہ تر شخصی معیشت ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ مثلاً جہاں تک ہمیں علم ہے اس مذہب والوں نے کہیں تفصیل نہیں کی ہے کہ لگان کی رقم جائے پیدائش سے جتنی قریب صرف میں آئے قوم کیلئے اتنی ہی مفید ہوتی ہے۔ لیکن مختلف ریاستوں میں یہ اکثر فرمانروا کے مستقر میں آن کی صرف ہوتی ہے مثلاً مطلق شاہی حکومتوں میں دار الحکومت میں ان صوبوں سے دور جہاں وہ پیدا ہوتی ہے یعنے ایسے طریقہ سے صرف ہوتی ہے جس میں زراعت کو، مفید عام صنعتوں کو، اور قوم کی ذہنی قوتوں کے نشو و نما کو کم سے کم فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں زمین کے مالک اُمراء کو اس وقت تک کوئی حقوق یا سیاسی اثر ہی حاصل نہ ہو، جب وہ دربار شاہی میں آکر نہ رہیں یا سرکاری عہدوں پر، مامور نہ ہوں، جہاں ساری قوت سمٹ کر دار الحکومت میں جمع ہو جائے؛ وہاں لگان پانے والے اسی مرکزی نقطہ کی طرف کھنچتے ہیں کہ یہیں انہیں اپنے حوصلے نکالنے کے ذرائع اور اپنی اراضیات کی آمدنی کو مسرت بخش طریقوں سے صرف کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ اور جس قدر یہ

لگان وار دار الحکومت میں رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں اُسی قدر صوبہ کے قیام میں افراد کو جماعتی ربط ضبط اور لطیف ذہنی اور مادی مسرتیں حاصل کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ صوبہ اُنہیں اپنے سے دُور دھکیلتا ہے اور دارالحکومت اُنہیں اپنی طرف گھسیٹتا ہے۔ چنانچہ ذہنی تکمیل کے تمام وہ ذرائع صوبہ کے ہاتھ سے نکل کر قومی دارالحکومت کو مل جاتے ہیں جو صوبہ کو لگان کے صرف سے حاصل ہوتے خصوصاً وہ صنعتیں اور وہ ذہنی کام کرنے والے جنہیں لگان کی رقم سے پالا جا سکتا تھا دارالحکومت ضرور بہت شاندار ہو جاتا ہے کہ اس میں ذہنی کام کرنے والوں کی ساری قابلیتیں اور مادی تعیش کے مال کی اکثر صنعتیں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ لیکن صوبوں سے وہ ذہنی قوتیں، وہ مادی وسائل، اور خصوصاً وہ صنعتیں چھن جاتی ہیں جن سے کاشتکار کے لئے زراعت میں ترقی ممکن ہوتی ہے اور جن سے اسے ترقی کی تحریک ہوتی ہے۔ انہی حالات میں بڑی حد تک اس بات کا سبب پوشیدہ ہے کہ فرانس میں، خصوصاً مطلق العنان شاہی کے زمانہ میں، اگرچہ دارالحکومت برّاعظم یورپ کے تمام بڑے شہروں میں اپنی شان و شوکت اور علم و ذہانت ہر اعتبار سے افضل تھا لیکن زراعت نے بہت کم ترقی کی تھی اور صوبوں میں ذہنی تہذیب اور مفید عام صنعتوں کا کال تھا۔ لیکن جوں جوں زمین کے مالک امراء دربار شاہی سے زیادہ بے تعلق ہوتے جاتے ہیں، اور آئین سازی اور نظم و نسق ملکی میں اثر حاصل کرتے جاتے ہیں، جوں جوں نیابتی نظام اور نظم حکومت کی وجہ سے شہروں اور صوبوں کو خود اپنے معاملات کے انصرام اور ریاست کی آئین سازی اور انتظام میں شرکت کا حق ملتا جاتا ہے، جوں جوں عزت

اور راز کا صوبہ میں اور صوبہ کے ذریعہ سے حاصل ہونا ممکن ہوتا جاتا ہے، زمین کے مالک امرار اور خوش حال تعلیم یافتہ شہری اس مقام کی طرف کھنچتے ہیں جہاں سے انہیں لگان ملتا ہے، لگان کے صرف کا اثر صوبہ میں مذہبی قوتوں اور جماعتی اداروں کے نشوونما پر، زراعت کی ترقی پر، اور مفید عام صنعتوں کے فروغ پر بڑھتا جاتا ہے۔

اس مشاہدہ کی تصدیق انگلستان کے معاشی حالات سے ہوتی ہے۔ یہ بات کہ انگریز زمیندار سال کا بڑا حصہ اپنی جائداد پر صرف کرتا ہے، مختلف طریقوں سے انگریزی زراعت کی ترقی میں مدد دیتی ہے۔ براہِ راست تو یوں کہ مقیم زمیندار اپنے لگان کا ایک حصہ خود اپنی کاشت کو بہتر بنانے میں یا اپنے اسامیوں کی کاشت کے سدھارنے میں مدد دینے کے لئے صرف کرتا ہے۔ بالواسطہ یوں کہ اس کے صرف سے آس پاس کی صنعتوں اور ذہنی کام کرنے والوں کو مدد ملتی ہیں۔ انہی حالات سے کچھ کچھ اس سوال کی بھی توضیح ہوتی ہے کہ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں ہر چند کہ بڑے بڑے شہر نہیں ہیں۔ نہ نقل و حمل کے اچھے وسائل نہ قومی ادارے، پھر آخر کیوں یہاں کی عام تہذیب فرانس سے بمراتب بہتر ہے؛

لیکن اس مادہ میں آدم اسمتھ اور اس کے شاگردوں سے جو سب سے بڑی غلطی ہوئی اُسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں لیکن یہاں اسے اور روشن کرنا چاہتے ہیں۔ وہ غلطی یہ ہے کہ وہ لگان، اراضی کی قیمت، اور زرعی سرمایہ میں اضافہ پر صنعت کے اثر کو نہ تو اچھی طرح تسلیم کرتے ہیں نہ پوری طرح بیان کرتے ہیں۔ بلکہ ایک طرح زراعت کو صنعت کے مقابلہ میں اس طرح لا رکھتے ہیں کہ گویا زراعت قوم کے لئے بمراتب اہم تر

ہے، اس سے جو خوشحالی پیدا ہوتی ہے وہ صنعت اور اس سے پیدا ہونے والی خوشحالی سے بمراتب زیادہ پائدار ہے۔ سمتھ نے یہاں دراصل طبعیین کے غلط خیال کو، ذرا بدلی ہوئی شکل میں قائم رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس غلطی میں اس لئے مبتلا ہوا کہ (جیسا کہ ہم انگلستان کے متعلق اعداد و شمار سے ظاہر کر چکے ہیں) خود اس ملک میں جس میں صنعت سب سے زیادہ ترقی کر چکی ہے زراعت میں لگا ہوا مادی سرمایہ صنعت کے مادی سرمایہ سے دس سے بیس گنا تک ہے، یہی نہیں بلکہ زراعت کی سالانہ پیداوار سارے صنعتی سرمایہ سے کہیں زیادہ ہے ممکن ہے کہ اسی وجہ سے طبعیین نے بھی صنعت کے مقابلہ میں زراعت کو غلط اہمیت دی ہو۔ اور اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہی معلوم بھی ہوتا ہے کہ زراعت سے دولت چونکہ دس گنی ملتی ہے اس لئے وہ دس گنی توجہ کی مستحق ہے اور صنعت سے دس گنی زیادہ اہم بھی ہے لیکن یہ سب دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ اگر ہم اس زرعی خوش حالی کے اسباب کی تہ کو پہنچیں تو زیادہ تر صنعت ہی نظر آتی ہے صنعتی سرمایہ کے ۲۱۸ ملین ہی زرعی سرمایہ کے ان ۳۳۱۱ ملین کو وجود میں لاتے ہیں۔ یہاں بھی معاملہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ وسائل حمل و نقل کا ہے، نہر میں جو سرمایہ لگا ہے اسی نے تو ان اراضیات کی قیمت بڑھا دی جو نہر کی پہنچ کے اندر ہیں، حمل و نقل کے ذریعہ کی حیثیت سے اس نہر کی صلاحیت کو برباد کر دو اور جو پانی اب تک اس کا آتا تھا اس سے چراگاہوں کو سیراب کر دیجئے بظاہر زرعی سرمایہ اور زرعی لگان وغیرہ بڑھانے کے لئے استعمال کرو اور فرض کرو کہ اس طرح چراگاہوں کی قیمت میں ملینوں کا اضافہ ہو گیا۔ تب بھی اس تبدیلی سے جو بظاہر زراعت کے فائدہ کی

ہے ان اراضیات کی قیمت میں جو نہر کی پہنچ میں تھیں دس گنے کی کمی ہو جائے گی۔

اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو اس بات سے کہ ملک کا کل صنعتی سرمایہ کل زرعی سرمایہ سے اتنا کم ہوتا ہے ان نتائج سے بالکل مختلف نتائج اخذ کرنے چاہئیں جو کہ مذہب رائج اور سالقہ مذاہب نے کئے ہیں۔ زراعت کے مقابلہ میں صنعت جس قدر کم سرمایہ کو اپنے اندر سے سکتی ہے اور حرکت میں لا سکتی ہے اسی قدر خود زراعت والوں کو یہ بات زیادہ اہم معلوم ہو گی کہ صنعت کو قائم رکھیں اور بڑھائیں۔ زراعت والوں اور خصوصاً لگان پانے والوں اور مالکان اراضی پر یہ بات روشن ہو جانی چاہئیے کہ ملکی صنعت کے قیام و بقا میں خود ان کی غرض مضمر ہے۔ اس وقت بھی کہ اس کے لئے جو سرمایہ درکار ہے وہ انہیں یوں ہی مفت اور بلا امید واپسی فراہم کرنا پڑے جس طرح کہ نہروں، ریلوں اور سڑکوں کے بننے میں ان کا فائدہ ہے چاہے ان سے کوئی خالص حاصل بھی نہ ملے بسو اب ذرا متذکرہ بالا سلسلہ میں ان صنعتوں کو دیکھئے جو زراعت سے قریب تر ہیں اور اس کے لئے سب سے زیادہ مفید اور لازمی ہیں۔ مثلاً آٹا پیسنے کی چکیوں کو دیکھئیے، تو ہماری رائے کی صحت میں کوئی شبہ باقی نہ رہیگا۔ ایک علاقہ میں جہاں کاشتکار کی پہنچ کسی چکی تک نہیں ہے اس علاقہ کے لگان اور قیمت اراضی کا مقابلہ ان علاقوں سے کیجئے جہاں زراعت والوں کے درمیان ہی یہ کام ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ تنہا یہ صنعت بھی دونوں پر معتدبہ اثر ڈالتی ہے اور اگر زرخیزی برابر ہی مانی جائے تو یہاں جائداد غیر منقولہ کی کل قیمت میں اضافہ اس سرمایہ سے دوگنا نہیں بلکہ دس اور بیس گنا ہے جو اس چکی میں لگا ہوا تھا۔ اگر یہاں کے

زمیندار سب مل کر خود اپنے خرچ سے یہ چکی لگوانے اور چکی چلانے والے کو مفت میں دے ڈالتے تب بھی بہت فائدہ میں رہتے۔ اور یہ صورت شمالی امریکہ کے جنگلی علاقوں میں آئے دن بیشتر ہی آتی ہے کہ جہاں لوگوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ ایسے کام اپنے ہی خرچ سے شروع کر سکیں تو زمیندار خوشی سے مزدور، گاڑی، لکڑی وغیرہ سے اُس کی تیاری میں مدد پہنچاتے ہیں۔ نہیں خود پرانے متمدن ممالک میں بھی ایسا ہوتا تھا، اگرچہ دوسری شکل میں، اور شک نہیں کہ بہت سے "مشترک چکی کے حقوق" کی اصل اسی قسم کی ہے۔

جو حال پیسنے کی چکی کے کارخانہ کا ہے وہی آرہ کشی، تیل اور پلاسٹر کے کارخانوں کا ہے۔ ہر جگہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اراضیات ان کارخانوں سے جس قدر قریب ہوتی ہیں یا ان کارخانوں سے جس قدر قرب یا بُعد کا تعلق باہمی زراعت کو ہوتا ہے اسی نسبت سے ان کا لگان اور قیمت اراضی بڑھتی ہے۔ پھر یہی حال اُون، سنی، پٹ سن، کاغذ اور ردی کے کارخانوں کا بھی کیوں نہ ہو۔ بالعموم طور پر سب صنعتوں کا ؟ یہ تو ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ لگان اور قیمت اراضی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے جس قدر کہ زمین شہر کے قریب ہو، شہر جتنا آباد اور صنعتوں سے پُر ہو۔ ان چھوٹے حلقوں میں اگر ہم اراضی کی قیمت اور اس میں لگے ہوئے سرمایہ کا تخمینہ کریں، اور صنعت میں لگے ہوئے سرمایہ کا بھی اندازہ لگائیں۔ اور ان کی میزانوں کا مقابلہ کریں تو ہر جگہ معلوم ہوگا کہ پہلی میزان دوسری سے کم از کم دس گنی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا حماقت ہوگا کہ قوم کو اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے

کہ اپنا مادی سرمایہ بمقابلہ صنعت کے زراعت میں لگائے اور زراعت بہ نسبت صنعت کے فی نفسہ افزونی سرمایہ کے زیادہ موافق ہے۔ در اصل مادی زرعی سرمایہ کا بڑھنا بڑی حد تک مادی صنعتی سرمایہ کے بڑھنے پر منحصر ہے اور جو قومیں اس حقیقت کو نہیں سمجھتیں چاہے اُنہیں قدرت کی طرف سے زراعت کے معاملے میں کتنی ہی فوقیت حاصل ہو وہ دولت، آبادی، تمدن اور طاقت میں بھی نہیں کہ آگے نہیں بڑھتیں بلکہ پیچھے ہی ہٹتی ہیں۔

تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی ملکی صنعت قائم کرنے کے لئے کچھ کارروائیاں کی جاتی ہیں تو لگان پانے والے اور زمین کے مالک اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاص مراعات صنعت کو مالا مال کرنے کے لئے کی گئی ہیں۔ اور ان کا سارا کا سارا بوجھ بسرہمیں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جو تہذیب کے آغاز میں نہایت صاف صاف دیکھ لیتے ہیں کہ اگر ان کے قریب ایک آٹا پیسنے کی چکی، لکڑی چیرنے کا کارخانہ یا لوہے کا کارخانہ قائم ہو جائے تو اُنہیں کیسے کیسے فوائد ہوں گے اور اس کے قیام کے لئے ہر طرح کی قربانی کرتے اور قیام میں ہر طرح کی مدد دیتے ہیں، وہ تہذیب کی ذرا ترقی یافتہ حالت میں یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ملک کی پوری زراعت کے لئے کیسے بے حساب فوائد مترتب ہوں اگر اس کی اپنی مخصوص اور مکمل قومی صنعت قائم ہو جائے اور خود اُن کا اپنا فائدہ چاہتا ہے کہ بیان قربانیوں کے لئے تیار ہو جائیں جن کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ کم قوموں میں اور وہ بھی صرف خوب تعلیم یافتہ قوموں میں یہ ہوتا ہے کہ

انفرادی زمیندار کی ذہنی آنکھ جو اکثر قریب کا تو خوب دیکھ لیتی ہے دور پرے کی چیزوں دیکھنے میں بھی کام دے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ مذہب رائج نے بھی زمینداروں کی رائے کو گرا بڑا لنے میں اپنے بس بھر حصّہ لیا ہے۔ اہلِ صنعت کی نامینی کارروائیوں کے لئے کوشش کو اسمتھ اور نسے ہر جگہ خود غرضی پر مبنی بتاتے ہیں اور برخلاف اس کے زمینداروں کی فیاضی اور بے غرضی کی مدح کرتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے لئے اس قسم کی کارروائیاں طلب کرنے سے کوسوں دُور ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تعریف ہی سے زمیندار اپنی ان اعلیٰ صفات کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں تحریک ہوئی کہ اپنے کو ان سے بری کر دیں۔ اس لئے کہ اکثر اہم ترین صنعتی ممالک میں حال میں انہوں نے بھی نامینی تدابیر کا مطالبہ کیا اور حاصل کر لیں۔ اگرچہ اس میں (جیسا کہ ہم دوسری جگہ بتا چکے ہیں) خود اُن کا بہت نقصان ہے۔ شروع میں جب زمینداروں نے قومی صنعت کے قیام کے لئے قربانیاں کیں تو انہوں نے وہی کیا جو جنگلی علاقہ کا ایک کاشتکار کرتا ہے یعنی اس لئے قربانی کرتا ہے کہ اس کے قریب کوئی آٹا پیسنے کی چکّی یا لوہا کاٹنے کا کارخانہ قائم ہو جائے لیکن اب جو زمیندار اپنی زراعت کے نامین کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ان پرانے زمینداروں کی ہوتی کہ جب ان کی مدد سے چکّی لگ گئی تو وہ چکّی والے سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اب چل کر اُنکے کھیت جوتنے میں مدد دے۔ بلاشبہ یہ ایک احمقانہ مطالبہ ہوتا (بات یہ ہے) کہ زراعت کو

ترقی ہو سکتی ہے، لگان اور زمین کی قیمت بڑھ سکتی ہے صرف اسی نسبت سے جس سے
کہ صنعت اور تجارت پھلیں پھولیں اور صنعتیں پھل پھول نہیں لا سکتیں اگر خام اجناس
اور کھانے پینے کی چیزوں کی درآمد محدود ہو۔ صنعت والوں نے ہر جگہ اسے محسوس کر
لیا ہے لیکن یہ بات کہ اکثر بڑی ریاستوں میں زمینداروں کو تامین حاصل ہو گئی دو وجوہ
پر مبنی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نیابتی ریاستوں میں قانون سازی پر ان کا اثر
غالب ہے اور دوسرے صنعت والوں نے اس ڈر سے ان کی احمقانہ خواہش کی جم کر
مخالفت نہ کی کہ اس سے یہ زمیندار آزاد تجارت کے اصول کے حامی ہو جائیں گے لہذا
انہوں نے زمینداروں کی بات ماننے میں ترجیح دی۔

پھر مذہب رائج نے زمینداروں کو اشارہ دیا کہ مصنوعی طریقوں سے صنعت
قائم کرنا ایسی ہی حماقت کی بات ہے۔ جیسے سرد ملکوں میں شیشہ خانوں میں شراب تیار
کرنا۔ صنعتیں خود بخود قدرت کے اصولوں کے مطابق پیدا ہوتی ہیں۔ سرمایہ کے
استعمال کا موقع صنعت کے مقابلہ میں زراعت میں کہیں زیادہ ہے، قوم کے سرمایہ
کو مصنوعی ترکیبوں سے انہیں بڑھایا جا سکتا، قانونی اور ریاست کی کارروائیوں سے
بس یہی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کسی ایسی جگہ لگا دیا جائے جہاں کم منافع ہو اور جہاں کہیں
سوائے اس کے چارہ ہی نہ تھا کہ زراعت پر صنعت کا اثر تعلیم کیا جائے۔ وہاں
کوشش کی گئی کہ اس اثر کو جتنا ہو سکے کم کر کے اور غیر متعین طریقہ سے بیان کیا جائے
مثلاً کہا گیا کہ صنعت کا زراعت پر اثر تو ضرور ہوتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جس

چیز سے صنعت کو نقصان پہنچے وہ زراعت کے لئے بھی مضر ہے؛ اور اِس طرح لگان
کے اضافہ پر بھی صنعت کا اثر ہوتا ہے لیکن بالواسطہ۔ برخلاف اس کے لگان پر براہِ
راست اثر ہوتا ہے۔ آبادی میں اضافہ کا، مویشیوں میں اضافہ کا، فنِ زراعت میں ترقی
کا، وسائلِ حمل ونقل کی تکمیل کا وغیرہ وغیرہ۔ اِس بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر کی تفریق
کا حال یہاں بھی وہی ہے۔ جو ان دوسری جگہوں پر ہے۔ جہاں مذاہبِ رائج نے یہ
تفریق کی ہے (مثلاً ذہنی دولت آفرینی کے سلسلہ میں) اور یہاں بھی وہی تمثیل عائد ہوتی
ہے جو ہم پہلے بھی پیش کر چکے ہیں؛ یعنی معاملہ ویسا ہی ہے جیسا کہ درخت کے پھل کا
کہ مذہبِ رائج کے نزدیک یہ بلاواسطہ ہے اِس لئے کہ ٹہنی پر لگتا ہے، جو شاخ کا
ایک پھل ہے، جو تنے کا ایک پھل ہے، جو جڑ کا ایک پھل ہے اور کہیں یہ جا کر زمین کا
بلاواسطہ پھل ہوتی ہے۔ اور کیا اسی قسم کی فسطائیت نہیں ہے کہ آبادی کو، مویشیوں کو،
وسائلِ حمل ونقل وغیرہ کو بلاواسطہ اور صنعت کو اضافہ لگان کی بالواسطہ وجہ بتایا جائے
حالانکہ ہر صنعتی قوم میں ظاہر طور پر یہ سبق ملتا ہے کہ صنعت خود آبادی، مویشیوں کی تعداد اور
وسائلِ حمل ونقل وغیرہ میں ترقی کی ایک خاص وجہ ہے۔ پھر یہ کونسی منطق ہے۔ کہ اِن
نتائج کو اپنے سبب یعنی صنعت کے ساتھ لگا دیا جائے، نہیں بلکہ انہیں اصل سبب مانا
جائے اور صنعت کو بالواسطہ بتا کر گویا ایک ضمنی سبب بنا دیا اور ان سے پیچھے ڈال دیا جائے،
اور جب آدم اسمتھ جیسا محقق ایسی اور ماہیتِ اشیاء کے منافی دلیل پیش کرے تو اس
کی تہ میں سوائے اِس ارادہ کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ صنعت کو قوم کی خوش حالی اور

طاقت اور خصوصاً لگان اور قیمت اراضی میں اضافہ پر اس کے اثر کو پس پشت ڈالا جائے، اور اس کی بھلا سوائے اس کے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایسے مباحث سے بچا جائے، جن کے نتائج سے بلند آہنگی کے ساتھ تامینی کارروائیوں کی حمایت ہو گی؟

لگان کی ماہیت کے متعلق اپنی تحقیقات میں مذہب رائج آدم اسمتھ کے وقت سے برابر بد نصیب ہی رہا ہے۔ رکارڈو اور اس کے بعد مل، مک کلاک اور دوسروں کا خیال ہے کہ لگان اس قدرتی صلاحیت دولت آفرینی کے لئے ادا کیا جاتا ہے جو قطعات زمین میں موجود ہوتی ہے۔ رکارڈو نے تو اس خیال پر پورا ایک نظام قائم کر دیا ہے اگر وہ کبھی کینیڈا گیا ہوتا تو ہر وادی میں، ہر پہاڑی پر وہ ایسے مشاہدات کرتا جس سے اُسے یقین آ جاتا کہ اُس کے نظریہ کی بنیاد ریت پر ہے۔ لیکن اس کے پیش نظر چونکہ صرف انگلستان کے حالات تھے اس لئے وہ اس غلط خیال میں مبتلا ہو گیا کہ یہ انگریزی ملکیت اور چراگاہیں جن کی مفروضہ قدرتی صلاحیت دولت آفرینی کے لئے آج ایسے خوب لگان ادا کئے جا رہے ہیں ہمیشہ سے ایسے ہی کھیت اور چراگاہیں تھیں۔ زمین کی اصلی صلاحیت دولت آفرینی اس قدر حقیر ہوتی ہے اور اپنے استعمال کرنے والے کو اس قدر کم فاضل پیداوار دیتی ہے کہ اس سے پیدا ہونے والا لگان مشکل ہی سے قابل ذکر ہوتا ہے۔ اپنی اصلی حالت میں پورا کینیڈا کا ملک جس میں بس شکاری بستے تھے گوشت اور کھالوں سے بمشکل اتنا لگان دے سکتا کہ آکسفورڈ میں معاشیات کے ایک استاد کی تنخواہ ادا ہو جاتی۔ مالٹا کی زمین کی فطری صلاحیت دولت آفرینی، ان پتھروں سے

عبارت ہے جو مشکل ہی سے کبھی لگان دے سکتے۔ اگر قوموں کی ترقی کی تاریخ دیکھیے، شکار سے گلہ بانی اور گلہ بانی سے زراعت میں تبدیلی پر نظر کیجیے تو نہایت آسانی سے یقین آجائے گا کہ ہر جگہ لگان پہلے صفر تھا اور ہر جگہ تہذیب و تمدن کی ترقی، آبادی میں اور ذہنی اور مادی سرمایہ میں اضافہ، کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ محض زرعی قوم کا مقابلہ ایک زرعی، صنعتی، تجارتی قوم سے کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسری صورت میں پہلی سے بیس گنا زیادہ آدمی لگان پر گزر کرتے ہیں۔ مثلاً مارشل کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۳۱ء میں انگلستان اور اسکاٹستان میں (۱۶۵۳۷۳۹۵) آدمی بستے تھے۔ جن میں سے (۱۱۱۶۳۹۸) لگان دار تھے۔ پولینڈ میں اتنے ہی بڑے رقبہ زمین پر بمشکل ان کی اتنی تعداد ملے گی۔ اور اگر عموم سے مخصوص حالات پر آئیے اور منفرد قطعات زمین کے لگان کے اسباب کی تحقیق کیجیے تو ہر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ لگان اس صلاحیت دولت آفرینی کا نتیجہ نہیں ہے جو قدرت نے اپنی طرف سے عطا فرمائی ہے بلکہ اس صلاحیت کا معاوضہ ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ اس پر ذہنی اور مادی محنت اور سرمایہ کے صرف سے اور مجموعی طور پر جماعتی زندگی کی تکمیل سے اس میں پیدا ہوتی ہے۔ بےشک ایسے قطعات اراضی بھی لگان دیتے ہیں جنہیں آدمی کا ہاتھ بھی نہیں لگا، مثلاً پتھر کی کانیں، ریت کے گڑھے، قدرتی چراگاہیں، لیکن یہ لگان صرف نتیجہ ہے گرد و پیش کے تمدن، سرمایہ اور آبادی کے بڑھنے کا۔ اس کے برخلاف وہ قطعات زمین بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن سے سب سے زیادہ لگان آتا ہے جن کی قدرتی صلاحیت دولت آفرینی یک قلم

نابود ہو چکی ہے اور جن سے سوائے اس کے اور کوئی کام نہیں نکلتا کہ لوگ اُن پر کھاتے پیتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، سوتے ہیں، کام کرتے ہیں، مزے اڑاتے ہیں، پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں یعنے عمارتوں کی زمین۔

لگان کی بنیاد وہ افادہ ہے جو زمین سے اُن اشخاص کو بلا شرکت غیرے حاصل ہوتا ہے جن کے تصرف کامل میں وہ ہوتی ہے اور اس افادہ کی مقدار منحصر ہوتی ہے۔ ذہنی اور مادی سرمایہ کی اس مقدار پر جو جماعت میں موجود ہو نیز اس سہولت پر جو اس زمین کے مخصوص موقع اور کیفیت سے اور اس پر پہلے سے جو سرمایہ لگا ہے اس کی وجہ سے مادی قدروں کے حاصل کرنے میں یا ذہنی و جسمانی احتیاجات کے رفع کرنے یا مسرتوں کے حاصل کرنے میں اس شخص کے لئے پیدا ہوتی ہیں جس کا اس پر کامل تصرف ہے۔

لگان ایسے سرمایہ کا سود ہے جو ایک قدرتی فنڈ سے وابستہ ہو گیا ہے یا ایسے قدرتی فنڈ کا سود ہے جو سرمایہ میں تحویل کر لیا گیا ہے۔ اس قوم کا علاقہ جس نے صرف زراعت کا کام دینے والے (اور وہ بھی اس نامکمل طریقہ سے جو صرف زراعت ہی کرنے کی صورت میں ہوتا ہے) قدرتی فنڈ کو سرمایہ میں تحویل کیا ہو اس قوم کے علاقہ سے کہیں کم لگان دیتا ہے۔ جس نے اس علاقہ میں زراعت اور صنعت کو یکجا کر لیا ہو۔ اس کے لگان دار زیادہ تر اس قوم میں بستے ہیں جو انہیں مصنوعات مہیا کرتی ہے لیکن جب زراعت اور آبادی کے لحاظ سے اچھی طرح ترقی یافتہ قوم خود اپنی صنعت قائم کرتی ہے تو جیسا کہ ہم ایک سابقہ باب میں جتا چکے ہیں، وہ صرف

ان قدرتی قوتوں کے سرمایہ میں تحویل نہیں کرتی جو خاص طور پر صنعت کے بلئے ہی مفید ہیں۔ بلکہ اکثر ان قوتوں کو بھی کرلیتی ہے جو زراعت کے لئے فائدہ رساں ہیں۔ لہٰذا اس صنعت کے قیام میں جو مادی سرمایہ لگانا ہوتا ہے اس کے سُود سے کہیں زیادہ لگان میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

باب (۲۱)

صنعت اور تجارت

اب تک ہم نے صنعت اور زراعت کے تعلقات ہی کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ یہی قومی دولت آفرینی کے بنیادی ارکان ہیں اور اس لئے بھی کہ جب تک ان کے باہمی تعلق کا واضح نقشہ سامنے نہ ہو۔ اُس وقت تک تجارت کے وظیفہ خاص اور اس کی حیثیت کو صحیح صحیح سمجھنا ناممکن ہے۔ بے شک تجارت بھی دولت آفریں ہوتی ہے جیسا کہ مذہب رائج کا دعویٰ ہے لیکن یہ دولت آفرینی صنعت اور زراعت سے بالکل جدا قسم کی ہے۔ صنعت اور زراعت سے اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ تجارت صرف زراعت والوں اور صنعت والوں میں، پیدا کرنے والے اور صرف کرنے والوں میں، مبادلہ اشیاء کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت کو صنعت اور زراعت کے اغراض اور ضروریات کے مطابق چلانا چاہیئے نہ کہ اُس کے برعکس۔

لیکن مذہب رائج نے اس اصول کو بالکل پلٹ دیا ہے اُنھوں نے بوڑھے

گھرانے کے ایک قول کو کہ "جو کرتے ہیں کرنے دو، جو ہوتا ہے سو ہونے دو" اپنا ماٹو بنا لیا ہے، ایک قول جو دکانداری کو نہیں بلکہ قزاقوں، چوروں اور فریب دینے والوں کو بھی اتنا ہی بھاتا ہے اور نہیں تو اس وجہ سے بطور اصول مشتبہ ہے۔ یہ الٹی بات کہ صنعت اور زراعت کے اغراض کو بے روک ٹوک تجارت کے مطالبات پر سے قربان کر دو بس اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے جو ہر جگہ بس قدروں کو دیکھتی ہے، کبھی قوتوں پر دھیان نہیں کرتی، اور ساری دنیا کو بس دکانداروں کی واحد و غیر منقسم جمہوریت سمجھتی ہے۔ مذہب رائج یہ نہیں دیکھتا کہ دکاندار تو اپنے مقصد کو، یعنی مبادلہ کے ذریعہ قدریں حاصل کرنے کے مقصد کو زراعت والوں کو نقصان پہنچا کر، قوائے دولت آفرین کو نقصان پہنچا کر، نہیں قوم کے استقلال اور خود مختاری تک کو نقصان پہنچا کر بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ ایک سی بات ہے اور اس کے کام اور شغل کی ماہیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کا ذرا خیال نہ کرے کہ وہ جو مال منگاتا ہے یا باہر بھیجتا ہے اس سے قوم کے اخلاق، خوش حالی اور طاقت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ زہر بھی اسی طرح منگاتا ہے، جیسے دوائیں۔ قوموں کی قوموں کو یہ افیون اور برانڈی سے کمزور کر دیتا ہے۔ اپنے مال کی درآمد سے یا اسے چوری چھپے سے منگا کر وہ لاکھوں کے لئے کام اور روٹی کا انتظام کر دیتا ہے یا یہ اس کی وجہ سے بھیک کے ٹکڑوں سے لگ جاتے ہیں۔ بحیثیت کاروباری آدمی کے اس سے کوئی سروکار نہیں، اسے بس اتنا کافی ہے کہ اس کے حساب میں نفع ہو۔ روٹی کے ٹکڑے سے محروم ہو جانے والے جب ہجرت کر کے

وطن کی مصیبت سے بچنا چاہتے ہیں تو اُن کے باہر بھیجنے کا انتظام کر کے بھی یاد رفقد ریں حاصل کرتا ہے۔ جنگ میں یہ دشمن کے ہاتھ اسلحہ اور سامان جنگ بیچتا ہے۔ ممکن ہو تو یہ کھیت اور چراگاہیں بھی پردیس میں لے جا کر بیچ دے۔ اور جب زمین کا آخری قطعہ بھی بک جائے تو اپنے جہاز پر بیٹھ کر اپنے کو بھی باہر بھیج دے۔

اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ ایک منفرد دکاندار کی غرض اور ایک پوری قوم کی تجارت کی غرض میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مانٹیگو نے اس مطلب کو خوب ادا کیا ہے۔ "جب ریاست انفرادی دکاندار پر پابندیاں عائد کرتی ہے تو عام تجارت کے فائدہ کے لئے اور اس کے کاروبار پر کہیں اس سے زیادہ پابندیاں نہیں ہوتیں جتنی کہ آزاد اور خوشحال قوموں میں اور کہیں اتنی کم نہیں ہوتیں جتنی کہ مطلق العنان حکومتوں کے زیر فرمان ممالک میں"۔ تجارت، صنعت اور زراعت سے پیدا ہوتی ہے اور کوئی قوم، جو دولت آفرینی کی ان دونوں اہم شاخوں کو اپنے ملک میں اچھی ترقی نہ دے سکے، اس زمانہ میں کوئی معتدبہ اندرونی یا بیرونی تجارت نہیں کر سکتی۔ اگلے وقتوں میں بے شک ایسے منفرد شہر ہوتے تھے یا شہروں کی جمعیتیں ہوتی تھیں جو پردیسی صنعت والوں اور پردیسی زراعت والوں کے ذریعہ اس قابل ہو جاتی تھیں کہ بڑے پیمانہ پر تجارت مبادلہ کر لیں، لیکن جب سے بڑی زرعی صنعتی تجارتی قومیں وجود میں آئی ہیں اس وقت سے ایسی بیچ کی تجارت کا پنپنا، جیسی کہ ہنزا والوں کی تھی، خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ اور بہر صورت ایسی تجارت اتنی غیر یقینی اور پرخطر ہوتی

ہے کہ اس تجارت کے مقابلہ میں جو خود اپنی دولت آفرینی پر مبنی ہو مشکل سے توجہ کی مستحق ہے۔

اندرونی تجارت کی اہم چیزیں یہ ہوتی ہیں:۔ کھانے پینے کی چیزیں، نمک، ایندھن، تعمیر کا سامان، کپڑا، زراعت اور صنعت کے آلات اور اوزار، اور صنعت کی ضرورت کے لئے زرعی معدنی اجناس خام۔ اس اندرونی تجارت کی مقدار ایک ایسی قوم میں جس میں صنعت اچھی ترقی کر چکی ہو محض زراعت والی قوم سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دونوں کا مقابلہ بھی ہو سکتا۔ دوسری صورت میں اہل زراعت اپنے صرف کو زیادہ تر خود اپنی پیداوار تک محدود رکھتے ہیں۔ چونکہ مختلف النوع چیزوں کی زیادہ مانگ نہیں ہوتی اور وسائل حمل ونقل کم ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے احتیاج کی چیزیں خود ہی پیدا کرتے ہیں بلا لحاظ اس کے کہ ان کی زمین کی مخصوص قوت دولت آفرینی کا تقاضا کیا ہے۔ چونکہ ذرائع مبادلہ کم ہوتے ہیں اس لئے جن مصنوعات کی احتیاج ہوتی ہے وہ بھی زیادہ تر خود ہی بنا لیتے ہیں۔ ایندھن اور تعمیر کے سامان کے لئے، کھانے پینے کی چیزوں اور معدنی پیداوار کی منڈی اس وجہ سے محدود ہوتی ہے کہ اپنے وسائل حمل ونقل کمیاب ہوتے ہیں اور وسیع پیمانہ پر حمل ونقل ممکن نہیں ہوتا۔ ان چیزوں کی منڈی چونکہ محدود ہوتی ہے اور مانگ کم اس لئے انہیں سینت کر رکھنے یا سرمایہ جمع کرنے کی ترغیب نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے محض زراعتی قوموں میں اندرونی تجارت میں لگا ہوا سرمایہ تقریباً صفر ہوتا ہے، لہٰذا سب پیداوار کی قیمت میں

جو موسم کے خاص طور پر زیر اثر ہوتی ہے۔ غیر معمولی اُتار چڑھاؤ ہوتے ہیں، اور قوم جس قدر اپنے کو محض زراعت تک محدود رکھتی ہے اُسی قدر گرانی اجناس اور قحط کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔

اندرونی تجارت (ملکی صنعت کی وجہ سے اور اس کی ترقی کی نسبت سے اور اس سے جو ترقی وسائل حمل ونقل میں ہوتی ہے اور جو اضافہ آبادی میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ایسی اہمیت حاصل کرتی ہے جو محض زراعت کرنے والی قوم کی اندرونی تجارت سے دس سے بیس گنی زیادہ اور اچھی سے اچھی تجارتِ خارجہ سے پانچ سے دس گنی تک ہوتی ہے۔ انگلستان کی اندرونی تجارت کا مقابلہ پولینڈ اور اسپین سے کیجئے تو اس بات کی تصدیق ہوجائے گی۔

منطقہ معتدلہ کی زرعی قوموں کی تجارتِ خارجہ اگر کھانے پینے کی چیزوں اور خام اجناس تک محدود ہے تو اِن وجوہ سے اہمیت نہیں حاصل کرسکتی۔

(۱) اِس لئے کہ زرعی قوم اپنے مال کی بکری کے لئے بس چند ہی قوموں کی پابند ہے جن کے یہاں خود بھی زراعت ہوتی ہے اور صنعت وتجارت کے پھیلاؤ کی وجہ سے محض زراعت والی قوم سے بہتر طریقہ پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے مال کی بکری کبھی یقینی نہیں ہوتی، کبھی یکساں نہیں رہتی، زرعی پیداوار کی تجارت ہمیشہ ایک غیر معمولی قسم کا سٹہ ہوتی ہے جس میں زیادہ تر فائدہ سٹہ کرنے والے دکانداروں کو ملتا ہے۔ زرعی قوم کے کاشتکاروں اور اس کی قوت وہ لت آزیں کے کام نہیں آتا۔

(۲) اس لئے کہ زرعی پیداوار اور پردیسی مصنوعات کے درمیان تعلق مبادلہ اکثر پردیسی تجارتی کارروائیوں اور جنگوں سے منقطع ہو جاتا ہے۔

(۳) اس لئے کہ زرعی پیداوار کی بکری سے صرف ان ممالک کو فائدہ پہنچتا ہے جو ساحل سمندر پر واقع ہوں کہ دریاؤں کے دہانوں کے قریب؛ اندرون ملک کو لینے زرعی قوم کے علاقہ کے بڑے حصّے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

(۴) اس لئے کہ پردیسی صنعتی قوم کبھی اس میں اپنا فائدہ دیکھ سکتی ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں اور خام اجناس کسی دوسرے ملک سے یا نئی بسی ہوئی نوآبادیوں سے خریدے مثلاً انگلستان میں جرمن اون کی جگہ آسٹریلیا سے اون منگاکر، فرانسیسی اور جرمن شراب کی جگہ اسپین، پرتگال، سسلی سے، ہسپانی اور پرتگیزی جزائر اور کیپ سے شراب منگاکر، پرشیا کی لکڑی کی جگہ کینیڈا سے منگاکر، ان چیزوں کی بکری کم کردی گئی۔ اور یہاں، اس کے انتظامات بھی تو ہو چکے ہیں کہ انگلستان کے لئے زیادہ تر روئی ہندوستان سے فراہم کی جائے۔ اگر انگریز قدیم تجارتی راستہ کو پھر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اگر ٹکساس کی نئی ریاست ذرا مضبوط ہو گئی، شام و مصر، میکسیکو اور جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں تہذیب و تمدن نے ترقی کی تو پھر شمالی امریکہ میں روئی بونے والے بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ملک کی اندرونی منڈی ہی سب سے یقینی، سب سے زیادہ یکساں اور سب سے زیادہ مستقل طلب کی ضمانت دار ہوتی ہے۔

معتدل آب و ہوا میں تجارت خارجہ کا بہت بڑا حصّہ ملکی صنعت سے پیدا

ہوتا ہے اور اسی کے ذریعہ قائم رہتا اور ترقی پاتا ہے۔ صرف وہ قوم جو ہر قسم کے مصنوعات سستی سے سستی تیار کرتی ہو۔ سب منطقوں میں رہنے والی اور ہر درجہ تہذیب کی قوموں سے تجارتی تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ سب احتیاجات کو رفع کر سکتی ہے، اور یہ نہ کر سکے تو نئی احتیاجات پیدا کر سکتی ہے اور ہر قسم کی کھانے پینے کی چیزیں اور خام اجناس مبادلہ میں لے سکتی ہے۔ صرف ایسی قوم جہازوں کو طرح طرح کی چیزوں سے لاد سکتی ہے کہ یہی ایک دُور دراز اور ویسی مصنوعات سے محروم منڈی کا تقاضا ہے۔ جب برآمد کے سامان سے سفر خرچ نکل آئے تب ہی واپسی میں کم قیمت مال لادا جا سکتا ہے۔

منطقہ معتدلہ کے ممالک کی اشیاء درآمد زیادہ تر منطقہ حارہ کی پیداوار پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثلاً شکر، روئی، کافی، تمباکو، چاء، رنگ، کوکو، مسالے اور وہ سب چیزیں جنہیں نوآبادیاتی مال کہتے ہیں۔ اِن چیزوں کے زیادہ تر حصّہ کی قیمت مصنوعات میں ادا کی جاتی ہے۔ یہی مبادلہ بڑی حد تک منطقہ معتدلہ کی صنعتی قوموں کی صنعتی ترقی اور منطقہ حارہ کے ممالک میں پیداوار زرعی اور تہذیب و تمدن کی ترقی کا سبب ہوتا ہے۔ یہی دراصل وسیع ترین پیمانہ پر تقسیم عمل اور قوائے دولت آفریں کے تعاون کی مثال ہے جیسی کہ قدیم زمانہ میں کہیں موجود نہ تھی، اور جسے ہالینڈ اور انگلستان والوں نے شروع کیا۔

راس اُمید کی طرف سے راستہ معلوم ہونے سے پہلے مشرقی ممالک صنعت

میں یورپ سے بہت آگے تھے۔ قیمتی دھاتیں، کچھ تھوڑے سے کپڑے، سستی کے سامان، اسلحہ، لوہے کے سامان، چند تعیش کی چیزوں کے سوا وہاں یورپی مال کا کام نہ تھا، خشکی کے سفر کی وجہ سے مال کا لے جانا گراں تھا لانا بھی، معمولی زرعی پیداوار اور عام مصنوعات کو اگر یہ بہت زیادہ فاضل مقدار میں پیدا بھی ہوتیں، مشرقی ممالک کے ریشمی اور سوتی کپڑے، شکر اور مسالوں کے عوض بھیجنے کا تو خیال بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے ہم اُس زمانہ کی مشرقی تجارت کی اہمیت کے متعلق جو کچھ بھی پڑھیں سامنے کہ اُسے اعتباری جانیں، بس وہ اس زمانہ کے لئے اتنی اہم تھی ورنہ آج جو حالت ہے اُس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہ تھی۔ منطقہ حارہ کی چیزوں کی تجارت یورپ کے لئے اہم تر ہو گئی۔ جب یورپ نے خود اپنے یہاں سے اور امریکہ سے بڑی مقداریں قیمتی دھاتوں کی حاصل کیں اور راس امید کے راستہ سے مشرقی ممالک کے ساتھ براہ راست تعلق ہو گیا لیکن پھر بھی اسے اس وقت تک کوئی عام اہمیت حاصل نہ ہو سکتی تھی جب تک مشرقی ممالک مصنوعات دیتے زیادہ اور لیتے کم تھے۔

اس تجارت کو موجودہ اہمیت اُس وقت حاصل ہوئی جب جزائر شرق الہند اور جزائر غرب الہند میں، شمالی اور جنوبی امریکہ یورپ والوں نے نو آبادیاں بسائیں، وہاں نیشکر، کافی، کپاس، دھان اور نیل وغیرہ کے پودے لیجا کر ان کی کاشت کی، امریکہ اور جزائر غرب الہند میں حبشیوں کو غلام بنا کر بسایا، ہندوستان کے اہل صنعت سے یورپ والوں نے کامیاب مقابلہ کیا اور دوسرے بّر اعظموں میں انگریزوں اور

ولندیزیوں کی حکومت کو توسیع ہوئی، چونکہ ان دونوں قوموں نے بخلاف ہسپانیوں اور پرتگیزوں کے استحصال بالجبر کی جگہ نوآبادیاتی مال سے مصنوعات کا مبادلہ کرنے میں اپنا زیادہ فائدہ سمجھا اور واقعی حاصل کیا۔

آج اس تجارت میں اُن کی عظیم الشان جہازرانی کا بڑا حصہ مشغول ہے اور یورپ کے اس تجارتی اور صنعتی سرمایہ کا بہت بڑا حصہ بھی جو تجارتِ خارجہ میں لگا ہوا ہے اور منطقۂ حارہ سے منطقۂ معتدلہ کے ممالک کو دسیوں کروڑ کا سامان جو ہر سال آتا ہے اس کی قیمت سوائے بعض نادر مستثنیات کے صنعتی مال ہی سے ادا کی جاتی ہے۔

مصنوعات کا مبادلہ نوآبادیاتی مال سے کرنا منطقۂ معتدلہ کے ممالک کے قواے دولت آفرینی کے لئے کئی طرح سے مفید ہوتا ہے۔ یہ مال مثلاً شکر، کافی، تمباکو یا تو زرعی اور صنعتی دولت آفرینی کے لئے محرک کا کام دیتا ہے یا کھانے پینے کے کام آتا ہے۔ نوآبادیاتی مال کی قیمت ادا کرنے کے لئے جن مصنوعات کی ضرورت ہوتی ہے اُن کی تیاری میں بہت سے لوگ کام کرنے میں مصروف رہتے ہیں، صنعت کے کاروبار اور کارخانوں کو بہت بڑے پیمانہ پر یعنے زیادہ فائدہ سے چلایا جا سکتا ہے، اس تجارت میں بہت سے جہاز، جہازران اور تاجر مشغول رہتے ہیں، اور آبادی میں توسیع اضافہ سے ملک کی زرعی پیداوار کی مانگ بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔

اس تعلق باہمی کی وجہ سے جو صنعت کی پیداوار اور منطقۂ حارہ کی پیداوار میں قائم ہو گیا ہے انگلستان کے باشندے فرانسیسیوں کے مقابلے میں اوسطاً دوگنا :

ننگنا نو آبادیاتی مال استعمال کرتے ہیں، جرمنوں کے مقابلہ میں ۳ یا ۴ گنا۔ اور پولینڈ کے مقابلہ میں پانچ یا دس گنا۔

اور اس نوآبادیاتی مال کی پیدائش میں توسیع کی جو گنجائش ہے اس کا اندازہ ہو سکے گا اگر ہم اس رقبہ زمین کا سرسری حساب لگائیں جو اس وقت کی تجارت کے لئے نوآبادیاتی مال کے پیدا کرنے میں کام آتا ہے۔ اگر ہم اس وقت روئی کا صرف ۱۰ ملین سنٹنر اور ایک ایکڑ زمین کی اوسط پیداوار ۸ سنٹنر مانیں تو اس کے پیدا کرنے کے لئے ۱¼ ملین ایکڑ زمین سے زیادہ درکار نہیں ہے۔ اسی طرح تجارت میں جو شکر آتی ہے اس کی مقدار ۲۴ ملین سنٹنر اور ایک ایکڑ زمین کی پیداوار ۲۰ سنٹنر فرض کریں تو اس تمام مقدار کے لئے صرف ۱¼ ملین ایکڑ کی ضرورت ہے اور اگر باقی چیزوں کے لئے (کافی، چاول، نیل، گرم مسالے وغیرہ) بھی اسی قدر زمین کی ضرورت فرض کر لی جائے کہ ان دو خاص خاص چیزوں کے لئے ہے تو اس وقت تجارت میں جتنا نوآبادیاتی مال آتا ہے اس سب کے سب کے لئے ۶ یا ۸ ملین ایکڑ زمین کی ضرورت ہوگی جو غالباً اس رقبہ کا پچاسواں حصہ بھی نہیں ہے جو ان چیزوں کی پیداوار کے لئے موزوں ہے اور حال ہی میں انگریزوں نے ہندوستان میں، فرانسیسیوں نے الجیریا میں اور ولندیزیوں نے جاوا اور سماٹرا میں اس مال کی پیداوار میں غیر معمولی وسعت کے امکانات کو ثابت کر دیا ہے۔

خصوصاً انگلستان نے ہندوستان سے اپنی روئی کی درآمد کو چوگنا کر دیا ہے

اور انگریزی اخبارات نہایت وثوق سے لکھتے ہیں کہ اگر انگلستان کو ہندوستان کے پہلے تجارتی راستہ پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تو چند سال کے اندر وہ اپنے نوآبادیاتی مال کی تمام ضرورتوں کو ہندوستان ہی سے پورا کرے گا اور اگر ہندوستان میں انگریزی مملکت کی بے پایاں وسعت، اس کی زرخیزی اور ان ممالک میں اجرت کی کمی پر بھی خیال کیا جائے تو اس امید میں چنداں مبالغہ نہ نظر آئیگا۔

انگلستان جب اس طرح سے ہندوستان سے فائدہ اٹھائے گا تو جزائر میں ولندیزیوں کی کاشت کی ترقی بھی جاری رہے گی، ترکی سلطنت کے انتشار کی وجہ سے افریقہ اور مغربی اور وسطی ایشیا کے بڑے حصوں میں بھی یہ پیداوار ہوسکے گی، ٹکساس کے لوگ تمام میکسیکو میں شمالی امریکہ کی تہذیب پھیلا دیں، جنوبی امریکہ میں منظم حکومتیں قائم ہو جائیں گی اور اس سے ان گرم ملکوں کی پیداوار میں بے حساب ترقی ہو گی۔

جب منطقہ حارہ کے ممالک نوآبادیاتی مال کی اتنی بڑی مقداریں پیدا کر لیں گے تو انہیں منطقہ معتدلہ کے ممالک سے مصنوعات کی اب سے زیادہ مقداریں لینے کے ذرائع ہاتھ آجائیں گے۔ اور جب مصنوعات کی اتنی زیادہ بکری ہو گی تو ان (منطقہ معتدلہ کی) قوموں کو اب سے بہت زیادہ نوآبادیاتی مال صرف کرنے کا موقع ملے گا۔ پیداوار کے اس اضافہ اور ذرائع مبادلہ میں اضافہ سے منطقہ حارہ کے زرعی ممالک اور منطقہ معتدلہ کے صنعتی ممالک میں تجارت مبادلہ یعنی تجارت عالم

کہ آئندہ اس سے کہیں زیادہ ترقی ہوگی جتنی کہ پچھلی صدی میں ہوئی ہے۔ اس تجارت کی موجودہ اور متوقع ترقی کی وجہ کچھ تو صنعت کی دولت آفرینی میں ترقی ہے، کچھ خشکی اور تری پر وسائلِ حمل و نقل کی تکمیل اور کچھ سیاسی واقعات اور رجحانات۔

مشینوں اور ایجادوں نے مشرق کے ناقص طریقۂ صنعت کو یورپ کی قوت صنعتی کے فائدہ کے لئے بالکل نابود کر دیا ہے۔ اور اب یورپ اس قابل ہو گیا ہے کہ منطقہ حارہ کے ممالک کو مصنوعات کی بڑی بڑی مقداریں سستے سے سستے داموں پر بھیجے اور اس طرح اُن کے لئے اپنی محنت اور قوائے دولت آفرین کے بڑھانے کی محرک بنے۔

وسائل حمل و نقل کی تکمیل سے منطقہ حارہ کے ممالک منطقہ معتدلہ کے ملکوں سے بہت قریب ہو گئے ہیں، خطرات کم ہو گئے ہیں، وقت اور کرایوں میں تخفیف ہو گئی ہے، باضابطگی بڑھ گئی ہے، اس لئے ان ممالک کے باہمی ربط ضبط کو بے شمار فوائد پہنچے ہیں، اور ابھی اور بے حساب فائدے پہنچیں گے۔ جب وخانی جہازرانی عام ہو جائے گی اور ریلوں کے جال ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ملک کے اندر تک پہنچ جائیں گے۔

جنوبی امریکہ کے اسپین اور پرتگال سے جدا ہو جانے اور سلطنت ترکی کے منتشر ہو جانے سے دُنیا کے کئی سب سے زیادہ دولت آفریں ممالک آزاد ہو گئے

ہیں۔ اور اب بڑے ارمان سے اس کے منتظر ہیں کہ دُنیا کی متمدّن قومیں پُرامن سمجھوتہ کے ساتھ تحفّظ قانونی، نظم، تہذیب اور خوش حالی کی راہ پر اُن کی راہ نمائی کریں۔ یہ ملک اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ اُن کے یہاں مصنوعات بھیجی جائیں اور ان کی زرعی پیداوار کو قیمت کے عوض قبول کر لیا جائے۔

صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہاں یورپ اور شمالی امریکہ کے ان تمام ممالک کے لئے جنہیں خود اپنی صنعتی قوت کو ترقی دینے کی صلاحیت ہے، اس بات کا کافی موقع ہے کہ وہ اپنی صنعت کو فروغ دیں، گرم ممالک کی پیداوار کا صرف بڑھائیں اور اسی نسبت سے منطقہ حارہ کے ممالک سے اپنی براہِ راست تجارت کو وسعت دیں۔

باب (۲۲)

صنعت اور جہاز رانی، بحری قوت اور نو آبادیاں

صنعت چونکہ اندرونی اور خارجی تجارت کی بنیاد ہے اس لئے استدیہ جہاز رانی کی بھی شرط اوّل ہے۔ چونکہ اندرونی حمل ونقل کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اہل صنعت کے لئے ایندھن، تعمیری سامان، خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزیں پہنچاتے۔ اس لئے محض زرعی ملک میں تو ساحلی اور دریائی جہاز رانی بھی فروغ نہیں پا سکتی اور یہی ساحلی جہاز رانی ملاحوں، جہاز کے کپتانوں اور جہاز سازی کے لئے مدرسہ اور مرکز اقامت کام دیتی ہے۔ اس لئے خالص زرعی ملک میں تو بڑی جہاز رانی کی پہلی بنیاد ہی موجود نہیں ہوتی۔

جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں بتا چکے ہیں بین الاقوامی تجارت زیادہ تر یوں پیدا ہوتی ہے کہ صنعتی مال کا مبادلہ خام اجناس سے اور خاصکر منطقہ حارہ کی پیداوار سے کیا جاتا ہے منطقہ معتدلہ کی زرعی قومیں منطقہ حارہ کے ممالک کو بس وہ چیزیں دے جو یہ خود پیدا کرتے ہیں یا جسے یہ کام میں نہیں لا سکتے یعنی اجناس خام اور کھانے پینے

کی چیزیں ہیں۔ اس لیئے اس کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان بیرا و منطقہ حارہ کے ممالک میں براہ راست کوئی تجارت یا جہاز رانی ہو سکے۔ ان کا نو آبادیاتی مال کا صرف ایسی اس حد تک ہونا چاہیئے جہاں تک یہ اس کی قیمت صنعتی اور تجارتی قوموں کے ہاتھ اپنی زرعی پیداوار اور خام اجناس بیچ کر ادا کر سکیں، لہذا ضروری ہوا کہ یہ ان چیزوں کو کسی اور کی وساطت سے حاصل کریں اور جب کبھی ایک زرعی قوم اور ایک صنعتی تجارتی قوم میں باہم تجارت ہو گی تو بحری باربرداری کا بڑا حصہ صنعتی، تجارتی قوم کو ملے گا چاہے وہ تاوان جہاز رانی کے ذریعہ سب کچھ اپنے ہی پاس نہ بھی رکھ سکے۔

اندرونی اور بین الاقوامی تجارت کے علاوہ بحری ماہی گیری میں بھی بہت سے جہاز کام میں آتے ہیں لیکن اس سے بھی زرعی قوم کو معمولاً کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس لیئے کہ اس کے یہاں سمندر کی چیزوں کی زیادہ مانگ تو ہو نہیں سکتی، دوسرے صنعتی تجارتی قومیں اپنی بحری قوت کے خیال سے اپنی ملکی منڈی کو اکثر صرف اپنے ہی ماہی گیروں کے لیئے محفوظ کر دیتی ہیں۔

بحری تجارتی بیڑہ ہی سے جنگی بیڑہ بھی اپنے ملاح اور ناخدا حاصل کرتا ہے اور تجربہ نے ہر جگہ ثابت کیا ہے کہ بری فوج کی طرح اچھے ملاحوں کو جلدی سکھا سکھا کر تیار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ لازمی ہے کہ ساحلی جہاز رانی میں، بین الاقوامی جہاز رانی میں اور بحری ماہی گیری میں ان کی تربیت ہو۔ قوموں کی بحری قوت اسی درجہ پر ہو گی جس پر بحری کاروبار کی یہ شاخیں ہوں گی، لہذا خالص زرعی قوم کے یہاں یہ قوت صفر ہو گی۔

صنعتی قوت کا، اس سے پیدا ہونے والی تجارت داخلی اور خارجی کا، ساحلی اور بحری جہاز رانی اور بحری ماہی گیری کا اور آخر میں متمول بحری قوت کا سب سے بڑا پھل، نوآبادیاں ہیں۔

اصلی ملک اپنی نوآبادیوں کو مصنوعات کھینچتا ہے اور ان کے بدلہ میں ان کی فاضل زرعی پیداوار اور خام اجناس منگاتا ہے۔ اس مبادلہ سے اس کی صنعت میں جان پڑتی ہے، آبادی بڑھتی اور خود اپنی زرعی پیداوار کی مانگ میں اضافہ ہوتا ہے اور جہاز رانی اور بحری قوت کو ترقی ہوتی ہے۔ وطن کی فاضل آبادی، فاضل سرمایہ اور فاضل حوصلہ مندی کے لئے نوآبادیوں میں ایک مفید نکاسی کی صورت نکل آتی ہے اور اس کی تلافی وطن کے لئے مع سود کے یوں ہو جاتی ہے کہ جو لوگ نوآبادیوں میں مالدار بنتے ہیں ان کا بڑا حصہ وہاں کے جمع کئے ہوئے سرمایہ کو پھر وطن کی گود میں لا ڈالتا ہے یا وطن میں آکر وہاں کے لگانوں کو صرف کرتا ہے۔

زرعی قوموں کے پاس ایک تو نوآبادیاں بسانے کے ذرائع ہی نہیں ہوتے۔ دوسرے ان میں نوآبادیوں سے فائدہ اٹھانے اور انہیں قائم رکھنے کی قوت نہیں ہوتی۔ نوآبادیوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ انہیں دے نہیں سکتیں اور جو کچھ دے سکتی ہیں وہ نوآبادی کے پاس خود ہی ہوتا ہے۔ مصنوعات اور زرعی پیداوار کا مبادلہ موجودہ نوآبادیاتی تعلق کی شرط لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ انگلستان سے اسی وقت الگ ہوگئیں جس وقت انہیں احتیاج

محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے اندر یہ طاقت پائی کہ اپنی چیزیں آپ بنائیں، اور خود ہی منطقہ حارہ کے ممالک سے جہازرانی اور تجارت کریں۔ اسی وجہ سے کینیڈا ابھی جونہی کہ اس درجہ پر پہنچا الگ ہوجائیگا۔ اس وجہ سے زمانہ گزرنے پر آسٹریلیا میں بھی منطقہ معتدلہ کے ممالک میں زرعی، صنعتی، تجارتی ریاستیں وجود میں آجائیں گی۔

لیکن منطقہ معتدلہ اور منطقہ حارہ کے ممالک میں مبادلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قدرتی اسباب پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی خود مختاری کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے اپنی صنعت بھی انگلستان کے ہاتھ کھو ڈالی، اسی وجہ سے ایشیا اور افریقہ کے منطقہ حارہ والے سب مشرقی ممالک رفتہ رفتہ منطقہ معتدلہ کی صنعتی، تجارتی قوموں کے زیر فرمان آ جائیں گے۔ اسی وجہ سے منطقہ حارہ کے جزیرے اس وقت نوآبادیاں ہیں وہ مشکل ہی سے کبھی اپنے کو اس تعلق سے آزاد کرسکیں گے؛ اسی وجہ سے جنوبی امریکہ کی ریاستیں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں صنعتی۔ تجارتی قوموں کی دستنگر رہیں گی۔

انگلستان کے بے پایاں نوآبادیانی مقبوضات اس کی غالب صنعت ہی کی وجہ سے ہیں۔ اگر یورپ کی دوسری قومیں بھی اس سود بخش کاروبار میں حصہ بٹانا چاہتی ہیں، ویران ملکوں کو زیر کاشت لانا اور وحشی قوموں کو اور ان پرانی متمدن قوموں کو جو پھر وحشی ہوگئی ہیں مہذب و متمدن بنانا چاہتی ہیں تو انہیں اپنی ملکی

صنعت، اپنی جہازرانی اور اپنی بحری قوت کو ترقی دے کر یہ کام شروع کرنا چاہئے اور اگر ان کی اس کوشش میں موجودہ صنعتی، تجارتی اور بحری تفوق رکاوٹ ڈالے تو ان ناجائز دعاوی کو معقولیت کے درجہ پر لانے کے لئے بس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ آپس میں اپنی قوتوں کا اتحاد ہے۔

باب (۲۳)

صنعت اور زر

اگر پچھلے پچیس برس کے تجربہ نے ان اصولوں کو ایک حد تک صحیح ثابت کیا ہے جو مذہب رائج نے نام نہاد تجارتی مذہب کے خیالات کے خلاف قیمتی دھاتوں کی گردش اور توازن کے متعلق پیش کئے تھے تو اسی تجربہ نے مذکورہ بالا موضوع کے متعلق نظریہ رائج کی خامیوں کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔

تجربہ نے بار بار اور خصوصاً روس اور شمالی امریکہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان زرعی قوموں کے ہاں جن کی مصنوعات کی منڈی ایک ایسی قوم کے آزاد مقابلہ کے لئے کھلی ہوئی ہے، جس نے صنعتی تفوق حاصل کر لیا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنوعات کی قیمت زرعی پیداوار کی برآمد کی قیمت سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ یکایک ملک سے قیمتی دھاتیں غیر معمولی مقدار باہر نکل جاتی ہیں جس سے زرعی قوم کی معیشت میں خصوصاً اگر اس کا اندرونی کاروبار زیادہ تر زر کاغذی پر مبنی ہو، سخت انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور ایک قومی مصیبت

رُو نما ہو جاتی ہے۔

نظریۂ رائج کا دعوٰے ہے کہ قیمتی دھاتیں بھی اسی طرح فراہم کی جاتی ہیں جیسے اور کوئی دوسری چیز، یہ بات ایک سی ہے کہ دھات کی کم مقدار گردش میں ہے یا زیادہ، اس لئے کہ کسی چیز کا سستا یا مہنگا ہونا قیمت اشیاء کے باہمی تناسب پر مبنی ہے۔ اگر شرح مبادلہ مساوی نہ رہے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ملک سے زیادہ برآمد ہو جس کی موافقت میں یہ شرح اس وقت ہے۔ لہٰذا زرا ور برآمد درآمد کا توازن اور قوم کے سب دوسرے معاشی معاملات کا انتظام بہترین طریقہ سے اور سب سے یقینی طور پر خود قدرت کر دیتی ہے۔

یہ استدلال قوم کی اندرونی تجارت کے متعلق تو بالکل صحیح ہے، شہر شہر میں، شہر اور دیہات میں، صوبہ صوبہ میں، یا اتحاد تجارتی میں ریاست ریاست میں جو تجارت ہوتی ہے اس پر یہ ٹھیک اترتا ہے۔ اس معاشی کی حالت قابل افسوس ہو گی جو یقین کرتا ہو کہ امریکی جرمن اتحاد تجارتی کی ریاستوں میں یا انگلستان، اسکاٹلستان اور آئرستان کے مابین توازن برآمد و درآمد کا انتظام آزاد تعلق کی نسبت سرکاری کارروائیوں اور قانون سے بہتر طریقہ پر کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دنیا کی مختلف ریاستوں میں اس قسم کا اتحاد موجود ہے تو پھر نظریۂ رائج کا استدلال حقیقت حال کے بالکل مطابق ہوگا لیکن اگر کوئی دنیا کے موجودہ حالات میں یہ یقین کرتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت میں معاملات کی صورت یہ ہے تو پھر تجربہ

اس کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔

اس وقت خود مختار قوموں کی درآمد برآمد اس کے مطابق نہیں ہے جسے نظریۂ رائج حقیقتِ حال کہتا ہے بلکہ زیادہ تر اُن کا دار و مدار ہے قوم کی تجارتی سیاست اور قوت پر، دنیا کے حالات اور دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں اس کے اثر پر، نوآبادیوں کے قبضہ میں ہونے پر، ملک میں اعتبار کے اداروں پر، یا صلح و جنگ پر، یہاں سارے معاملات اس سے بالکل مختلف طریقہ پر ہوتے ہیں جیسے کہ ان جماعتوں کے مابین ہونے چاہئیں۔ جن میں سیاست، قانون اور نظم ملکی کے بندھن باندھ کر امن دائمی اور اغراض کا کامل اتحاد پیدا کر چکے ہوں۔

مثال کے طور پر انگلستان اور امریکہ کے تعلقات لیجئے۔ اگر انگلستان کبھی شمالی امریکہ کی منڈی میں بہت زیادہ مصنوعات لاڈ تا ہے، اگر انگلستان کا بنک اپنی کٹوتی کی شرح بڑھا گھٹا کر غیر معمولی طور پر شمالی امریکہ کو برآمد میں اور اُسے جو مال اعتبار پر دیا جاتا ہے اس میں بہت کچھ بیشی یا کمی کر سکتا ہے، اگر وہ اس طریقہ سے امریکہ کی مصنوعات کی منڈی کو اتنا غیر معمولی طور پر بھر دے کہ انگریزی مصنوعات امریکہ میں خود انگلستان سے بھی سستے مل سکتے بلکہ کبھی کبھی مصارف پیدائش سے بھی کم پر مل جائیں، اگر اس ترکیب سے شمالی امریکہ دائمی طور پر انگلستان کا مقروض ہو جائے، انگلستان کے ساتھ اس کی شرح مبادلہ ناموافق ہو جائے تو آزاد تجارت میں کیسے نتیجے آسانی سے اپنی اصلاح آپ کر لے گی۔ شمالی امریکہ تنبا کو، تعمیر کے کام کی لکڑی،

غلہ اور کھانے پینے کا سامان انگلستان سے کہیں سستا پیدا کرتا ہے، جتنے زیادہ انگریزی مصنوعات شمالی امریکہ کو جائیں گے اتنی ہی امریکن کاشتکار کو تحریک ہوگی اور اتنے ہی وسائل اس کے ہاتھ آئیں گے کہ اتنی ہی قدر کی چیزیں وہ بھی پیدا کرے، اسے اعتبار پر جتنا زیادہ دیا جائے گا، اتنا ہی یہ محرک قوی ہوگا کہ اپنے واجبات پورے کرنے کے ذرائع حاصل کرے، انگلستان سے شرح مبادلہ جس قدر شمالی امریکہ کے خلاف ہوگی اتنی قدر زیادہ اس بات کی ترغیب ہوگی کہ امریکہ سے زرعی پیداوار کی برآمد بڑھے اور اسی قدر کامیابی کے ساتھ امریکن کاشتکار انگلستان کی زرعی منڈی میں مقابلہ کرسکیں گے۔

برآمد کے اس اضافہ سے شرح مبادلہ میں جلد توازن پیدا ہو جائے گا، بلکہ بہت زیادہ عدم توازن پیدا ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی، اس لئے کہ شمالی امریکہ کے لوگ یقین کے ساتھ پہلے سے جانتے کہ اس سال میں مصنوعات کی بہت زیادہ درآمد سے جو قرض ہوگیا ہے وہ اگلے سال کی فاضل زرعی پیداوار کی برآمد کے بڑھنے سے برابر ہو جائے گا، چنانچہ زر اور اعتبار کے بارے میں کچھ نہ کچھ مفاہمت پہلے ہی سے ہو جاتی ہے۔

حالات کی صورت یہ ہوتی کہ اگر انگلستان کے صنعت والوں اور امریکہ کے زراعت والوں میں لین دین اس قدر آزاد اور بے پابندیوں کے ہوتا جیسا کہ انگریز اہل صنعت اور آئرستانی کاشتکاروں کے درمیان ہے۔ لیکن صورت دوسری ہوگی

اور لازم ہے کہ دوسری ہو جب انگلستان امریکن تمباکو پر پانسو تا ہزار فیصدی کا محصول درآمد لگا دے، اپنے محاصل کے ذریعہ امریکن تعمیری لکڑی کی درآمد کو ناممکن کر دے اور امریکہ سے کھانے پینے کی چیزیں صرف قحط کی صورت میں اپنے یہاں آنے دے، اس لئے کہ اس صورت میں امریکن زراعت کی پیداوار اپنے کو انگریزی مصنوعات کے صرف کے برابر نہیں کر سکتی۔ اب مصنوعات کا قرض زرعی پیداوار کی شکل میں ادا نہیں کیا جا سکتا ہے، اب انگلستان کو امریکن برآمد پر سخت پابندیاں ہیں اور شمالی امریکہ میں انگریزی مصنوعات کی برآمد بے حد پابندی ہے، اب دونوں ملکوں کے درمیان شرح مبادلہ میں توازن نہیں پیدا ہو سکتا، اب امریکہ کو اپنا قرض برابر کرنے کے لئے قیمتی دھاتیں انگلستان بھیجنی ہوں گی۔

لیکن قیمتی دھاتوں کے باہر بھیجنے سے امریکن زر کاغذی کے نظام کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی اور لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکن بنکوں کی ساکھ ختم ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے زمین کی اور جو جو چیزیں اس وقت تجارت میں موجود ہیں سب کی قیمتوں میں انقلاب ہو جائے گا، غرض قیمتوں کا اور اعتبار کا وہ انتشار رونما ہوگا جو قوم کی حیثیت کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور جو ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی امریکہ کی آزاد ریاستوں پر ہمیشہ نازل ہوتا ہے، جب کبھی وہ محاصلی تدابیر اختیار کر کے اپنی درآمد و برآمد میں توازن قائم نہیں کرتیں۔

شمالی امریکہ والوں کو اس بات سے کیا تسلی ہو سکتی ہے کہ دیوالوں کے باعث

اور صرف میں کمی ہو جانے کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد دونوں ملکوں کی درآمد اور برآمد میں کم و بیش ٹھیک نسبت قائم ہو جاتی ہے اس لیئے کہ تجارت اور اعتبار کی تباہی اور انتشار اور صرف میں کمی کے ساتھ افراد کی خوش حالی اور چین کے لیئے اور نظم عام کے لیئے بہت سی مضرتیں وابستہ ہیں جن سے بچنا ممکن نہیں ہوتا اور اگر بار بار ان کی تکرار ہو تو لازم ہے کہ مستقل طور پر مضر اثرات پیدا ہوں۔

اس سے بھی کم تسکین شمالی امریکہ والوں کو اس وقت پہنچ سکتی ہے جب نظریۂ رائج یہ بتلائے کہ یہ ایک سی بات ہے کہ قیمتی دھاتوں کی زیادہ مقدار گردش میں ہو یا کم، چیزوں کا مبادلہ تو چیزوں سے ہوتا ہے، اس مبادلہ میں ذریعہ دھات کی بڑی مقدار ہے یا چھوٹی، یہ بات فرد کے لیئے برابر ہے۔ بے شک کسی چیز کے بنانے والے یا مالک کے لیئے یہ بات ایک سی ہو سکتی ہے کہ اس چیز کی قیمت سو سانتیم ہے یا سو فرانک، بشرطیکہ وہ سو سانتیم سے بھی اپنے لیئے رفع احتیاج اور حصول حظ کے اتنے ہی ذرائع فراہم کر سکے جتنے ۱۰۰ فرانک سے۔ نیچی یا اونچی قیمتیں اسی حالت میں ایک سی ہو سکتی ہیں جب کہ عرصہ تک اسی جگہ قائم رہیں۔

لیکن اگر ان میں جلد جلد اور شدت کے ساتھ کمی بیشی ہو تو ایسی بے ترتیبیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے ہر فرد کی اور جماعت کی معیشت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ جس نے چڑھی ہوئی قیمت پر اجناس خام خریدی ہوں وہ اتری ہوئی قیمتوں پر اپنی مصنوعات بیچ کر قیمتی دھاتوں کی وہ مقدار حاصل نہیں کر سکتا جو اس نے خام اجناس

کے لیئے دی تھی جس نے چڑھی ہوئی قیمت پر غیر منقولہ جائداد خریدی تھی اور قیمت کا ایک حصّہ اسی زمین کو رہن رکھ کر اپنے اوپر بطور قرض رہنے دیا تھا۔ اُس کی ادائیگی کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور ملکیت بھی، اِس لیئے کہ قیمتیں گھٹنے پر شاید ساری املاک کی قیمت بھی قرض رقم کے برابر نہ ہو۔ جو چڑھی ہوئی قیمتوں کی حالت میں پٹّے کرتا ہے۔ وہ قیمت گھٹنے پر تباہ ہو جاتا ہے یا اس قابل نہیں رہتا کہ شرائط پٹہ کو پورا کر سکے قیمتوں میں جتنا اتار چڑھاؤ زیادہ ہوتا ہے اور یہ اتار چڑھاؤ جتنا بار بار ہوتا ہے اُتنا ہی قوم کی معاشی حالت اور خصوصاً اعتبار پر اُس کا اثر مضر پڑتا ہے لیکن قیمتی دھاتوں کی غیر معمولی مقداروں کے اندر آنے اور باہر جانے سے جو مضر اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ کہیں اس قدر تیز روشنی میں سامنے نہیں آتے جتنے اُن ملکوں میں جو اپنی مصنوعات کی احتیاج رفع کرنے اور اپنی زرعی پیداوار کے بیچنے کے لیئے دوسری قوموں کے بالکل پابند ہوں اور جن کا لین دین زیادہ تر زر کاغذی پر مبنی ہو۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ بنک نوٹوں کی وہ تعداد جو کوئی ملک گردش میں لا سکتا اور رکھ سکتا ہے زر فلزاتی کی اس مقدار پر منحصر ہے جو اس ملک میں موجود ہو۔ ہر بنک اپنے کاروبار کو اپنے زر کاغذی کو قیمتی دھاتوں کی اس مقدار کے مطابق گھٹانے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی تجوریوں میں رکھا ہو۔ اگر اس سرمایۂ زر میں یا امانتوں کی رقموں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے تو وہ اعتبار پر زیادہ رقم دے گا، اور یوں اعتبار پر دے کر اپنے قرضداروں کو اعتبار پر زیادہ دینے کے قابل بنائیگا اور اس طریقے سے صرف

اور قیمتوں کو خصوصاً جائداد غیر منقولہ کی قیمتوں کو بڑھا دے گا۔ اگر برخلاف اس کے یہ محسوس ہو رہا ہو کہ قیمتیں دھاتیں کم ہو رہی ہیں تو اپنے اعتبار کے کام کو کم کریگا اور اس طرح اپنے قرضداروں کے اعتبار اور صرف کو کم کرے گا۔ اور اس طرح آگے ان تک کرتا چلا جائیگا جو باہر سے آئے ہوئے مصنوعات کو اعتبار پر (اُدھار) لیکر صرف کرتے ہیں چنانچہ ایسے ممالک میں زر فلزاتی کے غیر معمولی طور پر باہر چلے جانے سے سارا نظامِ اعتبار، مصنوعات اور زرعی پیداوار کی منڈیاں اور خاص طور پر تمام جائداد غیر منقولہ کی نذر (قیمت) میں سخت گڑبڑ پیدا ہو جائے گی۔

لوگوں نے کوشش کی ہے کہ امریکہ میں حال کی اور اس سے پہلے کی سخت تجارتی کساد بازاری کا سبب امریکہ کے بنک (ساہوکارہ) اور زر کاغذی کے نظام میں تلاش کریں لیکن سچ یہ ہے کہ اگرچہ بنکوں نے متذکرہ بالا طریق سے اس میں حصہ لیا ہے لیکن اس کی اصلی وجہ ظہور یہ ہے کہ "کمپرومائز بل" (Compromise Bill) کے اجراء کے وقت سے انگریزی مصنوعات کی قیمت امریکن زرعی پیداوار کی قیمت کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئی ہے اور اس وجہ سے یہ آزاد امریکن ریاستیں انگریزوں کی سینکڑوں کروڑ کی مقروض ہو گئی ہیں۔ اور اس قرض کو زرعی پیداوار کی شکل میں ادا نہیں کر سکتیں۔ اس بات کا ثبوت کہ یہ کساد بازاری کے دورے غیر متناسب درآمد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یہ ہے کہ یہ دورے ہمیشہ اس وقت ظہور پذیر ہوئے جب کبھی امن قائم ہونے کی وجہ سے یا محاصل میں کمی کے باعث شمالی امریکہ میں مصنوعات کی درآمد غیر معمولی طور پر زیادہ ہوئی اور یہ کبھی

ظہور پذیر نہیں ہوئے جب تک کہ محاصلِ درآمد کے نظام کے ذریعہ مصنوعات کی درآمد کو زرعی پیداوار کے برآمد کے برابر رکھا گیا۔

کساد بازاری کے اِن دوران کا الزام اس کثیر سرمایہ کے سر بھی تھوپا گیا ہے جو ان آزاد ریاستوں میں نہروں اور ریلوں پر لگا ہے اور جو زیادہ تر انگلستان سے قرض لیکر فراہم کیا گیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان قرضوں نے اس دورہ کو کئی سال تک روکا۔ البتہ جب وہ شروع ہوا تو اسے شدید تر بنا دیا، لیکن خود یہ قرضے بھی تو اسی درآمد اور برآمد کے عدم تناسب کی وجہ سے لیے گئے، یہ عدم تناسب نہ ہوتا تو یہ قرضے نہ لیے جاتے بلکہ لیے جا ہی نہ سکتے۔

اب چونکہ شمالی امریکہ انگریزی مصنوعات کی کثیر درآمد کے باعث انگریزوں کو بڑی رقموں کا قرضدار ہو گیا ہے جسے زرعی پیداوار کی شکل میں نہیں بلکہ قیمتی دھاتوں ہی کی شکل اتارا جا سکتا ہے اس لئے انگریزوں کے لئے یہ ممکن ہوا اور غیر مساوی شرح مبادلہ اور شرح سود کی وجہ سے ان کے لئے مفید بھی کہ وہ یہ رقم امریکن ریلوں، نہروں اور بنکوں کے حصوں کی شکل میں یا امریکن ریاست کے قرض کے تمسکات کی شکل میں ادا کر لیں۔

امریکہ میں مصنوعات کی درآمد زرعی پیداوار کی برآمد سے جتنی زیادہ ہوئی اسی قدر ان کاغذوں کی مانگ انگلستان میں بڑھی، اسی قدر امریکہ والوں کو تحریک ہوئی کہ ریاست میں رفاہِ عام کے بڑے بڑے کام شروع کریں اور جتنا زیادہ یہ سرمایہ ان کاموں میں لگا اُسی قدر انگریزی مصنوعات کی مانگ بڑھی، اور اس کے ساتھ ساتھ اس عدمِ تناسب میں

اضافہ ہوا جو امریکہ کی درآمد میں رونما ہو چکا تھا۔

ایک طرف تو انگریزی مصنوعات کی شمالی امریکہ میں درآمد کو اس سے آسانیاں ملیں کہ امریکن بنکوں نے کافی رقمیں اعتبار پر دیں، دوسری طرف انگلستان کے بنک نے بھی اعتبار پر رقمیں دے کر اور اپنی کٹوتی کی شرح کم رکھ کر اس میں مدد دی۔ تجارت و صنعت پر انگریزی کمیٹی کی باضابطہ رپورٹ سے واضح ہے کہ انگلستان کے بنک نے اس کٹوتی کی وجہ سے اپنے زر نقد کو ۴ ملین پونڈ سے ۲ ملین پونڈ تک گھٹا دیا۔ اس طرح اس نے ایک تو امریکن نظام تامینی کے اثر کو کم کر کے امریکن کارخانوں سے انگریزوں کو مقابلہ میں مدد دی، دوسرے انگلستان میں امریکن حصّوں اور سرکاری تمسکات کی بکری ممکن بھی کی اور اس کے لئے لوگوں کو تحریک بھی دی۔ اس لئے کہ جب تک انگلستان میں زر ۳ فی صدی پر مل سکتا تھا اس وقت امریکہ کے ٹھیکیداروں اور قرض حاصل کرنے والوں کے لئے خریداروں کی کیا کمی تھی کہ یہ ۶ فی صدی سود پیش کر رہے تھے۔

یہ حالت بظاہر تو خوش حالی کا منظر پیش کرتی تھی اگرچہ امریکن کارخانے رفتہ رفتہ بالکل پسے جا رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ امریکن کاشتکاروں نے اس فاضل زراعتی پیداوار کا بڑا حصہ جو آزاد تجارت کی صورت میں انگلستان جاتا، ملکی کارخانوں کی مناسب تامین کی صورت میں ملک کے صنعتی مزدوروں کے ہاتھ بکتا، ان مزدوروں کے ہاتھ فروخت کر لیا جو رفاہ عام کے کاموں میں مشغول تھے اور جن کو انگریزی سرمایہ سے اجرت دی جا رہی تھی۔ مخالف قومی اغراض کی وجہ سے ایسی غیر فطری حالت کسی طرح جاری نہ رہ

سکتی تھی اور جتنے دن اس کے خاتمہ کو روکا جاتا اُسی قدر یہ خاتمہ شمالی امریکہ کے حق میں مضر اثرات رکھتا۔ جس طرح ایک قرض خواہ اپنے قرضدار کو نیا قرض دے دیکر عرصہ تک سہارا دے سکتا ہے، لیکن اگر قرض خواہ سے نیا قرض لے لیکر قرضدار ایک تباہ کن تجارت کو جاری رکھے تو جس وقت دیوالہ نکلے گا تو اور بھی سخت ہوگا۔ یہی حال اس جگہ تھا۔

جب خراب فصلوں کی وجہ سے اور برّاعظم کے نظامہائے تامینی کے باعث انگلستان سے قیمتی دھاتیں بکثرت دوسرے ملکوں میں جانے لگیں تو اسی سے امریکہ میں بنکوں کے دیوالے نکلنے لگے ہم نے کہا "برّاعظم کے نظامہائے تامینی کے باعث" اس لئے کہ اگر برّاعظم یورپ کی منڈیاں ان کے لئے کھلی ہوتیں تو انگلستان والے برّاعظم سے جو غیر معمولی مقداریں غلّہ کی منگاتے اُسے زیادہ تر مصنوعات کی غیر معمولی مقداریں بھیجکر برابر کر لیتے اور اگر انگریزی زر نقد برّاعظم کو چلا بھی جاتا تو وہ برآمد مصنوعات میں اضافہ کے ذریعہ پھر انگلستان میں واپس آجاتا، ایسی صورت میں بلاشبہ برّاعظم کے کارخانے انگریزی امریکی تجارتی کارروائیوں کے نذر ہو جاتے۔

لیکن جو حالات واقعی تھے اُن میں انگلستان کا بنک بس اس طرح ہاتھ بٹا سکتا تھا کہ اعتبار کے کاروبار کو کم کرے اور اپنی کٹوتی کی شرح کو بڑھائے۔ ان تدابیر کیوجہ سے صرف امریکن حصوں اور سرکاری قرضوں کے کاغذوں کی مانگ ہی کم نہیں ہوئی بلکہ جو کاغذ پہلے سے گردش میں تھے وہ بھی منڈی میں بکنے کے لئے آگئے۔ اس طرح ریاستہائے امریکہ کے ہاتھ سے اوّل تو اس کا موقع نکل گیا کہ ان کاغذوں کو بیچکر اپنی رواں تجارت کی کمی کو پورا کریں اور دوسرے انہوں نے کئی برس سے جو قرض لیا تھا عملاً گویا اس کا مطالبہ ہو گیا۔ اب

معلوم ہوا کہ امریکہ میں جو زرِ نقد رائج تھا وہ در اصل انگریزوں کا تھا اور اس سے زیادہ، یہ معلوم ہوا کہ اس زرِ نقد کو جس پر ریاستہائے آزاد کے ساہوکارہ اور زرِ کاغذی کا تمام نظام مبنی تھا انگریز جس طرح چاہیں کام میں لا سکتے ہیں اور اگر اس پر ان کا تصرّف ہو تو وہ سارا نظام ایک کاغذی گھر کی طرح ختم ہو جاتا اور اس کے ساتھ وہ بنیاد درہم برہم ہو جاتی ہے جس پر اراضی کی قیمتیں یعنے افراد کے بڑے حصّہ کے معاشی وجود کا انحصار ہے۔

امریکن بنکوں نے نقد ادائیگی روک کر اپنی تباہی کو روکنا چاہا، اور یہی ایک ذریعہ تھا جس سے اس میں کچھ کمی ہو سکتی تھی۔ ایک تو اس طریقہ سے وہ کچھ وقت لینا چاہتے تھے تاکہ نئی کپاس کی فصل سے ریاستہائے آزاد کے قرض میں کچھ کمی ہو جائے اور اس طرح وہ رفتہ رفتہ اسے ادا کر دیں۔ دوسرے انہیں امید تھی کہ اس سے اعتبار کے کاروبار میں جو انتشار ہوگا وہ انگریزی مصنوعات کی درآمد میں کمی پیدا کر دے گا اور آئندہ درآمد برآمد برابر ہو جائیں گی۔

لیکن یہ بڑی مشتبہ بات ہے کہ کپاس کی برآمد کس حد تک مصنوعات کی درآمد سے توازن پیدا کر سکتی ہے۔ بیس برس سے زیادہ سے اس جنس کی پیداوار صرف سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے اور پیداوار جتنی بڑھی ہے قیمتیں گھٹی ہیں۔ مزید برآں روئی کے مال کے بنانے والے کارخانوں کو سن کے مال کے کارخانوں سے مقابلہ کا سامنا ہے جن کا طریقۂ پیدائش مشینوں کی وجہ سے بہت مکمل ہو گیا ہے۔ اُدھر ٹکساس، مصر، برازیل اور ہندوستان میں کپاس کی کاشت کا سخت مقابلہ ہے۔ بہر صورت یہ بات پیشِ نظر رکھنی ہے کہ شمالی امریکہ سے روئی کی برآمد ان ریاستوں کو سب سے کم فائدہ پہنچا سکتی ہے جو سب سے زیادہ انگریزی مصنوعات منگاتی

ہیں۔ ان ریاستوں میں جو غلہ کی کاشت اور بستیوں سے مصنوعات حاصل کرنے کے ذرائع نکالتی ہیں ایک دوسرے قسم کی مصیبت درپیش ہے۔ انگلستان سے چونکہ مصنوعات کی برآمدبہت ہوئی اس لئے خود امریکہ کی صنعت دب گئی۔ آبادی میں اور سرمایہ میں جو کچھ اضافہ ہُوا وہ اسی وجہ سے سب کا سب مغربی علاقہ کی نئی بستیوں میں منتقل ہو گیا ہر نئی نئی بستی سے پہلے پہل تو زرعی پیداوار کی مانگ بڑھتی ہے مگر چند سال بعد یہاں سے فاضل پیداوار مل سکتی ہے۔ یہ صورت ان نئی بستیوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ لہذا آئندہ سالوں میں مغربی ریاستیں نئی نہروں اور ریلوں کے ذریعہ اپنی فاضل پیداوار کی بڑی بڑی مقداریں مشرقی ریاستوں کو بھیجیں گی، حالانکہ یہاں خارجی مقابلہ کے باعث صنعت کے دب جانے سے صرف کرنے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے اور لازماً پوا بر کم ہوتی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ پیداوار اور اراضی کی بے قدری ہو گی۔ اور جب تک حکومت اتحادی نے جلد ایسی تدابیر نہ کیں جن سے وہ اصل مخرج بند ہوں جن کی وجہ سے یہ مفصلۂ بالا کساد بازاری پیدا ہوئی ہے لزوماً پیدا کرنے والی ریاستوں میں کاشتکاروں کا دیوالہ نکلنا ناگزیر ہے۔

انگلستان اور امریکہ کے تجارتی تعلقات کا جو ذکر اوپر ہُوا۔ ان سے مفصلۂ ذیل سبق حاصل ہوتے ہیں:۔

ا۔ کہ جو قوم سرمایہ اور صنعت میں انگریزوں سے بہت پیچھے ہو وہ اپنی منڈی میں انگریزوں کو مقابلے کا حق نہیں دے سکتی، سوائے اس کے کہ مستقل طور پر

ان کی مقروض ہو جائے، ان کے ادارات زر کی پابند اور ان کے زرعی، صنعتی اور تجارتی کساد بازاری کے چکر میں خود بھی گھسیٹی جائے۔

۲۔ انگلستان کا بنک اپنی تدابیر سے مصنوعات کی امریکن منڈی میں جو اس کے زیر اثر ہے انگریزی مصنوعات کی قیمت اس طرح گھٹا سکتا ہے کہ اس میں انگریزی کارخانوں کا فائدہ اور امریکن کارخانوں کا نقصان ہو۔

۳۔ انگلستان کا بنک اپنی تدابیر سے یہ کر سکا کہ متواتر کئی سال تک شمالی امریکہ کے لوگ درآمد مصنوعات کی شکل میں اس سے کہیں زیادہ قدریں صرف میں لاتے رہے، جتنی کہ وہ اپنی زرعی پیداوار کی برآمد سے کر سکتے تھے اور کئی سال تک اس کمی کو حصے اور سرکاری کاغذ باہر بھیج بھیج کر ادا کرتے رہے۔

۴۔ ان حالات میں امریکن لوگ اپنے ساہوکارہ اور زر کاغذی کے نظام کو اس زر نقد سے چلاتے رہے جس کا بڑا حصہ انگلستان کا بنک اپنی تدابیر سے جس وقت چاہتا اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔

۵۔ زر کی منڈی میں اتار چڑھاؤ ہر حالت میں معیشت اقوام کے لئے نہایت مضر ہوتا ہے خصوصاً ان ممالک میں جہاں قیمتی دھاتوں کی ایک مقررہ مقدار پر وسیع ساہوکارہ اور زر کاغذی کا نظام مبنی ہوتا ہے۔

۶۔ زر کی منڈی میں اتار چڑھاؤ اور اس سے جو کساد بازاری کے دورے ہوتے ہیں انہیں روکا جا سکتا ہے اور مضبوط ساہوکارہ کا نظام قائم ہو سکتا ہے صرف اس طرح

کہ درآمد اور برآمد میں توازن قائم کیا جائے۔

۷۔ اس توازن کا قائم رکھنا اس قدر مشکل ہے جس قدر کہ اپنی منڈی میں پردیسی مصنوعات کے لئے مقابلہ سہل ہو اور جس قدر کہ دیسی زرعی مال کی برآمد پر دوسرے ملکوں کی تجارتی کارروائیوں سے پابندیاں عائد ہوں، اور اس توازن کو بگاڑنا بھی اتنا ہی مشکل ہے جس قدر کہ کوئی قوم مصنوعات کی احتیاج میں اور زرعی پیداوار کی کھپت کے لئے دوسری قوموں کی دست نگر ہو۔

روس کے تجربہ سے بھی ان مسئلوں کی تصدیق ہوتی ہے، لوگوں کو یاد ہوگا کہ جب تک روسی منڈی انگریزی مصنوعات کے طوفان کے لئے بالکل کھلی تھی اس وقت تک روس کے سرکاری نظام اعتبار میں کیا کچھ انقلابات نہ ہوتے تھے لیکن جب سے روس نے ۱۸۲۱ء میں محاصل نامینی لگائے اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر نام نہاد تجارتی مذہب ایک انتہا پر تھا تو نظریہ رائج بالکل دوسری انتہا کی غلطی میں مبتلا ہو گیا، بیشک یہ کہنا غلط تھا کہ قوموں کی دولت صرف قیمتی دھاتوں پر مشتمل ہوتی ہے، یا قوم اسی وقت مالدار ہو سکتی ہے کہ وہ زیادہ مال باہر بھیجے اور کم اندر منگائے، تاکہ اس فرق کا حساب قیمتی دھاتوں کی درآمد سے برآمد ہو، لیکن یہ بھی غلط ہے اگر نظریہ رائج موجودہ حالات عالم میں یہ دعوے کرے کہ اس سے کچھ نہیں ہوتا کہ قوم میں کتنی زیادہ یا کتنی کم قیمتی دھاتیں گردش میں ہیں، ضرورت سے کم قیمتی دھاتوں کا ڈر ایک طفلانہ ڈر ہے، اور کوشش زیادہ ان کی برآمد کی کرنی چاہیئے نہ کہ درآمد کی وغیرہ وغیرہ!

یہ استدلال صرف اس وقت صحیح ہے جب آپ یہ فرض کرلیں کہ تمام قومیں اور سب ملک قانونِ انصاف کے ماتحت متفق و متحد ہوگئے ہیں، یہ فرض کرلے کہ ہماری زرعی پیداوار کی برآمد پر ان قوموں کی طرف سے کوئی تجارتی پابندیاں نہیں لگائی گئی ہیں، جن کی مصنوعات کی قیمت ہم صرف اپنے زرعی مال سے ادا کرسکتے ہیں، جب یہ مان لیں کہ جنگ اور صلح کی دھوپ چھاؤں اور دوسری چیزوں سے دولت آفرینی اور صرفِ دولت میں، قیمتوں اور زر کی منڈی میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ہیں، اور یہ تسلیم کرلیں کہ اعتبار کے بڑے بڑے ادارے خاص اس قوم کے اغراض کے جس سے اُن کا تعلق ہے اپنا اثر دوسری قوم پر نہیں ڈالتے، لیکن جب تک مخصوص قومی اغراض باقی ہیں، اُس وقت تک ہر بڑی قوم کی سیاسی دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے تجارتی نظام کے ذریعے اپنے کو زر کے اس غیر معمولی اُتار چڑھاؤ اور قیمتوں کے اس انقلاب سے محفوظ رکھے، جس سے اس کی اندرونی معیشت بالکل تہ و بالا ہوجاتی ہے، اور یہ مقصد اسے اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے اندر صنعتی دولت آفرینی اور زرعی دولت آفرینی میں اور اپنی برآمد اور درآمد میں صحیح توازن قائم رکھے۔

بظاہر نظریۂ رائج نے قیمتی دھاتوں یہ واقعی قبضے اور بین الاقوامی لین دین میں قیمتی دھاتوں پر عملاً تصرف میں پورا پورا فرق نہیں کیا جاتا، شخصی لین دین تک میں اس امتیاز کی ضرورت روشن ہے، کوئی شخص اپنے پاس زر رکھنا نہیں چاہتا، ہر شخص اسے جلد از جلد گھر سے باہر ہانکتا ہے لیکن ہر ایک چاہتا ہے کہ جو رقم اُسے درکار ہو وہ اُس

کے تصرف میں آسکے، زر نقد کو واقعی قبضہ میں رکھنے کی طرف بے اعتنائی دولت کیساتھ ساتھ بڑھتی ہے، جس قدر کوئی شخص مالدار ہوتا ہے اُسی قدر اسے واقعی زر نقد قبضہ میں رکھنے کا خیال کم ہوتا ہے بس یہ کافی ہے کہ ہر وقت دوسروں کے پاس رکھا ہوا زر نقد اُس کے تصرف میں ہے۔ برخلاف اس کے جس قدر مفلس کوئی شخص ہوتا ہے جس قدر کم اس میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ دوسرے کے پاس رکھے ہوئے روپیہ کو اپنے تصرف میں لائے اسے اس کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ زر کی ضروری مقدار اپنے پاس موجود رکھے، بالکل یہی حال صنعت کے اعتبار سے مالدار اور غریب قوموں کا ہے، اگر انگلستان کو معمولاً اس کی بہت کم پروا رہتی ہے کہ ملک کے باہر سونا اور چاندی کتنا زیادہ جاتا ہے یا کتنا کم تو اسی سے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے، اگر قیمتی دھاتیں بہت زیادہ باہر چلی گئیں تو اس سے ایک تو دھاتوں کی قیمت اور کوٹھی کی شرح بڑھ جائے گی، دوسرے مصنوعات کی قیمت گھٹ جائے گی، اور وہ مصنوعات کی برآمد میں اضافہ سے یا پردیسی حصّوں اور سرکاری قرضہ کے کاغذوں کی قیمت وصول کرکے جلد پھر اتنا زر نقد قبضہ میں لا سکتا ہے جتنا اس کے کاروبار کے لئے درکار ہے، انگلستان تو وہ مالدار ساہوکار ہے جو جیب میں ایک ڈالر رکھے بغیر نزدیک یا دُور کے کاروباری دوستوں سے جو رقم چاہے لے سکتا ہے، لیکن جب خالی زراعت کرنے والی قوموں کے یہاں سے بہت سا زر نقد نکل جاتا ہے تو اُن کی حالت ایسی اچھی نہیں ہوتی اس لئے کہ اُن کے پاس ضروری زر نقد فراہم کرنے کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ اسی وجہ سے نہیں کہ اُن کے ذخائر اور زرعی

قدروں کی قوت مبادلہ کم ہے، بلکہ اس سبب سے بھی کہ پردیسی قوانین ان ذخائر کی برآمد میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، ان کی مثال اس غریب آدمی کی سی ہے جو اپنے کاروباری دوستوں کے نام کوئی چیک نہیں کاٹ سکتا، بلکہ جب مالدار مشکل میں پڑتا ہے تو اس کے نام بل آتے ہیں اور جو اس کو اپنا نہیں کہہ سکتا جو اس کے ہاتھ میں واقعی موجود ہے،

زرنقد کی جو مقدار اندرونی کاروبار کے لئے ہمیشہ درکار ہوتی ہے، اس پر تصرف کی قوت قوم کو زیادہ تر ایسے مال اور ایسی قدروں پر قبضہ سے یا اُن کے پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے جن کی قوت مبادلہ بیش قیمتوں، دھاتوں کے بعد ہی سمجھنا چاہیئے۔

کاروبار اور قبضہ میں جو مختلف چیزیں ہوتی ہیں، اُن کی قوت مبادلہ کی صفت میں تفاوت پر مذہب رائج نے بین الاقوامی تجارت پر غور کرتے ہوئے اسی قدر کم توجہ کی ہے جتنی کہ قیمتی دھاتوں پر تصرّف کی قوت پر، اس سلسلہ میں اگر ہم ان مختلف قدروں پر نظر ڈالیں جو نجی کاروبار میں سامنے آتی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے بہتیری اس طرح پابند مقام ہیں کہ ان کی قدر بس اسی جگہ قابلِ مبادلہ ہے، اور اس میں بھی کافی صرفہ اور دشواریاں لاحق ہوتی ہیں، اس میں قومی املاک کی تین چوتھائی سے زیادہ آجاتی ہے یعنے جائداد غیر منقولہ اور نصب شدہ مشینیں اور حالات، کسی شخص کی املاک زمین کتنی ہی بڑی ہو، وہ اپنے کھیت اور چراگاہیں شہر میں نہیں بھیج سکتا کہ اُن کے عوض زر اور مال حاصل کرے، وہ اس املاک کو رہن ضرور رکھ سکتا ہے لیکن اس میں ضرورت ہے کہ پہلے ایسا آدمی ملے جو اُسے رہن رکھنے پر رضامند ہو، اس لئے یہ شخص اپنے مستقر سے جتنا دور ہوتا جائیگا،

اس کی ضرورت کے رفع ہونے کا امکان کم ہوتا جائیگا،

ان پابند مقام قدروں کے بعد بین الاقوامی تجارت میں اکثر زرعی پیداوار (نو آبادیاتی مال اور چند قیمتی چیزوں کے علاوہ) میں کم سے کم قوتِ مبادلہ (بدل پذیری) ہوتی ہے، ان میں زیادہ تر قدریں (مثلاً تعمیر کا سامان، ایندھن، غلہ وغیرہ، پھل، مویشی) صرف اردگرد قریب کے علاقہ میں کھپ سکتی ہیں اور اگر بہت پیدا ہو جائیں تو قابلِ بدل جانے کے لیئے ان کے ذخائر کو اٹھا رکھنا پڑتا ہے، ان میں سے جو چیزیں دوسرے ملکوں کو جاتی ہیں ان کی کھپت بھی چند تجارتی قوموں میں محدود ہوتی ہے اور یہاں بھی اس پر بہت کچھ تجارتی محاصل و درآمد کا اور خود اپنے یہاں فصل کے اچھے یا برے ہونے کا اثر پڑتا ہے، شمالی امریکہ کے اندرون ملک کے علاقے چاہے مویشیوں اور زرعی پیداوار سے پٹے پڑے ہوں، لیکن یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ان فاضل اشیاء کو باہر بھیجکر وہ جنوبی امریکہ یا انگلستان، یا براعظم یورپ سے قیمتی دھاتوں کی کوئی معتد بہ مقدار حاصل کرلیں، برخلاف اس کے تمام استعمال کی مصنوعات میں ان سے کہیں زیادہ قوت مبادلہ (بدل پذیری) ہوتی ہے، معمولی حالات میں ان کی کھپت دنیا کی تمام کھلی منڈیوں میں ہوتی ہے، اور غیر معمولی کساد بازاری کے زمانہ میں جب قیمتیں گھٹ جاتی ہیں تو ان منڈیوں میں بھی کھپت ہونے لگتی ہے جن کے محاصل معمولی زمانہ کے حساب سے لگائے گئے تھے، ان قدروں کی بدل پذیری میں اگر کم ہے تو قیمتی دھاتوں سے، اور انگلستان کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اگر فصل خراب ہو جانے سے زر کی کمی بھی پڑ جائے، تب بھی مصنوعات کی زیادہ برآمد اور پردیسی

حصوں اور قرضوں کے کاغذوں کے باہر جانے سے بہت جلد توازن قائم ہو جاتا ہے، یہ کاغذ یعنی پردیسی حصّوں اور سرکاری قرضوں کے کاغذ، جو ظاہر ہے کہ اس موافق توازن تجارت کا نتیجہ ہوتے جو پہلے مصنوعات کی برآمد سے پیدا ہوا تھا صنعتی قوم کے ہاتھ میں گویا زرعی قوم کے نام کے بل ہوتے ہیں جنھیں ایسے وقت پر کہ قیمتی دھاتوں کی غیر معمولی ضرورت ہو طلب کیا جا سکتا ہے، چاہے اس میں انفرادی مالکوں کا کچھ نقصان ہی ہو، (جیسا کہ کساد بازاری کے وقت مصنوعات کا حال ہوتا ہے) مگر قوم کی معاشی حالت کو سنبھالنے کے لئے اس سے بے حساب فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے،

اب چاہے مذہب رائج نے توازنِ تجارت کے مسئلہ کی کتنی ہی تحقیر کی ہو، متذکرہ بالا قسم کے مشاہدات سے ہمیں تو ہمت ہوتی ہے کہ اپنی یہ رائے ظاہر کریں کہ بڑی بڑی اور خودمختار قوموں کے درمیان تو کسی ایسی چیز کا ہونا ضروری ہے جیسے کہ توازنِ تجارتی، اور بڑی قوموں کے لئے یہ بڑی خطرہ کی بات ہے، کہ اس توازنِ تجارت میں عرصہ تک معتد بہ نقصان میں رہیں، اور یہ کہ اگر ملک سے قیمتی دھاتوں کی خاصی مقدار پیہم نکلتی رہے تو لازمی طور پر ملک کے اندر نظام اعتبار میں اور قیمتوں کے تناسب میں بڑا انقلاب پیدا ہوگا، یہ بات ہم سے بہت بعید ہے کہ ہم توازنِ تجارت کے اس مسلک کو پھر زندہ کرنا چاہیں جو نام نہاد مذہب تجارتی نے پیش کیا تھا اور یہ کہیں کہ قوم کو چاہیے کہ قیمتی دھاتوں کی برآمد میں رکاوٹیں پیدا کرلے، یا یہ کہ ہر قوم سے تا حد امکان سے حساب رکھا جائے، یا یہ کہ بڑی بڑی قوموں کے باہمی لین دین میں برآمد و درآمد کے چند لاکھ کے فرق سے کچھ اثر

پڑجاتا ہے، ہم جس چیز سے انکار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی بڑی اور خود مختار قوم، جیسا کہ اس موضوع سے متعلق باب کے خاتمہ پر آدم اسمتھ نے کہا ہے "متواتر ہر سال زرعی پیداوار اور مصنوعات کی زیادہ مقدار منگا اور کم مقدار باہر بھیج سکتی ہے، اس قوم کے پاس قیمتی دھاتوں کی جو مقدار ہے وہ سال بہ سال کم ہو سکتی اور زر کاغذی سے ملک کے اندر اس کی قائم مقامی کرائی جا سکتی ہے، نہیں، بلکہ ایسی قوم اپنے پر ایک دوسری قوم کا قرض برابر بڑھا سکتی اور بڑھنے دے سکتی ہے اور پھر بھی سال بہ سال خوشحالی میں ترقی کر سکتی ہے،

بس آدم اسمتھ کا یہی خیال ہے جسے اس کے بعد سے اس کے متبعین نے برابر پیش کیا، جس کی تجربہ نے سینکڑوں مرتبہ تردید کر دی ہے، جسے ہم عقل سلیم کے نزدیک ماہیت اشیاء کے منافی اور اگر آدم اسمتھ کو اسی کے سے سخت انداز بیان میں جواب دیا جائے تو "مہمل" سمجھتے ہیں،

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں ان ملکوں کا ذکر نہیں ہے جو خود منافع پر قیمتی دھاتیں نکالتے ہیں، کہ ان کے یہاں تو ان دھاتوں کی برآمد کا حال بالکل مصنوعات کی برآمد کا سا ہے، ہم توازن تجارت میں اس فرق کا بھی ذکر نہیں کر رہے ہیں جو لازمی طور پر ہونا چاہئے، اگر کوئی اپنی درآمد اور برآمد کا حساب ان قیمتوں پر لگائے جو خود اپنے بندرگاہوں میں ہوتی ہیں، اس صورت میں تو ہر قوم کی درآمد اس کی برآمد سے بقدر قوم کے کل تجارتی منافع کے ضرور زیادہ ہوگی، یہ تو بالکل صاف اور ناقابل تردید بات ہے اور یہ ایسی

صورت حال ہے جو اس کے مخالف نہیں بلکہ اس کے موافق ہی ہے، اس سے بھی کم ہماری یہ نیت ہے کہ ان غیر معمولی صورتوں سے انکار کریں، جہاں زیادتی برآمد نفع کی جگہ نقصان کی علامت ہوتی ہے، مثلاً جب قدریں کسی جہاز کے ڈوب جانے سے برباد ہو جاتی ہیں، مذہب رائج نے نہایت چالاکی کے ساتھ ان تمام ڈھولوں سے کام لیا ہے جو درآمد و برآمد کی قیمتوں کا ایک دکاندار کی طرح حساب لگانے اور مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتے ہیں، تاکہ اُن کی وجہ سے ہم ان نقصانات کو بھی یاد نہ کریں، جو ایک بڑی خود مختار قوم کی درآمد و برآمد میں واقعی اور بڑے اور پائیدار عدم تناسب سے پیدا ہوتے ہیں، اور جن کا شمار ایسی بڑی بڑی رقموں میں ہوتا ہے جیسے کہ فرانس کے معاملہ میں ۱۸۶۰-۶۹ء میں روس میں ۱۸۲۰-۲۱ء میں اور شمالی امریکہ میں کمپرومس بل کے بعد، اور یہ بھی اچھی طرح ملحوظ رہے کہ ہم نوآبادیوں کا بھی ذکر نہیں کر رہے ہیں، نہ دست نگر محکوم اقوام کا، نہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں، نہ منفرد آزاد شہروں کا، بلکہ یہاں ذکر ہے پوری پوری بڑی بڑی خود مختار قوموں کا، جو خود اپنا تجارتی نظام رکھتی ہیں، ایک قومی نظام زراعت و صنعت رکھتی ہیں، اور ایک قومی نظام زر و اعتبار کی مالک ہیں۔

ظاہر ہے کہ نوآبادیوں کی نوعیت کے مطابق ہے کہ اُن کی برآمد ان کی درآمد سے معتدبہ طور پر اور عرصہ تک زیادہ ہو سکتی ہے، بلا اس کے اس سے اس کی خوشحالی کے بڑھنے گھٹنے پر کوئی حکم لگایا جا سکے، نوآبادی کی خوشحالی اس نسبت سے بڑھتی جس نسبت سے سال بہ سال اس کی درآمد اور برآمد کی مجموعی مقدار بڑھے، اگر نوآبادیاتی مال کی

برآمد مصنوعات کی درآمد سے معتدبہ طور پر اور عرصہ تک زیادہ رہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نوآبادی کے مالکان زمین اصلی وطن میں رہتے ہیں اور اپنا لگان یا تو نوآبادیاتی مال میں بشکل جنس وصول کرتے ہیں، یا بشکل زر اس قیمت سے جو اس مال سے حاصل ہوتی ہے اگر وطن سے نوآبادی کو مصنوعات کی برآمد بہ نسبت نوآبادیاتی مال کی درآمد کے معتدبہ طور پر زیادہ ہو تو اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہجرت کے ذریعہ یا قرض کی وجہ سے سال بہ سال بہت زیادہ سرمایہ نوآبادی کو جا رہا ہے، یہ آخری صورت نوآبادی کی خوشحالی کے لیے بہت ہی مفید ہے، یہ صدیوں تک جاری رہ سکتی ہے اور صورت میں تجارتی کساد بازاری کا دور ہے شاذ بلکہ محال ہیں، اس لیے کہ نوآبادی کو نہ مادر وطن کی طرف سے جنگ کا ڈر، نہ معاندانہ تجارتی کارروائیوں کا خوف، نہ اس کے قومی بنک کی تدابیر سے نقصان کا اندیشہ، اس لیے کہ اس کا کوئی اپنا علیحدہ خود مختار نظام تجارت و عنت بارد صنعت تو ہے نہیں بلکہ اس کے برخلاف ہمیشہ وطن اصلی کے ادارات، اعتبار اور تدابیر سیاسی ہی سے ہمیشہ اس کو مدد پہنچتی اور سہارا ملتا ہے، اس قسم کا تعلق صدیوں تک نہایت سودبخش طریقہ پر انگلستان اور شمالی امریکہ میں قائم رہا، آج بھی انگلستان اور کینیڈا میں قائم ہے اور غالباً صدیوں تک انگلستان اور آسٹریلیا میں قائم رہیگا، لیکن اس تعلق میں بس اسی لمحہ بنیادی تغیر ہو جاتا ہے جب کہ نوآبادی بہ حیثیت خود مختار قوم کے، ایک بڑی اور مستقل قومیت کی صفات کے تمام و کمال کے ساتھ سامنے آتی ہے، اس وجہ سے کہ اب وہ اپنی طاقت اور اپنی سیاست اور اپنے مخصوص نظام تجارت اور اعتبار کو ترقی دیتی ہے

یہ سابقہ نوآبادی اب خود اپنی جہاز رانی اور بحری قوت کو فروغ دینے کے لئے قوانین بناتی ہے اپنی صنعت کے فائدے کے لئے اپنا نظام محاصل قائم کرتی ہے، اس کا اپنا قومی بنک بنتا ہے، وغیرہ وغیرہ، بشرطیکہ نوآبادیاتی تعلق سے نکل کر خود مختاری کی طرف جانے والی قوم، ذہنی طبیعی اور معاشی وسائل و ذرائع کے اعتبار سے اپنے کو صنعتی اور تجارتی قوم بننے کا اہل محسوس کرتی ہے، اس کے خلاف اصلی وطن اب اپنی طرف سے سابقہ نوآبادی کی جہاز رانی، تجارت اور زرعی پیداوار پر پابندیاں عائد کرتا ہے، اور اپنے اوارات اعتبار کے ذریعے سے صرف اپنے معاشی معاملات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن انہیں شمالی امریکہ کی نوآبادیوں کی مثال سے، جیسی کہ وہ امریکن جنگ آزادی سے پہلے تھیں، آدم اسمتھ اپنے مذکورہ بالا متناقض اصول کو ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ایک قوم کی خوشحالی میں برابر ترقی بھی ہو سکتی ہے اور ایسی حالت میں کہ برابر اس کی سونے چاندی کی برآمد بڑھ رہی ہو، قیمتی دھاتوں کی گردش ملک میں کم ہو رہی ہو، زر کاغذی برابر بڑھتا جاتا ہو اور دوسری قوم کا جو اس پر قرض ہے اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہو! آدم اسمتھ نے بڑی ہوشیاری کی کہ ایسی دو قوموں کی مثال نہ لی جو عرصہ سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں خود مختار رہی ہوں اور اپنی جہاز رانی، تجارت، صنعت اور زراعت کے اغراض میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں، اپنے دعوے کے ثبوت میں اس نے ہمیں ایک نوآبادی کا تعلق دکھلایا ہے اصلی وطن سے، اگر وہ آج تک زندہ رہا ہوتا اور اب اپنی کتاب

لکھی ہوتی تو وہ ہرگز شمالی امریکہ کی مثال نہ دیتا، اس لئے کہ اس زمانہ میں اس مثال سے اس کا بالکل اُلٹا ثابت ہوتا ہے جو وہ اس سے ثابت کرنا چاہتا تھا۔

لیکن ان حالات میں کوئی ہمارے خلاف کہہ سکتا ہے کہ ان آزاد ریاستوں کے لئے بڑے فائدہ کی بات ہوتی، اگر یہ پھر انگریزی نوآبادی بن جائیں، ہمارا جواب ہے کہ ہاں! بشرطیکہ امریکہ یہ نہ چاہتا کہ اپنی قومی آزادی سے کام لیکر خود اپنا صنعتی نظام، اپنا خود مختار اور دوسروں کے اثر سے آزاد تجارت اور اعتبار کا نظام کیسے وجود میں لاتے ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ لیا تم، یہ نہیں دیکھتے کہ اگر نوآبادیاتی تعلق قائم ہوتا تو انگریزی غلے کے قانون کبھی وجود میں نہ آتے، انگلستان امریکہ کی تمباکو پر ایسا غیر مناسب محصول نہ لگاتا، ریاستہائے امریکہ سے برابر تعمیری لکڑی کے انبار کے انبار انگلستان جاتے رہتے، انگلستان بجائے دوسرے ملکوں میں کپاس کی پیداوار کو ترقی دینے کا خیال ترک کرنے کے شمالی امریکہ والوں کو اس جنس کا اجارہ دے دیتا، اور اسے قائم رکھنے کی کوشش کرتا، اور یوں کساد بازاری کے وہ دورے جو پچھلے دس سال میں شمالی امریکہ پر گزرے ہیں ناممکن ہو جاتے، ہاں بیشک، اگر یہ ریاستیں خود صنعت کا کام نہ کریں، خود اپنا مستقبل اور پائیدار نظام اعتبار نہ کریں، بحری قوت قائم نہ کرنا چاہیں یا نہ کر سکیں، اگر ایسا ہے تو بوسٹن کے شہریوں نے سمندر میں چاء بیکار پھینکی، تب تو آزادی اور آئندہ قومی عظمت پر اُن کی ساری تدبیر بازی بے سود تھی، تب واقعی یہی بہتر ہے کہ وہ جلد سے جلد انگریزوں سے نوآبادی والا تعلق ماتحت پھر قائم کر لیں۔ پھر انگلستان ان پر پابندیاں عائد کرنے کی جگہ اُن کے ساتھ

رعایتیں کر لیگا، اور بجائے اس کے کہ روئی اور غلّہ کی کاشت میں کوشش کر کے ان کے مقابلہ کرنے والے پیدا کرے شمالی امریکہ سے مقابلہ کرنے والوں کو دبائے گا، انگلستان کا بنک تب شمالی امریکہ میں اپنی شاخیں کھول دیگا، انگریزی حکومت لوگوں کو ہجرت کر کے شمالی امریکہ جانے میں اور سرمایہ کے امریکہ پہنچنے میں مدد دے گی اور امریکن کارخانوں کو بالکل برباد کر کے اور انگلستان امریکن کو اجناس خام اور زرعی پیداوار کی برآمد کو ترجیح دے کر شفقت اور ہمدردی کے ساتھ اس کا انتظام کر لے گی کہ شمالی امریکہ میں کساد بازاری کے دورہ نہ ہوں اور نوآبادی کی درآمد و برآمد میں ہمیشہ توازن قائم رہے، مختصر یہ کہ امریکن غلاموں کے مالکوں اور روئی لینے والوں کے سب خواب مبدل بہ حقیقت ہو جائینگے،

اور واقعی ایک عرصہ سے اس قسم کا تعلق ان بڑے کاشتکاروں کے جذبۂ حب وطن اور اُن کے اغراض اور ضروریات کو زیادہ اُبھار رہا ہے، بہ نسبت شمالی امریکہ کی قومی عظمت اور خود مختاری کے، بس آزادی و استقلال کے شروع شروع جوش میں ہی ان میں بھی صنعتی خود مختاری کا ولولہ تھا اور یہ کانگرس کے سامنے اس قسم کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں کہ امریکہ کی خوشحالی انگلستان کے صنعتی تسلط پر منحصر ہے، ان باتوں کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہے کہ اگر شمالی امریکہ پھر انگلستان کی نوآبادی ہی ہو جائے زیادہ مالدار اور زیادہ خوشحال رہے ؟

ہمیں تو سمجھتے ہیں کہ آزاد تجارت کے حامی توازن تجارت اور دشواریوں کے متعلق نیز صنعت کی بابت اپنے استدلال میں زیادہ مستحکم اور مستقیم ہوں اگر وہ صاف صاف یہ مشورہ

دے دیں کہ بہتر یہی ہے کہ سب انگلستان کے باجگذار بن جائیں اور اس کے عوض وہ فوائد حاصل کریں جو انگریزی نوآبادیوں کو حاصل ہیں، کہ یہ ماتحتی ان کے لئے معاشی اعتبار سے ادھوری خود مختاری سے بدرجہا مفید ہوگی جس سے وہ قومیں بہرہ یاب ہیں، جو خود اپنا صنعت تجارت اور اعتبار کا انتظام تو رکھتی ہیں اور انگلستان کے مقابلے میں پھر بھی خود مختار رہنا چاہتی ہیں۔ کیا ہم نہیں دیکھ سکتے کہ یہ پرتگال کو کیا کیا فائدے ہوتے کہ اگر معاہدہ میتھوین کے بعد سے وہاں ایک انگریزی نائب شاہ حکمران ہوتا، اگر انگلستان نے وہاں اپنے قوانین رائج اور اپنی قومی روح منتقل کردی ہوتی، اور اس ملک کو بھی اپنی ہندی سلطنت کی طرح اپنے زیر سایہ لے لیا ہوتا؟ کیا ہم نہیں دیکھ سکتے کہ ایسی ہی صورت جرمنی کے لئے بلکہ پورے براعظم یورپ کے لئے کس قدر فائدہ بخش ہو سکتی ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہندوستان نے اپنی صنعت انگلستان کے ہاتھ کھوئی، مگر کیا اپنی ملکی اندرونی زراعت میں اور اپنی زرعی پیداوار کی برآمد میں اسے بے حساب فائدے نہیں ہوئے؟ کیا اس کے نوابوں میں جنگیں بند نہیں ہو گئیں؟ کیا دیسی بادشاہ اور نواب نہایت مزے میں نہیں ہیں؟ کیا ان کی بڑی بڑی شخصی آمدنیاں محفوظ نہیں ہو گئیں؟ اور کیا ان کے سر سے افکارِ حکومت کا بارِ گراں نہیں ہٹ گیا؟

علاوہ بریں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے (اگرچہ ان لوگوں کی سی بات ہے جن کا آدم اسمتھ کی طرح متناقص رائیں پیش کرنا قومی پہلو ہے) کہ یہ مشہور مصنف بھی توازنِ تجارت کے خلاف سب دلیلیں دے چکنے کے بعد پھر بھی ایک چیز کا وجود تسلیم کرتا ہے جسے یہ قوم

کا صرف اور دولت آفرینی کا توازن کہتا ہے، اور اگر ذرا روشنی میں دیکھا جائے تو یہ چیز سوائے ہمارے واقعی توازن تجارت کے اور کیا ہے؛ جس قوم کی درآمد و برآمد میں کم و بیش توازن قائم ہو یقین رکھ سکتی ہے جہاں تک اس کے قومی لین دین کا تعلق ہے وہ اس سے بہت زیادہ قدریں اپنے یہاں منگاتی ہے جتنی کہ وہ زرعی پیداوار کی شکل میں باہر بھیجتی ہے، جیسا کہ حال میں امریکہ کا حال ہو رہا ہے، تو اسے یقین کے ساتھ سمجھنا چاہیئے کہ جہاں تک قومی لین دین کا تعلق ہے وہ اس سے بہت زیادہ پر دیسی قدریں صرف کر رہی ہے، جتنی ملک میں پیدا کرتی ہے اور اگر یہ نہیں تو پھر فرانس کے (۸۲-۱۸۸۶ء) روس کے (۲۱-۱۸۲۰ء) اور ۱۸۳۳ء سے شمالی امریکہ کے دورہ کساد بازاری سے اور کیا ظاہر ہوتا ہے۔

اس باب کے خاتمہ پر ہم ان لوگوں سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں جن کے نزدیک توازن تجارت کا مسلک پرانے افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے،

یہ کیا بات ہے کہ جہاں کہیں توازن تجارت بیّن طور پر اور عرصہ تک ناموافق رہا ہے تو ہمیشہ بلا استثنا، ان ملکوں میں جن کے خلاف توازن تھا، (یہ استثنائے نو آبادیات) اندرون ملک میں کساد بازاری کے دورے، قیمتوں کے انقلابات، مالی مشکلیں اور عام طور پر دیوالے رونما ہوتے ہیں، عام اعتبار کے اداروں کے بھی دیوالے اور منفرد تاجروں، صنعت والوں اور کاشتکاروں کے بھی،

یہ کیا بات ہے کہ توازن تجارت جن قوموں کے بیّن طور پر موافق رہا ہے، انکے ہاں

ہمیشہ اس کے برعکس معاملات دیکھنے میں آتے ہیں، اور جن ملکوں سے ایسی قوموں کے تجارتی تعلقات تھے اُن میں اگر تجارتی کساد بازاری کے دورے ہوئے بھی تو اُن پر اس کا مضر اثر بہت ہی وقتی اور عارضی طور پر ہو سکا؟

یہ کیا بات ہے کہ جب سے روس اپنی ضروریات کی مصنوعات خود تیار کرتا ہے اور جب سے توازنِ تجارت بیّن طور پر اور عرصے سے اُس کے موافق ہے، تب سے رُوس میں کوئی معاشی انقلاب سننے میں نہیں آیا، اور اس وقت سے اس سلطنت کی اندرونی خوش حالی بھی سال بہ سال ترقی ہی رہی ہے؟

یہ کیا بات ہے کہ شمالی امریکہ کی آزاد ریاستوں میں بھی ایسے ہی اسباب سے ایسے ہی نتائج دیکھنے میں آئے؟

یہ کیا بات ہے کہ جب "کمپرومس بل" کے بعد سے شمالی امریکہ کی آزاد ریاستوں میں مصنوعات کی درآمد بڑھی تو پیہم کئی سال تک توازنِ تجارت صاف طور سے اُن کے مخالف رہا اور اس حالت کے ساتھ ساتھ قوم کی اندرونی معیشت میں نہایت عظیم الشّان اور دیرپا انقلابات ہوتے؟

یہ کیا بات ہے کہ اس وقت یہ آزاد ریاستیں ہر قسم کی زرعی پیداوار سے (مثلاً روئی، تمباکو، غلّہ، مویشی وغیرہ) اس قدر بھری پڑی ہیں کہ ہر جگہ قیمتیں آدھی سے بھی کم ہو گئی ہیں اور پھر بھی ریاستیں اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی درآمد اور برآمد میں توازن پیدا کر لیں، انگلستان کا جو قرض ان پر ہے اسے اتار دیں اور اپنے اعتبار کے نظام کو پھر

کسی مضبوط بنیاد پر قائم کرسکیں ؟

جب توازنِ تجارت کوئی چیز ہی نہیں یا جب اسے کوئی اہمیت نہیں کہ وہ ہمارے موافق ہے یا مخالف، جب یہ ایک سی بات ہے کہ قیمتی دھاتیں کم مقدار میں دوسرے ملکوں کو جائیں یا زیادہ مقدار میں، تو پھر کیا بات ہے کہ جب فصلیں خراب ہوتی ہیں تو (اور یہی ایک صورت ہے جب کہ توازنِ تجارت انگلستان کے خلاف ہوتا ہے) انگلستان ڈر ڈر کر لرز لرز کر درآمد اور برآمد کو برابر کرنے کی کوشش کرتا ہے، سونے چاندی کے ایک ایک اونس کا حساب لگاتا ہے جو باہر گیا اور اندر آیا، اس کا قومی بنک نہایت فکر کے ساتھ قیمتی دھاتوں کی برآمد کو روکنے اور درآمد کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، ہم پوچھتے ہیں کہ اگر توازنِ تجارت ایک "رد شدہ مغالطہ" ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ ایسے موقعوں پر کوئی انگریزی اخبار ایسا پڑھنے میں نہیں آتا جس میں اس "رد شدہ مغالطہ" کا ذکر نہ ہو اور اس طرح کہ گویا یہی ملک کا اہم ترین معاملہ ہے،

یہ کیا بات ہے کہ شمالی امریکہ میں جو لوگ "کمپرومس بل" سے پہلے توازنِ تجارت کے مسئلہ کو ایک "رد شدہ مغالطہ" بتلاتے تھے وہ "کمپرومس بل" کے بعد برابر کہے جاتے ہیں کہ یہ "رد شدہ مغالطہ" ملک کا اہم ترین مسئلہ ہے،

جب خود حالات کی رفتار سے ہر ملک کو قیمتی دھاتوں کی ضروری مقدار مہیا ہو جاتی ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ انگلستان کا بنک اعتبار کا کام گھٹا کر اور کٹوتی کی شرح بڑھا کر حالات کی اس رفتار کو اپنے موافق بنانا چاہتا ہے، اور امریکن بنکوں کو بھی وقتاً فوقتاً ضرورت

پڑتی ہے کہ اپنی نفت دار انگیاں اس وقت تک روک دیں جب تک کہ درآمد و برآمد
میں پھر کم و بیش توازن نہ ہو جائے "

باب (۲۴)

قوت صنعتی اور کام کے استحکام و تسلسل کا اصول

اگر ہم صنعت کی مختلف شاخوں کے آغاز اور ترقی کی تحقیق کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قبضہ میں کام کے بہتر طریقے، بہتر مشینیں، عمارتیں، چیزیں بنانے کے مفید گُر، تجربہ، مہارت، اور سب وہ واقفیت اور تعلقات رفتہ رفتہ ہی آتے ہیں جن سے خام اجناس کی فائدہ بخش خریداری اور اپنی پیدا کی ہوئی چیز کی فائدہ بخش بکری کا اطمینان ہوتا ہے، یہ بھی یقین آجاتا ہے کہ پہلے سے چلتے ہوئے کام کو پھیلانا اور مکمل کرنا نیا کام شروع کرنے سے بہت زیادہ آسان ہے، ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو پرانے کام پشتوں سے چل رہے ہیں ان میں نئے کاموں سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے، یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ نیا کام شروع کرنا مشکل ہوتا ہے اگر اس قسم کے اور کام پہلے سے قوم میں موجود نہ ہوں اس لئے کہ پھر کارخانہ دار، نگراں کار، مزدور سب کو پہلے سکھا کر تیار کرنا پڑتا ہے۔ بہر سے لانا ہوتا ہے تاکہ سرمایہ داروں کو کام کی کامیابی کا یقین دلایا جاسکے۔ یہ اس لئے کہ پہلے سے کام

کے نفع بخش ہونے کا پورا پورا تجربہ نہ ہو" نہیں کسی قوم میں مختلف اوقات میں صنعت کی شاخوں کی حالت پر نظر کیجیئے تو ہر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اسباب مانع نہ ہوئے ہوں تو نہ صرف قیمتوں میں کمی کے اعتبار سے بلکہ مال کی خوبی اور مقدار کے لحاظ سے بھی ایک نسل سے دوسری نسل تک معتد بہ ترقیاں ہوئی ہیں، دوسری طرف یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ناموافق اسباب کی وجہ سے مثلاً جنگوں یا تاخت وتاراج کے باعث یا حکومتوں کی ظالمانہ اور متعصبانہ سیاسی اور مالی کارروائیوں کے باعث (مثلاً فرمان نانٹس کی منسوخی) قومیں کی قومیں یا تو تمام صنعت میں، یا اس کی مخصوص شاخوں میں صدیوں پیچھے پڑ جاتی ہیں اور جن قوموں سے یہ پہلے آگے تھیں اب وہ ان سے بڑھ جاتی ہیں؛

غرض یہ بات صاف سامنے آتی ہے کہ اور تمام انسانی اداروں کی طرح صنعت میں بھی معتد بہ نتائج کے لیئے ایک قانون قدرت ہے جس میں بہت کچھ تقسیم عمل اور تعاون قوائے دولت آفرین کے قدرتی قانون کے ساتھ مشترک ہے اور جس کی اصل یہ ہے کہ کئی ایک دوسرے کے بعد آنے والی، نسلیں اپنی قوت کو ایک ہی مقصد کے لیئے متحد کر دیں اور اس طرح اس محنت کو باہم تقسیم کر لیں جو اس کے حصول کے لیئے مطلوب ہے،

یہ وہی اصول ہے جو موروثی بادشاہتوں میں قومی قوت کے بقا اور ترقی کے لیئے انتخابی حکومتوں میں حکمراں خاندانوں کی روز روز کی تبدیلی سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ ایک حد تک اسی قانون قدرت کا طفیل ہے کہ جو کوئی قومیں بہت عرصہ سے ایک اچھی منتظم و مستقل حکومت کے تحت میں بستی ہیں انہیں صنعت، تجارت اور جہاز رانی میں

اتنی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں،

اس قانونِ قدرت کے عمل سے اس اثر کی کچھ تشریح ہوتی ہے جو تحریر اور چھپائی کی ایجاد نے انسانی ترقی پر ڈالا ہے، تحریر ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوا کہ زبانی روایت سے بہت بہتر طریقہ پر انسانی علم اور تجربہ موجودہ نسل سے آنیوالی نسل کو ورثہ میں مل سکے،

بلاشبہ ایک حد تک اسی قانون کے علم کی وجہ سے پرانی قوموں میں ذات پات کی تقسیم تھی اور مصریوں کا یہ قانون کہ بیٹے کو باپ کا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے تحریر کی ایجاد اور عام اشاعت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ یہ ادارے صنعت اور فنون کے بقا اور ترقی کے لیئے ناگزیر ہوں،

ایک حد تک پیشہ وروں کی جمعیتیں بھی غالباً اسی خیال پر مبنی تھیں، علوم و فنون کی بقا و ترقی اور اُن کا ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچنا بڑی حد تک قدیم قوموں میں پجاریوں کی خانقاہوں، خانقاہوں، اور تعلیم گاہوں کے وسیلہ سے ہوا ہے، پادریوں اور نائٹوں کی جمعیتوں کو اور پاپائے روم کے منصب کو کیا کچھ قوت اور کیا کچھ اثر حاصل نہ ہوا اس وجہ سے کہ صدیوں تک ایک ہی مقصد کے لیئے کوشش جاری رہی اور آنے والی نسل نے ہمیشہ کام کو وہاں سے جاری رکھا جہاں پچھلی نسل نے چھوڑا تھا۔

مادی ترقیوں کے معاملہ میں اس اصول کی اہمیّت اور بھی روشن ہو جاتی ہے منفرد شہروں، خانقاہوں اور جمعیتوں نے عمارتیں کھڑی کر دی ہیں جن کے مجموعی مصارف غالباً ان کی تمام موجودہ املاک سے زیادہ ہوں گے، اس کے لیئے وہ وسائل اسی طرح تو

فراہم کرسکے کہ کئی نسلوں نے اپنی بچت کو ایک ہی بڑے مقصد میں لگایا۔

ہالینڈ کی نہروں اور پشتوں کے انتظام کو دیکھو، اس میں کئی نسلوں کی محنت اور بچت لگی ہوئی ہے، کئی نسلیں ہی کام کریں تب ہی ممکن ہوتا ہے کہ نقل وحمل کا پورا قومی نظام بن جائے، قلعے اور مدافعانہ تعمیرات کھڑی ہو جائیں۔

ریاست کی طرف سے اعتبار کا انتظام جدید تدبر سیاسی کی سب سے نفیس تخلیق ہے اور اس لئے قوموں کے واسطے ایک رحمت ہے کہ اس کے ذریعہ سے موجودہ نسل کی وہ خدمات اور مساعی کئی نسلوں پر تقسیم ہو سکتی ہیں جو قوم کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کام آنے والی ہیں اور اس کے وجود، نشو و نما، عظمت، طاقت اور قوائے دولت آفریں میں اضافہ کی ضامن ہیں۔ یہ انتظام مصیبت ہو جاتا ہے مگر صرف اس وقت کہ اس سے بے سود قومی صرف کا کام نکلے، اور اگلی نسلوں کی ترقی میں یہی نہیں کہ مدد نہ پہنچائے بلکہ پہلے سے انہیں بڑے قومی کاموں کے وسائل سے محروم کر دے، یا اس وقت کہ قومی قرض کے سود کا بار سرمایہ کی جگہ مزدور جماعت کے صرفِ دولت پر ڈال دیا جائے،

ریاستوں کے قرض در اصل بل ہوتے ہیں جو موجودہ نسل آنے والی نسل کے نام کاٹتی ہے، یا اس سے موجودہ نسل کا خاص فائدہ ہو سکتا ہے، یا آنے والی نسل کا یا دونوں کا مشترک فائدہ، صرف پہلی صورت میں یہ قابلِ اعتراض چیز ہے، لیکن تمام وہ صورتیں، آخری مد میں آتی ہیں جن میں قوم کے بقا اور ترقی کا سوال ہو اور اس کے وسائل موجودہ نسل کی قوت سے متجاوز ہوں۔

موجودہ نسل کا کوئی صرفہ اس وقت بمخصوص طور پر اور یقینی طور پر آئندہ نسل کو نفع پہنچانے کے کام نہیں آتا جیسا وہ جو وسائل حمل و نقل کی درستی پر لگتا ہے، خاص کر اس لئے کہ ان سے اگلی نسلوں کی قوت دولت آفرینی میں غیر معمولی اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اور ایسا اضافہ جو برابر بڑھتا جاتا ہے اور جیسے وقت گزرتا ہے اس پر کافی سود ہی نہیں ملتا رہتا بلکہ منافع بھی حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ نسل کے لئے یہ بات صرف جائز ہی نہیں ہے کہ جب تک کافی آمدنی نہ ہو اس کام پر لگے ہوئے سرمایہ اور اس کے سود کا تمام بار اگلی نسلوں کے سر ڈالی دیں بلکہ وہ خود اپنے ساتھ بے انصافی کرتی ہے اور معاشیات کے صحیح اصولوں کے ساتھ چلتی ہے اگر یہ بوجھ یا اس کا معتدبہ حصہ خود اپنے سر لے لیتی ہے۔

تسلسل کار کے اصول پر غور کرتے ہوئے اگر ہم دولت آفرینی کی اہم شاخوں کو دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تسلسل کا اثر یوں تو زراعت میں بھی خاصا اہم ہے تاہم صنعت کے مقابلہ میں یہاں اس میں رکاوٹیں اور وقفے کم ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو ان کے اثرات بہ نسبت صنعت کے یہاں بہت کم مضر ہوتے ہیں اور مضر اثرات کی مقابلۃً بہت جلد اور بہت آسانی سے تلافی ہو جاتی ہے۔

زراعت میں چاہے کتنا ہی بڑا ہرج واقع ہو، کاشتکار کی اپنی احتیاج اور اس کا اپنا صرف، زراعت کے لئے جس مہارت اور جس واقفیت کی ضرورت ہے اس کا عام طور پر پھیلا ہونا، کام کی اور اس کے آلات کی سادگی کبھی زراعت کو بالکل تباہ نہیں ہونے

دیتی، حتیٰ کہ جنگ کی بربادیوں کے بعد بھی یہ جلدی سے اپنے کو ٹھیک کر لیتی ہے۔ زراعت کے خاص آلہ کار یعنی زمین کو نہ دشمن چھین کر لے جا سکتا ہے نہ پورلیسی مقابلہ کرنیوالے اور قابلِ کاشت زمین کو ویران کرنے لئے اور ملک کے باشندوں سے کاشتکاری کی صلاحیت چھیننے کے لئے کئی نسلوں تک مظالم کی ضرورت ہوتی ہے۔

برخلاف اس کے صنعت کو تھوڑے ہی عرصہ کا معمولی سا ہرج لنگ کر دیتا ہے اور طویل ہو تو مہلک ہی ثابت ہوتا ہے، کسی صنعت کی شاخ میں جس قدر زیادہ ہنرمندی اور مہارت درکار ہوتی ہے، اس میں جس قدر زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ سرمایہ جس قدر زیادہ اسی صنعت کی شاخ سے وابستہ ہوجاتا ہے جس میں لگا ہوا ہے اسی قدر زیادہ ہرج ہوتا ہے مشینیں اور آلات کی حیثیت پرانے لوہے اور جلانے کی لکڑی کی رہ جاتی ہے ؛ عمارتیں کھنڈر ہوجاتی ہیں، مزدور اور مستری ہجرت کر جاتے ہیں یا کھیتی میں روٹی کمانے کی فکر کرتے ہیں، اور اس طرح تھوڑی سی مدت میں چیزوں اور طاقتوں کا ایسا مجموعہ ضائع ہوجاتا ہے جسے کئی نسلوں کی کوشش اور محنت بنا سکی تھی۔

صنعت کے اجرا اور قیام کے وقت جس طرح ایک شاخ سے دوسری شاخ پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے کی ریس کرتی اور ایک دوسرے کو سہارا اور فروغ دیتی ہے اسی طرح اس کے زوال کے وقت ایک شاخ کی تباہی کئی دوسری شاخوں کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور آخر میں قوت صنعتی کے تمام ارکان کی بربادی کا پیام۔

صنعت کے تسلسل کے اہم نتائج اور اس میں وقفوں کے ناقابلِ تلافی نقصانات

کے یقین نے صنعت کے لئے تامینی محاصل کے خیال کو مقبولیت بخشی ہے نہ کہ صنعت والوں کی چیخ پکار یا خود غرضانہ التجاؤں نے،

جب تامینی محاصل بھی مدد نہیں کر سکتے، یعنی جب کارخانوں کے مال کی کھپت ہی باہر نہیں ہوتی اور حکومت اس قابل نہیں ہوتی کہ اس رکاوٹ سے صنعت کو نکالے، تب بھی ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ کارخانہ والے نقد نقصان کے باوجود مال بناتے جاتے ہیں، بہتر زمانہ کی امید میں یہ لوگ کام میں وقفہ کے ناقابلِ تلافی نقصانات سے بچنا چاہتے ہیں۔

آزاد مقابلہ میں اکثر اس توقع پر کہ مقابلہ کرنے والے کام بند کرنے پر مجبور ہو جائینگے اہلِ صنعت اور کارخانوں کے مالک اپنے مال کو قیمت گھٹا کر اور بسا اوقات نقصان اٹھا کر بیچ دیتے ہیں، لوگ اپنے کام کے رکنے ہی سے بچنا نہیں چاہتے بلکہ دوسروں کو کام بند کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، اس توقع میں کہ بعد کو بہتر قیمتیں لیکر اپنے نقصان کی تلافی کر لیں گے،

اجارہ دار بن جانے کی کوشش تو صنعت کی فطرت میں ضرور ہے لیکن یہ بات ساہیت تامینی کی موافقت میں پڑتی ہے نہ کہ مخالفت میں، اس لئے کہ اگر یہ کوشش ملکی منڈی تک محدود ہو تو اس سے قیمتیں کم ہوتی ہیں اور چیزیں تیار کرنے کے طریقوں میں ترقیاں ہوتی ہیں اور اس طرح قومی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن اگر یہی چیز غالب قوت کے ساتھ باہر سے ملکی صنعت پر دباؤ ڈالے تو اس سے کام میں ہرج اور قومی صنعت کو زوال ہوتا ہے۔

یہ خاصہ کہ صنعتی دولت آفرینی کے لئے زخصوصاً جب سے کہ مشینوں کی ایجاد نے اس قدر غیر معمولی مدد پہنچادی ہے) سوائے سرمایہ کی مقدار اور کثرت اور کھپت اور کوئی حدود ہی نہیں ہیں اُس قوم کو جس نے صدیوں برابر کوئی کام جاری رکھا ہے بے حساب سرمایہ جمع کرلیا ہے، دنیا بھر میں تجارت پھیلا دی ہے، بڑے بڑے اعتبار کے اداروں کے ذریعہ زر کی منڈی پر اس کا قابو ہے (جس کی طاقت میں یہ بات ہے کہ مصنوعات کی قیمت گھٹا دے اور کارخانہ والوں کو برآمد پر آمادہ کردے) ایسی قوم کو مذکورہ بالا خاصہ نے اس قابل کردیا ہے کہ سب دوسری قوموں کو صنعت کے خلاف بالکل ان کی ہستی مٹا دینے والی جنگ کا اعلان کردے، ان حالات میں قطعاً ناممکن ہے کہ دوسری قوموں میں زراعت کی ترقی کی وجہ سے اور جیسا کہ آدم اسمتھ صاحب فرماتے ہیں "واقعات کی قدرتی افتاد" کے باعث بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانے قائم ہوجائیں یا وہ صنعتیں اس جنگ کی پیدا کی ہوئی تجارتی رکاوٹوں سے "واقعات کی قدرتی افتاد" کے باعث وجود میں آگئی ہیں اپنے کو قائم رکھ سکیں۔

وجہ اس کی بس وہی ہے جس کے سبب سے ایک بچہ یا ایک لڑکا کشتی میں قوی ہیکل آدمی سے نہیں جیت پاتا یا مقابلہ تک کی تاب نہیں لاتا۔ تجارتی اور صنعتی تفوق (انگلستان) کے کارخانوں کو دوسری قوموں کے نئے نئے پیدا ہونے والے اور بس کچھ کچھ پرورش پائے ہوتے کارخانوں کے مقابلہ میں ہزاروں فائدے حاصل ہیں، مثلاً ان کے پاس با مہارت اور مشاق مزدور کثیر تعداد میں موجود ہیں، بہترین صناع ہیں، مکمل سے

مکمل اور نہایت سستی مشینیں ہیں، خرید و فروخت میں بے حد فائدے حاصل ہیں، خصوصاً خام اجناس کے منگانے اور تیار مال کے بھیجنے میں سستے سے سستے حمل و نقل ان کے لئے موجود ہیں، اداراتِ زر میں کارخانے والوں کو کم سے کم شرح سود پر بڑی بڑی رقمیں اعتبار پر ادھار مل سکتی ہیں، ان کے پاس ایسا تجربہ ہے، ایسے آلات اور عمارات، ایسے انتظامات اور تعلقات ہیں کہ ایک قرن میں جا کر جمع ہو سکتے یا پیدا کئے جا سکتے ہیں، ایک جیسے نہایت اندرونی منڈی ہے، اور بات ایک ہی ہے، ایک اتنی ہی بے نہایت نوآبادیاتی منڈی ہے، یعنی ہر حال میں اسباب کا یقین ہے کہ اگر منڈی سے کام ہوا تو مصنوعات کی ایک بڑی مقدار بک سکتی ہے، اس لئے اس بات کی ضمانت ہے کہ کام چلتا رہیگا اور اگر کسی پردیسی مصنوعات کی منڈی پر قبضہ جمانا ہے تو اتنے وسائل موجود ہیں کہ آئندہ سالہا سال تک کے لئے اعتبار پر مال دیدیں، اگر ان آسانیوں کو ایک ایک کرکے دیکھئے تو یقین آجائیگا کہ ایسی طاقت کے مقابلہ میں واقعات کی قدرتی رفتار سے آزاد مقابلہ کی صورت میں کوئی امید رکھنا سراپا حماقت ہے جبکہ ابھی مزدوروں اور صناعوں کو سکھانا ہو، مشینوں کی تیاری کے کارخانے اور حمل و نقل کے وسائل ابھی معرض تکمیل میں ہوں، کارخانہ والوں کے لئے اندرونی منڈی تک یقینی نہ ہو، کسی معتد بہ برآمد کا تو ذکر ہی کیا کارخانہ والوں کو، بہت خوش نصیب ہوئے تو بس اپنی شدید ضرورتوں تک کے لئے ادھار مل سکے، جہاں ایک دن کے لئے بھی اس بات کا یقین نہ ہو کہ انگلستان میں کساد بازاری کی وجہ سے یا انگریزی بنکوں کی کسی تدبیر سے پردیسی مال کے انبار کے انبار ایسی قیمتوں پر بازار

کی منڈی میں نہ لاڈالے جائیں گے جن سے خام اجناس تک کے دام نہیں نکل سکیں اور جن سے صنعت کا کاروبار سالہا سال تک کے لئے رک سکے۔

اگر یہ قومیں اس کا تہیہ بھی کرلیں کہ ہمیشہ کے لئے انگلستان کے تحت صنعت کے رہیں گی اور اسی ادنیٰ حیثیت پر قناعت کرلیں گی کہ انگلستان کے لئے وہ چیزیں فراہم کریں جو وہ خود تیار نہیں کرسکتا یا دوسری جگہ سے حاصل نہیں کرسکتا، تو اس ماتحتی میں ان کا بھلا نہ ہوگا۔ شمالی امریکہ کے لئے یہ کون سے نفع کی بات ہے کہ وہ اپنی سب سے خوبصورت اور عمدہ ریاستوں کو آزاد محنت کی رہ سے دور کرے اور شاید اپنی تمام آئندہ قومی عظمت کو اس فائدہ پر سے قربان کردے کہ اوہ انگلستان کے لئے روئی فراہم کیا کرےگا؟ کیا اس سے انگلستان کی یہ کوشش رک جائیگی کہ وہ یہ مال دوسرے ممالک سے حاصل کرے؟ اگر جرمن اس پر راضی ہو جائیں کہ اپنی نفیس اون کے بدلے اپنی تمام مصنوعات کی ضرورتیں انگلستان سے پوری کیا کرینگے تو یہ بھی بے سود ہوگا، وہ اس طرح آسٹریلیا کو روک نہ سکیں گے اور وہ اگلے بیس سال میں تمام یورپ کو نفیس اون سے بھردیگا۔

اور ماتحتی کا یہ تعلق اور بھی قابل افسوس معلوم ہوتا ہے جب یہ سوچئے کہ جنگ کے زمانہ میں ان قوموں کے ہاتھ سے اپنی زرعی پیداوار کی یہ منڈی اور اس کی وجہ سے پردیس سے مصنوعات خریدنے کے وسائل بھی جاتے رہتے ہیں، ایسے وقت معاشیات کے سارے خیالات اور تمام نظام پس پشت رہ جاتے ہیں، بقائے نفس اور حفاظت نفس کا اصول قوموں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی زرعی پیداوار کو خود کام میں لائیں اور دشمن کی مصنوعات

مستعفی ہو جائیں۔ اس جنگی نظام اجتماعی میں کیا کیا نقصان ہیں اس وقت اس پر وہ بیان نہیں دیا جا سکتا، لیکن زرعی قوم جنگ کے زمانہ میں چاہے کتنی ہی کوشش سے اور کیسی ہی قربانیاں برداشت کر کے صنعت اور کارخانے وجود میں لائے صلح ہوتے ہی تفوق صنعتی کا مقابلہ ان تمام ہنگامی تخلیقات کو پھر برباد کر دیگا، مختصر یہ کہ جو قومیں قومی تقسیم عمل اور تعاون قوائے دولت آفرین کے ذریعہ اپنے لئے نسلاً بعد نسلٍ کام جاری رکھنے کی ضمانت نہیں پیدا کرتیں۔ اُن کی قسمت میں بس تعمیر و تخریب، خوشحالی و فلاکت کی ایک دائمی دھوپ چھاؤں ہے۔

باب (۲۵)

صنعت کی قوت اور دولت آفرینی اور صرفِ دولت کی ترغیب

جماعتی زندگی میں آدمی کو اس وقت دولت آفرین نہیں سمجھنا چاہیے جب وہ بلاواسطہ کچھ اشیا یا قوائے دولت آفریں پیدا کرے، بلکہ وہ اس وقت بھی دولت آفریں ہوتا ہے جب اس کی وجہ سے دولت آفرینی اور صرفِ دولت کو تحریک ہو یا قوائے دولت آفریں پیدا ہوں۔

فنونِ لطیفہ کا ماہر اپنے کاموں سے ایک تو ذہنِ انسانی کی تہذیب پر اور جماعت کی قوت دولت آفریں پر اثر ڈالتا ہے لیکن دوسرے چونکہ فن سے محظوظ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مادی ذرائع موجود ہوں جن سے اسے خریدا جا سکے اس کے لئے فنونِ لطیفہ کا ماہر مادی دولت آفرینی اور کفایت شعاری کا محرک بھی بنتا ہے۔

کتابیں اور اخبار معلومات فراہم کر کے ذہنی اور مادی دولت آفرینی پر اثر ڈالتے ہیں مگر انہیں حاصل کرنے کیلئے دام درکار ہوتے ہیں، اور اس لحاظ سے ان سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ بھی مادی دولت آفرینی کا ایک محرک ہے۔

نوجوانوں کی تعلیم سے جماعت کی زندگی بہتر ہوتی ہے، لیکن والدین کو اس کے ذرائع فراہم کرنے کے لئے کہ بچوں کو اچھی تعلیم دے سکیں کتنی کچھ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ بہتر طبقہ کے لوگوں میں رہنے سہنے کی وجہ سے ذہنی اور مادی دولت آفرینی کے کتنے بے شمار کام ظہور میں آتے ہیں!

تختوں کے بنے ہوئے مکان میں بھی آدمی اسی طرح رہ سکتا ہے جیسے ایک محل میں، حتیٰ کہ گودڑ ہی صرف کر کے بھی آدمی اپنے کو سردی اور بارش سے اسی طرح محفوظ رکھ سکتا ہے جیسے خوبصورت سے خوبصورت اور پُرتکلف سے پُرتکلف لباس سے، سونے اور چاندی کے اوزاروں اور باسنوں سے کچھ اس سے زیادہ آرام نہیں ملتا جتنا فولاد اور ٹین سے، لیکن ان کے ساتھ جو امتیاز وابستہ ہے وہ محرک ہوتا ہے جسم و دماغ کی محنت کے لئے، نظم و ترتیب اور پس اندازی کے لئے؛ اور اپنی بہت کچھ دولت آفرینی کے لئے جماعتی زندگی اسی محرک کی ممنون ہے،

حتیٰ کہ وہ لگان دار جو صرف اپنی آمدنی کو قائم رکھنے، بڑھانے اور صرف کرنے کی فکر کرتا ہے وہ تک متعدد طریقوں سے ذہنی اور مادی دولت آفرینی پر اثر ڈالتا ہے، ایک تو اپنے صرف دولت سے علم و فن اور صنائع لطیفہ کو مدد پہنچاتا ہے، پھر اس طرح کہ وہ

جماعت کے مادی سرمایہ کے وصول کرنے اور بڑھانے کے عہدہ پر مامور ہے، تیسرے یوں کہ اپنی شان و شوکت سے یہ جماعت کے دوسرے طبقوں کو اپنی نقالی پر آمادہ کرتا ہے، جس طرح انعامی کام دینے سے سارے مدرسہ میں محنت کا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے ہر چند کہ وہ اچھے انعام صرف چند ہی کو ملتے ہیں۔ اس طرح بڑی جائداد اور دولت کے لوازم شان و شوکت سے تمام متوسط طبقہ پر اثر پڑتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ یہ اثر زائل ہو جاتا ہے، اگر یہ بڑی جائداد غصب، یا استحصال بالجبر، یا فریب کا پھل ہو یا جہاں اس پر قبضہ اور اس سے حاصل شدہ حظ کو سب کے سامنے ظاہر نہ کیا جا سکے۔

صنعت یا تو آلات دولت آفرینی پیدا کرتی ہے یا احتیاجات زندگی رفع کرنے کے وسائل، یا شان و شوکت اور ٹھاٹھ دکھاوے کے ذرائع۔ عموماً یہ آخری دو صنفتیں یکجا ہوتی ہیں، ہر جگہ جماعت کے مختلف طبقوں میں اسی اعتبار سے تفریق کی جاتی ہے کہ یہ کہاں رہتے ہیں اور کیسے رہتے ہیں، ان کا ساز و سامان کیسا ہے، اور لباس کیسا، گاڑی گھوڑے کیسے قیمتی ہیں، اور ان کے خدم و حشم کی ظاہری شکل صورت کیسی اور تعداد کیا ہے جہاں صنعت پست حالت میں ہوتی ہے وہاں یہ فرق بھی کم ہوتا ہے، یعنی تقریباً سب بُری طرح رہتے سہتے ہیں، سب ہی کے کپڑے بُرے ہوتے ہیں، اور کوئی کسی کی ریس اور تقلید نہیں کرتا۔ یہ تو امی نسبت سے پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے جس سے کہ صنعت کو فروغ ہوتا ہے، خوشحال صنعتی ممالک میں ہر ایک اچھا رہتا اچھا پہنتا ہے اگرچہ صرف مصنوعات کی کیفیت میں بے شمار مدارج ہوتے ہیں، کوئی شخص جس میں ابھی کام کرنے کی طاقت ہے

ظاہر ہیں محتاج نظر نہیں آتا جا پتا، یعنی مصنوعات جماعت کی دولت آفرینی کو ایسے محرکات سے ترقی دیتے ہیں جو زراعت کی معمولی گھریلو چیزیں، خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزیں پیش نہیں کرسکتیں۔

یہ ضرور ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں بہت فرق ہوتا ہے، اور اچھا کھانے اچھا پینے کی خواہش ہر شخص کے لئے محرک کا کام کرتی ہے لیکن لوگ کھانا سب کے سامنے علانیہ نہیں کھاتے اور جرمن ضرب المثل خوب ہے کہ سب دیکھتے ہیں کہ کالر کیسا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ پیٹ میں کیا ہے۔ اگر کم عمری سے آدمی موٹا جھوٹا کھانے کا عادی ہو تو بہتر غذا کی خواہش شاذ ہی پیدا ہوتی ہے، اور جہاں کھانے پینے کی چیزیں صرف قریب ہی آس پاس سے آتی ہیں وہاں تو ان کے صرف کی حدیں اور بھی تنگ ہوتی ہیں منطقۂ معتدلہ کے ممالک میں ان حدود میں توسیع اس وقت ہوتی ہے جب منطقۂ حارہ کی چیزیں فراہم ہونے لگتی ہیں لیکن یہ چیزیں ایسی اور اتنی کہ ملک کی ساری آبادی انکے استعمال سے حظ حاصل کرسکے (جیسا کہ ہم ایک پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں) اسی وقت فراہم ہوسکتی ہیں کہ مصنوعات کے ذریعہ خارجی تجارت ہوتی ہو۔

ظاہر ہے کہ نوآبادیاتی چیزیں اگر صنعت کے لئے بطور خام جنس کے کام نہ آئیں تو زیادہ تر محرکات کا کام دیتی ہیں نہ کہ غذا کا، کوئی اس سے انکار نہ کریگا کہ بے شکر کی چاہ کی کافی ہیں بھی اتنی ہی غذائیت ہے جتنی کہ شکر کے ساتھ ہو کافی میں، اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ان چیزوں میں کچھ غذائیت ہوتی ہے تب بھی اس لحاظ سے قدر اتنی کم ہے کہ

انہیں دیسی غذاؤں کا بدل بنانے پر مشکل ہی سے غور کیا جا سکتا ہے مسالے اور تمباکو تو قطعی طور پر صرف محرکات ہی ہیں یعنی ان کا اثر جماعت کے لئے بس یہ مفاد رکھتا ہے کہ ان سے عام آبادی کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ ذہنی اور جسمانی کام کے لئے اکساتی ہیں۔ بہتیرے ملک میں ان لوگوں کے اندر جن کا تنخواہ پر یا لگان پر گزر ہے اس چیز کے متعلق بڑے ہی غلط خیال پھیلے ہوئے ہیں جیسے وہ نچلے طبقوں کے تعیش سے موسوم کرتے ہیں، ان لوگوں کو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ مزدور کافی میں شکر ڈال کر پیتے ہیں اور اس زمانہ کو یاد کرتے ہیں جب یہ لوگ جی کے دلیہ پر اکتفا کرتے تھے۔ لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کسان نے اپنے غریبانہ کھدر کے بنے ہوئے کپڑے چھوڑ کر اونی کپڑا پہننا شروع کر دیا، لوگوں کو اندیشہ ہے کہ تھوڑے دن میں گھر کی بی بی اور خادمہ میں فرق نہ ہو سکیگا، پچھلی صدیوں میں لباس پر جو پابندیاں تھیں اُن کی ستائش ہوتی ہے لیکن اگر مقابلہ کیجئے ان مزدوروں کے کام جہاں وہ خوش حال آدمی کی طرح کھاتا پہنتا ہے اس ملک والے سے جہاں وہ موٹے جھوٹے کھانے کپڑے پر قانع ہے تو معلوم ہوگا کہ وہاں حظ و مسرت کا اضافہ عام خوشحالی کو نقصان پہنچا کر نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے جماعت کے قوائے دولت آفریں کو فائدے ہی پہنچے ہیں، وہاں مزدوروں کا کام یہاں سے دوگنا اور تگنا ہے، لباس کے متعلق ہدایتوں نے اور صرف کے اوپر پابندیوں نے جماعت کے عوام نے نقل کرکے بڑھنے کی خواہش کو بالکل مردہ کر دیا ہے اور ان سے فائدہ پہنچا ہے تو صرف کاہلی اور جمود کو۔

ظاہر ہے کہ پہلے چیزیں بننی چاہئیں تب ہی صرف میں آسکتی ہیں۔ اور اِس حد تک بے شک عام طور پر دولت آفرینی کو صرفِ دولت سے پہلے آنا چاہیئے، لیکن معیشت جماعتی و قومی میں اکثر صرف دولت آفرینی سے پہلے آتا ہے صنعتی قومیں کثیر سرمایہ کی مدد سے اور دولت آفرینی میں محض زرعی قوموں کے مقابلہ میں کم پابندیوں کی وجہ سے ان زرعی قوموں کو اگلی فصلوں کی ضمانت پر پہلے سے مال دے دیتی ہیں۔ یہ قومیں پیدا کرنے سے پہلے صرف کرتی ہیں، یہ پیدا کرتی ہیں بعد میں اس لئے کہ پہلے صرف کر چکی ہیں۔ یہی بات بہت وسیع تر پیمانہ پر شہر اور دیہات کے تعلق میں ظاہر ہوتی ہیں، صنعت والا زراعت والے سے جس قدر نزدیک ہوگا اسی قدر اُسے صرف کرنے کی تحریک کرے گا اور اِس کے ذرائع فراہم کرے گا، اور اُسی قدر اُسے فائدہ پیدا کرنے کی خواہش ہوگی۔

سب سے اہم محرکات تو وہ ہیں جو جماعتی اور سیاسی ادارات نظم سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں یہ ممکن ہی نہ ہو کہ کام کرکے اور خوش حالی کی وجہ سے آدمی ایک طبقہ سے دوسرے میں، نیچے طبقہ سے اونچے میں پہنچ جائے، جہاں مالک اپنی املاک کو سب کے سامنے ظاہر کرنے سے اور اُس کے پھلوں سے متمتع ہونے سے ڈرے، اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ اِس سے املاک خطرہ میں آجائے گی، یا یہی کہ لوگ بے جا دکھاوے اور بننے کا الزام لگائیں گے؛

جہاں کاروبار کرنے والوں کو سرکاری اعزاز حاصل نہیں ہوتے، انتظام ملکی میں، قانون سازی اور انصرام عدل میں حصّہ لینے سے وہ یک قلم محروم ہوتے ہیں، جہاں زراعت، صنعت اور تجارت میں نمایاں خدمات سے نہ سرکار میں عزّت حاصل ہوتی ہے نہ جماعت میں امتیاز، تو وہاں صرف دولت اور دولت آفرینی دونوں کے لئے قوی ترین محرکات گویا مفقود ہوتے ہیں۔

ہر قانون، ہر سرکاری ادارہ دولت آفرینی پر، یا صرف دولت پر، یا قوائے دولت آفریں پر اثر ڈالتا ہے، یا اُسے قوت پہنچاتا ہے یا کمزور کرتا ہے۔

پیٹینٹ سے حق محفوظ کرنے کا طریقہ دراصل ایجاد و اختراع پر انعام دینا ہے، اس انعام کو حاصل کر لینے کی توقع ہی ذہنی قوتوں کو اکساتی ہے، اور اُنہیں صنعت میں ترقیاں کرنے کی طرف لگاتی ہے۔ جماعتی زندگی میں اس سے ایجاد و اختراع کی قدر ہوتی ہے اور وہ مضرّت رساں تعصب مٹتا ہے جو غیر متمدّن قوموں میں پُرانی عادتوں اور قدیم طریقوں کی حمایت کرتا ہے، اور جو آدمی ان نئی ایجادوں کی صرف ذہنی استعداد رکھتا ہے، اُس کے لئے ایجاد کے مادی ذرائع بھی اس طریقہ سے فراہم ہوتے ہیں کہ ایجاد سے جن فوائد کی توقع ہے اُن کا ایک حصّہ اپنے لئے محفوظ کر کے سرمایہ دار کو بھی ترغیب ہوتی ہے کہ موجد و مخترع کی مدد کرے۔

تاہم محاصل ملکی صنعت کو ان تمام شاخوں کے لئے محرّک کا کام دیتے ہیں

جن کا مال پردیس سے بہتر آتا ہے لیکن جس کے پیدا کرنے کی صلاحیت ملک میں موجود ہے، ان سے ضمانت ہو جاتی ہے کہ اگر کارخانہ والے اور مزدور نئی واقفیت اور نئی مہارت پیدا کر لیں اور ملکی اور پردیسی سرمایہ دار ایک مقرّرہ وقت کے لئے اپنا سرمایہ ایک خاص نفع بخش طریقہ پر لگائیں، تو اس کا انعام پائیں گے۔

باب (۲۶)

محاصل تجارت: ملکی صنعت کے قیام و تحفظ کا خاص ذریعہ

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم اس جگہ ملکی صنعت کو ترقی دینے کے ان وسائل سے بحث کریں جن کے قابل ہونے پر اور جن کی تاثیر پر کوئی اعتراض ہی وارد نہیں ہوتا ان میں، مثال کے طور پر، شامل ہیں: تعلیمی ادارے، خصوصاً صنعتی مدرسے، مصنوعات کی نمائشیں، انعاموں کے اعلان، وسائل نقل و حمل کی ترقی، پیٹنٹ کے قوانین وغیرہ یعنی سب وہ قوانین اور ادارے جن سے صنعت کو فروغ ہو اور اندرونی و بیرونی تجارت میں سہولت اور باضابطگی پیدا ہو، ہم تو یہاں صرف محاصل تجارت سے متعلق قوانین پر بہ حیثیت صنعتی تعلیم کے ایک ذریعہ کے، گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نظام کے مطابق برآمد کو روکنے یا برآمد پر محاصل لگانے کا ذکر تو شاذ و نادر ہی آسکتا ہے؛ قدرتی پیداوار کی درآمد پر بھی صرف آمدنی کے لئے محاصل لگائے جا سکتے ہیں، کبھی ملکی زراعت کی تائید کے لئے نہیں۔ صنعتی ممالک میں گرم ممالک کی صرف

اس پیداوار پر آمدنی کے لئے محاصل لگائے جاسکتے ہیں جو تعیش کے کام آئے، عام ضروریاتِ زندگی کی چیزوں پر نہیں مثلاً غلہ، ذبح کرنے کے جانور، وغیرہ۔ اِس نظام کے مطابق منطقہ حارہ کے ممالک کو، یا کم آباد و پچھڑے علاقے والے ممالک کو، یا ان ممالک کو جن میں ابھی کافی آبادی نہیں ہے، یا جن میں تہذیب و تمدن، اجتماعی اور سیاسی ادارے ابھی بہت پیچھے ہیں، ایسے ممالک کو چاہئے کہ مصنوعات کی درآمد پر صرف آمدنی کے لئے محاصل لگائیں۔

لیکن آمدنی کے لئے محاصل کو ہمیشہ اتنا معتدل ہونا چاہئے کہ اُن سے درآمد اور صرف میں کوئی خاص کمی نہ ہو، اس لئے کہ اگر ایسا ہوا تو نہ صرف ملکی قوت دولت آفریں کمزور ہوتی ہے بلکہ خود مالی غرض بھی حاصل نہ ہو سکے گی۔

"تامینی تدابیر صرف اس غرض کے لئے حق بجانب ہیں کہ ملک کی صنعتی قوت کی ترقی اور تحفظ حاصل ہو، اور صرف ان قوموں کے لئے حق بجانب ہیں جن کے پاس وسیع یکجا علاقہ ہو، خوب آبادی ہو، قدرتی وسائل ہوں، ترقی پائی ہوئی زراعت ہو، اعلیٰ تہذیب ہو، اچھا سیاسی نشوونما پا چکا ہو اور ان وجوہ سے وہ اس کی اہل ہوں کہ اوّل درجہ کی زرعی صنعتی تجارتی قوموں کے ساتھ ساتھ، اور قومی سے قوی بحری اور برّی قوتوں کے پہلو بہ پہلو ایک صف میں کھڑی ہو سکیں۔

"تامین کی غرض حاصل ہو سکتی ہے یا تو بعض مصنوعات کی درآمد قطعاً منع کر لے، یا بھاری بھاری محاصل سے جو یا تو بالکل، یا کچھ کچھ امتناع قطعی ہی کے برابر ہوں، یا معتدل

محاصل ودرآمد کے ذریعہ تامین کی ان تدابیر میں سے کوئی بھی فی نفسہ مطلق پسندیدہ یا غیر پسندیدہ نہیں ہے، اور اس کا انحصار قوم کے مخصوص حالات اور اس کی صنعت کی حالت پر ہے کہ ان میں سے کونسی تدبیر وہاں عمل ہو سکتا ہے۔

ذرائع تامین کے انتخاب میں جنگ کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے کہ جنگ سے مجبوراً ہی ایک نظام انتہاعی پیدا ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں لڑنے والے ملکوں میں لین دین بند ہو جاتا ہے، اور ہر قوم کو بلا لحاظ اپنے معاشی حالات کے کافی بالذات ہونے کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو کم ترقی یافتہ صنعتی قوم کی صنعت کو ترقی ہوتی ہے، دوسری طرف بہت زیادہ ترقی یافتہ صنعتی قوم میں زراعت کو اس قدر غیر معمولی طریقہ سے ہوتی ہے کہ اگر حالت جنگ کئی سال تک جاری رہی ہو تو کم ترقی یافتہ صنعتی قوم کو بھی قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کی وجہ سے ان مصنوعات کے آنے میں جو روک ہو گئی تھی جن میں یہ ابھی تک بہت زیادہ ترقی یافتہ صنعتی قوم سے آزادمقابلہ نہیں کر سکتی، اس روک کو امن کے زمانہ میں بھی کچھ دنوں جاری رہنے دے۔

یہ حالت امن عام کے بعد فرانس اور جرمنی کی تھی، اگر فرانس نے ۱۸۱۵ء میں انگریزی مقابلہ کی اجازت دے دی ہوتی، جیسا کہ جرمنی، روس اور شمالی امریکہ نے کیا، تو اس کی بھی وہی حالت ہوتی جو اُن کی ہوئی۔ جنگ کے زمانہ میں جو کارخانے قائم ہو گئے تھے وہ سب برباد ہو جاتے۔ اس وقت سے صنعت کی تمام شاخوں میں جو ترقیاں ہوئی ہیں، ملکی وسائل حمل ونقل میں، تجارت خارجہ میں، دریائی اور بحری جہازرانی میں، دخانی جہازرانی

ہیں، جو جو ترقیاں ہوئیں، اراضی کی قیمت میں رجس میں چلتے چلتے کیسے و بینے ہیں، اس نا منہ میں دو گنے کا فرق ہو گیا) آبادی میں، اور ریاست کی آمدنی میں جو اضافے ہوئے، ان کا وہم و گمان بھی پیدا نہ ہو سکتا۔ فرانس کے کارخانوں کا ابھی عہد طفلی ہی تھا، ملک میں ابھی سڑکیں بہت ہی کم تھیں، کانوں سے ابھی پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جا رہا تھا، سیاسی انقلابات اور جنگوں نے ابھی نہ معتدبہ سرمایہ جمع ہونے دیا تھا، نہ کافی صنعتی تعلیم ہو سکی تھی؛ نہ مستعد مزدور پیدا ہو پائے تھے، نہ صنعتی احساس، نہ حوصلہ مندی کی رُوح؛ ابھی قوم کا ذہن جنگ ہی کی طرف زیادہ متوجہ تھا اور صلح و امن کے فنون کی طرف کم، وہ تھوڑا بہت سرمایہ جو جنگ کے زمانہ میں جمع ہو بھی گیا وہ ابھی زیادہ تر زراعت ہی میں لگنا پسند کرتا تھا جو بہت ہی بُری حالت میں تھی، کہیں اس وقت جا کر پہلی مرتبہ فرانس دیکھ سکا، کہ انگلستان نے جنگ کے دوران میں کیا کیا ترقیاں کر لی ہیں؛ اب کہیں وہ انگلستان سے مشینیں، صناع، مزدور، سرمایہ، حوصلہ مندی کی ذہنیت اپنے ملک میں لا سکتا تھا؛ اب ضرورت تھی کہ ملکی صنعت کے لئے ملکی منڈی کو بلا شرکت غیرے محفوظ کر کے اس کی تمام قوتوں کو ابھارا جائے اور تمام قدرتی وسائل کو کام میں لایا جائے۔ اس تامینی روک کے نتائج آنکھوں کے سامنے ہیں، صرف اندھی عالم پرستی ان سے انکار کر سکتی اور دعوے کر سکتی ہے کہ آزاد مقابلہ میں فرانس اور زیادہ ترقی کرتا۔ کیا جرمنی، شمالی امریکہ اور روس کا تجربہ قطعی طور پر اس کے برعکس ثابت نہیں کرتا؟

ہم جب یہ کہتے ہیں کہ ۱۸۱۵ء سے فرانس کے لئے یہ امتناعی نظام مفید ثابت ہوا

تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس کی غلطیوں یا مبالغہ آمیزیوں کو ڈھانپنا چاہتے ہیں یا اس کے جاری رکھنے کے مفید اور ضروری ہونے کے مدعی ہیں۔ بیشک یہ غلطی تھی کہ فرانس نے زرعی پیداوار اور خام اجناس (کچا لوہا، پتھر کا کوئلہ، اون، غلہ، مویشی) کو محاصل درآمد لگا کر روکا! یہ غلطی ہوئی کہ اپنی صنعت کے کافی مضبوط ہو جانے کے بعد بھی فرانس رفتہ رفتہ معتدل نظام تامینی کی طرف نہ آتا اور محدود مقابلہ کی اجازت دے کر اپنے اہل صنعت کو دوسروں کی برابری کرنے کی تحریک نہ دیتا۔

محاصل تامینی کے متعلق یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ آیا ایک قوم آزاد مقابلہ کیجائیت سے تامین کی طرف جانا چاہتی ہے یا امتناعی نظام سے معتدل تامینی نظام کی طرف۔ پہلی صورت میں ضروری ہے کہ محاصل شروع شروع میں بہت کم ہوں، اور رفتہ رفتہ بڑھائے جائیں، دوسری صورت میں شروع میں بہت زیادہ ہوں اور رفتہ رفتہ کم ہوتے جائیں۔

جس قوم میں پہلے سے محاصل کے ذریعہ تامین صنعت کا کافی انتظام نہ ہو لیکن وہ محسوس کرتی ہو کہ وہ صنعت میں بڑی بڑی ترقیوں کا اہل ہے تو اسے سب سے زیادہ ان صنعتوں کو ابھارنے کی طرف دھیان کرنا چاہیئے جو عام استعمال کی چیزیں تیار کرتی ہیں۔ اول تو یہ کہ ان مصنوعات کی قیمت کی میزان ان سے کہیں مہنگی تعیش کی چیزوں کی قیمت کی میزان سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی مقابلہ ہی نہیں، اس لئے یہ صنعتیں بہت زیادہ قدرتی ذہنی اور شخصی قوائے دولت آفریں کو حرکت میں لاتی ہیں اور چونکہ سرمایہ

ان میں بہت درکار ہوتا ہے اس لئے سرمایہ کی پس اندازی، باہر سے سرمایہ اور فوتوں کو لانے کے مواقع پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ صنعت کی ان شاخوں کے فروغ پانے سے آبادی تیزی سے بڑھتی ہے، ملکی زراعت پھلتی پھولتی ہے، تجارت خارجہ میں خاص طور سے ترقی ہوتی ہے اس لئے کہ کم متمدن ممالک زیادہ تر یہی عام استعمال کی چیزیں منگاتے ہیں اور منطقہ معتدلہ کے ممالک زیادہ تر یہی چیزیں تیار کرکے گرم ملکوں سے براہ راست تجارت کا تعلق قائم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مثلاً جو ملک سوت اور روئی کا کپڑا باہر سے منگاتا ہو مصر، لوئی سیانا یا برازیل سے براہ راست تجارت نہیں کرسکتا اس لئے کہ ان قوموں کو جو روئی کے کپڑے کی احتیاج ہے اسے یہ پورا نہیں کرسکتا اور ان کی روئی لے نہیں سکتا۔ علاوہ بریں چونکہ ان چیزوں کی مجموعی قیمت بہت ہوتی ہے اسلئے ان سے قوم کی برآمد اور درآمد میں کم و بیش توازن پیدا ہوجاتا ہے، اور ہمیشہ زرمبادلہ کی جو مقدار درکار ہوتی ہے وہ قوم کے پاس ان کی وجہ سے موجود رہتی ہے یا حاصل کی جاسکتی ہے پھر صنعت کی انہیں شاخوں کے قیام اور فروغ سے قوم کو معاشی خود مختاری حاصل ہوتی اور قائم رہتی ہے۔ اور اگر جنگ کی وجہ سے لین دین میں ہرج پیدا ہوتا ہے بھی تو اس کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی کہ صرف گرانبہا تعیش کی چیزوں کا آنا رکتا ہے، برخلاف اس کے اگر عام ضرورت کی مصنوعات نہ ملیں یا گراں ہوجائیں اور زرعی پیداوار کی جو منڈی پہلے سے اہمیت رکھتی تھی اس سے کاروبار بند ہوجائے تو ہر طرف سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ اور آخر میں یہ بات ہے کہ ان چیزوں کو چھپا کر ملک میں لانے یا گھٹا کم

قیمت بتانے سے تابینی محاصل کے عمل سے بچنے کا امکان ان چیزوں میں بہ نسبت قیمتی سامان تعیش کے بہت کم ہیں اور اس کے تدارک کا انتظام بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

صنعتیں اور کارخانے ہمیشہ بہت دیر میں بڑھنے والے پودے ہوتے ہیں اور ہر ایسا تابینی محصول جو یکایک سابقہ تجارتی تعلقات کو منقطع کر دے خود اس قوم کے لئے مضر ہوتا ہے جس کے فائدہ کے لئے یہ عاید کیا جاتا ہے۔ ان محاصل کو بڑھنا چاہیئے بس اسی نسبت سے جس سے کہ ملک میں خود سرمایہ، صنعتی مہارت اور حوصلہ مندی کا اضافہ ہو یا کہیں باہر سے یہ چیزیں آئیں، اور اس نسبت سے جس سے کہ قوم ان فاضل اجناس خام اور قدرتی پیداوار کو جو پہلے باہر بھیجی جاتی تھیں اب خود کام میں لانے کے قابل ہو گئی ہو۔ خاص طور پر مفید بات یہ ہے کہ جن مدارج سے کہ شرح محاصل میں اضافہ کرنا ہو وہ پہلے سے طے ہو جائیں تاکہ جو سرمایہ دار، صناع یا مزدور جو ملک میں تیار ہوں یا باہر سے بلائے جائیں انہیں پہلے سے ایک مقررہ معاوضہ اور انعام کا یقین رہے اور لازم ہے یہ بات کہ یہ شرح محاصل بلا کم و کاست رکھی جائے اور وقت مقررہ سے پہلے ان میں کبھی کمی نہ کی جائے، اس لئے کہ اگر ایسی وعدہ خلافی کا ذرا بھی اندیشہ ہوا تو اس انعام کے یقین کا جو کچھ اثر ہوگا وہ بڑی حد تک کالعدم ہو جائیگا۔

یہ بات نظری طور پر طے نہیں کی جا سکتی کہ جب آزاد مقابلہ کی حالت سے تابین کی طرف جانا ہو تو محاصل درآمد کو کتنا بڑھنا چاہیئے اور نظام امتناعی سے معتدل تابین کی طرف آنا ہو تو ان محاصل میں کتنی تخفیف ہونی چاہیئے۔ اس کا انحصار خاص حالات پر ہے

اور اس اعتباری نسبت پر جو کم ترقی یافتہ قوم کو زیادہ ترقی یافتہ قوم سے ہو، مثلاً ریاستہائے متحدہ کو اس خام روئی کی برآمد کا خاص خیال رکھنا ہوگا جو وہ انگلستان بھیجتی ہیں اور ان زرعی اور بحری پیداوار کا جو وہ انگریزی نوآبادیوں کو بھیجتی ہیں نیز اپنے یہاں کی چڑھی ہوئی شرح اجرت کا، لیکن ان باتوں کے مقابلہ میں یہ بات اُن کے موافق ہے کہ پھر دوسری قوم سے زیادہ وہ اس بات پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ اپنے یہاں انگریزی سرمایہ انگریز صناعوں، کارخانہ داروں اور مزدوروں کو بلا سکیں گے۔

عام طور پر یہ مانا جاسکتا ہے کہ جہاں شروع میں ۴۰ تا ۵۰ فی صدی کا تاہینی محصول لگا کر بھی صنعت شروع نہ ہوسکے اور بعد کو ۲۰ تا ۳۰ فی صدی کی شرح سے ہمیشہ کے لئے قائم نہ رہ سکے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہاں قیام صنعت کی شرائط لازمی مفقود ہیں۔

اس عدم صلاحیت کے اسباب کا دور کرنا کہیں مشکل ہوتا ہے کہیں سہل، آسانی سے دور ہوسکنے والے اسباب میں ملک کے اندر وسائل حمل و نقل کی کمی ہے صنعتی واقفیت کی کمی، تجربہ کار کاریگروں کی کمی، اور صنعتی جوہر صاحب مندی کی کمی، مشکل سے دور ہونے والوں میں لوگوں کے اندر کام کے شوق کی، روشن خیالی کی، تعلیم کی، اخلاق کی، انصاف پسندی کی کمی ہے، اچھی زراعت کا نہ ہونا بھی ہے اور مادی سرمایہ کی کمی، لیکن خاص طور پر خراب سیاسی اداروں اور شہری آزادی کا فقدان اور انصاف کا یقینی نہ ہونا ہیں، اور آخر میں ریاست کی مملکت کا یکجا اور گٹھا ہوا نہ ہونا کہ اس کی وجہ سے ممنوعہ اشیاء کی تجارت کا روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

جو صنعتیں محض تعیش کی گراں چیزیں تیار کرتی ہیں وہ توجہ اور تامین کی سب سے آخر میں مستحق ہیں، ایک تو اس وجہ سے کہ ان کو جاری کرنے کے لئے ہی صنعتی تعلیم کا بہت اعلیٰ درجہ درکار ہوتا ہے، دوسرے ان کی مجموعی قیمت کل قومی پیداوار کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہے اور ان کی درآمد کا معاوضہ آسانی سے زرعی پیداوار یا اجناس خام یا عام ضرورت کی مصنوعات کی شکل میں ادا کیا جا سکتا ہے، مزید یہ کہ جنگ کے زمانہ میں ان کی درآمد رک جانے سے کوئی خاص ہرج واقع نہیں ہوتا، اور آخری بات یہ کہ ان پر اگر زیادہ محصول درآمد لگایا جائے تو یہ بآسانی چوری چھپے سے ملک میں لائی جا سکتی ہیں اور محصول کو ٹالا جا سکتا ہے۔

جن قوموں نے صناعی میں اور مشینوں کی تیاری میں ابھی خاص ترقی نہ کی ہو انہیں چاہئے کہ ہر قسم کی پیچیدہ مشینوں کو بلا محصول اندر آنے دیں یا ان پر اس وقت تک کے لئے بہت ہلکا سا محصول لگا دیں جب تک وہ خود اس سلسلہ میں اتنی ہی کارگزاری نہ دکھا سکیں جتنی کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم۔ مشینوں کے کارخانے ایک طرح سے کارخانوں کے کارخانے ہوئے ہیں اور پردیسی مشینوں پر ہر محصول گویا دیسی صنعت پر ایک پابندی عائد کرنا ہے، لیکن چونکہ کل صنعت پر اس کا اثر اس درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ مشینیں منگانے کے معاملہ میں جنگ کے اتفاقات پر منحصر کر دینا ٹھیک نہیں اس لئے صنعت کی یہ شاخ اگر معتدل محاصل کے باوجود دوسروں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے تو بھی اسے ریاست سے بلا واسطہ امداد کا مخصوص طور پر حق حاصل ہے، کم سے کم ریاست

کو چاہیئے کہ خود اپنے مشینوں کے کارخانوں کی اس حد تک پرورش کرے اور انہیں اس حد تک براہِ راست مدد دے جس حد تک کہ ان کی ترقی اور بقا اس بات کے لئے ضروری ہو کہ جنگ کی صورت میں شروع میں تو اشد ضرورتیں ان سے پوری ہو جائیں اور اگر وقفہ طویل ہو تو نئے قائم ہونے والے کارخانوں کے لئے نمونہ کا کام دے سکیں۔

واپسی محاصل کا سوال ہمارے نظام میں بس اس جگہ پیدا ہوتا ہے کہ پردیس سے جو نیم مصنوع مال آتا ہو مثلاً روئی کا سوت اس پر معتدبہ محصول تا طلبی اس لئے عائد ہو کہ رفتہ رفتہ ملک کے اندر ہی اس کی تیاری ممکن ہو جائے۔

امدادی رقمیں مستقل طور پر اس لئے دینا کہ زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے کارخانوں کے مقابلہ میں کسی تیسری قوم کی منڈی کے لئے ملکی مصنوعات کی برآمد ممکن ہو جائے بہت قابل اعتراض ہے اور اگر اسے ایسی صنعتی قوموں کی منڈیوں پر قبضہ کرنے کا ذریعہ بنایا جائے جو خود صنعت میں ترقیاں کر چکی ہیں تو پھر یہ اور بھی قابلِ اعتراض ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ایسے مواقع ہوتے ہیں کہ عارضی ہمت افزائی کے طور پر امداد دینا حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے خصوصاً اس وقت کہ قوم کا خفتہ جذبۂ حوصلہ مندی صرف تحریک کا محتاج ہے اور اپنی بیداری کے دورِ آغاز ہی میں ذرا سہارا چاہتا ہے تاکہ مستقل طور پر دولت آفرینی کی قوت پیدا کر لے اور ان ملکوں کو مصنوعات کی برآمد کر سکے جن میں خود ابھی صنعت موجود نہیں ہے لیکن خود اس صورت میں بھی وزن کر کے دیکھنا چاہیئے کہ آیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ریاست منفرد کارخانوں کو سود کی رقمیں پیشگی دے اور دوسری سہولتیں بہم پہنچاتے یا ان پہلی کوششوں کے لئے کمپنیاں قائم

کرائے اور ان کمپنیوں کو ضروری ابتدائی سرمایہ کا ایک حصہ خزانۂ ریاست سے پیشگی ادا کر دے اور اس میں حصہ لینے والے اشخاص کو اپنے سرمایہ پر سود کے معاملہ میں ترجیح اور اولیت حاصل ہو۔ اس قسم کے مواقع کی مثالیں ہمارے نزدیک یہ ہیں۔ دور دراز ممالک سے تجارت اور جہازرانی کی کوشش جہاں ابھی تک نجی اشخاص کی تجارت نہیں پہنچی ہے؛ بعید اقطاع عالم تک دخانی جہازرانی کے سلسلوں کا قیام؛ جدید نوآبادیوں کا بسانا، وغیرہ۔

باب (۲۷)

محاصل تجارتی اور مذہب رائج

تامینی تدابیر کے اثر کے معاملہ میں مذہب رائج قدرتی پیداوار اور صنعتی پیداوار میں فرق نہیں کرتا، چونکہ یہ تدابیر قدرتی پیداوار پر ہمیشہ مضر اثر ڈالتی ہیں اس لئے مذہب رائج اس بات کی مدد سے یہ غلط ثبوت پیش کرتا ہے کہ صنعتی پیداوار پر بھی ان کا ایسا ہی مضر اثر پڑے گا۔

صنعت کے قائم کرنے کے معاملہ میں مذہب رائج ان قوموں میں جو اس کی اہل نہیں ہیں اور ان قوموں میں کوئی فرق نہیں کرتا جو اپنے علاقہ کی نوعیت کی وجہ سے ترقی یافتہ زراعت کی وجہ سے، اپنی تہذیب کی وجہ سے، اپنی آئندہ خوشحالی، بقا اور قوت کی ضمانتوں کی وجہ سے اس کی خاص طور پر اہل ہیں۔

مذہب رائج یہ نہیں دیکھتا کہ اگر بہت ترقی یافتہ صنعتی قوموں کے ساتھ ایک کم ترقی یافتہ قوم کا بالکل آزاد مقابلہ ہو تو یہ دوسری قوم چاہے اس کی اہل بھی ہو لیکن تامینی تدابیر

بغیر کبھی بھی خود اپنی پوری ترقی یافتہ صنعت قائم نہیں کر سکتی اور کبھی بھی کامل آزادی حاصل نہیں کر سکتی۔

وہ ذرا خیال نہیں کرتا کہ تامینی نظام کی ضرورت پر جنگ کا کیا اثر ہوتا ہے وہ خاصکر یہ نہیں دیکھتا کہ جنگ سے لازماً ایک نظامِ امتناعی پیدا ہو جاتا ہے اور محاصل کے ذریعہ امتناع دراصل اسی جنگی نظام امتناعی کا لازمی سلسلہ ہے۔

اندرونی تجارت کی آزادی سے جو فوائد مرتب ہو سکتے ہیں انہیں یہ مذہب اس بات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ صرف بین الاقوامی تجارت کی مطلق آزادی ہی سے قومیں خوشحالی اور قوت کے مدارج اعلیٰ کو پہنچ سکتی ہیں، حالانکہ تاریخ سے ہر جگہ اس کے خلاف ثبوت ملتا ہے۔

اس کا دعویٰ ہے کہ تامینی تدابیر سے ملکی صنعت والوں کو اجارہ مل جاتا ہے اور اس سے کاہلی پیدا ہوتی ہے، حالانکہ اندرونی مقابلہ اتنا ہوتا ہے کہ برابری اور ریس کی تحریک کے لئے کافی ہے۔

یہ مذہب ہمیں یقین دلانا چاہتا ہے کہ تامینی محاصل سے زراعت والوں کو نقصان پہنچا کر صنعت والوں کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے حالانکہ بالکل ثابت ہے کہ ملکی صنعت سے ملکی زراعت کو بے حساب فوائد پہنچتے ہیں جن کے مقابلہ میں وہ قربانیاں بہت حقیر ہیں جو زراعت کو نظام تامینی کی خاطر کرنی پڑتی ہیں۔

نظام تامینی کے خلاف مذہب رائج کا خاص اعتراض یہ ہے کہ اس میں خرچ

بہت ہوتا ہے اور ممنوعہ اشیاء کی چوری چھپے کی تجارت سے بہت نقصان پہنچتا ہے ان نقائص سے انکار نہیں، لیکن کیا اس پر دھیان کیا جا سکتا ہے جب ایسی تدابیر زیر غور ہوں جن کا اثر قوم کے وجود، اور طاقت اور خوشحالی پر اس قدر بے حساب ہوتا ہے ؟ کیا مستقل فوج رکھنے اور جنگ کے نقصانات اس بات کی دلیل ہو سکتے ہیں کہ قوم کو اپنے تحفظ کا انتظام نہ کرنا چاہیئے ؟ جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر محصول اتنا ہو کہ ممنوعہ تجارت میں فائدہ یقینی ہو جائے تو اس سے صرف ممنوعہ تجارت کرنے والوں کو فائدہ ہوتا ہے، صنعت کو نہیں ہوتا، تو یہ صرف خراب نظام محاصل کے متعلق صحیح ہو سکتا ہے یا منتشر اور چھوٹے چھوٹے علاقوں کے ملکوں کے متعلق، یا صرف سرحدی تجارت کے متعلق اور بہت بھاری محاصل کے متعلق جو کم حجم کی اشیاء تعیش پر لگائے گئے ہوں۔ برخلاف اس کے تجربہ تو ہر جگہ یہ بتلاتا ہے کہ اگر محاصل کا انتظام اچھا ہو، اچھی بیجا علاقہ والی ریاستوں میں مناسب شرح محاصل کی ہو تو تامینی محاصل کے مقصد میں ممنوعہ تجارت سے کچھ زیادہ ہرج پیدا نہیں ہو سکتا، رہا تامینی نظام کے خرچ کا سوال تو یوں بھی خالص آمدنی والے محاصل کے وصول کرنے میں بھی خرچ تو اٹھانا ہی پڑیگا اور یہ تو مذہب رائج کا بھی دعوےٰ نہیں ہے کہ بڑی قومیں ان خالص آمدنی والے محاصل کو ترک کر سکتی ہیں۔

علاوہ بریں خود مذہب رائج بھی ہر قسم کی تامین کا مخالف نہیں ہے، تین حالتوں میں آدم اسمتھ نے ملکی صنعت کی تامین روا رکھی ہے، اوّل تو بطور انتقام، یعنی جب کوئی دوسری قوم ہماری برآمد کو روکے اور اس بات کی امید ہو کہ انتقامی کارروائیوں سے وہ اس

ردک کو ہٹا لیگی ، دوسرے قوم کی حفاظت کے لئے ، یعنی جب وہ صنعتی اشیاء جو حفاظت قومی کے لئے ضروری ہیں آزادانہ مقابلہ کی حالت میں ملک کے اندر تیار نہیں ہو سکتیں ، تیسرے بطور ذریعۂ توازن ، یعنے جب پردیسیوں کے مال پر ملک والوں کے مقابلہ میں کم ٹیکس ہو۔ سمتھ ان تینوں حالتوں میں بھی تاوان پر معترض ہے ، البتہ ایک چوتھی صورت میں اس کی اجازت دیتا ہے یعنی جب توقع ہو کہ صنعت کی کوئی شاخ چند سال بعد اتنی نفع رساں ہو جائے گی کہ پھر تاوان کی محتاج نہ رہے گی۔

گویا آدم سمتھ ہی سیاست تجارتی میں انتقام کے اصول کو داخل کرنا چاہتا ہے ، یعنی ایک ایسے اصول کو جس سے نہایت احمقانہ اور سخت تباہ کن کارروائیاں ظہور میں آئیں گی خصوصاً اگر ، آدم سمتھ کے مطالبہ کے مطابق ، یہ انتقامی تدابیر اسی وقت واپس لے لی جائیں جبکہ دوسری قوم اپنی پابندیاں ہٹانے پر آمادہ ہو جائے فرض کیجیے کہ انگلستان نے جو جرمنی کے غلّہ اور لکڑی کی برآمد پر پابندیاں کر دی ہیں اس کے خلاف جرمنی یہ انتقامی کارروائی کرے کہ اپنی حدود میں انگریزی مصنوعات کا داخلہ بند کر دے اور اس انتقامی کارروائی کی وجہ سے ملک میں مصنوعی طور پر اپنی صنعت وجود میں آ جائے ، اب اگر انگلستان راضی ہو کر اپنے دروازے جرمن غلّہ اور لکڑی کے لئے کھول دے تو کیا جرمنی ان بنے بنائے کارخانوں کو جن کی تیاری میں اتنی قربانیاں کرنی پڑی ہیں بالکل برباد ہو جانے دے ؟ کیسی حماقت کی بات ہے ! اس سے دس گنا بہتر ہوتا کہ جرمنی انگلستان کی تمام پابندیوں کو خاموشی سے سہتا اور اگر باوجود انگریزی رکاوٹوں کے اور بغیر کسی قسم کی تاوان کے ملک میں صنعت پیدا ہوتی

تو اس کو فروغ دینے کی جگہ مدد کرتا۔

انتقام کا اصول بس اسی وقت معقول اور قابل عمل ہوتا ہے جب اس کیساتھ قوم کی صنعتی تعلیم کا اصول بھی شامل ہو، اور انتقام کا اصول اس کا معین و مددگار ہو اور بس بلاشبہ، یہ معقول بات ہے اور مفید بات کہ اگر انگریز ان کی زرعی پیداوار کی درآمد کو روکیں تو وہ انگریزی مصنوعات کی درآمد اپنے یہاں روک کر اس کا جواب دیں مگر صرف اس وقت کہ یہ قومیں خود اپنی صنعت شروع کرنے اور اسے ہمیشہ قائم رکھنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔

آدم اسمتھ نے جو دوسرا استثناء کیا ہے اس سے صرف ایسی مصنوعات کی تامین ہی حق بجانب نہیں قرار پاتی جو جنگ کی فوری ضرورتوں کو پورا کریں جیسے اسلحہ اور گولہ بارود کے کارخانے، بلکہ ہمارا سارا کا سارا نظام تامین حق بجانب تسلیم ہو جاتا ہے۔ اس لئے تامین اور کیا کرتی ہے، یہی تو کہ قوم کی اپنی صنعت قائم کر کے آبادی میں اضافہ کراتی ہے مادی دولت مشینوں کی قوت بڑھاتی ہے، قوم کی خود مختاری اور اس کی ذہنی قوتوں کو مدد پہنچاتی ہے، اور اس طرح تحفظ قومی کے اس سے کہیں اعلیٰ ذرائع فراہم کرتی ہے جو محض اسلحہ اور گولہ بارود کی تیاری سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

یہی حال تیسرے استثناء کا ہے۔ خود ہماری پیداوار پر جو محصول لگتا ہے اگر وہ اس کی وجہ بن سکتا ہے کہ پردیس کے کم محصول دینے والے مال پر تامینی محصول لگایا جائے تو پھر جو دوسری دشواریاں ہماری صنعت کو پردیس کی صنعت کے مقابلہ میں ایں

اس بات کے لئے کافی وجہ کیوں نہیں ہیں کہ ملک کی صنعت کو پردیسی صنعت کے شدید مقابلہ سے محفوظ رکھا جائے۔

ژ۔ ب۔ سے نے ان مستثنیات کے تناقض کو خوب محسوس کر لیا تھا لیکن ان کی جگہ اس نے جو بدل رکھا ہے وہ بھی کچھ بہتر نہیں ہے، اس لئے کہ جو قوم قدرت کی طرف سے اور اپنی تعلیم کی وجہ سے اپنی صنعت قائم کرنے کی اہل ہے اس میں تو مستقل اور اچھی تامین سے صنعت کی تقریباً ہر شاخ نفع رساں ہو جائیگی۔ اور یہ تو دل لگی کی سی بات ہے کہ صنعت قومی کی ایک بڑی شاخ کی تکمیل کے لئے کسی قوم کو صرف چند سال مرحمت کئے جائیں، جیسے کسی موچی کے شاگرد کو جوتا بنانا سیکھنے کے لئے چند سال دیئے جاتے ہیں۔

آزادی تجارت کی خوبیوں اور تامین کی برائیوں پر مذہب رائج والے ہر وقت جو خطابت فرماتے ہیں ان میں چند قوموں کی مثال بہت دی جاتی ہے۔ سپتان کی مثال سے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ صنعت بالکل تامین کے بھی فروغ پا سکتی ہے اور یہ کہ بین الاقوامی تجارت کی مطلق آزادی ہی قومی خوشحالی کی سب سے مضبوط بنیاد ہے اسپین کا جو حشر ہوا اس سے تمام ان قوموں کے سامنے جو نظام تامین میں فلاح و بہبود کی متلاشی ہیں اس تامین کے مضر اثرات کی بڑی ہیبت ناک مثال پیش کیجاتی ہے انگلستان جو جیسا کہ ہم ایک پچھلے باب میں بتا چکے ہیں، تمام ان قوموں کے لئے جن میں اپنی صنعت قائم کرنے کی اہلیت ہے، نہایت اچھی طرح نمونہ اور تقلید کے لئے مثال کا کام دے

سکتا ہے، اس کو (مذہب رائج کے لیئے) یہ نظری صرف اپنے اس بیان کی تصدیق میں پیش فرماتے ہیں کہ صنعت کی اہلیت قدرت کی دین ہے جو بس بعض ملکوں سے اس طرح مخصوص ہے جیسے برگنڈی سے شراب پیدا کرنے کی صلاحیت، اور قدرت نے تمام ممالک عالم کے مقابلہ میں انگلستان ہی کے لیئے مقسوم کر دیا ہے کہ صنعت اور وسیع تجارت کے لیئے اپنے کو وقف کر دے! اب ذرا ان مثالوں پر قریب سے نظر ڈالیئے۔

سوستان کی بابت تو سب سے پہلے یہ بات کہنی ہے کہ وہ کوئی قوم نہیں، کم سے کم نہ معمولی انداز کی قوم ہے نہ بڑی قوم، بلکہ صرف چند بلدیوں کا مجموعہ ہے ساحل سمندر اس کے پاس نہیں، تین بڑی قوموں کے بیچ میں پھنسی ہوئی ہے، اس لیئے خود اپنی جہازرانی کو ترقی دینے کا یا منطقہ حارہ کے ممالک سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا حوصلہ اُسے نہیں، بحری قوت بڑھانے یا نوآبادیاں بسانے اور حاصل کرنے کا ولولہ ان میں مفقود۔ اپنی موجودہ خوشحالی کی بنیاد (جو یوں ہی معمولی سی خوشحالی ہے) سوستان نے اسی وقت رکھ لی تھی جب یہ جرمن سلطنت کا حصہ تھا۔ اس وقت سے یہ کم و بیش اندرونی جنگوں سے مامون رہا ہے، نسلاً بعد نسل سرمایہ جمع ہوتا رہا ہے، اس لیئے کہ ان کی بلدی حکومتوں نے ٹیکسوں میں تقریباً کچھ بھی نہیں لیا۔ مطلق العنان شاہی، اور تعصب مذہبی کی ان تباہیوں، جنگوں اور انقلابوں کی ان بربادیوں میں جن میں یورپ پچھلی صدیوں میں مبتلا رہا سوستان ہی ان سب کے لیئے دارالامان تھا جو اپنا سرمایہ اور

اپنی صلاحیت لیکر بھاگنا چاہتے تھے اور اس طرح اس نے باہر سے بہت سے وسائل حاصل کر لئے۔ جرمنی نے کبھی بھی اپنے کو سوسٹنان کے لئے سختی سے بند نہیں کیا اور سوسٹنان کی مصنوعات کا بڑا حصہ وہاں آتا رہا۔ علاوہ بریں اس کی صنعت کبھی قومی صنعت نہ تھی، یعنے روز مرہ کے استعمال کی چیزوں کی صنعت نہ تھی بلکہ تعیشات کی صنعت تھی جس کی پیداوار آسانی سے پڑوس کے ممالک میں چوری چھپے سے بھیجی جا سکتی تھی یا دور دراز ممالک کو آسانی سے پہنچائی جا سکتی تھی، اس کے علاوہ یہ ملک آڑھت کے کاروبار کے لئے نہایت اچھا واقع ہے اور ایک طرح خاص موزونیت رکھتا ہے انہیں تین پڑوسی قوموں کی زبانیں سیکھنے، ان کے قوانین اور ادارے اور حالات کے جاننے کا نہایت عمدہ موقع ہے، اسی بات سے سوسٹنان کے باشندوں کو آڑھت کے کام میں اور ہر دوسری حیثیت سے معتدبہ سہولتیں ہیں شہری اور مذہبی آزادی اور عام تعلیم نے ان میں جستی اور حوصلہ مندی پیدا کر دی ہے، اور چونکہ ملک میں زراعت بھی محدود ہے اور روزی کمانے کے اور وسائل بھی، اس لئے یہاں کے باشندے دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں، وہاں فوجی خدمت سے، تجارت سے، ہر قسم کی صناعی سے دولت جمع کرتے ہیں اور جب لوٹتے ہیں تو اپنے وطن میں ساتھ لاتے ہیں۔ اگر ان مخصوص حالات میں انسانی اور ذہنی سرمایہ وہاں جمع ہو گیا کہ چند تعیش کے سامان کی صنعتیں پیدا ہو گئیں اور یہ صنعتیں بلا محاصل نا بینی کے پروبس میں اپنا مال بیچکر قائم رہ سکیں تو اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جا سکتا کہ بڑی بڑی قومیں بھی بالکل مختلف حالات میں یہی تدابیر اختیار کر سکتی

ہیں۔ اپنے خرچ کی کمی میں سوستان کو وہ سہولت حاصل ہے جو دوسری قومیں اسی وقت پا سکتی ہیں کہ سوستان کی طرح بلدیوں میں منتشر ہو جائیں اور اپنی قومیت کو دوسروں کے حملے کا شکار بننے دیں۔

یہ بات تو ہر معقول آدمی تسلیم کر لیگا کہ فرانس نے جو قیمتی ذہانتوں کی برآمد کو روکا حالانکہ وہ خود ان کی بڑی فاضل تعداد پیدا کرتا تھا، تو بڑی حماقت کی، لیکن کوئی اس کی صنعت اور قومی خوشحالی کے زوال کی ذمہ داری برآمد مصنوعات پر پابندیوں کو قرار دے تو یہ غلط ہے۔ اگر اسپین نے مسلمانوں اور یہودیوں کو خارج نہ کیا ہوتا، اور وہاں احتساب مذہبی کا دور دورہ نہ رہا ہوتا، اگر چارلس پنجم اسپین میں عقیدہ کی آزادی دے دی ہوتی، اگر پادری اور راہب قوم کے معلم بن گئے ہوتے، اور ان کی عظیم الشان جائدادیں ریاست اپنے قبضہ میں لے لیتی، یا کم سے کم انہیں حد ضروری تک گھٹا دیتی، ان اسباب سے اگر شہری آزادی وہاں جگہ پاتی، منصب داری امراء کی کایا پلٹ جاتی اور شاہی حدود مناسب میں آجاتی، بالفاظ مختصر، اگر اسپین میں بھی "سدھار" کی وجہ سے سیاست کا ویسا ہی نشو و نما ہوتا، جیسے انگلستان میں ہوا، اور اگر یہی ذہنیت منتقل ہو کر اس کی نوآبادیوں میں پہنچتی تو اسپین میں بھی امتناعی اور تامینی تدابیر کا وہی اثر ہوتا جو انگلستان میں ہوا، بلکہ اس سے بھی بہتر ہوتا اس لئے کہ چارلس پنجم کے وقت میں اسپین والے انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں سے ہر اعتبار سے آگے تھے، صرف نیدرلینڈ ان سے بھی آگے تھا، لیکن اس کی صنعت اور تجارت کی ذہنیت تامینی محاصل کے ذریعہ اسپین میں منتقل کی جا سکتی تھی بشرطیکہ اسپین کے

اندرونی حالات ایسے ہوتے کہ بجائے اس کے کہ اپنا سرمایہ اور قابلیت ملک سے باہر بھاگے باہر سے سرمایہ اور قابلیت کو آنے کی ترغیب ہوتی۔

انگلستان کا صنعتی اور تجارتی تفوق جن اسباب کا مرہون منت ہے انہیں ہم پانچویں باب میں ظاہر کر چکے ہیں۔

انگلستان کی سیاست تجارتی کے لئے ملک کی قدرتی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور قوم کے قوائے دولت آفرینی کو کماحقہٗ ترقی دینا زیادہ تر اس لئے ممکن ہوا کہ وہاں ذہنی اور بلدی آزادی تھی، اور ملک کا دستور اساسی اور سیاسی ادارے نہایت اچھے تھے، لیکن کون انکار کر سکتا ہے کہ دوسری قومیں بھی ترقی کر کے آزادی کا یہی درجہ حاصل کر سکتی ہیں ؟ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ قدرت نے دوسری قوموں کو صنعت کے وسائل سے محروم کر دیا ہے ؟

اس سلسلہ میں اکثر انگلستان میں پتھر کے کوئلہ اور لوہے کی فراوانی کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ اسی وجہ سے انگریز صنعت کے لئے خاص طور پر موزوں ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ اس باب میں قدرت نے انگلستان کے ساتھ بڑی رعایت کی ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ ان معدنیات قدرتی کے معاملہ میں قدرت نے اور ملکوں کے ساتھ بھی سوتیلی ماں کا سا سلوک نہیں کیا ہے۔ اکثر تو ذرائع حمل و نقل کی کمی ان ذخائر سے پورا فائدہ نہیں اٹھانے دیتی، دوسری قوموں کے پاس غیر مستعمل آبی قوت کی بڑی زیادتی ہے جو بھاپ کی قوت سے سستی ہوتی ہے، اور اگر کہیں کوئلہ کی کمی ہو

بھی تو دوسرے اپنے دھندوں سے اس کی تلافی ممکن ہے۔ بہت سے ملکوں میں لوہے کی صنعت کے لئے اتنے وسائل ہیں کہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے، اور پھر یہ خام اجناس مبادلہ کی راہ سے بھی تو حاصل کی جا سکتی ہیں۔

آخر میں ہمیں ان تجارتی معاہدوں کا ذکر کرنا ہے جن میں باہم محاصل کی رعائتیں کی جاتی ہیں۔ مذہب رائج تو ان معاہدوں کو غیر ضروری اور مضر بتلاتا ہے اور ہمیں اس بات کا سب سے مؤثر ذریعہ نظر آتے ہیں کہ رفتہ رفتہ باہمی تجارتی پابندیاں کم ہوں اور قومیں آہستہ آہستہ آزاد تجارت عالمی کی طرف آئیں۔ یہ ضرور ہے کہ دنیا نے اب تک جو ایسے معاہدے دیکھے ہیں ان سے تقلید کی کچھ بہت ہمت نہیں ہوتی۔ ہم پچھلے ابواب میں بتا چکے ہیں معاہدہ میتھوین پرتگال میں اور معاہدہ ایڈن فرانس میں کیا کیا تباہیاں لایا۔ محاصل کی باہمی رعایت کے ان معاہدوں نے جو اثرات دکھائے شاید انہیں کی وجہ سے مذہب رائج میں تمام تجارتی معاہدوں کی طرف سے بددلی پیدا ہو گئی۔ بظاہر تو اس سے ان کے آزاد تجارت کے اصول کی عملی تردید ہوتی ہے کہ اس لئے کہ اس اصول کے مطابق تو چاہئے تھا کہ یہ معاہدے دونوں قوموں کے لئے مفید ثابت ہوتے یہ نہ ہوتا کہ ایک تو تباہ ہو جائے اور دوسری قوم کو بے حساب فائدے حاصل ہو جائیں۔ اس غیر مساوی اثر کی وجہ ڈھونڈیئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان معاہدوں کی رُو سے فرانس اور پرتگال انگلستان کی خاطر تمام ان ترقیوں سے دست بردار ہو گئے جو وہ صنعت میں کر چکے تھے نیز ان ترقیوں سے جو وہ آئندہ کر سکتے تھے، اور ارادہ یہ تھا کہ اس طرح اپنی قدرتی پیداوار

کی برآمد (انگلستان کو) بڑھائیں گویا ان معاہدوں کی وجہ سے وہ دونوں قومیں تہذیب کے ایک اعلیٰ درجہ سے ادنیٰ درجہ پر اُتر آئیں۔ اس سے بس یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو قوم تجارتی معاہدہ کی وجہ سے اپنی صنعت کو پردیسی مقابلہ کے بھینٹ چڑھا دیتی ہے اور ہمیشہ کے لئے زراعت کے ادنیٰ درجہ پر رہنے کی پابندی اپنے پر لے لیتی ہے تو وہ بڑی حماقت کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کس طرح نہیں نکلتا کہ وہ معاہدے بھی قابل اعتراض اور مضر ہیں جن سے دو قوموں میں باہم زرعی پیداوار اور اجناس خام کا مبادلہ یا باہم مصنوعات کا مبادلہ ترقی پائے۔

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ زرعی پیداوار اور خام اجناس کی بے روک ٹوک تجارت سے سب قوموں کو تمدن کے ہر درجہ پر فائدہ پہنچتا ہے اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر وہ تجارتی معاہدہ جو ان رکاوٹوں اور پابندیوں کو جو اس لین دین کی راہ میں پہلے سے موجود ہیں کم کرے وہ دونوں معاہدہ کرنے والی قوموں پر لازمی طور سے مفید اثر کرتا ہے، مثلاً انگلستان اور فرانس میں ایسا معاہدہ جس سے شراب اور برانڈی کا خام لوہے اور پتھر کے کوئلہ سے مبادلہ ترقی پائے، یا فرانس اور جرمنی میں ایسا معاہدہ جس سے شراب، تیل اور خشک میوہ کا غلہ، اون اور ذبح کرنے کے جانوروں سے مبادلہ بڑھے۔

ہمارے گزشتہ بالا نتائج کے مطابق تامین صرف اس حد تک قوم کی خوشحالی میں مدد دیتی ہے جب تک وہ قوم کی صنعتی تعلیم کے درجہ سے مطابقت رکھتی ہو۔ تامین کی ہر نامناسب زیادتی مضر ہوتی ہے اور قومیں کامل صنعتی قوت رفتہ رفتہ ہی حاصل کر

سکتی ہیں، چنانچہ دو قومیں جو صنعتی ترقی کے دو مختلف درجوں میں ہوں وہ اپنی مختلف مصنوعات کے مبادلہ کے متعلق ایک دوسرے کو رعایتیں دے کر ایسا معاہدہ کر سکتی ہیں جس میں دونوں کا نفع ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کم ترقی یافتہ قوم نفیس مال مثلاً باریک سوتی کپڑا اور ریشمی سامان، خود نہ بنا سکے لیکن اس قابل ہو کہ زیادہ ترقی یافتہ قوم کو موٹے مال کی جو ضرورت ہوتی ہے اس کا ایک حصہ فراہم کر سکے۔

ایسے معاہدے اور بھی زیادہ جائز اور مفید ہونگے ایسی دو قوموں میں جو صنعتی ترقی کے تقریباً ایک سے درجہ میں ہیں، جن میں مقابلہ جارحانہ، تباہ کن اور مانع ترقی نہیں ہوتا، جہاں بس ایک طرف سے ہر چیز کا اجارہ نہیں ہوتا جاتا بلکہ جیسا کہ اندرونی تجارت میں ہوتا ہے ترقی کی خواہش تکمیل کی آرزو اور قیمتوں میں تخفیف پیدا کرنے کا محرک ہوتا ہے، یہ صورت براعظم یورپ کی اکثر قوموں کی ہے، مثلاً فرانس، آسٹریا اور جرمن اتحاد محاصلی ملکے تا میں محاصل سے نہایت اچھے اثرات کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ نیز ان ملکوں میں اور رُوس میں بھی باہم ایسی رعایتیں کی جا سکتی ہیں جن سے سب کو فائدہ ہو؛ ان سب کو اس وقت جس چیز سے ڈرنا ہے وہ انگلستان کا تفوق ہے۔

چنانچہ اس پہلو سے نظر کرنے پر بھی صنعت و تجارت، جہاز رانی اور نوآبادیوں کے معاملہ میں اس جزیرہ کا تفوق ہی اس وقت اس بات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کہ سب قومیں ایک دوسرے سے قریب تر ہوں، اگرچہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے

کہ اس تفوق کے حاصل کرنے کی کوشش سے انگلستان نے تمام انسانیت کی قوتِ دولت آفرینی میں بے حساب اضافہ کر دیا ہے اور برابر کرتا جا رہا ہے ۔

تیسری کتاب

نظامہائے معاشی

باب (۲۸)

اطالوی معاشیین

معاشیات کے عمل اور معاشیات کے نظریہ دونوں میں اٹلی تمام نئی قوموں سے پیش پیش رہا ہے۔ کونٹ پکیو نے اطالوی ادب کے اس حصہ کا ایک خاکہ نہایت محنت سے تیار کیا ہے، بس ان کی کتاب پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے نظریۂ رائج کی بہت ہی غلامانہ پابندی کی ہے اور اطالوی صنعت قومی کے بنیادی اسباب پر لیتے ایسی بڑی بڑی قوموں کے بیچ میں رہ کر جنہیں وراثتی شاہیت نے متحد کر دیا تھا اس میں اتحاد قومی کے فقدان پر، پھر پاپا رلیوں کی حکومت اور اطالوی شہروں اور ریاستوں میں جلدی آزادی کے

زوال پر، پوری روشنی نہیں ڈالی ہاگر وہ ان اسباب کی ذرا اور گہری تحقیق کرتے تو میکیاولی کی تصنیف "حکمران" کا اصلی میلان ان سے پوشیدہ نہ رہتا اور وہ اس مصنّف کا ذکر یونہی روا روی نہ کرتے۔

رینکیو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میکیاولی نے اپنے دوست گوسچاپاریڈینی کو ایک خط میں یہ تجویز لکھی تھی کہ اٹلی کی ساری طاقتیں پردیس کے مقابلہ میں متحد ہو جائیں۔ یہ خط پوپ کلیمنس ہفتم کو پہنچایا گیا، اور اس سے ۱۵۲۶ء میں مقدس جمعیتہ Holy League کے قیام پر بہت کچھ اثر بھی پڑا۔ رینکیو کے اس بیان کو پڑھ کر ہی ہمیں پہلے پہل یہ خیال آیا کہ بہت ممکن ہے کتاب "حکمران" کی تہ میں بھی یہی رجحان ہو۔ ہم نے خود جو کتاب ہاتھ میں لی تو پہلی ہی نظر میں اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ ۱۵۱۳ء کی مصنّفہ کتاب "حکمران" کا مقصد بس یہ ہے کہ مدیچیوں میں یہ خیال پھونک دے کہ انکا خاندان اس پر مامور ہے کہ سب اٹلی کو ایک اقتدار اعلےٰ کے ماتحت متحد کرے اور انہیں وہ ذرائع بتلا دے جن سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے[1]۔

کتاب کا نام اور شکل، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت شخصی کی ماہیت پر عام بحث مقصود ہے، بلا شبہ محض وجوہ احتیاط سے اختیار کی گئی ہے، موروثی حکمرانوں

---

[1] یہ کتاب زیر طبع تھی کہ پہلی مرتبہ جرمنی کی جانب سفر کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ٹانکے اور ڈاکٹر گرہینس نے بھی کتاب "حکمران" پر اسی نقطہ نظر سے تنقید کی ہے۔ (مصنّف)

اور ان کی حکومت کا تو بس رواروی میں ذکر آگیا ہے، مصنف کی نظر کے سامنے تو ہر وقت ایک اطالوی غاصب ہے، شاہیاں فتح کرتی ہیں، خاندان تباہ کرنے میں، منصب دار امراء کو دبانا ہے، ریاستوں سے آزادی کو مٹانا ہے، جنت کی نیکیاں اور دوزخ کی عیاریاں چالاکی اور جرأت، شجاعت اور دغابازی، بخت اور اتفاق، غاصب کو ان سب سے کام لینا ہے، ان سب کو آزمانا ہے تاکہ ایک اطالوی سلطنت کی بنیاد پڑ جائے، اس غرض سے ایک راز اسے تفویض کیا گیا ہے، جس کا پورا اندازہ تین سو سال بعد ہوگیا، وہ راز کیا ہے؟ یہ کہ ایک قومی لشکر بننا چاہیئے، جس کی فتح کی ضمانت نئے ضبط سے، نئے نئے اختراع کئے ہوئے اسلحہ سے اور نئی فوجی قواعد سے ہونی چاہیئے۔[1]

اور اگر اس کے طرزِ استدلال کی عمومیت سے مصنف کی اس مخصوص رجحان کے متعلق شبہ کی گنجائش رہ جائے تو وہ شبہ آخری باب سے بالکل رفع ہوجاتا ہے۔ یہاں وہ صاف صاف کہتا ہے کہ پردیسی حملے اور اندرونی انتشار اٹلی کی تمام مصیبت کے اصل اسباب ہیں،

۱؎ میکیاولی نے "حکمران" کی اشاعت سے پہلے یا بعد میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں اسی قسم کی تجویزیں چکر کاٹ رہی تھیں، ورنہ اس کی کیا تشریح ہوسکتی ہے کہ وہ ایک غیر فوجی آدمی، عالم، سفیر، ریاست کا عہدہ دار جس نے کبھی ہتھیار نہ باندھے تھے وہ فن جنگ کے مطالعہ میں اس درجہ منہمک رہتا کہ اس پر ایک ایسی کتاب لکھ سکتا جس نے اس کے عہد کے سب سے ممتاز فوجی لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا؟

میڈیچیوں کا خاندان جس کے ہاتھ میں خوش قسمتی سے ٹسکنی اور کلیسائی ریاست موجود ہیں مشیت کی طرف سے مامور ہے کہ یہ عظیم الشان کام اس کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچے۔ نئی صورت حال کو رائج کرنے کا بہترین وقت اور موقع آن پہنچا ہے، ضرورت ہے کہ ایک نیا موسیٰ اٹھے اور اپنی قوم کو مصر کی زنجیروں سے آزادی دے، حکمران کو کوئی چیز اس قدر عزت اور شہرت نہیں بخشتی جتنا کہ حوصلہ مندی کے ایسے بڑے بڑے کارنامے۔[لے]

یہ بات کہ باقی ابواب میں بھی جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کے علاوہ اس کتاب کے پنہاں معنی کا پتہ بھی چل سکتا ہے اس انداز سے ثابت ہوتی ہے جس میں مصنّف نے نویں۹ باب میں کلیسائی ریاست کا ذکر کیا ہے۔ اس کا یہ کہنا محض طعن ہی تو ہے کہ "پادریوں کے پاس ملک ہے مگر وہ اس پر حکومت نہیں کرتے، ان کے پاس نوابیاں ہیں اور وہ ان کی حفاظت نہیں کرتے، یہ علاقوں میں سب سے خوش قسمت علاقے براہِ راست مشیت ربانی کے زیرِ سایہ ہیں، ان پر کوئی حکم لگانا سراسر گستاخی ہوگی۔" ظاہر ہے کہ صاف صاف کہنے

لے فریڈرک اعظم نے اپنی کتاب "ردِ میکیاولی" میں "حکمران" کو بس فرمانرواؤں کے حقوق و فرائض کے متعلق ایک مقالہ سمجھا ہے، پھر بھی قابلِ لحاظ بات ہے کہ حالانکہ اس نے میکیاولی کی کتاب کا باب باب کرکے رد لکھا ہے لیکن آخری یا چھبیسویں باب کا بھی ذکر نہیں کیا جس کا عنوان ہے "اٹلی کو پردیسیوں سے آزاد کرنے کی اپیل۔" اور بجائے اس کے ایک اور باب بیچ میں لگا دیا ہے جسے میکیاولی کی تصنیف سے کوئی تعلق نہیں اور جس کا عنوان ہے، "سیاسی گفت و شنید کی مختلف قسمیں اور اعلانِ جنگ کے جائز وجوہ۔"

کی جگہ وہ بس یہ سمجھا دینا چاہتا ہے کہ ایک جرأت والے فاتح کے لئے اس سرزمین میں کوئی بڑی رکاوٹیں نہیں اور خصوصاً ایک مدیچی خاندان والے کی راہ میں جس کا ایک عزیز پاپائے رُوم ہے۔

لیکن اس مشورہ کی کیا توجیہ ہو سکے گی جو میکیاوَلی نے ایک غاصب کو جمہوری ریاستوں کے متعلق دیا ہے حالانکہ خود اس کا عقیدہ جمہوری ریاستوں کے موافق تھا؟ اور کیا اس کی غرض صرف یہ ہے کہ جس فرمانروا کے نام اس نے اپنی کتاب معنون کی ہے اس کی خوشامد کرے اور نجی فائدے حاصل کرے جب وہ، ایک جوشیلا جمہوریت کا دوست، عظیم الشان مفکر اور ادیب، شہیدِ وطن، اس ہونے والے غاصب کو مشورہ دیتا ہے کہ جمہوری ریاستوں کی آزادی کو بیخ و بُن سے برباد کر ڈالے؟

اس سے بے شک انکار نہیں ہو سکتا کہ میکیاوَلی نے جس وقت یہ کتاب "حکمراں" لکھی تھی اُس زمانہ میں سخت احتیاج کی زندگی گزار رہا تھا، اپنے مستقبل کو نہایت تشویشناک پاتا تھا، اور مدیچیوں سے ملازمت اور امداد کی التجائیں کر رہا تھا اور اس میں کامیابی کا متوقع تھا۔ اس نے ۲۰ اکتوبر ۱۵۱۳ء کو جو خط اپنے غریب دیہی گھر سے اپنے دوست وِٹوری کے نام فلارنس لکھا ہے اس سے یہ سب باتیں بلاشبہ ظاہر ہوتی ہیں[1]۔

پھر بھی اس کی وزنی وجوہ موجود ہیں کہ وہ اس کتاب سے صرف مدیچیوں کی چاپلوسی

---

[1] پہلی مرتبہ کتاب موسومہ Nicolo Macchiavelli nel libro Il Principe مطبوعہ میلان سنہ ۱۵ء میں شائع ہوا۔

کرنا یا نجی منفعت حاصل کرنا نہ چاہتا تھا، بلکہ اس کا مقصد تھا کہ ایک غاصبانہ منصوبہ کو عمل کا جامہ پہنائے، ایک منصوبہ جو اس عقیدۂ جمہوریت دوستی اور وطن پرستی سے کسی طرح نہ ٹکراتا تھا، چاہے ہمارے زمانہ کا اخلاق اُسے قابلِ نفرت اور شیطانی ہی کیوں نہ بتلائے۔ اس کی تصانیف سے اور حکومت کی خدمت میں اُس کے اعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ میکیاولی ہر عہد کی تاریخ سے اور تمام ریاستوں کے حالات سے بخوبی واقف تھا، اس لئے جو آنکھ پیچھے اتنی دُور تک اور اپنے اردگرد اس صفائی کے ساتھ دیکھتی تھی ضروری تھا کہ مستقبل میں بھی دور تک دیکھ سکے، جو ذہن سولھویں صدی کے شروع میں قومی لشکر سازی کے فوائد دیکھ سکتا تھا وہ ضرور تھا کہ یہ بھی دیکھ سکے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا زمانہ ختم ہوا اور بڑی شاہیوں کا عہد آگیا ہے اور اس وقت کے حالات میں قومیت متحدہ کا حصول صرف غصب کے ذریعہ اور اس کا قیام حکومت شخصی کے ذریعہ ممکن ہے، اور یہ کہ چھوٹی اطالوی ریاستوں میں خواص کی جو حکومتیں بن گئی ہیں وہ اتحادِ قومی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اس لئے اُن کا برباد کرنا لازم ہے، کہ قومی اتحاد سے قومی آزادی پھر پیدا ہو جائیگی۔ غالبًا میکیاولی چند شہروں کی فرسودہ آزادی کو مطلق العنان حکومت شخصی کا شکار اس امید پر بنا دینا چاہتا تھا کہ اس کی مدد سے قومی اتحاد حاصل کرے اور یوں آنے والی نسلوں کے لئے وسیع تر اور بہتر شکل کی آزادی یقینی کر دے۔

پہلی کتاب جو خاص کر کے معاشیات پر اٹلی میں لکھی گئی انتونیو زیرا ساکن نیپلز کی

تصنیف ہے۔ شاہیوں کے بکثرت سونے چاندی حاصل کرنے کے ذرائع پر رسالہ ۱۶۱۳ء ہے اور میک کلاک نے شاید اس کتاب کا صرف نام دیکھا اور پڑھا ہے۔ دونوں اُسے یہ کہکر ایک طرف ڈال دیتے ہیں کہ اس میں صرف زر پر بحث ہے اور نام ہی سے ثابت ہے کہ مصنف اس غلطی میں مبتلا ہے کہ بس قیمتی دھاتوں ہی پر دولت کو مشتمل سمجھنا چاہیے۔ اگر وہ ذرا آگے پڑھتے اور اس کے مطالب پر غور کرتے تو شاید اس سے مفید سبق حاصل کر سکتے۔ انتونیو زیرا سے اگرچہ یہ گناہ تو ضرور ہوا کہ اس نے سونے چاندی کی فراوانی کو دولت کی نشانی جانا پھر بھی وہ اس کے اسباب سے ٹھیک ٹھیک واقف معلوم ہوتا ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ کان کنی کو قیمتی دھاتوں کے بلا واسطہ مخرج کی حیثیت سے سب سے اول رکھتا ہے لیکن ان دھاتوں کو بالواسطہ حاصل کرنے کے ذرائع کیساتھ بھی تو پورا پورا انصاف کرتا ہے۔ اس کے نزدیک قومی دولت کے خاص ذرائع زراعت، صنعت، تجارت اور جہازرانی ہیں؛ زمین کی زرخیزی بھی خوشحالی کا یقینی وسیلہ ہے لیکن صنعت اس سے کہیں زیادہ زرخیز ہوتی ہے، اس کی کئی وجوہ ہیں لیکن خاص وجہ یہ ہے کہ یہی وسیع تجارت کی بنیاد ہے۔ ان وسائل کی قوت دولت آفرینی منحصر ہوتی ہے آدمیوں کی صفات پر (آیا وہ محنتی، چست، حوصلہ مند اور کفایت شعار ہیں) وغیرہا اور قدرتی اور مقامی حالات پر (مثلاً شہر کا موقع بحری تجارت کے لئے مناسب ہے یا نہیں) ان تمام وجوہ سے افضل زیرا حکومت کی شکل کو رکھتا ہے نظم عامہ کو، بلدی آزادی کو، سیاسی ضمانتوں کو اور قانون کی پائیداری کو، وہ کہتا ہے، "وہ قوم خوشحال نہیں ہو سکتی

جہاں ہر نیا حکمران نئے قوانین نافذ کر سکے، اسی وجہ سے پاپائے مقدس کی ریاستیں اتنی خوش حال نہیں ہیں جتنے وہ ممالک جن کی حکومت اور آئین سازی کو زیادہ پائیداری حاصل ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دیکھے کہ وینس میں صدیوں سے جو قانون اور نظم قائم ہے اس کا اثر تمام خوشحالی پر کیا پڑتا ہے" یہ معاشیات کے ایک ایسے نظام کا نچوڑ ہے جو ہر چند کہ وہ بظاہر قیمتی دھاتوں کے حصول سے ہی بحث کرتا معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی پیچیدہ پن اور اصابت رائے کی صفتوں میں ممتاز ہے۔ بالکل ظاہر ہے کہ ج۔ ب۔ سے کی تصنیف، ہر چند اس میں معاشیات کے ایسے تصورات اور ایسے مسائل پیش کئے گئے جن کی خبر بھی انتونیو زیرا کو نہ تھی، خاص خاص باتوں میں اور خصوصاً دولتِ اقوام پر سیاسی حالات کے اثر کا صحیح اندازہ لگانے کے باب میں زیرا کی تصنیف سے بہت پیچھے ہے۔ اگر سے نے زیرا کو ایک طرف ڈال دینے کی جگہ اس کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اپنے نظام معاشیات کے پہلے ہی صفحہ پر مشکل سے یہ لکھ سکتا کہ:۔ معاشیات میں قوموں کے دستور سیاسی پر نظر نہیں کی جا سکتی، قوموں کو ہر طرح کی حکومت میں خوشحال ہوتے بھی دیکھا گیا ہے اور مفلس ہوتے بھی، اصل بات بس اتنی ہے کہ ملک کا نظم و نسق اچھا ہو۔"

ہم سے یہ بات بہت بعید ہے کہ ہم حکومت کی کسی ایک شکل کو دوسری شکلوں پر مطلق ترجیح دینے کے مدعی ہوں۔ امریکہ کی جنوبی ریاستوں پر ایک نظر ڈالیے اور آپ کو یقین آجائیگا کہ جو قومیں اس کے لئے تیار نہیں ان میں حکومت کی جمہوری شکل

تمام خوشحالی میں معتدبہ رجعت کا باعث ہو سکتی ہے، روس پر ایک نظر ڈالیے اور
آپ دیکھ لیں گے کہ جو قومیں ابھی تمدن کے پست درجہ پر ہیں ان کی قومی خوشحالی
شاہی حکومت میں بہت زیادہ ترقی کر سکتی ہے؛ لیکن اس سے اس بیان کی تصدیق
کسی طرح نہیں ہوئی کہ ہر قسم کی حکومت میں قوموں کو خوش حال ہونے یعنے معاشی
خوشحالی کے اعلیٰ ترین مدارج حاصل کرتے دیکھا گیا ہے بلکہ تاریخ تو یہ سبق دیتی ہے کہ
عام خوشحالی کا یہ مرتبہ، یعنی صنعت اور تجارت کا فروغ، صرف ان ممالک کو حاصل ہوا
ہے جن کا دستور سیاسی، چاہے اسے عمومی یا خصوصی جمہوریت کہیے یا محدود شاہی، اپنے
شہریوں کے لیے شخصی آزادی کے ایک درجہ اعلیٰ، حق ملکیت اور نظم ملکی میں پائیداری،
جماعتی مقاصد کے لیے کوشش کرنے کے واسطے قوت اور عمل کے میدان کا اور اس
کوشش میں تسلسل کا ضامن ہو۔ اس لیے کہ ترقی یافتہ تہذیب کی حالت میں یہ بات
اتنی اہم نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے نظم و نسق ملکی اچھا ہو بلکہ اہمیت اس کی ہے کہ یکساں
اور مسلسل اچھا رہے۔ آنے والا انتظام پچھلے کے اچھے کاموں کو مٹا نہ دے، بیس سال
تک کالبیر کے انتظام کے بعد فرمان نانٹس کی منسوخی نہ ہو جائے، بلکہ صدیوں تک ایک
ہی نظام چلتا رہے اور ایک ہی مقصد کے لیے کوشش ہوتی رہے۔ چنانچہ جیسا کہ
انتو تیو تزیر انے صحیح لکھا ہے نظم کا تسلسل صرف ان دستوروں میں حاصل ہو سکتا ہے
جن میں قوم کے اغراض کی نمائندگی ہو، مطلق العنان اقتدار میں نہیں ہوتا کہ اس میں ہر
مرتبہ حکمران کی شخصیت کے مطابق نظم و نسق میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، لیکن اس کے برخلاف

تہذیب و تمدن کے بلاشبہ ایسے مدارج بھی ہیں کہ جن میں مطلق العنان حکومت کا نظم و نسق قوم کی معاشی اور ذہنی ترقی کے لئے پابند دستور شاہی حکومت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مفید ہو سکتا ہے اور اکثر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ غلامی (مطلق) اور زرعی غلامی کا، بربریت اور توہم پرستی کا، قومی انتشار اور ذات پات کے تعصبات کا زمانہ ہوتا ہے کہ اس حالت میں دستور کے ذریعہ سے صرف قوم کے مفادوں کو پائیداری نصیب نہ ہوگی بلکہ ان رائج الوقت برائیوں کو بھی ہو جائے گی حالانکہ مطلق العنان حکومت کا فائدہ اور اس کی ماہیت کا تقاضا ہے کہ انہیں مٹا دے؛ اور اس قسم کی حکومت میں یہ امکان ہے کہ کوئی ایک طاقتور اور دانشمند فرمانروا برسر اقتدار آجائے جو قوم کو صدیوں آگے بڑھا دے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے اس کے وجود اور اس کی ترقی کو یقینی بنا دے۔

لہٰذا ایک عامیانہ سی بات ہے جس میں ایک مشروط حقیقت بھی شامل ہے جس کے ذریعہ ج ۔ ب، ستے نے اپنے مسلک کو سیاست سے الگ رکھنا چاہا ہے اس میں شک نہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ نظم و نسق اچھا ہو، لیکن نظم کی مستعدی اور کارکردگی کا انحصار حکومت کی شکل پر ہے اور ظاہر ہے کہ وہی شکل بہترین ہے جو کسی قوم کے اخلاقی اور مادی حالات اور اس کی آئندہ ترقیوں کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہو۔ بے شک قوموں کو ہر طرح کی حکومت میں ترقی کرتے دیکھا گیا ہے لیکن انہیں معاشی ترقی کے مراتب اعلےٰ حاصل کرتے انہیں ملکوں میں دیکھا گیا ہے جن میں حکومت

کی مکمل آزادی اور قوت کے مدارج اعلیٰ، قوانین، تدبیر سیاسی اور اچھے اداروں کے بقا کی ضامن تھی۔

انتونیو زیرا ماہیت اشیاء کو اس طرح دیکھتا ہے جیسی کہ وہ ہے۔ وہ اسے گزشتہ نظاموں کی یا کسی ایک اصول کی عینک لگا کر نہیں دیکھتا جس کو حق بجانب ثابت کرنا اور عمل میں لانا اس کا مقصد ہو، وہ مختلف اطالوی ریاستوں کے حالات کا مقابلہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سب سے زیادہ دولت وہاں ہے جہاں زیادہ تجارت ہے؛ اور زیادہ تجارت وہاں ہے جہاں صنعت کا خوب نشو و نما پا چکا ہے، اور یہ نشو و نما وہاں ملتا ہے جہاں شہری آزادی ہے۔

برخلاف اس کے بیچارے پاس کی رائے پر معاشی طبعیین Physiocrats کے غلط اصولوں کا تسلط ہے، یہ ضرور ہے کہ اس مصنف نے آدم اسمتھ سے پہلے یا اسی کے ساتھ ساتھ تقسیم عمل کا اصول دریافت کیا یا ارسطو کے یہاں سے ڈھونڈ کر نکالا۔ بلکہ وہ تو اسے آدم اسمتھ سے بھی زیادہ آگے تک لے جاتا ہے اور اس کی طرح یہ صرف ایک کارخانہ میں کاموں کی تقسیم پر نہیں رک جاتا بلکہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ جماعت کے اعضا کے مختلف دولت آفریں طبقوں میں تقسیم ہونے سے عام خوش حالی کیونکر پیدا ہوتی ہے، لیکن طبعیین کی طرح یہ بھی صنعت کو غیر دولت آفریں بتلانے میں ذرا نہیں جھجکتا!

مشہور فلسفیانہ فقیہ، فی لان جیبتری کے خیالات میں سب سے زیادہ تنگی ہے،

اس پر غلط عالم دوستی کا غلبہ ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ انگلستان نے اپنی تامینی سیاست تجارتی سے بس ممنوع تجارت کو اور فائدہ مند بنا دیا ہے۔ اور اپنی تجارت کو خود کمزور کر لیا ہے۔

ڈیری جو ایک عملی عہدہ دار ہے، اس حد تک غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بدیسی مقابلہ سے دیسی صنعت کو امان دینے کی ضرورت تسلیم کرتا ہے لیکن یہ نہیں دیکھتا یا دیکھ نہیں سکتا کہ اس سیاست کا دار و مدار قوم کی عظمت اور اتحاد پر ہے۔

باب (۲۹)

نظامِ صنعتی

(جسے مذہب رائج غلطی سے نظامِ تجارتی سے موسوم کرتا ہے)

جس وقت موروثی شاہیت نے اور قوت کے یکجا ہو جانے نے مختلف جماعتوں کو متحد کر کے بڑی قومیتوں کی بنیاد رکھی تو اس زمانہ میں، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں صنعت تجارت، جہاز رانی، اور ان کی وجہ سے دولت اور بحری قوت بھی، زیادہ تر شہری جمہوریتوں یا ان جمہوریتوں کی جمعیتوں کے ہاتھوں میں تھی، لیکن جوں جوں ان بڑی قوموں کے ادارے نشو و نما پاتے گئے اسی قدر یہ ضرورت زیادہ واضح ہونے لگی کہ دولت اور قوت کے ان اہم وسائل کو خود اپنے علاقوں میں بھی قائم کیا جائے۔

اس احساس کی وجہ سے کہ یہ صرف شہری آزادی کی زمین میں جڑ پکڑ سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں قوت شاہی نے بلدی آزادی اور کاریگروں کی منظم جمعیتوں کی طرف عنایت کی نظر رکھی۔ اس میں وہ یہ کہ سمجھتے تھے کہ یہ چیزیں منصب داراں کے مقابلہ میں

جو خود مختاری کی فکر میں تھے اور اتحاد قومی کے دشمن، توازن قائم رکھنے کا کام بھی دینگی مگر پھر بھی یہ ذریعہ ناکافی معلوم ہؤا، ایک تو اس وجہ سے کہ جو جو فوائد افراد کو آزاد شہروں اور جمہوریتوں میں حاصل تھے اس کا مجموعہ ان فوائد سے بہت زیادہ تھا جو شاہیاں اپنے بلدیوں میں پیش کرتی یا کر سکتی تھیں، دوسرے یہ کہ جو ملک ہمیشہ سے زیادہ تر زراعت ہی کرتا رہا ہو اس کے لئے یہ بڑی دشوار بات ہے کہ ان ممالک کی جگہ چھین لے جو صدیوں سے اپنے قبضہ میں صنعت، تجارت اور جہازرانی رکھتے ہیں، اور آخری بات یہ کہ بڑی شاہی حکومتوں میں منصب داری ادارے اندرون ملک میں زراعت کی ترقی میں حائل تھے اور اسی وجہ سے صنعت کے فروغ میں بھی۔ لہٰذا ماہیت اشیاء نے ان بڑی شاہیوں کو ان سیاسی کارروائیوں پر مجبور کیا جن کا مقصد تھا کہ پڑوسی مصنوعات کی درآمد میں اور پڑوسیوں کی تجارت اور جہازرانی میں دشواریاں پیدا کریں اور خود اپنی صنعت، تجارت اور جہازرانی کی ترقی کی حمایت کریں۔

بجائے اس کے کہ ملک سے باہر جانے والی اجناس خام پر محصول لگا کر آمدنی حاصل کی جاتی، جیسا کہ پہلے ہوتا تھا، اب محصول اندر آنے والے مصنوعات پر لگائے جانے لگے۔ اس طرزِ عمل سے جو فوائد حاصل ہونا ممکن تھے اُنھوں نے زیادہ ترقی یافتہ شہروں اور ملکوں کے تاجروں، جہازرانوں اور صناعوں کو مع اپنے سرمایہ کے ان بڑی شاہیوں میں ہجرت کر آنے کی ترغیب دلائی اور خود اپنی ریاست والوں کے حوصلہ کو حرکت دی تو جب صنعت کو فروغ ہؤا تو اس سے قومی آزادی کو بھی ترقی دی منصب دار امرائے دیکھا کہ صنعت

اور تجارت کرنے والی آبادی کو نیز زراعت پیشہ لوگوں کو رعایتیں دینے میں خود ان کا فائدہ ہے، اس سے نیز خود اپنی صنعت اور اپنی تجارت کی ترقی سے زراعت میں ترقیاں ہوئیں اور پھر ان ترقیوں کا اثر دولت قومی کے ان دونوں عاملوں پر اچھا پڑا ہم بتلا چکے ہیں کہ اس نظام کی بدولت اور مذہبی سدھار تحریک کی وجہ سے انگلستان نے اپنی قوت عمل، آزادی اور طاقت میں صدی بہ صدی کیسی ترقی کی ہے ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ فرانس میں کچھ عرصہ کے لیئے نہایت اچھے نتائج کے ساتھ اس نظام کی نقل کی گئی مگر پھر وہاں بعد کو یہ ناکام رہا اس لیئے کہ منصب داری کی، پادریوں کی اور مطلق العنان شاہی کی اصلاح وہاں نہ ہو پائی تھی۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اہل پولینڈ کی قوم کیسے تباہ ہوئی، اس وجہ سے کہ ان کی انتخابی طریقہ والی شاہی کو نہ اتنا اثر حاصل تھا نہ اتنا دوام کہ وہ اس سیاست کے ذریعہ شہریوں کے ایک مضبوط طبقہ کو وجود میں لاتی اور منصب دار امراء کی اصلاح کر سکتی۔

اس سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارتی صنعتی شہر کی جگہ جس کا زراعتی علاقہ عموماً اس کے سیاسی حلقہ سے باہر ہوتا تھا، اب زرعی صنعتی تجارتی ریاست نے لے لی یعنی بذاتہ مکمل اور ہم آہنگ قوم نے، جس میں ایک طرف تو ان اختلافات نے جو پہلے شاہی منصبداری امراء اور شہریوں میں رہا کرتے تھے ایک ہم آہنگ اتحاد کی صورت اختیار کر لی اور دوسری طرف زراعت، صنعت اور تجارت میں گہرا تعلق پیدا ہو گیا اور ایک سے دوسرے کا فائدہ ہونے لگا۔ یہ پہلے والی ہئیت اجتماعی سے کہیں زیادہ مکمل شکل تھی، اس لئے کہ پہلے جو صنعتی قوت شہری جمہوریت کے تنگ قبہ میں محدود تھی اسے اب وسیع ترعلاقہ مل گیا؛

اس علاقہ میں جو جو امدادی ذرائع موجود تھے وہ اس قوت کے تصرّف میں آنے لگے، تقسیم عمل اور قوائے دولت آفریں کا تعاون، صنعت کی مختلف شاخوں میں بھی اور زراعت میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ ممکن ہو گیا، زراعت والوں کے بڑے طبقہ کا سیاسی اور تجارتی اعتبار سے صنعت اور تجارت والوں سے تعلق پیدا ہو گیا، ان میں باہم امن دائمی قائم ہو گیا، صنعتی اور زراعتی قوت میں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والا تعلق دائمی طور پر پیدا ہو گیا اور ہمیشہ ہمیش کے لئے یقینی بن گیا، اور زراعت والے تہذیب تمدن کے ان تمام فوائد میں حصّہ دار بن گئے جو صنعت اور تجارت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ زرعی صنعتی۔ تجارتی ریاست در اصل ایک شہر ہے جو وسعت پاکر پوری مملکت پر پھیل گیا ہے یا ایک ملک ہے جو شہر بن گیا ہے۔ اس اتحاد سے حقیقی ترقی مادی دولت آفرینی کو ہوئی اس نسبت سے لازم تھا کہ ذہنی قوتیں بھی نشو و نما پائیں سیاسی ادارے مکمل ہو۔ تے، ریاست کی آمدنی، ریاست کی جنگی قوت اور ریاست کی آبادی میں بھی اضافہ ہوتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قوم نے سب سے پہلے زرعی صنعتی تجارتی ریاست کو تکمیل کو پہنچایا وہ ان تمام اعتبارات سے تمام دوسری قوموں کی سردار ہے۔

یہ نظام صنعتی کوئی لکھی ہوئی چیز نہ تھا، محض مصنّفوں کے سوچ بچار کا نتیجہ نہ تھا، یہ تو عمل میں برتی ہوئی چیز تھا تا آنکہ اسٹیورٹ نے زیادہ تر انگریزی عمل سے اس کی تجرید کی جیسے انتونیو زیرا نے اپنا نظام وینس کے حالات کے مشاہدہ کی تجرید سے پیدا کیا تھا لیکن اس کتاب (اسٹیورٹ کی کتاب) کی حیثیت ایک علمی کتاب کی سی نہیں ہے، اس کا بڑا حصّہ

زر، بنک، زر کاغذی، کساد بازاری، توازن تجارت اور آزادی سے متعلق بحثوں کے لئے وقف ہے۔ یہ بحثیں ضرور ایسی ہیں کہ ہمارے زمانہ میں بھی ان سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے، لیکن ایسے غیر منطقی طریقہ سے اور ایسے انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ اکثر سمجھ میں نہیں آتیں اور اکثر ایک ہی خیال کو دس دس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ معاشیات کے باقی حصوں پر یا تو بہت سطحی بحث ہے یا انہیں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، نہ تو فوائدِ دولت آفرین پر کوئی بنیادی بحث ہے نہ اشیاء کی قیمت کے عناصر پر، ہر جگہ مصنف کے پیشِ نظر بس انگلستان کے حالات اور تجربات ہیں مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں انگریزی اور کالبیری عمل کی تمام خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔

بعد کے نظاموں کے مقابلہ میں نظامِ صنعتی کی خوبیاں یہ ہیں:۔

۱۔ کہ یہ ویسی صنعت کی قدر و قیمت اور ویسی زراعت، تجارت، جہاز رانی اور قوم کی تہذیب اور طاقت پر اس کے اثر کو واضح طور پر دیکھتا اور صاف صاف بیان کر دیتا ہے۔

۲۔ یہ عام طور پر صحیح ذرائع کا انتخاب کرتا ہے جن سے ایک ایسی قوم میں جو صنعتی قوت کے قیام کے لئے تیار ہو قومی صنعت قائم ہو سکتی ہے۔

۳۔ یہ "قومیت" کے تصور پر اپنی بنیاد رکھتا ہے، قوموں کو ایک وجودِ واحد مانتا اور ہر جگہ قومی اغراض اور قومی حالات کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف اس نظام میں مندرجہ ذیل خامیاں ہیں:۔

۱۔ کہ یہ قوم کی صنعتی تعلیم کے اصول کو اور ان شرائط کو جن میں اس اصول پر کاربند رہنا چاہیئے، اچھی طرح تسلیم نہیں کرتا،

۲۔ اس وجہ سے یہ ایسی قوموں کو بھی جو صنعت کے لئے ناموافق آب و ہوا میں رہتی ہیں نیز چھوٹی چھوٹی اور غیر متمدن ریاستوں اور قوموں کو غلطی سے نظام تامینی کی تقلید کی ترغیب دلاتا ہے۔

۳۔ یہ اس تامین کو زراعت اور عام طور پر تمام اجناس خام پر بھی عائد کر کے خود زراعت کو نقصان پہنچاتا ہے، حالانکہ بہ تقاضائے فطرت زراعت خود ہی خارجی مقابلہ سے کافی مامون ہے۔

۴۔ یہ اجناس خام کی برآمد میں دشواریاں ڈال کر انصاف کے خلاف صنعت کو ایسا فائدہ پہنچانا چاہتا ہے جس سے زراعت کا نقصان ہو،

۵۔ یہ اس قوم کو جو صنعت اور تجارت میں سب پر تفوق حاصل کر چکی ہے یہ سبق نہیں سکھاتا کہ اب اپنی منڈیوں کو آزاد مقابلہ کے لئے کھول کر اپنے صناعوں اور تاجروں کو سستی اور کاہلی سے محفوظ رکھے۔

۶۔ صرف سیاسی غرض کی پیروی میں یہ تمام قوموں کے عالمی اغراض کو نظر انداز کرتا ہے، ساری انسانیت کے اغراض کو بھول جاتا ہے اور قوموں کو گمراہ کرتا ہے کہ جہاں نظام تامین کافی ہے وہاں نظام امتناعی کا استعمال کرنے لگیں، یا ایسے محاصل لگادیں جن کا اثر امتناع ہی کے قریب قریب ہو، حالانکہ معتدل تامینی محاصل سے مقصد بہتر

ہو سکتا تھا، اور بالآخر (۷)، عالمی اصول کو سراسر نظر انداز کرنے کی وجہ سے یہ تمام قوموں کے آئندہ اتحاد، امن دائمی کے قیام اور عام تجارتی آزادی کے رواج کو ایسا مقصد تسلیم نہیں کرتا جس کے لئے سب قوموں کو کوشش کرنی چاہیئے اور جس سے انہیں اپنے تئیں روز بروز قریب تر بنانا چاہیئے۔

بعد میں آنے والے مذاہب نے غلطی سے اس نظام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ صرف قیمتی دھاتوں کو ہی دولت جانتا ہے حالانکہ یہ بھی اور دوسری قیمتی چیزوں کی طرح ایک جنس ہے دراصل بات یہ ہے کہ دوسری قوموں کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ بیچا جائے اور جہاں تک ہو سکے کم خریدا جائے۔

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے سو نہ تو کالبیر کے انتظام پر اور نہ جارج اوّل کے وقت سے انگریزی نظام پر یہ صادق آتا ہے کہ انہوں نے زر کی درآمد کو کوئی بہت غیر معمولی اہمیت دی ہو۔ ان کی سیاست تجارتی کا رجحان یہ تھا کہ اپنی ملکی صنعت، خود اپنی جہازرانی، اور اپنی تجارت خارجہ کو ترقی دیں۔ اس میں ظاہر ہے بہت سی غلطیاں بھی ہوئیں لیکن فی الجملہ اس سے اہم نتائج بھی مترتب ہوئے ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہد نامہ میتھوین (۱۷۰۳ء) کے بعد سے انگریز ہر سال قیمتی دھاتوں کی ایک بڑی مقدار بھیجتے تھے اور اس برآمد کو کوئی بری بات نہیں سمجھتے تھے۔

جارج اوّل کے وزراء نے جب ۱۷۲۱ء میں ہندوستانی روئی اور ریشم کے مال کی درآمد کو ممنوع قرار دیا تو انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ ہم اس لئے کرتے ہیں کہ قوم کو جہاں

تک ہو سکے دوسرے ملکوں کے ہاتھ بیچنا اور جتنا کم ہو سکے پردیس سے خریدنا چاہیئے ، یہ حماقت تو نظام صنعتی کے سرلعبد کے مذاہب نے تھوپی ہے ، انہوں نے یہ کہا تھا کہ صاف بات ہے قوم اسی وقت دولت اور قوت میں ترقی کر سکتی ہے کہ اپنی مصنوعات باہر بھیجے اور پردیس سے کھانے پینے کی چیزیں اور خام اجناس منگائے۔ اس سیاسی اصول پر انگلستان تھے آج تک کاربند رہا ہے اور اسی پر عمل پیرا ہونے سے مالدار بھی بنا ہے اور قوی بھی اور یہی اصول ایک پرانی متمدن قوم کے لیے جس نے اپنی زراعت کو ترقی کی اعلےٰ منزل پر پہنچا لیا ہو بس ایک سچا اصول ہے۔

باب (۳۱)

طبعیین کا نظامِ زراعت

اگر کالبیر کی عظیم الشان کوشش کامیاب ہو جاتی، اگر فرمانِ نانٹس کی منسوخی، شاہ لوئی چہاردہم کی حشمت دوستی اور شہرت پسندی اور اس کے جانشینوں کی عیش پرستی اور اسراف نے ان سکیموں کو شروع ہی میں نہ مسل ڈالا ہوتا، جو کالبیر نے بوتے تھے، اگر اس کی وجہ سے فرانس میں ایک مالدار صنعتی اور تجارتی طبقہ پیدا ہو جاتا، اگر خوش قسمتی سے فرانسیسی پادریوں کے مقبوضات عام شہریوں کے ہاتھ آجاتے، اگر ان ترقیوں کی وجہ سے ایک طاقتور ایوانِ عام وجود میں آجاتا اور اس کے اثر سے منصب داروں اور امراء کی اصلاح ہو جاتی تو طبعیین کا یہ نظام مشکل ہی سے عالمِ وجود میں آتا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام بھی فرانس کے وقتی حالات کی تجرید سے بنا تھا اور صرف انہیں حالات کیلئے مقصود تھا۔

جس وقت یہ مذہب فرانس میں شروع ہوا ہے تو اراضی کا بڑا حصہ پادریوں اور امراء کے ہاتھ میں تھا، اس پر کاشت کرتے تھے کسان جو زرعی غلامی اور شخصی ظلم کے ہاتھوں مجبور اور توہم پرستی، بے علمی، کاہلی اور افلاس کا شکار تھے جن کے قبضہ میں دولت آفرینی کے

ذرائع تھے وہ لہو و لعب میں لگے ہوئے تھے انہیں نہ زراعت کی کچھ سمجھ تھی اور نہ اس سے دلچسپی، اور جو غریب ہل چلاتے تھے ان کے پاس زراعت کو ترقی دینے کے نہ ذہنی وسائل تھے نہ مادی منصب داری اداروں کا جو بوجھ زراعت پر تھا اس میں شاہی کے بے حد وحساب مطالبوں نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا اور اصلی دولت پیدا کرنے والوں پر یہ بوجھ اور بھی بھاری اس لئے معلوم ہوتا تھا کہ پادری اور امراء ان مطالبات سے بالکل بری تھے۔ ان حالات میں ناممکن تھا کہ اہم ترین صنعتیں اور خصوصاً وہ صنعتیں پنپ سکیں، جن کا دارومدار ملکی زراعت کی پیداوار اور عام آبادی کے صرف پر ہوتا ہے، بس ترقی کر سکتی تھیں تو وہ صنعتیں جو اعلیٰ طبقوں کے لئے اسباب تعیش تیار کرتی تھیں۔ خارجی تجارت اس وجہ سے کم تھی کہ مادی اشیاء پیدا کرنے والے اس قابل نہ تھے کہ منطقہ حارہ کی پیداوار کی بڑی مقداریں کام میں لائیں اور ان کی قیمت اپنی فاضل پیداوار سے ادا کریں، رہی اندرونی ملکی تجارت سو اس کو صوبہ وار محاصل نے بالکل دبا دیا تھا۔

ان حالات میں اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جب ارباب فکر اس افلاس اور فلاکت کے اسباب کی تحقیق کریں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں کہ قومی خوش حالی کا اس وقت تک فروغ پانا ناممکن ہے جب تک زراعت کو ان بندھنوں سے آزاد نہ کیا جائے، جب تک زمیندار اور سرمایہ دار زراعت میں دلچسپی نہ لیں، جب تک کسان شخصی غلامی، توہم پرستی، کاہلی اور جہل کا اس طرح شکار رہیں، جب تک کہ ٹیکسوں میں کمی نہ ہوگی اور وہ سب پر برابر برابر منقسم نہ ہونگے، جب تک تجارت خارجہ کو فروغ نہ ہوگا

اور اندرونی تجارت پر پابندیاں رہیں گی۔

مگر بس بات یہ تھی کہ یہ لوگ بادشاہ اور دربار کے طبیب تھے، امراء اور پادریوں کے مصاحب تھے، معتمد راز دار تھے، دوست تھے۔ یہ اس مطلق العنان قوت سے اور امراء اور پادریوں سے کھلا کھلا معرکہ تو نہ کرنا چاہتے تھے نہ کر سکتے تھے، ان کے پاس بس یہی تدبیر تھی کہ اپنے خیالات کو ایک عمیق نظام کے دھندلکے میں پوشیدہ کر کے پھیلائیں جس طرح اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی سیاسی اور مذہبی اصلاحی خیالات کو فلسفیانہ نظاموں کے لباس میں چھپایا گیا ہے، انہوں نے بھی اپنے زمانہ اور اپنے ملک کے فلسفیوں کی تقلید کی جو فرانس کے معاملات قومی کی تباہی کے سبب سے اب انسانیت پرستی اور عالم دوستی کے وسیع ترین میدان میں اپنے لئے تسکین کا سامان ڈھونڈتے تھے، کم و بیش اس طرح جیسے اپنے خاندان کی تباہی و بربادی کے بعد خاندان کا نوجوان لڑکا میکدہ میں جا کر اپنا غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ ان طبیعتیین کو بھی آزاد تجارت کا عالی اصول کیا ملا گویا ایک نسخہ مل گیا جس سے وقت کی تمام برائیوں کا علاج ہو سکتا تھا۔ عالم علوی میں جب انہیں یہ نکتہ ہاتھ آ گیا تو پھر عالم سفلی میں انہوں نے کھود کھاد کر زمین کی "آمدنی خالص" کا تصور نکال ہی لیا جو ان کے خیالات کے لئے مناسب بنیاد کا کام دے سکتا تھا۔ فوراً ہی سارے نظام کی بنیاد قائم کی گئی کہ "صرف زمین سے خالص آمدنی ہوتی ہے اس لئے زراعت ہی دولت کا تنہا ذریعہ ہے"۔ یہ ایک قضیہ ہے جس سے خوب خوب نتائج اخذ ہو سکتے ہیں، پہلے تو لازم ہوا کہ منصب داری کا خاتمہ ہو اور اس میں زمینداری کا فائدہ ملحوظ خاطر ہے، پھر تمام ٹیکس زمین پر ڈالے جائیں کہ یہی ساری

دولت کا منبع ہے اس سے امراء اور پادریوں کی ٹیکس سے بریت ختم ہوئی۔ آخر میں یہ کہ صناع دولت آفریں طبقہ نہیں، ان پر کوئی ٹیکس نہ لگنا چاہیئے لیکن انہیں حکومت سے تحفظ کا مطالبہ بھی نہ کرنا چاہیئے، اس سے محاصل سرحدی کا خاتمہ ہو گیا۔

مختصر یہ کہ بے معنی سے بے معنی دلیلوں اور دعووں سے ان عظیم الشان صداقتوں کو ثابت کر دیا گیا جن کا ثابت کرنا اصل مقصود تھا۔

اب قوم کا اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنے قومی حالات وکیفیات کا ذکر ہی کیسے ہو سکتا تھا، کہ جب کہ Encyclopedia Methodique نے ثابت کر دیا تھا کہ "فرد کی خوش حالی ساری انسانیت کی خوش حالی سے مشروط ہے"۔ یہاں نہ قوم ہے، نہ جنگ، نہ پردیسی تجارتی تدابیر، تاریخ اور تجربہ کو یا تو نظر انداز کرنا ہے یا اس کی غلط تاویل۔

اس نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بظاہر معلوم ایسا ہوتا تھا کہ آدمی کالبیر کے نظام اور صناعوں کی رعایتوں کے خلاف زمینداروں کی طرف سے لڑ رہا ہے حالانکہ اصل زد زیادہ تر مؤخر الذکر کے مخصوص حقوق ہی پر پڑتی تھی، بیچارے کالبیر کو فرانسیسی زراعت کے زوال کا سارا الزام اٹھانا پڑا حالانکہ ہر شخص جانتا تھا اور ادنیٰ سے ادنیٰ سمجھ والا سمجھتا تھا کہ صنعت ہی تجارت اور زراعت کو ترقی دینے کا خاص ذریعہ ہے۔ فرمان نانٹس کی منسوخی، لوئی چہاردہم کی جنگیں، لوئی پانزدہم کے اسراف، سب کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

کینے نے اپنی کتابوں میں ان اعتراضات کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے اور رد کیا ہے جو اس کے نظام کے خلاف کئے گئے ہیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ اس نے اپنے مخالفوں

کے منہ سے کیسی کیسی سمجھ کی باتیں کہلائی ہیں اور ان کے رد میں اپنی طرف سے منصوفانہ لایعنی دلائل کا کیسا انبار پیش کیا ہے، پھر بھی اس مصلح کے ہم عصروں نے اس لایعنی انبار ہی کو حکمت و دانش مانا، اس لئے کہ اس کے نظام کا بنیادی میلان فرانس کے وقتی حالات، اس صدی کی انسان پرستی اور نرالم دوستی کے مطابق تھا۔

باب (۳۱)

قدرِ مبادلہ کا نظام

(جسے مذہب رائج غلطی سے نظامِ صنعتی سے موسوم کرتا ہے)

آدم اسمتھ

قومی اور بین الاقوامی حالات کے تعلق سے آدم اسمتھ کا مسلک طبعیین کے نظام ہی کا سلسلہ ہے، ان کی طرح یہ بھی قوموں کی ماہیت کو نظر انداز کرتا ہے، سیاست اور ریاست کی قوت کو تقریباً خارج ہی کر دیتا ہے، امن دائمی اور عالمی اتحاد کو پہلے سے موجود فرض کر لیتا ہے، قوم کی قوتِ صنعتی کی قدر کو نہیں مانتا نہ اس تک پہنچنے کے وسائل کی، اور تجارت میں مطلق آزادی کا طالب ہے۔

ان بنیادی غلطیوں میں آدم اسمتھ بھی اسی راہ پر چل کر مبتلا ہوا جس پر اس سے پہلے طبعیین چلے تھے یعنی اس وجہ سے کہ وہ بین الاقوامی تجارت کی آزادی مطلق کو عقل کا مطالبہ جانتا ہے اور اس خیال کی تاریخی نشو و نما کی تحقیق میں تہ کو نہیں پہنچتا۔

آدم اسمتھ کا ذہین سوانح نگار ڈوگالڈ اسٹیورٹ خبر دیتا ہے کہ وہ اپنی کتاب کی اشاعت (۱۷۷۶ء) سے اکیس سال پہلے یعنی ۱۷۵۵ء میں ایک ادبی جماعت کے سامنے اسمتھ نے عام آزادی تجارت کے خیال کی ہدایت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: "مدبر اور منصوبہ ساز انسان کو عموماً ایک قسم کی سیاسی دستکاری کا موضوع سمجھتے ہیں۔ منصوبہ ساز انسانی معاملات میں دخل دے کر قدرت کے کام کو بگاڑتے ہیں، حالانکہ چاہیئے یہ کہ اسے اس کے حال پر چھوڑا اور آزادی سے کام کرنے دیا جائے تاکہ وہ اپنے آخری مقاصد حاصل کرے۔ کسی ریاست کو پست سے پست بربریت سے دولت کے اعلیٰ ترین مرتبہ تک پہنچانے کے لیئے بس ضرورت ہے امن کی، معتدل محاصل اور اچھے نظم و نسق کی، باقی اور سب قدرتی طور پر خود بخود ہوجاتا ہے۔ جو حکومت اس فطری رفتار کی مخالفت کرتی ہیں جو سرمایہ کو دوسرے راستوں پر ڈالنا چاہتی ہیں، یا جماعت کی ترقیوں کو روکنا چاہتی ہیں وہ قدرت کے مخالف عمل کرتی ہیں اور اپنے کو قائم رکھ سکنے کے لیئے ظالم اور مستبد بن جاتی ہیں۔"

آدم اسمتھ اس بنیادی عقیدہ سے آگے چلا ہے اور اس کے بعد کی تصانیف کا مقصد یہ تھا کہ اس عقیدہ کو ثابت کرے اور روشنی میں لائے۔ عقیدہ میں اسے بعد کو کینے، ترگو، اور مذہب طبیعین کے دوسرے Koryphain سے تقویت پہنچی جن سے سفر فرانس کے دوران میں ۱۷۶۵ء میں اس کا تعارف ہوا۔

ظاہر ہے کہ آزادی تجارت کے خیال کو آدم اسمتھ ایک ذہنی انکشاف جانتا تھا جس پر وہ ادبی شہرت کی بنیاد رکھنی چاہتا تھا۔ پھر تو یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ وہ اپنی تصنیف میں

ہر اس چیز کو ہٹانے اور رد کرنے کی کوشش کرتا جو اس خیال کی راہ میں حائل ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنے کو تجارت کی آزادی مطلق کا وکیل سمجھتا ہے اور اسی حیثیت سے سوچتا اور لکھتا ہے۔

جب رائے پہلے سے یوں طے ہو تو پھر یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ اسمتھ اشیاء اور اشخاص پر، تاریخ اور اعداد وشمار پر، سیاسی تدابیر اور ان کے حامیوں پر سوائے اس کے اور کسی طرح حکم لگا سکتا کہ آیا وہ اس کے بنیادی اصول کے موافق ہیں یا مخالف۔

ڈوگالڈ اسٹیورٹ نے اوپر جو قول نقل کیا ہے اس میں آدم اسمتھ کے تمام نظام کو گویا کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ریاست نہ اس سے زیادہ کچھ کر سکتی ہے نہ اس سے زیادہ اسے کچھ کرنا چاہیے کہ انصاف کر دے اور جہاں تک کم ٹیکس لگا سکے لگائے۔ مدبر جو صنعتی قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں، جہاز رانی کو فروغ دینا چاہتے ہیں، تجارت خارجہ کو بڑھانا چاہتے ہیں، اسے بحری قوت کے ذریعہ محفوظ کرنا چاہتے ہیں، نوآبادیاں بسانا یا حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ سب اس کے نزدیک منصوبہ ساز ہیں جو بس جماعت کی ترقی کو روکتے ہیں۔ اس کے نزدیک قوم کا وجود نہیں، صرف ایک جماعت ہے یعنی ساتھ ساتھ رہنے والے افراد۔ اور یہ افراد خود سب سے اچھی طرح جانتے ہیں کہ دولت آفرینی کی کون سی شاخ ان کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے اور جن ذرائع سے انہیں خوشحالی حاصل ہو سکتی ہے ان کا انتخاب یہ خود سب سے بہتر کر سکتے ہیں۔

قومیت اور قوت سیاسی کا یہ کامل انکار، اور فرد کو ساری قوت تخلیقی کا حامل بنانا اسی

دقت کچھ قرین عقل ثابت کیا جا سکتا تھا کہ قوت تخلیقی کے بجائے شئے مخلوق کو یعنے مادی دولت کو بلکہ صرف اس قدر کو جو یہ شئے مخلوق مبادلہ میں رکھتی ہے موضوع تحقیق بنایا جائے انفرادیت کے پہلو بہ پہلو مادیت کے رکھنے کی بھی ضرورت تھی تاکہ اس بے پایاں قوت کو چھپایا جا سکتا جو افراد کو قوم سے، قومی اتحاد سے، قوم کے فوائے دولت آفرین کے تعاون باہمی سے حاصل ہوتی ہے۔ ضرورت تھی کہ محض نظریۂ اقدار کو معاشیات منوایا جائے اس لیئے کہ صرف افراد ہی قدریں پیدا کرتے ہیں، ریاست تو قدریں پیدا کر نہیں سکتی اس لیئے اسے لازم ہے کہ وہ افراد کی دولت آفریں قوتوں کو اکسانے محفوظ رکھنے اور ترقی دینے تک اپنے کام کو محدود رکھے۔ اس آمیزش کے بعد معاشیات کا نچوڑ یوں پیش کیا جا سکتا ہے :۔ دولت نام ہے اقدار مبادلہ پر قبضہ کا۔ انفرادی محنت، قدرت اور سرمایہ کے ساتھ مل کر، اقدار مبادلہ پیدا کرتی ہے؛ تقسیم عمل کی وجہ سے محنت کا درجہ دولت آفرینی بڑھ جاتا ہے؛ سرمایہ پس اندازی سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس طرح کہ پیدائش صرف سے زیادہ ہو؛ سرمایہ کا مجموعہ جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر زیادہ تقسیم عمل ہوگی اور اتنی ہی بلند صلاحیت دولت آفرینی؛ محنت اور پس اندازی کے لئے بہترین مہمیز خود غرضی ہے؛ تو سیاسی کے لیئے سب سے بڑی حکمت بس یہ ہے کہ شخصی کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کرے اور صرف انصاف کا اہتمام کر دے؛ یہ بیہودگی ہے کہ ریاست کی طرف سے اس بات کی تدبیریں کی جائیں کہ رعایا اس چیز کے پیدا کرنے پر مجبور ہو جسے وہ پردیس سے سستا خرید سکتی ہے ؛

جب کوئی دوسرا نظام نہ ہو تو لازم تھا کہ ایسا نظام محکم جس نے دولت کو اپنے عناصر میں تحلیل کر دیا ہو، دولت آفرینی کے عمل کو ایسا واضح بنا دیا ہو، مذاہب ماقبل کی غلطیوں کو بظاہر عریاں کر دے قبول عام حاصل کر لیتا۔ غلطی بس اتنی ہے کہ بنیادی حیثیت سے یہ نظام کسی ملک کے تمام افراد کی معیشت شخصی کا نظام تھا یا ساری نوع انسانی کا جیسی کہ وہ اس وقت ہو گی جب کوئی علیحدہ علیحدہ ریاستیں نہ ہوں، قومیں اور قومی اغراض نہ ہوں، مختلف دستور اساسی اور حالات تمدنی نہ ہوں، قومی جذبات اور جنگیں نہ ہوں۔ غلطی بس اتنی ہے کہ یہ صرف قدروں کا ایک نظریہ ہے، ایک حسابی یا یوں کہئے دوکانداروں کا نظریہ۔ اس میں اس کا سبق نہیں ہے کہ کسی قوم کے قوائے دولت آفریں کو اس کی تہذیب و تمدن کے فائدے کے لئے، اس کی خوشحالی، اس کی قوت، اس کے دوام اور اس کی خود مختاری کے کس طرح بیدار کیا جا سکتا ہے کس طرح بڑھایا، قائم رکھا اور محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

یہ نظام ہر چیز کو دوکاندار کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، اشیاء کی قدر اس کے نزدیک دولت ہے، اس لئے یہ صرف قدر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قوائے دولت آفریں کا پیدا ہونا اتفاق پر چھوڑ دیتا ہے یا قدرت پر یا خدائے تعالیٰ پر، جو نام چاہے دے لیجئے۔ البتہ اس سے اگر سروکار نہ ہونا چاہیئے تو ریاست کو۔ اور قدروں کا انبار لگانے کے اس کاروبار میں دخل نہ دینا چاہیئے تو سیاست کو۔ یہ بس وہاں خریدنا چاہتا ہے جہاں سستا ملے۔ درآمد سے ملکی کارخانے تباہ ہوتے ہیں تو ہو جائیں، پردیسی قومیں اپنے یہاں سے مصنوعات کی برآمد پر اگر کچھ چھوٹ دیتی ہیں تو کیا کہئے، مال اور بھی سستا خریدا جا سکتا ہے۔ دولت آفریں اس کے نزدیک

بس وہی ہیں جو اقدار مبادلہ کریں۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ جزوی طور پر تقسیم عمل سے کاروبار کو کیسا فروغ ہوتا ہے پر قومی پیمانہ پر جو تقسیم عمل ہوتی ہے اُسے نہیں دیکھتا۔ انفرادی پس اندازی سے ہی اس کے نزدیک سرمایہ بڑھتا ہے اور اسی اضافہ سرمایہ کی نسبت سے کاروبار کو وسعت دی جا سکتی ہے البتہ قوت دولت آفرین میں ملکی کارخانوں کے قیام و ترقی سے اور اس سے جو خارجی تجارت اور قومی طاقت پیدا ہوتی ہے ان سے جو اضافہ ہوتا ہے اس کی اسے کوئی قدر نہیں مستقبل میں پوری قوم کا حشر کچھ ہو یہ اس کے لئے برابر ہے، بس آج بھی افراد کو اقدار مبادلہ میں فائدہ ہو جائے۔ یہ صرف زمین کا لگان جانتا ہے، اراضی کی قدر نہیں جانتا وہ نہیں دیکھتا کہ کسی قوم کی دولت کا بہت بڑا حصہ اس کی اراضیات اور اس کی جائیداد غیر منقولہ کی قدر پر مشتمل ہوتا ہے۔ خارجی تجارت کا جو اثر اراضیات کی قیمت پر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے جو اتار چڑھاؤ اور مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں اس کی اسے ذرا بھی فکر نہیں۔ مختصر یہ کہ یہ نظام نہایت سخت اور محکم قسم کا تجارتی نظام ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نام آخر کالبیر کے نظام کو کیوں دیا گیا حالانکہ وہ تو اپنے رجحان خاص کے اعتبار سے صنعتی نظام ہے یعنی ایک ایسا نظام جو اقدار مبادلہ کے وقتی فائدہ یا نقصان سے قطع نظر کر کے صرف قومی صنعت اور قومی تجارت کے قیام کو پیش نظر رکھتا ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم کسی طرح آدم اسمتھ کی عظیم الشان خوبیوں سے انکار نہیں کرنا چاہتے۔ معاشیات میں سب سے پہلے اسی نے تحلیلی طریقہ کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس طریقہ کے استعمال سے اور اپنی غیر معمولی ژرف نگاہی سے

اس نے اس علم کے ایسے اہم ترین حصوں پر روشنی ڈالی جو اس سے پہلے تقریباً بالکل تاریکی میں تھے۔ آدم اسمتھ سے پہلے صرف عمل تھا، اسی کی تصانیف نے یہ ممکن کیا کہ معاشیات کا ایک علم بنے اور اس کے لئے اس نے اپنے پیش روؤں اور پیروؤں سب سے زیادہ مواد فراہم کر دیا ہے۔

البتہ اپنے ذہن کی جس صفت کی وجہ سے اس نے معاشیات کے منفرد عناصر ترکیبی کی تحلیل میں اس قدر اہم کام کیا اسی صفت میں اس بات کی وجہ بھی ہے کہ جماعت کو من حیث الکل نہ دیکھ سکا، اور فرد واحد کو ایک ہم آہنگ کل میں شامل نہ کر سکا، افراد کی فراوانی میں قوم سے آگاہ نہ ہو سکا، اور منفرد دولت آفریں شخصوں کی آزادی عمل کی فکر میں کل قوم کے مقاصد کو نظر سے اوجھل کر دیا۔ وہ جو ایک کارخانہ میں تقسیم عمل کے فوائد واس وضاحت سے دیکھتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ وہی اصول اس شدت کے ساتھ صوبوں اور قوموں پر بھی عائد ہوتا ہے۔

ہم نے جو حکم اس کے متعلق لگایا ہے اس سے ڈوگالڈ اسٹیورٹ کی رائے بالکل مطابق ہے۔ اسمتھ کسی سیرت کے منفرد عناصر پر نہایت دقت نظر سے رائے قائم کرتا تھا، لیکن کسی سیرت یا کسی کتاب پر بحیثیت مجموعی جب کوئی رائے دیتا تو اس کے خیال معوج اور ایک طرفہ ہونے پر جتنا تعجب کیا جاتا کم تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ سالہا سال نہایت گہرے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے یہ ان

کی سیرت کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا سوانح نگار لکھتا ہے:۔

"اس کی بنائی ہوئی تصویر ہمیشہ بولتی ہوئی سی اور جلیتی جاگتی ہوتی تھی، اصل سے بہت مشابہت بھی رکھتی تھی بشرطیکہ ایک خاص نقطۂ نظر سے اصل سے مقابلہ کیا جائے، لیکن اگر تمام حالات اور سب ابعاد کو پیش نظر رکھئے تو یہ کبھی صحیح اور پوری تمثیل نہ ہوتی تھی۔"

باب (۳۲)

ژان باپٹسٹ سے اور اُس کا مذہب

آدم اسمتھ نے مواد کا جو بے ترتیب انبار فراہم کر دیا تھا اُسے بہ حیثیت مجموعی اس مصنّف نے ایک نظام میں لانے، اسے واضح اور عام فہم بنانے، کی کوشش کی ہے اور چونکہ اسے ترتیب دینے اور اچھی طرح پیش کرنے میں خاص ملکہ تھا اس کام میں پورا پورا کامیاب بھی ہوا ہے۔ اس کی کتابوں میں کوئی نئی اور خود اپنی بات نہیں ملتی، سوائے اس کے کہ آدم اسمتھ نے ذہنی کام کو دولت آفرینی کی صفت سے محروم کر دیا تھا اور اس نے اسے یہ صفت واپس دے دی ہے۔ اس کا یہ خیال نظریۂ قوائے دولت آفرینی کے مطابق تو بہت صحیح ہے لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اقدارِ مبادلہ کے نظریہ سے ٹکراتا ہے۔ لہٰذا اسمتھ میں بہ نسبت سے کے منطقی استقامت زیادہ ہے ذہنی کام کرنے والے براہِ راست کوئی اقدارِ مبادلہ پیدا نہیں کرتے، بلکہ یہ تو پہلے اپنے مصارف سے مادی پیداوار اور مادی بچت کے مجموعہ میں یعنے مادی دولت میں کمی کا باعث ہوتے ہیں۔ سے نے اپنے نقطۂ نظر سے جو ذہنی کام میں دولت آفرینی

کی صفت تسلیم کی ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ انہیں معاوضہ مادی اقدارِ مبادلہ میں دیا جاتا ہے، بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ یہ قدریں تو پیدا ہوچکی ہیں، قبل اس کے کہ یہ ذہنی کام کرنے والوں کے ہاتھ میں پہنچیں، ان کا صرف مالک بدلتا ہے اور اس تبدیلی کی وجہ سے ان کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ذہنی کام کرنے والوں کو دولت آفریں تو اسی وقت کہا جا سکیگا جب اقدارِ مبادلہ پر قابض ہونے کو نہیں بلکہ قوم کے قوائے دولت آفریں کو قومی دولت سمجھے۔ اس معاملہ میں سے کا حال اسمتھ کے مقابلہ میں بالکل وہی تھا جو اسمتھ کا طبیعیین کے مقابلہ میں تھا۔ اہلِ صنعت میں دولت آفرینی کی صفت ماننے کے لئے آدم اسمتھ کو دولت کے تصور کو وسیع تر بنانا تھا اور سے کے لئے بھی سوا اس کے اور کوئی راہ نہ تھی کہ یا تو اس لغویت کو تسلیم کرلے جو آدم اسمتھ سے مروی تھی کہ ذہنی کام کرنے والے دولت آفریں نہیں ہوتے یا پھر قومی دولت کے تصور کو اس طرح وسعت دے جیسے آدم اسمتھ نے طبیعیین کے تصور دولت کو وسعت دی تھی یعنی اسے قوائے دولت آفریں پر حاوی کردے اور کہے کہ: "قومی دولت اقدارِ مبادلہ پر قبضہ سے عبارت نہیں ہے بلکہ قوت دولت آفریں ہے، جس طرح ایک مچھیرے کی دولت مچھلیوں پر قابض ہونے میں نہیں بلکہ اس صلاحیت اور ان ذرائع پر مشتمل ہے جن سے وہ برابر اپنی ضرورت کے موافق مچھلیاں پکڑ سکتا ہے۔"

یہ بات قابلِ توجہ ہے، اور جہاں تک ہم جانتے ہیں عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ ژاں باپتست سے کا ایک بھائی تھا جس کی سیدھی سادی مگر صحیح سمجھ نے نظریۂ قدر کی

بنیادی غلطی کو دیکھ لیا تھا اور ڈ. ب. سے نے متشکک بھائی کے سامنے خود اپنے مسلک کی صحت کے متعلق شبہ کا اظہار کیا تھا۔

لوئی سے، ساکن ناٹس کہتا ہے کہ "معاشیات میں کچھ ایسی اصطلاحات رائج ہو گئی ہیں کہ ان سے بہت کچھ چھوٹا کھیل کھیلا جا سکتا ہے اور خود میرا بھائی اس سے بری نہیں"[1] اس کی رائے میں قوموں کی دولت مادی چیزوں اور ان کی قدر مبادلہ پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں کو برابر پیدا کرتے رہنے کی صلاحیت سے عبارت ہوتی ہے۔ آسمتھ اور ژ۔ ب۔ سے کا نظریۂ اقدار مبادلہ۔ دولت کو صرف ایک دکاندار کے محدود نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور یہ نظام جو نام نہاد نظام تجارتی میں اصلاح کرنا چاہتا ہے در اصل خود ایک محدود قسم کا تجارتی نظام ہے[2]۔ ان شبہات اور اعتراضات کے جواب میں ژان باتیست

---

[1] لوئی سے کی کتاب دیباچہ صفحہ ۴۔

[2] لوئی سے کے اپنے الفاظ یہ ہیں (صفحہ ۲۱) "دولت ان چیزوں پر مشتمل نہیں ہوتی جن سے ہماری احتیاج پوری ہو یا ہمارے ذوق کی تسکین ہو بلکہ دولت نام ہے اس قوت کا کہ ان چیزوں سے سال بہ سال استفادہ کیا جا سکے"۔ آگے صفحہ ۳۶ تا ۱۵ کہتا ہے "غلط نظام تجارتی کی جگہ ایک اور غلط نظام نے لے لی ہے۔ اُس کی بنیاد اس پر تھی کہ وہ قیمتی دھاتوں کو دولت جانتا تھا، اس کی بنیاد یہ ہے کہ دولت بس چیزوں کی مبادلہ پذیر قدروں کا نام ہے۔ قوم کی دولت جن قدروں پر مشتمل ہوتی ہے اُنہیں یہ ایک دکاندار کی نظر سے دیکھتا ہے"۔ پھر صفحہ ۱۴ پر ایک نوٹ ہے کہ "مذہب رائج نے نظام تجارتی کو تو رد کیا ہے مگر خود ایک نظام قائم کر دیا ہے۔ جس کو نظام تجارتی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

اپنے بھائی کو لکھتا ہے کہ میرا طریقہ (طریقہ کیا!) یعنے اقدار مبادلہ کا نظریہ بلاشبہ سب سے اچھا نہیں ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس سے بہتر نہیں ملتا[1]

یہ کیا؟ بہتر نہیں ملتا! کیا خود اس کے بھائی لوئی نے اس کا پتہ نہیں چلا لیا تھا؟ مشکل بس یہ تھی کہ اتنی وقت نظر نہ تھی کہ بھائی نے جو خیال عام طریقہ پر پیش کر دیا تھا اُسے سمجھ کر اور آگے بڑھایا جاتا یا شاید یہ ہو کہ ایک مذہب قائم ہو چکا تھا اُسے توڑنا اور اب اُس کی بالکل ضد پیش کرنا جس سے شہرت حاصل ہوئی تھی، بہت مشکل تھا۔

سے کی کتابوں میں اس کی اپنی چیز صرف اس نظام کی شکل ہے، یعنے یہ کہ اُس نے معاشیات کو اس علم کی حیثیت سے پیش کیا جس میں بتایا جاتا ہے کہ مادی دولت کیسے پیدا کی جاتی ہے، کیسے تقسیم ہوتی اور کیونکر صرف میں آتی ہے۔ صرف اس تقسیم سے اور اس کے شروع سے آخر تک چلائے جانے سے سے نے کامیابی حاصل کی اور ایک مذہب معاشی کی بنیاد بھی رکھ دی! اور تعجب بھی کیا ہے، یہاں ہر چیز ایسی تھی کہ بس ہاتھوں سے تھام لو، اس نے دولت آفرینی کے خاص عمل کو اور ان انفرادی قوتوں کو جو اس میں مشغول ہوتی ہیں اس فصاحت اور صراحت سے بیان کیا، اپنے محدود حلقہ میں تقسیم عمل کے اصول کو اتنا صاف کر دیا، افراد کے تجارتی تعلقات کو اس طرح بیان کیا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر سی پھر جاتی ہے، ہر کُمہار ہر بساطی اسے سمجھ سکتا تھا اور جناب ژان باپٹسٹ سے نے جس قدر کم نئی اور نامعلوم باتیں فرمائیں اسی قدر بہتر سمجھ سکتا تھا،

---

[1] لوئی سے کی کتاب صفحہ ۱۳۶۔

اس لئے کہ یہ بات ہر معقول کمہار کو پہلے سے معلوم تھی کہ اس کے ہاتھ اور اس کی مہارت (محنت) جب مٹی (قدرت) سے ملیں تب چاک اور آوے اور ایندھن وغیرہ (سرمایہ) کی مدد سے مٹی کے برتن (قیمتی اشیاء، افزارِ مبادلہ) پیدا ہوتے ہیں۔ وہ صرف ان باتوں کو اصطلاحات میں بیان نہیں کر سکتا تھا اور نہ ان کے ذریعہ ان میں تعمیم کر سکتا تھا! اور کہیں ایسے بساطی بھی مشکل ہی سے ہونگے جو ترنب ے سے پہلے یہ نہ جانتے ہوں کہ مبادلہ میں طرفین قدر مبادلہ میں فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور جو ہزار ڈالر قیمت کا مال ملک سے باہر بھیجتا ہے اور اس کے بدلے میں ڈیڑھ ہزار کا مال پاتا ہے تو اُسے پانسو ڈالر کا نفع ہوتا ہے! یہ بھی پہلے سے معلوم ہی تھا کہ محنت سے آدمی مالدار ہوتا ہے اور کاہلی بھیک کے ٹکڑوں سے لگا دیتی ہے"! یہ بھی کہ شخصی خود غرضی محنت مشقت کے لئے سب سے قوی محرک ہے، اور یہ بھی کہ مرغی کے بچے نکالنے ہیں تو انڈے کھانا نہ چاہئیں ہاں یہ البتہ پہلے معلوم نہ تھا کہ یہ سب معاشیات ہے!! اور لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ اتنی کم محنت سے علم کے رازہائے سربستہ کا پتہ انہیں بھی چل گیا، اور پھر ان قابل نفرت محاصل سے نجات ملنا، جنہوں نے ہماری محبوب ترین اشیاء تعیش کو ایسا مہنگا کر رکھا ہے، اور اُوپر سے امن دائمی، عالمی برادری، اور (امن و آشتی کو) ہزار سالہ سلطنت منافع میں! یہ بھی چنداں تعجب کی بات نہیں کہ اتنے علماء اور حکومت کے عہدہ دار آئمہ اور تے کے مداحوں کی صف میں جا ملے، اس لئے کہ جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے، وہ کے اصول میں کچھ دقت نظر کی ضرورت پڑی تھی تو بس انہیں پڑی تھی جنہوں نے پہلے پہل اسے پیش کیا

اور رائج کیا، ان کے بعد میں آنے والے مصنّفوں کو تو کچھ کرنا دھرنا تھا نہیں سوائے اس کے اسی دلیل کو دہرا دیں، اسے ذرا خوشنما بنا دیں، صاف کر دیں۔ اور کون ہوگا جسے یہ خواہش نہ ہوگی جس میں اس کی صلاحیت نہ ہوگی کہ بہت بڑا مدبّر بن جائے جبکہ اس کے لئے سوائے اس کے اور کچھ درکار نہ تھا کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔

ان نظاموں کا بھی نرالا خاصّہ ہے، بس چند مقدمات کو مان لیجئے، بس چند ابواب میں ذرا اعتبار اور یقین کے ساتھ مصنّف کے پیچھے پیچھے چلئے اور بس آپ کھو گئے گئے۔ لہٰذا ہم شروع ہی سے جناب ڈان باپٹسٹ سے عرض کئے دیتے ہیں کہ معاشیات ہمارے نزدیک اس علم کو نہیں کہتے جو بس اتنا سکھاتا ہے کہ اقدار مبادلہ کو افراد کیسے پیدا کرتے ہیں، یہ ان میں کیسے تقسیم ہوتی اور کیونکر صرف میں آتی ہیں ہم ان سے عرض کئے دیتے ہیں ہم ان سے عرض کئے دیتے ہیں کہ اس کے علاوہ مدبّر کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ قوم کے قوائے دولت آفریں کیسے بیدار کئے جاتے ہیں، کیسے ان میں اضافہ ہوتا ہے اور کس طرح ان کا تحفّظ کیا جاتا ہے، اور وہ کیا چیزیں ہیں جن سے یہ کمزور پڑ جاتے یا خوابیدہ بلکہ مردہ تک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ قوم کے ان قوائے دولت آفریں ہی کے ذریعہ وسائل قومی کو بہترین اور مناسب ترین طریقہ پر استعمال میں لایا جا سکتا ہے تاکہ اس سے وجود قومی، استقلال قومی، قومی خوشحالی، قومی قوت، قومی تمدّن اور قوم کا مستقبل استوار ہو۔

یہ نظام اس انتہائی نقطہ سے کود کر، کہ ریاست ہی سب چیزوں کو چلا سکتی ہے

اور اسی کو چلانا چاہیئے، بالکل مخالف نقطۂ انتہائی پر پہنچ گیا ہے کہ ریاست کچھ نہیں کر سکتی نہ اسے کچھ کرنا چاہیئے۔ فرد ہی سب کچھ ہے، ریاست کچھ نہیں، افراد کی قدرت کامل اور ریاست کے عجز اور بے بسی کے متعلق جناب سے کی رائے مضحکہ انگیزی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ ایک جگہ مجبور ہوتے ہیں کہ فرانس کی صنعتی تعلیم میں کالبیر کے اثر کا اقرار کریں تو یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ "نجی افراد سے تو اتنی دانشمندی کی توقع کرنا ذرا مشکل ہوتا"!

اب اگر نظام کو چھوڑ کر مصنف کو دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شخص ہے جسے نہ تو تاریخ کا پورا پورا علم ہے، نہ علوم سیاسی یا نظم و نسق ملکی میں وہ کوئی خاص درک رکھتا ہے نہ سیاسی نظر ہے نہ فلسفیانہ دماغ ہے بس ایک خیال ہے جو کسی دوسرے سے لے لیا ہے اور اس خیال کو لیکر ساری سیاست، تمام اعداد و شمار تجارتی اور صنعتی حالات کو کھنگال ڈالا ہے تاکہ ایسے منفرد واقعات اور ثبوت نکال لے جو اس کے کام آئیں اور وہ انہیں اس خیال کی تائید کے لئے استعمال کرے۔ ذرا کوئی اس کے خیالات پڑھے قوانین جہاز رانی کے متعلق، معاہدۂ میتھوین کے متعلق، کالبیر کے نظام اور معاہدۂ ایڈن وغیرہ کے متعلق تو ہماری رائے کی پوری تصدیق ہو جائے گی۔ انہیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ قوموں کی تجارتی اور صنعتی تاریخ کو ساتھ ساتھ دیکھنا چاہیئے، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ تابینی بحاصل کے ماتحت قومیں مالدار اور طاقت ور ہوئی ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ تابین اس کی وجہ نہیں بلکہ یہ بات با وجود تابین کے ہوئی اور ہمیں چاہیئے وہ یہ ہیں کہ ہم ان کے دعوے کو لفظ بہ لفظ مان لیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فلپ ثانی نے چونکہ پرتگیزی بندرگاہ ولندیزیوں کے لئے بند کر دیئے اس لئے ہالینڈ والوں کو ضرورت

ہوئی کہ وہ جزائر شرق الہند سے براہِ راست تعلقات پیدا کریں، گویا کہ نظامِ تامینی کی رُو سے اس قسم کی قطعی ممانعت حق بجانب سمجھی جا سکتی ہے! یا یہ کہ بغیر اس ممانعت کے ہالینڈ کے لوگ جزائر شرق الہند کو پہنچ ہی نہ سکتے۔ اعداد و شمار اور سیاست سے جناب ستے کو تاریخ سے بھی زیادہ بَیر ہے، بلاشبہ اس وجہ سے کہ اوّل الذکر میں ایسے واقعات ملتے ہیں جو "اکثر ان کے نظام کے خلاف سر اُٹھاتے ہیں" اور مؤخر الذکر سے یوں کہ وہ اس سے واقف ہی نہیں۔ وہ برابر متنبہ فرماتے جاتے ہیں کہ اعداد و شمار گمراہ کر کے غلط نتائج تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ سیاست کو معاشیات سے کوئی تعلق نہیں اور ان کا یہ ارشاد ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ اگر آپ ٹلین کی ایک پلیٹ کو دیکھ رہے ہوں تو اس میں ٹلین کا ذکر کہاں آتا ہے!

پہلے دُوکاندار، پھر کارخانہ دار اس کے بعد ناکام سیاسی رہنے کے بعد ستے نے معاشیات پر ہاتھ ڈالا، جیسے پرانا کام نہ چلتا ہو تو آدمی کسی نئے کام میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ خود اس کا اقرار موجود ہے کہ پہلے پہل وہ شبہ میں رہا کہ نام نہاد نظامِ تجارتی کا حامی ہوں یا آزاد تجارت کے نظام کا۔ نظامِ براعظمی کی نفرت نے جس نے اس کا کارخانہ تباہ کیا تھا اور اس کے بانی سے نفرت نے، جس نے اسے ٹریبون سے نکالا تھا اسے مطلق آزادی تجارت کی جماعت میں شریک کرا دیا۔

آزادی کا لفظ، چاہے کسی سلسلہ میں بولا جائے، پچھلے پچاس برس سے فرانس میں ایک طلسمی اثر رکھتا ہے۔ مزید برآں سلطنت کے زمانہ میں بھی اور رجعت شاہی کے

وقت بھی تے کا تعلق مخالف جماعت ہی سے تھا اور یہ برابر کفایت شعاری کا وعظ دیا کرتا تھا، لہٰذا اس کی تصانیف اپنے مطالب کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے وجوہ سے ہر دلعزیز ہوئیں۔ ورنہ یہ بات کیسے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کے نظام کی یہ ہر دلعزیزی نپولین کے بعد بھی جاری رہی یعنی ایسے زمانہ میں کہ اگر اس کے نظام پر عمل کیا جاتا تو فرانسیسی صنعت یقیناً تباہ ہو جاتی۔ ان حالات میں بھی اس کا عالم دوستی کے اصول پر اڑا رہنا ثابت کرتا ہے کہ اس میں بس کتنی سیاسی نظر تھی۔ دنیا سے اس کی واقفیت کا حال اس سے ظاہر ہے کہ یہ کیننگ اور ہسکسن کی دوستی پر پکا یقین رکھتا تھا۔ اُن کی شہرت میں بس ایک چیز کی کسر رہ گئی کہ کوئی ہشتدہم یا چارلس دہم نے انہیں تجارت و مالیات کی وزارت تفویض نہ فرما دی، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ تاریخ میں ہمیشہ ان کا نام کالبیر کے نام کے ساتھ لیا جاتا، اس کا قومی صنعت کے بانی کی حیثیت سے اور ان کا بحیثیت اس کے برباد کرنے والے کے۔

اتنی بے بضاعتی کے ساتھ کسی مصنّف نے اتنے علمی استبداد سے کام نہیں لیا ہے جانتا ژ، ب، سے نے کسی نے اس کے مسلک کے بری از خطا ہونے پر ذرا سا بھی شبہ کیا، اور قدامت پرستی کا ٹھپّہ اس پر لگا، شاتپال جیسا آدمی اس معاشی پوپ کے فتویٰ تکفیر سے ڈرا کرتا تھا۔ فرانسیسی صنعت پر شاتپال کی تصنیف شروع سے آخر تک فرانسیسی نظام تاجینی کی تاثیر کی روئداد ہے، وہ بصراحت کہتا بھی ہے اور بالکل کھلے کھلے کہتا ہے کہ دُنیا کے موجودہ حالات میں فرانس کو نظام تاجینی ہی میں فلاح کی امید ہو سکتی ہے لیکن پھر

بھی اپنی ساری کتاب کے رجحان کے خلاف یہ آزادی تجارت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر سے کے ساتھیوں سے اپنے اس ارتداد پر بہت معذرت خواہ ہے۔ سے نے پاپائے سوم کی تقلید میں "فہرست ممنوعات" تک نہیں کی ہے، اس نے ارتدادی کتابوں کو نام بنام منع نہیں کیا، بلکہ اس سے بھی سخت کارروائی یہ کی کہ ارتدادی سب کو منع کر دیا۔ وہ معاشیات سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ بہت کتابیں نہ پڑھا کریں، ان کا گمراہ ہو جانا بہت آسان ہے، بس چند اچھی کتابیں پڑھنی چاہئیں یعنی بالفاظ دیگر "میری اور آدم سمتھ کی کتابیں پڑھو، اور کوئی کتاب نہ پڑھو"۔ اور اس بات کا انتظام کہ مریدوں کی خوش عقیدگی کا کچھ زیادہ حصہ مذہب کے پیغمبر ثانی بانی (سمتھ) کو نہ مل جائے اس بانی کے خلیفہ ارضی اور ترجمان (سے) نے اچھی طرح کر لیا تھا، اس لئے کہ سے کے خیال میں آدم سمتھ کی کتابیں گنجلک، نقص اور تضاد سے بھری پڑی ہیں اور وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ یہ بات مجھ سے ہی سیکھ سکتے ہو کہ "آدم سمتھ کو کس طرح پڑھنا چاہئے"۔

تاہم، سے کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر ہی تھا، کہ نوجوان مرتد اٹھے جنہوں نے اس کے نظام کی بنیاد پر ایسی جرأت سے اور اتنی مؤثر ضرب لگائی کہ اس نے انہیں نجی طور پر ہی جواب دینا پسند کیا اور نہایت نرمی کے ساتھ عام مباحثہ سے بچ نکلا، ان مخالفوں میں تانگی دوشاتل (جو بعد کو وزیر ہوا اور آجکل پھر وزیر ہے) سب سے زوردار اور سب سے ہوشیار تھا، ایک نجی خط میں سے نے شاتل کو لکھا "آپ کے خیال کے مطابق تو، اے میرے پیارے ناقد، میری معاشیات میں سوائے اس کے کچھ دھرا ہی نہیں ہے کہ

اعمال ہیں بے محرکات، واقعات ہیں بلا توجیہات، اطلاعوں کی ایک زنجیر ہے جس کے سرے ناقص اور جس کی اہم کڑیاں ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ میں بدقسمتی میں آدم اسمتھ کا شریک ہوں جس کے متعلق ہمارے ایک ناقد نے لکھا ہے کہ اس نے معاشیات کو اُلٹا چلا کر اس کے زوال کا سامان کیا[1]۔"

اس خط کے خاتمہ پر ایک پس نوشت نوٹ ہے جس میں نہایت سادگی سے کہتا ہے:"آپ نے جس دوسرے مضمون کا اعلان کیا ہے اس میں اس بحثا بحثی کے پھر سے شروع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس سے تو بیباک بس اُکتا ئے گی ہی!"

آج فرانس میں اسمتھ اور سے کا مذہب رد ہو چکا ہے اور نظریہ اقتدار مبادلہ کے سخت اور بے روح تسلط کی جگہ ایک ایسے انقلاب اور ہراج نے لی ہے جیسے نہ مکیو راتسی نکال سکتے ہیں نہ موسیو بلانکی، سان سیمیوں اور فوریے کے ساتھیوں نے اچھے قابل لوگوں کی قیادت میں اس پرانے مسلک میں اصلاح کرنے کے بجائے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اور خود اپنا ایک خیالی نظام بنا یا ہے۔ ابھی ابھی حال میں اُن کے سب سے ذہین لوگوں نے اپنے مسلک اور قدیم مذہب کا تعلق معلوم کرنے اور اپنے خیالات کو موجودہ حالات کے ساتھ مطابق کرنے کی کوشش کی ہے؛ ان کی کاوشوں سے خصوصاً نہایت قابل مائیشل شوالیے سے، بہت کچھ توقعات ہیں۔ اس نئے مسلک

---

[1] سے کی کتاب Cours complet d'economie politique pratique, VII صفحہ ۳۷۸۔

میں جو کچھ حق ہے اور ہمارے زمانہ میں کام آسکتا ہے اُس کے زیادہ تر حصّہ کی تشریح قواے دولت آفریں کے تعاون وہم آہنگی کے اصول سے ممکن ہے انفرادی آزادی اور خود مختاری کی بربادی اس مسلک کا کمزور پہلو ہے، اُن کے یہاں فرد بالکل جماعت میں منضم ہوجاتا ہے، یعنی یہ نظریہ اقدار مبادلہ کی بالکل ضد ہے کہ اس میں فرد ہی سب کچھ مختار ریاست کچھ نہ تھی۔ ممکن ہے کہ زمانہ کا رجحان حالات کی تشکیل اسی طرح کرادے جیسا کہ یہ فرقے خواب دیکھتے ہیں یا پہلے سے اندازہ کرتے ہیں، لیکن بہرحال میرا عقیدہ ہے کہ ان کے امکان کے لیئے کئی صدیاں درکار ہونگی۔ آج کوئی انسان فانی ایسا نہیں ہے، جو اندازہ لگاسکے کہ آنے والی صدیوں میں اختراعات اور جماعتی حالات میں کیا کچھ ترقیاں ہوجائیں گی۔ خود افلاطون کا ذہن پہلے سے یہ نہ جان سکتا تھا کہ چند ہزار سال کے بعد جماعت کے (کارکن) غلام لوہے، فولاد اور پیتل سے بنائے جائیں گے؛ ارسطو تک کا دماغ پہلے سے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ چھاپے کی مشین سے یہ ممکن ہوجائے گا کہ حکومت کا مندوبی نظام پوری پوری سلطنتوں، نہیں شاید پورے پورے براعظموں بلکہ ساری نسل انسانی میں پھیل جائیگا۔ اور اگر چند بڑے دماغوں کے لئے یہ ممکن بھی ہے کہ وہ ہزاروں سال بعد کی بعض ترقیوں کا پہلے سے اندازہ کرلیں جیسے کہ مسیح نے غلامی کے مٹنے کا اندازہ کرلیا تھا، تب بھی ہر عہد کے لئے اس کا اپنا مخصوص کام معین ہوتا ہے جس عہد میں ہم رہتے ہیں اُس کا کام یہ نہیں ہے کہ انسانیت کو فوریئے کی مجوزہ جماعتوں میں (۱۸۔ ۱۸ سو آدمیوں کی) ٹکڑے ٹکڑے کردے تاکہ ہر فرد کو جہاں تک ممکن ہو ذہنی و جسمانی خط کا

برابر برابر حصہ پہنچے ؛ بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ پوری پوری قوموں کی قوت دولت آفریں، تمدن ذہنی، حالات سیاسی اور طاقت کو درجۂ تکمیل تک پہنچائیں اور ان میں جہاں تک ممکن ہو مساوات قائم کر کے اتحادِ عالم کی تیاری کریں۔ اس لئے کہ، اگر تسلیم بھی کر لیا جائے، کہ دنیا کے موجودہ حالات میں ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے بنانے سے ان کے حامیوں کی جو غرض ہے، ان کا جو فوری مقصد ہے، وہ حاصل ہو گیا تو اس کا اثر قوم کی قوت پر اور قوم کی خود مختاری پر کیا پڑے گا ؟ اور جو قوم ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں منقسم ہو گی اسے کیا اس بات کا خطرہ نہ ہوگا کہ اس سے کم ترقی یافتہ، بالکل پرانے حال میں رہنے والی قومیں آکر اس پر فتح حاصل کر لیں اور یہ اپنی آنکھوں سے اپنی قبل از وقت تخلیقات کو، اپنی ساری قوت کو، نیست و نابود ہوتا دیکھیں ؟

اس وقت اقدارِ مبادلہ کا نظریہ ایسی بے بسی کی حالت کو پہنچ گیا ہے کہ اسے بس لگان کی ماہیت کی تحقیق ہی سے کام ہے، چنانچہ ریکارڈو نے اپنی کتاب " Principles of Political Economy " میں یہ کہہ ہی دیا ہے کہ "معاشیات کا خاص کام یہ ہے کہ وہ قوانین معیّن کرے جن کی رو سے زمین کا حاصل زمیندار، پٹہ دار اور مزدور میں تقسیم ہوتا ہے۔"

بعض لوگ تو یہ کہکر اپنے کو تسلّی دے لیتے ہیں کہ یہ علم مکمل ہو چکا، اب اس میں کسی اہم بات کا اضافہ کرنا باقی نہیں، لیکن جو لوگ ان کتابوں کو عملی یا فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں اُن کا دعویٰ ہے کہ ابھی معاشیات کا وجود ہی نہیں، یہ علم تو ابھی مدون کرنا ہے،

اس وقت تک تو یہ نجوم کا سا علم ہے، لیکن ممکن ہے اور ضروری کہ اس سے علم ہیئت پیدا ہو۔

کوئی غلط فہمی نہ ہو اس لئے ہم آخر میں یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ہم نے ڑ، ب، تے اور ان کے پیش روؤں اور پیروؤں کی تصانیف پر جو تنقید کی ہے وہ صرف قومی اور بین الاقوامی معاملات تک محدود ہے ورنہ ضمنی مسائل کی تشریح میں ہم ان کی قدر تسلیم کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مصنّف علم کے منفرد شعبوں میں تو نہایت قیمتی خیال اور استنباط پیش کر سکتا ہے چاہے اُس کے نظام کی بنیاد بالکل ہی غلط کیوں نہ ہو۔

چوتھی کتاب

تدبیرِ سیاسی

باب (۳۳)

جزائری تفوق اور برِّاعظم کی دولتیں، شمالی امریکہ اور فرانس

یوں تو ہر زمانہ میں ایسے شہر اور ایسے ملک ہوتے ہیں جنہیں صنعت، تجارت، جہاز رانی میں اور سب ملکوں پر فضیلت حاصل ہوئی تھی، لیکن جو تفوق ہمارے زمانہ میں ہے وہ دنیا نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ہر زمانہ میں قوموں اور دولتوں نے ساری دنیا پر تسلّط کی کوشش کی ہے، لیکن کسی نے اپنی قوت کی عمارت اتنی وسیع بنیاد ولس پر کھڑی نہیں کی۔ ان اگلوں کی یہ کوشش کہ اپنا عالمی تسلّط محض ہتھیاروں کی قوت پر قائم کریں کیسی ہیچ معلوم ہوتی ہے انگلستان کی اس عظیم الشان کوشش کے مقابلہ میں کہ اپنے

سارے علاقہ کو بس ایک بے پایاں صنعتی اور تجارتی مرکز اور بندرگاہ بنا دے اور دُنیا
کی دوسری دولتوں اور ملکوں کے لئے وہ ہو جائے جو ایک بڑا شہر اپنے اردگرد کے
دیہی علاقہ کے لئے ہوتا ہے، یعنے اپنے اندر تمام صنعت، تمام علوم و فنون، تمام تجارت،
تمام دولت، ساری جہازرانی اور ساری بحری قوت یکجا کر لے، ایک عالمی شہر بنجائے
جو تمام ملکوں کو صنعتی چیزیں مہیّا کرے اور ان سے اجناس خام اور زرعی پیداوار،
غرض سب مفید اور کارآمد چیزیں لے، جن کے پیدا کرنے کی صلاحیت قدرت نے ان
میں رکھی ہے، خود دُنیا کے سارے سرمایہ کا خزانہ بن جائے، اور تمام قوموں کا ساہوکار
جو سب دُنیا کے سرمایہ داروں پر قابو رکھتا ہو اور قرض دے دے کر اور سود لے
لیکر دنیا کی سب قوموں کو اپنے لئے سُود مند بنائے۔

لیکن ہمیں اس سلطنت اور اس کی کوششوں کے باب میں انصاف سے کام
لینا چاہیئے۔ انگلستان کی وجہ سے دنیا کی ترقی رُکی نہیں بلکہ اس میں بے حد مدد ملی ہے
وہ سب قوموں کے لئے ایک مثال اور ایک نمونہ ہے، داخلی اور خارجی سیاست میں،
اعلیٰ جذبات میں اور بڑے بڑے حوصلہ مندی کے کاموں میں، صنعت اور وسائل آمدو
کی تکمیل میں، غیر کاشت ملکوں کے معلوم کرنے اور انہیں زرخیز بنانے میں، اور خصوصاً
منطقہ حارہ کی قدرتی دولت کو کام میں لانے اور وحشی قوموں یا بعد کو بربریت میں مبتلا ہو
جانے والی قوموں کو مہذّب بنانے کے معاملہ میں۔ کون جانتا ہے کہ اگر انگلستان نہ ہوتا
تو دُنیا کتنی پیچھے رہ جاتی؛ اور اگر آج وہ نہ رہے تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ انسانیت کتنی

پیچھے جا پڑے؟ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ اس قوم کی عظیم الشان ترقی پر خوش ہوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے اس کی خوش حالی کی دعا مانگیں، لیکن کیا ہمیں اس وجہ سے یہ خواہش بھی کرنی چاہیئے کہ وہ باقی دوسری قوموں کے کھنڈروں پر اپنی سرشاری حکومت کی بنا رکھے؟ اس بات کا جواب اثبات میں یا تو بے پیندے کی بین الاقوامیت دے سکتی ہے یا نیا کی سی کوتاہ نظری۔ ہم نے قوموں کے یوں خراب ہونے کے نتائج پچھلے بابوں میں بتلائے ہیں اور یہ دکھلایا ہے کہ نسل انسانی کی تہذیب و تمدن اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ بہت سی قومیں تمدن، دولت اور قوت میں ایک سی ہوں اور جس طرح انگلستان نے اپنے کو بربریت کی حالت سے ابھار کر موجودہ بلندی تک پہنچایا ہے اسی طرح یہ راہ اور قوموں کے لیئے بھی کھلی ہو۔ اور اس وقت ایک سے زیادہ قومیں اس کی اہل ہیں کہ تمدن، دولت اور قوت کے بلند سے بلند مقاصد کے لیئے کوشش کریں۔ اب ہم مختصراً سیاست عملی کے وہ اصول درج کرتے ہیں جن کے ذریعہ انگلستان اپنی موجودہ عظمت کو پہنچا ہے، مختصر لفظوں میں وہ یہ ہیں :-

ا۔ چیزوں کی درآمد کے مقابلہ میں ہمیشہ دولت آفریں قوت کی درآمد کو ترجیح دینا۔[1]

---

[1] انگلستان میں اُون کی پیداوار کا ایک حصہ اس اصول پر کاربند ہونے کی وجہ سے ہے، شاہ ایڈورڈ چہارم نے خاص رعائتیں دے کر اسپین سے تین ہزار بھیڑیں منگوائیں، حالانکہ وہاں سے بھیڑوں کا باہر بھیجنا ممنوع تھا، اور ان بھیڑوں کو مختلف کلیسائی علاقوں میں تقسیم کر دیا،

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر ہے)

۲۔ دولت آفریں قوت کی نشو و نما اور اس کے تحفظ کا اہتمام کرنا۔

۳۔ صرف خام اجناس اور زرعی پیداوار ملک کے اندر منگانا اور صرف صنعتی پیداوار کا باہر بھیجنا۔

۴۔ فاضل دولت آفریں قوت کو نوآبادیوں میں وحشی قوموں کو زیر فرمان لانے میں استعمال کرنا۔

۵۔ نوآبادیوں اور مفتوحہ ملکوں میں صنعتی چیزوں کے فراہمی کا حق تمام تر اپنے لیے محفوظ رکھنا اور اس کے بدلہ میں اپنے یہاں سے اُن کی اجناس خام اور نوآبادی پیداوار کو ترجیح دینا۔

۶۔ ساحلی جہاز رانی، اور اپنی نوآبادیوں کے ساتھ بحری آمد و رفت کے وسائل تمام تر خود مہیا کرنا، حکومت کی طرف سے مدد دے دے کر بحری ماہی گیری کو فروغ دینا اور بین الاقوامی جہاز رانی میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنا۔

(بقیہ صفحہ ۵۱۹) اور یہ حکم دیدیا کہ ۷ سال تک نہ تو ان میں سے کوئی ذبح کیا جائے اور نہ خصی (جلد اول صفحہ ۳۷۹) d'Angleterre Essai sur la Commerce

اس کارروائی کا مقصد جب حاصل ہوگیا تو انگلستان نے ہسپانی حکومت کی رعایت کا جواب یوں دیا کہ اپنے یہاں ہسپانی اُون کی درآمد بالکل بند کردی، یہ ممانعت کتنی ہی مخالف انصاف کیوں نہ معلوم ہو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کا اثر ویسا ہی ہوا جیسا کہ چارلس دوم کے اُون کی درآمد کو ممنوع قرار دینے کا (۱۶۷۲ و ۱۶۷۴)۔

۷۔ ان طریقوں سے اپنے تمدن کی بنیاد رکھنا، اور پھر اس کے ذریعہ اپنی تجارت خارجہ کو وسعت دینا اور اپنی نوآبادیوں کو مسلسل بڑھانا۔

۸۔ نوآبادیوں سے تجارت اور جہاز رانی میں بس اسی حد تک آزادی دینا کہ اس سے نقصان سے زیادہ نفع ہو، کسی دوسری قوم سے جہاز رانی کے باہمی رعایتوں کا معاہدہ اس وقت کرنا کہ اس سے انگلستان ہی کا فائدہ ہو اور دوسری قوموں کو اس کے ذریعہ روکا جائے کہ وہ جہاز رانی پر کوئی ایسی قیود عائد کریں جن سے خود ان کا فائدہ ہو۔

۹۔ دوسری خود مختار قوموں کو زرعی پیداوار کی درآمد کے بارہ میں رعایتیں دینا اگر وہ ان کے مقابلہ میں وہاں صنعتی پیداوار کی درآمد کے لئے رعایتیں حاصل ہو سکیں۔

۱۰۔ جہاں اس قسم کی رعائتیں معاہدوں کے ذریعہ سے مل سکیں وہاں یہی غرض تجارت ممنوع کے ذریعہ پوری کرنا۔

۱۱۔ محض صنعت، تجارت، جہاز رانی اور نوآبادیوں کی خاطر جنگیں کرنا اور دوسری قوموں سے اتحاد قائم کرنا، ان کے ذریعہ دوست دشمن سب سے فائدہ اٹھانا، دشمنوں سے ان کی بحری تجارت کو روک کر اور دوستوں کو ایسی امدادیں دے کر جو انگریزی صنعتی پیداوار کی شکل میں ادا ہوتی ہوں اور ان کی اپنی صنعت کو تباہ کر دیں۔

اگلے وقتوں میں سب انگریز وزراء اور پارلیمنٹ کے سب مقررین ان اصولوں کا بلا تامل اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ جارج اوّل کے وزراء نے ۱۷۲۱ء میں جب ہندوستانی صنعتی پیداوار کی درآمد بند کی گئی تو صاف صاف اعلان کیا کہ ظاہر ہے قوم اسی وقت مالدار

اور طاقت در بن سکتی ہے جب خام مال کی درآمد ہو اور صنعتی مال کی برآمد۔ لارڈ چیتھم اور لارڈ نارتھ کے زمانہ تک وہ کھلی پارلیمنٹ میں یہ کہتے ذرا نہ جھجکتے تھے کہ شمالی امریکہ میں گھوڑے نے نعل کی ایک کیل بنانے کی بھی اجازت نہ دینی چاہیئے۔

اُوپر جو اصول درج کئے گئے ہیں اُن میں آدم سمتھ کے وقت سے ایک اور اصول کا اضافہ ہوا یعنی انگلستان کی واقعی تدبیر سیاسی کو ان بین الاقوامی اور عالمی لفظوں اور دلیلوں کے پردہ میں چھپایا جائے جو آدم سمتھ نے اختراع کئے ہیں تاکہ دوسری قوموں کو اس تدبیر سیاسی کے نقل کرنے سے روکا جاسکے۔

بہ ہوشیار لوگوں کا عام قاعدہ ہے کہ جب عظمت کے عروج کو پہنچ جائیں تو اس سیڑھی کو پھینک دیں جس سے وہ اس بلندی کو پہنچے ہیں تاکہ پیچھے سے کوئی دوسرا بھی اُس سے اُوپر چڑھنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ آدم سمتھ کے عالمی مذہب معاشی اور اُس کے بڑے ہم عصر ولیم پٹ اور برطانوی سیاست ملکی میں اس کے تمام جانشینوں کے بین الاقوامی رجحانات کا راز بس یہ ہے۔ جب ایک قوم تامینی کارروائیوں سے اور جہازرانی پر قیود لگا لگا کر اپنی قوت صنعتی اور اپنی جہازرانی کو اس درجہ ترقی کو پہنچا لے کہ کوئی دوسری قوم اس سے آزاد مقابلہ کی تاب نہ لا سکے تو پھر وہ اس سے زیادہ چالاکی کی کوئی بات نہیں کر سکتی کہ اپنی عظمت کی اس سیڑھی کو الگ ہٹا دے، دوسری قوموں کے سامنے آزاد تجارت کے فوائد کا وعظ کہے، اور خود اپنے پچھتاوے کا اظہار کرے، کہ اتنے عرصہ راہ خطا پر گامزن رہی اور اب کہیں جا کر حقیقت کا علم ہوا۔

ولیم پٹ انگلستان کا پہلا مدبّر تھا جس نے دیکھا کہ آدم اسمتھ کا عالمی نظریہ معاشی کس طرح کام میں لایا جا سکتا ہے، اور وہ جو اپنے ساتھ اس کی کتاب "دولتِ اقوام" کا ایک نسخہ ہر وقت لئے پھرتا تھا تو کچھ یونہیں نہیں، اس کی ۱۷۸۶ء والی تقریر نہ انگریزی پارلیمنٹ کے لئے تھی نہ انگریزی قوم کے لئے بلکہ فرانس کے ناتجربہ کار اور فراستِ سیاسی سے عاری مدبّروں کے کانوں کے لئے تھی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان مدبّروں پر معاہدۂ ایڈن کے موافقت میں اثر ڈالا جائے۔ یہ تقریر اسمتھی طریقۂ استدلال کا نمونہ ہے۔ اس نے کہا کہ فرانس قدرت کی طرف سے زراعت اور شراب کی تیاری کے لئے موزوں ہے اور انگلستان مصنوعات کے لئے، ان دونوں قوموں کا باہمی تعلق اسی قسم کا ہے جیسے دو بڑے بڑے تاجروں کا جو مختلف چیزوں کی تجارت کرتے ہیں اور اپنے مالِ تجارت کے مبادلہ سے ایک دوسرے کی دولت بڑھاتے ہیں[1]۔ یہاں انگلستان کے اس پرانے اصول کے متعلق ایک لفظ بھی

---

[1] پٹ نے کہا "فرانس کو انگلستان کے مقابلہ میں آب و ہوا اور دوسرے قدرتی عطیوں کے اعتبار سے فضیلت حاصل ہے، اس لئے وہ انگلستان سے اجناسِ خام کے معاملہ میں بڑھا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے انگلستان کو فرانس پر مصنوعات کے معاملہ میں فضیلت ہے، فرانس کی شراب، برانڈی، تیل اور سرکہ خصوصاً اول الذکر دو چیزیں اتنی اہم اور اتنی قیمت کی ہیں کہ ہماری قدرتی پیداوار کی قیمت کا ان سے مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا؟ لیکن دوسری طرف یہ بھی اسی قدر یقینی امر ہے کہ بعض مصنوعات تو تمام تر انگلستان ہی میں بنتی ہیں اور دوسری ایسی ہیں کہ اُن میں

نہیں ہے کہ قوم کی تجارت خارجہ اس وقت دولت اور قوت کے کمال کو پہنچ سکتی ہے کہ وہ زرعی پیداوار اور خام اجناس لیکر مصنوعات مبادلہ میں دے، یہ اصول اس وقت بھی انگلستان کا ایک سیاسی راز تھا اور اس وقت سے برابر رہا ہے، ہاں کبھی پھر اعلانیہ اس کا ذکر نہیں ہوا، لیکن عمل اس پر اور بھی سختی سے کیا گیا!

(بقیہ صفحہ ۵۲۳) اسے ایسی خاص فضیلت حاصل ہے کہ وہ بلا تامل فرانس کے مقابلہ کو نظرانداز کر سکتا ہے۔ یہ دوطرفہ صورت حال ہے اور وہ بنیاد ہے جس پر دونوں قوموں میں ایک مفید تجارتی معاہدہ قائم ہو سکتا ہے۔ چونکہ دونوں کی اپنی اپنی مخصوص پیداوار ہے، دونوں کے پاس وہ ہے جو دوسرے کے پاس نہیں، اس لئے ان دونوں کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسے دو بڑے تاجروں کا جو مختلف چیزوں کی تجارت کرتے ہیں اور اپنے تجارتی مال کے مبادلہ سے ایک دوسرے کیلئے یکساں مفید ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ جس قوم سے ہمیں تعلق ہمسائیگی ہے اس کی دولت کتنی ہے، اس کی آبادی کتنی ہے، وہ ہم سے کتنی قریب ہے، اور اس کی وجہ سے ہم میں باہم کس قدر تیزی اور باضابطگی سے مبادلہ ممکن ہے؟ پھر بھلا کون ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس آزادی کے نظام کو پسند نہ کرے اور نہایت انہماک بلکہ بے چینی سے اس کے استحکام میں ہر ممکن عجلت کا خواہشمند نہ ہو؟ ایسی وسیع اور ایسی یقینی منڈی سے ہماری تجارت کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوگا اور محاصل تجارت کی بہت کچھ آمدنی گھاٹ ماروں سے بچکر ریاست کو حاصل ہوگی اور اس طرح ہماری مالیات کو فائدہ پہنچائیگی اور یوں برطانوی دولت اور برطانوی طاقت کے دو خاص ذرائع زیادہ دولت آفریں ہو جائیں گے۔

اگر ولیم پٹ کے بعد انگلستان واقعی تاجرِ تجارت کو ایک بے سود جیسا کھی جان کر پھینک دیتا تو وہ آج جہاں ہے اس سے کہیں بلند تر ہوتا، وہ اپنے اس مقصد سے قریب تر ہوتا کہ ساری دنیا کو صنعتی قوت کا اجارہ دار بن جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے پورا ہونے کے لئے مناسب وقت عام امن کے قائم ہونے کے بعد ہی تھا (نپولین کے، برّاعظمی نظام سے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی اس نے اس عالمی مذہب معاشی کی تعلیمات کے لئے برّاعظم یورپ کے ممالک میں جگہ پیدا کر دی تھی۔ روس، سارا شمالی یورپ، جرمنی، جزیرہ نمائے ہسپانیہ، اور شمالی امریکہ کی متحدہ ریاستیں سب کے سب اپنے کو خوش قسمت سمجھتے اگر اپنی زرعی پیداوار اور خام جنسوں کو انگلستان کے مصنوعات سے بدل سکتے۔ خود فرانس، اگر اسے شراب اور ریشمی مال کے معاملہ میں کچھ معقول رعایتیں مل جاتیں، تو غالباً وہ اپنے امتناعی نظام کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ یعنی وہ وقت آ گیا تھا جب کہ "بقول پوسٹلے متعلق بہ انگریزی قوانین جہاز رانی" انگریزی نظام تاجرین کا ختم کر دینا اتنی ہی دانشمندی کا کام ہوتا جیسا کہ پہلے اس کا جاری کرنا تھا۔"

اس تدبیرِ سیاسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دونوں برّاعظموں سے تمام فاضل پیداوار اور اجناس خام انگلستان میں ڈھل آتیں اور ساری دُنیا انگریزی کپڑے سے اپنا بدن ڈھانکتی اور ہر چیز انگلستان کی دولت اور قوت کو بڑھانے کا کام کرتی۔ اس حالت میں نہ تو امریکنوں یا روسیوں کو یہ خیال ہوتا کہ اس صدی کے اندر اپنے یہاں تاجرین کی ابتدا کریں، نہ جرمنوں کو اپنا اتحاد محاصلی قائم کرنے کی سوجھتی، لوگ مشکل ہی سے وقتی فائدوں

کو کسی مستقبل بعید کی امیدوں پر قربان کرنے کا تہیّہ کر سکتے۔

لیکن اس کا بھی تو انتظام ہے کہ درخت بڑھتے بڑھتے آسمان کو نہ پہنچ جائیں!

"لارڈ کاسل ریگ نے انگلستان کی تجارتی سیاست زمیندار اُمراء کے ہاتھ میں دے دی اور اُنہوں نے اس مرغی ہی کو مار ڈالا جس نے سونے کے انڈے دینے تھے، اگر یہ لوگ اس بات کی اجازت دے دیتے کہ انگریزی مصنوعات تمام قوموں کی منڈیوں پر چھا جائیں اور انگلستان دنیا کے لئے وہ ہوجائے جو ایک صنعتی شہر گردو نواح کے دیہات کے لئے ہوتا ہے تو اس جزیرہ کی ساری زمین مکانوں اور کارخانوں سے پٹ جاتی یا اس پر تفریحی باغ ہوتے اور میوہ اور ترکاری کی کاشت، دودھ اور گوشت کی پیداوار کی تدابیر ہوتیں، تجارت میں کام آنے والی چیزیں بوئی جاتیں، غرض سب وہی چیزیں جو صرف کسی بڑے شہر کے قریب بوئی جاسکتی ہیں۔ ان چیزوں کی کاشت انگریزی زراعت کے لئے غلّہ کی کاشت سے بمراتب زیادہ نفع بخش ہوتی اور کچھ عرصہ بعد انگریز زمینداروں کو اس سے کہیں زیادہ لگان وصول ہوتا بہ نسبت اس لگان کے جو ملک کی منڈی سے پردیسی غلّہ کی درآمد روک کر اُنہوں نے وصول کیا پس ہؤا یہ کہ زمیندار امراء نے اپنے وقتی فائدہ کو پیشِ نظر رکھکر اس بات کو ترجیح دی کہ غلّہ کے قوانین کی مدد سے اپنے لگان اراضی کو اس بلند سطح پر قائم رکھیں جس پر جنگ کے زمانہ میں پردیسی خام اجناس اور پردیسی غلّہ کے انگریزی منڈی سے مجبوراً بند ہوجانے نے اسے پہنچا دیا تھا، اور اس طرح ان امراء نے برِّاعظم کی قوموں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے فلاح کا

کوئی دوسرا راستہ سوچیں اور صرف اس پر تکیہ نہ کریں کہ ان کی زرعی پیداوار کا مبادلہ انگریزی مصنوعات سے ہو جائے، یعنی انہوں نے خود اپنی صنعت کو فروغ دینے کی راہ پر دھیان دیا، یوں گویا انگریزی قوانین اقتناعی کا اثر بھی اسی قسم کا ہوا جیسا کہ نپولین کے برّاعظمی نظام کا ہوا تھا، البتہ اس کے مقابلہ میں ذرا آہستہ۔

جب کیننگ Canning اور ہسکسن Huskisson برسر اقتدار آئے تو زمیندار اس ثمر ممنوعہ کا ذائقہ چکھ چکے تھے کہ اب عقلی دلیلوں سے انہیں اس سے باز رکھنا ممکن نہ تھا۔ ان مدبروں کو ایک ناممکن مسئلہ کا حل نکالنا تھا اور یہی مسئلہ آج تک انگریزی وزارت کے سامنے ہے۔ انہیں برّاعظم یورپ کی قوموں کو یقین دلانا ہے کہ آزاد تجارت میں بڑے فوائد ہیں اور ساتھ ہی اپنے زمینداروں کے فائدے کے لئے پردیسی پیداوار زرعی کی درآمد پر پابندیاں برقرار رکھنی ہیں، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ یہ لوگ اپنے نظام کو اس طرح نشو و نما دیتے کہ دونوں برّاعظموں میں آزاد تجارت کے حامیوں کی امیدیں پوری ہو سکتیں۔ انگلستان اور دوسرے ممالک کے تجارتی نظام کے متعلق عام مباحث میں یہ لوگ ہر چند نہایت فراخدلی سے انسانیت دوستی اور عالمی محبت کی تائید میں الفاظ سے کام لیتے تھے لیکن جب کبھی کسی انگریزی محصول میں تبدیلی کا معاملہ آتا تو انہیں اپنے دلائل کو اصول تامین پر مبنی کرنے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔

سچ ہے کہ ہسکسن نے بہت سی چیزوں پر محاصل کی شرح کم کی لیکن اس نے

کبھی یہ ثابت کرنے سے احتراز نہ کیا کہ محصول کم کر دینے کے باوجود بھی دیسی مال
کافی طور پر مامون ہے، وہ گویا تقریباً ہالینڈ کے پانی والے انتظام کا مقلّد تھا کہ
جہاں پانی باہر سے اونچا اٹھتا ہے وہاں بند اونچا بنایا جائے جہاں کم اٹھتا ہے وہاں
نیچا، اس طرح انگریزی سیاست تجارتی کی جس اصلاح کا اعلان اس قدر زور شور سے
کیا گیا تھا وہ حقیقتاً بس سیاست معاشی کی ایک بازیگری سے زیادہ نہ تھی ریشمی مال
پر محصول کی کمی کو لوگ انگریزی فراخدلی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں اور اس پر دھیان
نہیں کرتے کہ انگلستان کا مقصد اس میں صرف یہ تھا کہ ریشمی مال کی جو تجارت چھپے چوری
سے ہوتی تھی اس کو نقصان پہنچائے اور اپنی ریشم کی صنعت کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی
مالیات کو فائدہ پہنچا دے، اور یہ مقصد اس نے پورے طور پر حاصل کر بھی لیا اور اگر ۵۰ تا
۷۰ فی صدی کا تامینی محصول (اور اسی قدر پر دیسی ریشمی مال پر مشمول محصول اضافی انگلستان
میں دینا ہوتا ہے) انگریزی فراخدلی کا ثبوت تسلیم کیا جا سکتا ہے تو پھر تو اکثر دوسری
قومیں اس فراخدلی میں انگریزوں سے پہل کر چکی ہیں، ان کی مقلّد نہیں۔

چونکہ کیننگ اور ہسکسن کے مظاہرہ کا مقصد زیادہ تر فرانس اور شمالی امریکہ میں
اثر پیدا کرتا تھا اس لئے یہ یاد کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس کا اثر ان دونوں ملکوں
میں کیسے بالکل باطل ہو گیا۔ ۱۷۸۶ء کی طرح اس دفعہ بھی انگریزوں کو فرانس کے نظریئین
اور وہاں کی لبرل جماعت میں بہت سے ہمنوا ملے، کچھ تجارت عالم کی آزادی کے عظیم الشان
خیال نے بہکایا، کچھ ستے کے سطحی دلائل نے، کچھ ایک قابل نفرت حکومت کی مخالفت

ہیں، اور کچھ جہاز رانی کے مرکزی شہروں اور شراب اور ریشم پیدا کرنے والوں کی مدد سے ۱۷۸۶ء کی طرح اب بھی لبرل جماعت نے چلّا چلّا کر انگلستان سے تجارت بڑھانے کا مطالبہ کیا اور اسی کو قومی خوشحالی کی ترقی کا واحد ذریعہ بتلایا۔

رجعت شاہی کے خلاف اور جو کچھ بھی کہا جائے، اس نے فرانس کی ایک ایسی خدمت ضرور کی، ایسی خدمت جس سے بعد میں آنے والی نسلیں انکار نہ کر سکینگی یعنی یہ کہ اس نے نہ تو انگریزی چالوں سے اثر لیا، نہ لبرل جماعت کی پکار سے اور اپنی سیاست تجارتی میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔ جناب کیننگ کے دل کو یہ بات ایسی لگی تھی کہ وہ خود پیرس تشریف لے گئے کہ موسیو ویئے کو ایسی تدبیر کی خوبی کا قائل کریں اور اس کی تقلید کی رغبت دلائیں، لیکن موسیو ویئے اس قدر عملی آدمی تھا وہ بھلا ان چالوں کی تہ میں کیوں نہ پہنچ جاتا، چنانچہ انہوں نے مسٹر کیننگ کو جواب دیا کہ "اگر انگلستان اپنی صنعت کی ترقی یافتہ حالت میں پہلے سے زیادہ پردیسی مقابلہ کی اجازت دیتا ہے تو یہ تدبیر تو خود انگلستان کے سمجھے بوجھے اغراض کی تائید میں ہے، لیکن اس وقت فرانس کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنے کارخانوں کو جو ہنوز پوری تکمیل کو نہیں پہنچے ہیں، مامون رکھے کہ یہ ابھی اس غرض کے لئے ناگزیر ہے، لیکن جب وہ وقت آئیگا کہ فرانس کی صنعت کو پردیسی مقابلہ کے روکنے سے نہیں بلکہ اس کی اجازت دینے سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے گا اس وقت ہم بھی (ویئے) مسٹر کیننگ کی مثال سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہ کریں گے۔"

اس قطعی جواب سے ناخوش ہو کر جب کیننگ واپس آیا ہے تو اس نے کھلی پارلیمنٹ میں اس پر فخر کیا کہ میں نے فرانس کی گردن میں ہسپانوی مداخلت کی سل لٹکا دی ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کیننگ کا عالمی شہریت کا احساس اور اس کے سارے یورپ پر حاوی لبرل اصول اس قدر سنجیدہ باتیں نہ تھیں جیسا کہ بر اعظم کے بھولے لبرل سمجھتے تھے، اس لئے کہ اگر مسٹر کیننگ کو بر اعظم میں لبرل اصولوں کے چرچے میں ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو وہ کیسے اسپین کے لبرل دستور اساسی کو فرانسیسی مداخلت پر قربان کر دیتے صرف اس غرض سے کہ فرانس کی گردن میں ایک سل لٹکا دیں! سچ یہ ہے کہ مسٹر کیننگ اینچ اینچ انگریز تھے، اور عالمی یا انسانی دوستی کے عقائد کی پیدائش ان کے یہاں اسی وقت ہوئی تھی جب ان سے انگریزی صنعت اور تجارت کا تسلط مستحکم ہوتا جاتا اور وسعت پاتا تھا یا جب ان سے انگلستان کی صنعت و تجارت کا مقابلہ کرنے والوں کی آنکھوں میں خاک ڈالی جا سکتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ موسیو ویلیئے کو کچھ بہت فراست درکار نہ تھی کہ وہ اس جال کو دیکھ لیتے جو مسٹر کیننگ نے ان کے لئے بچھایا تھا۔ اپنے پڑوسی جرمنی کے تجربہ میں موسیو ویلیئے کے لئے آزادیٔ تجارت کے اصول کی، جیسا کہ انگلستان میں یہ اصول سمجھا جاتا ہے، اصل قیمت کا بڑا اچھا ثبوت تھا، کہ جرمنی بر اعظمی نظام کے اٹھ جانے کے بعد سے برابر صنعت کے اعتبار سے روبہ تنزل تھا۔ پھر خود فرانس اس نظام کے ماتحت جو اس نے ۱۸۱۵ء میں اختیار کیا تھا ایسی اچھی ترقی کر رہا تھا کہ وہ کہانی کے کتے کی طرح اس بات کے واسطے کیسے

آمادہ ہو جاتا کہ حقیقت کو چھوڑ کر سایہ پر جھپٹے حقیقت صنعت کے نہایت گہرے فنکاروں مثلاً شاپتال Chaptal اور شارل دوپین Charles Dupin نے اس نظام کی کامیابی پر نہایت قطعی رائیں ظاہر کی تھیں۔

فرانسیسی صنعت پر شاپتال کی تصنیف فرانسیسی سیاست تجارتی کی تائیدی تحریر کے سوا اور کیا ہے اور بحیثیت مجموعی نیز جزوی طور پر اس کی کامیابی کا بیان، اس تصنیف کا میلان اس کے ایک مقام سے ظاہر ہوتا ہے "فلسفیانہ تجریدات کے بھول بھلیاں میں اپنے تئیں کھونے کے عوض ہمیں چاہئے کہ جو کچھ موجود ہے اسے برقرار رکھیں اور اس کی تکمیل کی صورت نکالیں۔ ایک اچھا قانون محاصل صنعت کا پشت پناہ ہوتا ہے، یہ حسب ضرورت محاصل کو بڑھاتا بھی ہے گھٹاتا بھی ہے، گراں اجرت اور گراں ایندھن کے نقصانات کی تلافی کرتا ہے، دستکاریوں اور صنعتوں کو جب وہ پالنے میں ہوتی ہیں یہی پناہ دیتا ہے، حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہیں کہ پردیسی مقابلہ کو سہہ سکیں، اس سے فرانس کی صنعتی خودمختاری پیدا ہوتی ہے اور قوم میں وہ محنت بڑھتی ہے جو (جیسا کہ میں نے اکثر پہلے کہا ہے) دولت کا خاص منبع ہے[1]"

شارل دوپین نے اپنی کتاب "فرانس کی دولت آفریں قوتیں اور ۱۸۱۴ء سے ۱۸۲۷ء تک فرانس کی صنعتی ترقی" میں اس سیاست تجارتی کی کامیابی پر ایسی تیز روشنی ڈالی ہے، جو فرانس نے رجعت شاہی کے بعد سے اختیار کی تھی، کہ کوئی فرانسیسی وزیر نصف صدی کے

---

[1] Chaptal : de l'industrie froncaise جلد ۲، صفحہ ۲۴۶۔

اس کام کو جس کے لئے ایسی قربانیاں کی گئیں اور جس نے ایسے پھل دیئے اور جو آئندہ کیلئے امیدوں سے ایسا پُر ہے کس طرح عہدنامہ ملبقہ بن جیسی چیز کے عوض ناممکن تھا کہ ہاتھ سے دے دیتا۔

۱۸۰۸ء میں امریکہ نے جو قانون محاصل نافذ کیا وہ انگریزی سیاست تجارتی کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ تھا، انگریز شمالی امریکہ کی لکڑی، غلّہ، آٹا اور دوسری زرعی پیداوار اور اجناس خام تو انگریزی سواحل سے واپس کر دیتے تھے اور اپنی صنعتی پیداوار کے بدلہ میں صرف امریکہ کی کپاس لے لیتے تھے؛ یُوں انگلستان سے تجارت کی وجہ سے صرف امریکی غلاموں کے زرعی کام کو فروغ ہوتا تھا اور اتحاد امریکی کی سب سے آزاد، سب سے روشن خیال اور سب سے طاقتور ریاستوں کی معاشی ترقی بالکل رُک گئی تھی اور وہ مجبور تھیں کہ ہر سال اپنی آبادی اور اپنے سرمایہ کے اضافہ کو مغرب کی غیر مزروعہ زمینوں کی طرف بھیجیں مسٹر ہسکسن اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے، عام طور پر معلوم تھا کہ انگریزی سفیر متعینہ واشنگٹن نے ایک سے زائد مرتبہ انہیں انگریزی سیاست کے نتائج سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگر مسٹر ہسکسن وہی آدمی ہوتے جو لوگ انہیں پردیس میں منوانا چاہتے ہیں تو انہوں نے امریکی قوانین محاصل کے نفاذ کو اس بات کا غنیمت موقع جانا ہوتا کہ انگریز اُمرا ارکو قوانین غلہ کی حماقت سمجھائیں اور اُن کے ہٹانے کی ضرورت جتائیں لیکن مسٹر ہسکسن نے کیا کیا؟ وہ امریکنوں پر خفا ہوئے دیا کہ (انہوں نے ظاہر خفا بنے) اور اشتعال میں

وہ وہ باتیں کہیں جن کی عدم صحت کا علم ہر امریکی کسان کو ہے اور غصہ میں ایسی دھمکیاں دیے ڈالیں کہ خود مضحکہ خیز بن گئے۔ مسٹر ہیرکسن نے فرمایا: "انگلستان جو کچھ امریکہ کو بھیجتا ہے وہ کل انگریزی برآمد کا صرف ایک چھٹا حصہ ہے۔ درانحالیکہ امریکہ جو کچھ انگلستان کو بھیجتا ہے وہ کل اس کی برآمد کا آدھا ہے۔" اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ امریکن لوگ انگلستان کے "قابو میں زیادہ ہیں اور انگریز کم، اگر جنگ وغیرہ کی وجہ سے تجارت منقطع ہو جائے تو انگریزوں کو اس کا ڈر امریکیوں سے کم ہونا چاہیئے۔ اگر آدمی درآمد برآمد کے محض اعداد قیمت پر نظر کرے تو تو مسٹر ہیرکسن کی دلیل خاصی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اگر دونوں جانب کی درآمد اور برآمد کی ماہیت پر نگاہ ڈالے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر ہیرکسن نے یہ دلیل کیوں استعمال کی جس سے تمام تر اس قضیہ کی ضد ثابت ہوتی ہے جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ جو مال انگلستان کو بھیجتا ہے وہ سب کا سب یا اس کا زیادہ حصہ اجناس خام پر مشتمل ہے جس کی قیمت کو انگلستان والے دس گنا کر لیتے ہیں، اور جو ان کے لیئے ناگزیر ہیں اور انہیں دوسرے ممالک سے یا تو مل ہی نہیں سکتے یا کم از کہ اس مقدار میں نہیں مل سکتے، ادھر امریکہ والے جو انگلستان سے لیتے ہیں وہ ایسی اشیاء ہیں جو یا تو وہ خود بھی بنا سکتے ہیں یا دوسری قوموں سے اسی طرح خرید سکتے ہیں۔ اب اگر انقطاع تجارت کے نقصانات پر نظریہ قدر کے نقطۂ نظر سے غور کیجیئے تو نقصان امریکہ کا معلوم ہوتا ہے اور اگر قوائے دولت آفرینی کے نظریہ کو پیش نظر رکھیئے تو اس سے انگلستان کو بے حساب نقصان پہنچتا معلوم ہوتا ہے، اس لیئے کہ اگر ایسا ہو تو انگلستان کے دو تہائی روئی کے کارخانے

کام بند کردیں اور لگیں تباہ و برباد ہونے اور انگلستان اس طرح جیسے کسی نے جادہ سے یکایک ایسا کردیا ہو۔ دولت آفرینی کا ایک ایسا ذریعہ کھو بیٹھے جس سے کہ سالانہ آمدنی اپنی قدر کے اعتبار سے اس کی ساری برآمد سے بمراتب زیادہ ہے۔ اس نقصان سے جو نتیجے انگلستان کے امن، دولت، ساکھ، انگلستان کی تجارت اور قوت کے لئے ظاہر ہوں وہ بے حد و حساب ہیں، اور اس کارروائی کے نتائج امریکہ کے لئے کیا ہوتے؟ جب وہ مجبور ہوتا کہ وہ تمام مصنوعات جو پہلے انگلستان سے آتی تھیں خود تیار کرے تو چند سال کے اندر وہ سب کچھ حاصل کرلیتا جو انگلستان والے کھو تے۔ بلاشبہ اس قسم کی کارروائی کا نتیجہ ایک موت و حیات کا معرکہ ہوتا جیسا کہ پہلے انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان قوانین جہازرانی پر ہوا تھا، اور غالباً اس کا نتیجہ بھی ویسا ہی نکلتا جیسا کہ پہلے انگریزی Channel میں نکلا تھا۔ یہاں اس رعایت کے نتائج کی تفصیل کرنا غیر ضروری ہے جس کا کسی نہ کسی وقت پیدا ہونا ہماری رائے میں تقاضائے فطرت معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ کہا گیا وہ ہسکسن صاحب کے دلائل کے عبث ہونے اور اُن کے خطرات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے اور اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انگلستان نے کیسی بے عقلی سے کام کیا کہ اپنے قوانین غلہ کی وجہ سے شمالی امریکہ کے لوگوں کو خود اپنی صنعت قائم کرنے پر مجبور کیا اور یہ کیتنی دانشمندی ہوتی اگر مسٹر ہسکسن بجائے اس کے کہ عبث اور خطرناک دلائل سے کھیلیں خود ان اسباب کو ہٹانے کی کوشش فرماتے جن کی وجہ سے ۱۸۲۸ء والا امریکی قانون محاصل وجود میں آیا تھا۔

امریکیوں کو جتلانے کے لئے کہ انگلستان سے تجارت کس قدر مفید ہے مسٹر ہسکسن

نے انگلستان میں روئی کی درآمد کی غیر معمولی ترقی کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن امریکہ والے اس دلیل کی حقیقت سے بھی واقف ہیں۔ کوئی دس برس سے زیادہ زمانہ سے امریکہ میں روئی کی پیداوار اس کے صرف اور مانگ کے مقابلہ میں سال بہ سال اس تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ جس نسبت سے روئی کی برآمد بڑھی اسی نسبت سے قیمتیں گھٹیں، چنانچہ ۱۸۱۶ء میں ۲۰۴ ملین پونڈ روئی کے لئے صرف ۲۵ ملین ڈالر!

آخر میں مسٹر ہس کسن نے امریکہ والوں کو دھمکی دی کہ بڑے پیمانہ پر کینیڈا کی راہ سے چوری چھپے کی تجارت کا انتظام کیا جائیگا۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات میں امریکہ کے نظام تاہین کو کسی اور چیز سے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا جتنا کہ اس ذریعہ سے جس کا ذکر مسٹر ہس کسن نے کیا، لیکن اس کا نتیجہ؟ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکہ والے اپنے اس نظام کو برطانوی پارلیمنٹ کے قدموں میں ڈال دیں گے اور عاجزی سے انتظار کیا کریں گے کہ سال بہ سال یہ پارلیمنٹ ان کی قومی صنعت کے متعلق کیا ارشاد فرماتی ہے؟ یہ بھی کیسی حماقت کی بات ہے! نہیں، اس کا نتیجہ بس یہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ والے کینیڈا کو لے لیں اور اسے اپنے اتحاد میں شامل کر لیں یا اسے خود مختار ہونے میں مدد دیں۔ یہ پیمانۂ حماقت کو لبوں تک بھرنا نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک قوم جسے صنعتی اور تجارتی اقتدار حاصل ہے ایک ایسی زرعی قوم کو جو اس سے نسل، زبان، اور اغراض کے قریبی رشتوں سے بندھی ہوئی ہے پہلے تو اس پر مجبور کرتی ہے کہ خود ایک صنعتی قوم بنے اور جب وہ اس جبری محرک عمل پر کاربند ہوتی ہے تو اسے اس

سے روکنے کے لئے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ خود ان کی نوآبادیوں کو آزاد ہونے میں مدد دے؟

ہسکسن کے انتقال کے بعد انگلستان کے تجارتی معاملات کی باگ مسٹر پولٹ ٹامس کے ہاتھ میں آئی جس طرح یہ عہدہ میں اپنے ممتاز پیش رو کے جانشین تھے اسی طرح اپنی تدبیر سیاسی میں بھی ان کے متبع تھے، لیکن جہاں تک شمالی امریکہ کا تعلق ہے انہیں کچھ کرنا ہی نہ تھا اس لئے کہ اس ملک میں انگریزوں کی خاص کوشش کے بغیر خود وہاں کے کپاس بونے والوں، باہر سے مال منگانے والوں اور جمہوری (Democratic) جماعت سیاسی کی مدد سے ۱۸۳۲ء کے کمپرومائز بل کی رُو سے سابقہ قانون محاصل میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ اس نئے قانون کی رُو سے ہر چند سابقہ قانون کی زیادتیوں اور غلطیوں کی اصلاح کر دی گئی تھی اور جہاں تک روئی اور اون کے موٹے کپڑے کا تعلق ہے اب بھی اس سے امریکی کارخانوں کو خاصی تامین حاصل تھی لیکن اس سے انگریزوں کو وہ سب رعائتیں دے دی تھیں جن کی وہ خواہش کر سکتے تھے اور لطف یہ کہ بغیر اس کے کہ انگلستان کو ان کے عوض کوئی رعایت بھی کرنی پڑی ہو۔ اس قانون کے بعد سے امریکہ کو انگلستان کی برآمد بے حساب بڑھ گئی ہے اور شمالی امریکہ کے مال کی جو درآمد ان کے یہاں ہے اس سے کہیں زیادہ ہے، چنانچہ اب ہر وقت انگلستان کی قدرت میں یہ بات ہے کہ امریکہ میں جو قیمتی دھاتیں رائج و دائر ہیں اُن کا جتنا حصہ اپنے لئے مفید سمجھے اپنی طرف کھینچ لے اور جب کبھی یہ خود مالی دشواریوں میں مبتلا ہو تو ریاستہائے

متحدہ میں بھی تجارتی کساد بازاری پیدا کر دے لیکن بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ اس قانون کا پیش کرنے والا ہنری کلے تھا جو امریکی صنعت کا سب سے ممتاز اور صائب الرائے حامی ہے۔ بات یہ ہے کہ ۱۸۲۸ء کے محاصل کے اہل صنعت کو جو خوش حالی نصیب ہوئی اس نے کپاس کی کاشت کرنے والوں میں ایسا رشک اور حسد پیدا کیا کہ انہوں نے ۱۸۲۸ء کے محاصل میں تغیر نہ ہونے کی صورت میں اتحاد سیاسی کو توڑ دینے کی دھمکی دی۔ حکومت متحدہ نے بھی جو ڈیمو کریٹک جماعت کے زیر اثر تھی خالص فرقہ وارانہ اور انتخاب کے مصالح کا خیال کر کے جنوبی کاشتکاروں کی طرفداری کی اور اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والے وسطی اور مغربی ریاستوں کے زراعت پیشہ لوگوں کو بھی اس کا موافق بنا لیا۔ ان موخر الذکر لوگوں کو جو ہمدردی صنعت کے ساتھ تھی وہ اس لئے ختم ہو گئی تھی کہ ان کی پیداوار کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ اس کی وجہ زیادہ تر اندرونی صنعت کی خوشحالی ہی تھی یا وہ نہریں اور ریلیں جو بڑی تعداد میں شروع کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں شاید یہ ڈر بھی ہو کہ جنوبی ریاستیں اپنی مخالفت کو واقعی یہاں تک بڑھائیں گی کہ باہمی جنگ ہو جائے اور اتحاد کا خاتمہ، اس لئے وسطی اور مشرقی ریاستوں کے ڈیمو کریٹک فرقہ کا فائدہ اسی میں تھا کہ جنوبی ریاستوں کے ہم جماعت لوگوں کی ہمدردی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ان باتوں کی وجہ سے رائے عامہ انگلستان کے ساتھ آزاد تجارت کی موافقت میں اس درجہ پلٹ گئی تھی کہ ڈر تھا کہ کہیں ملک کی ساری کی ساری صنعت کو انگلستان کے آزاد

مقابلہ پر قربان نہ کر دیا جائے۔ اِن حالات میں ہنری کلے کا کمپرومائز بل ہی ایک ایسا ذریعہ معلوم ہوا جو تامینی نظام کو کم از کم کسی حد تک تو بچا سکتا تھا۔ اس بل کی رُو سے امریکی صنعت کا ایک حصّہ پردیسی مقابلہ کے سامنے قربان کر دیا گیا (یعنی باریک اور مہنگی چیزوں کی صنعت) تاکہ دوسرے حصہ یعنی موٹے اور کم قیمت مال کی صنعت کو بچا لیا جائے۔

لیکن تمام علامات یہی بتلاتی ہیں کہ امریکہ میں عنقریب ہی تامینی نظام پھر سر اٹھائیگا اور از سرِ نو ترقی پائیگا۔ انگریز لوگ امریکہ میں تجارتی کساد بازاری کو ہلکا اور نرم کرنے کی کتنی ہی کوشش کریں، امریکہ میں اسٹاک خرید کر، قرض دے کر، یا ہجرت کے ذریعہ کتنا ہی سرمایہ انگلستان سے امریکہ جائے، پھر بھی برآمد اور درآمد کی قیمتوں کا باہمی تفاوت عرصہ تک اس طرح برابر نہیں کیا جا سکتا۔ لازم ہے کہ کساد بازاری کے بحران نہایت خوفناک صورت اختیار کریں اور روز بروز ان کی اہمیت بڑھے، اور لازم ہے کہ بالآخر اہلِ امریکہ کو اس مصیبت کی جڑوں کا پتہ چل جائے اور وہ انہیں قطع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں۔

لہذا یہ حالات کی ماہیت کا تقاضا ہے کہ نظام تامینی کے حامیوں کی تعداد پھر بڑھے اور آزاد تجارت کے حامیوں کی پھر گھٹے۔

اس وقت تک جو زرعی پیداوار کی قیمتیں غیر معمولی طور پر چڑھی رہی ہیں تو اس وجہ سے کہ صنعتی کارخانے پہلے سے زیادہ خوش حال ہیں، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں

بنی ہیں، کپاس کی پیداوار بڑھنے کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں کی مانگ بڑھ گئی ہے، اور کچھ اس وجہ سے کہ فصلیں خراب رہی ہیں، لیکن یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ چند سال میں قیمتیں اوسط سے اتنی ہی نیچے رہیں گی جتنی کہ اب تک اوپر رہی ہیں۔ امریکی سرمایہ میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے اس کا بڑا حصہ اس کلیر ومائز بل کے منظور ہونے کے بعد سے زراعت میں لگایا گیا ہے اور اس نے ابھی دولت آفرینی کا کام شروع ہی کیا ہے؛ اس طرح ایک طرف تو زراعتی پیدائش دولت غیرمعمولی طور پر بڑھ گئی ہے اور دوسری طرف مانگ میں غیرمعمولی کمی لازمی ہے، اوّل تو اس وجہ سے کہ امور عامہ میں اس پہلے پیمانہ پر کام نہیں ہو رہا ہے دوسرے خارجی مقابلہ کی وجہ سے صنعتی آبادی میں اب معتد بہ اضافہ ممکن نہیں، تیسرے چونکہ کپاس کی پیداوار مانگ سے اتنی زیادہ آگے بڑھ گئی ہے کہ کپاس کی مندھی قیمت کی وجہ سے کپاس کی کاشت کرنے والے ان کھانے پینے کی چیزوں کو خود پیدا کرنے پر مجبور ہونگے جو وہ اب تک وسطی اور مغربی ریاستوں سے لیا کرتے تھے، اور اگر ان پر مستزاد فصلیں بھی اچھی ہو گئیں تو وسطی اور مغربی ریاستیں پھر اسی طرح زیادتی پیداوار کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گی جیسے کہ ۱۸۲۸ء کے محاصل سے پہلے مبتلا تھیں اور ظاہر ہے اگر اسباب وہ ہونگے تو نتائج بھی وہی نکلیں گے، یعنی وسطی اور مغربی ریاستوں کے زراعت والے لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ صرف ملک کی صنعتی آبادی کو بڑھا کر ہی زرعی پیداوار کی مانگ کو بڑھایا جا سکتا ہے اور یہ اضافہ صرف انتظام آئینی

کی توسیع ہی سے ممکن ہے۔ اس طور پر تاجروں کے حامیوں کی تعداد اور اثر روز بروز بڑھیگا اور اسی نسبت سے مخالف جماعت کا کم ہوگا اور تبدیل شدہ حالات میں کپاس کی کاشت کرنے والے لازمی طور پر سمجھ لیں گے کہ ملک کی صنعتی آبادی میں اضافہ اور زرعی پیداوار اور اجناس خام کی مانگ میں زیادتی دونوں میں خود ان کا مفاد پنہاں ہے۔

ہاں، تو جیسا کہ ہم نے ظاہر کیا ہے کپاس کی کاشت کرنے والے اور ڈیموکریٹک جماعت کے لوگ خود اپنے طور پر شمالی امریکہ میں نہایت انہماک سے انگلستان کے تجارتی اغراض کی موافقت میں کارفرما تھے اس لئے مسٹر پولیٹ ٹامسن کو اس طرف توسیاست تجارتی میں اپنا ہنر دکھانے کا کوئی موقع نہ تھا، البتہ فرانس میں صورت ذرا دوسری تھی، یہاں لوگ اب بھی سختی سے اس نظام امتناعی کو پکڑے ہوئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بہت سے نظریات کے دلدادہ عہدہ دار اور نمائندے انگلستان اور فرانس کے درمیان تجارتی تعلقات کو وسعت دینے کے حامی تھے، اُدھر انگلستان کے ساتھ جو سیاسی اتحاد تھا اس نے اس خیال کو ذرا عام پسند بھی بنا دیا تھا لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع پر لوگ باہم متفق نہ تھے، نہ کسی طرف خیالات میں وضاحت تھی، سمجھ میں آنے کی اور ناقابل تردید بات تھی کہ پردیس سے جو کھانے پینے کی چیزیں اور خام اجناس آتی تھیں ان پر محصول کی زیادتی اور انگریزی کوئلہ اور کچے لوہے کی درآمد کی بندش کا اثر فرانسیسی صنعت پر بہت بُرا پڑ رہا ہے اور اگر

شراب، برانڈی اور ریشمی سامان کی برآمد بڑھ جائے تو فرانس کے لئے بڑے فائدے کی بات ہو۔ اس کے آگے بس لوگ امتناعی نظام کی خرابیوں پر عام خطیبانہ بیانوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے؛ اس نظام کے مخصوص حصوں پر حملہ کرنا اس وقت کم از کم مقتضائے مصلحت نہ تھا اس لئے کہ جولائی والی حکومت کے سب سے بڑے حامی و مددگار مالدار سرمایہ داروں میں تھے جن کا بڑے کارخانوں میں بہت کچھ حصہ تھا۔

ان حالات میں مسٹر پولیٹ ٹامسن نے ایک ایسا نقشہ کار بنایا جو ان کی وقت نظر اور سیاسی ہوشمندی کی روشن دلیل ہے انہوں نے ایک ایسے آدمی کو فرانس بھیجا جو تجارت اور صنعت سے اور فرانس کی سیاست تجارتی سے خوب واقف تھا، اپنے خیالات کی وسعت کے لئے مشہور تھا، یعنی مشہور عالم اور اہل قلم ڈاکٹر بورنگ کو، انہوں نے سارے ملک کا اور اس کے بعد سوستان کا بھی سفر کیا اور موقع پر وہ مواد جمع کیا جس سے امتناعی نظام کی مخالفت اور آزاد تجارت کی موافقت میں دلائل دیئے جا سکیں۔ ڈاکٹر بورنگ نے اس کام کو اس قابلیت اور ہوشیاری سے انجام دیا جو اُن کا حصہ ہے، انہوں نے خاص طور پر ان مفصلہ بالا فوائد پر روشنی ڈالی جو دونوں ملکوں میں کوئلہ اور کچے لوہے اور شراب اور برانڈی کے آزاد مبادلہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جو رپورٹ عام طور پر شائع کی ہے اس میں تو ان کے دلائل زیادہ تر انہیں چیزوں تک محدود ہیں، صنعت کی باقی شاخوں کے متعلق انہوں نے صرف اعداد دے دیئے ہیں، نہ کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے نہ کوئی مشورہ دیا ہے کہ انگلستان کے ساتھ آزاد مبادلہ سے ان میں کیونکر اضافہ ہو سکے گا۔

یوں گویا ڈاکٹر بورنگ نے پوری طرح ان ہدایات کی پیروی کی ہے جو مسٹر پولیٹ ٹامسن نے نہایت ہنرمندی اور چالاکی کے ساتھ تیار کرکے انہیں دی تھیں اور جو ان کی رپورٹ کے شروع میں شائع کی گئی ہیں۔ ان ہدایات میں مسٹر پولیٹ ٹامسن نے ایسے اصول پیش کئے ہیں جو انتہائی فراخدلی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ فرانس کے صنعتی اغراض کا خاص خیال فرما کر وہ ظاہر کرتے ہیں کہ فرانس کے ساتھ اس گفت و شنید سے کوئی مہتم بالشان نتیجہ نکلنا تو قرینِ قیاس نہیں، یہ ہدایت اس لئے مناسب تھی کہ فرانس کے روئی اور اون کا مال بنانے والوں کو انگلستان کے ارادوں کی طرف سے مطمئن کر دیا جائے۔ مسٹر ٹامسن کے نزدیک ان کے متعلق مراعات طلب کرنا تو حماقت ہوگی، البتہ وہ ایک اشارہ دیتے ہیں کہ "کم اہمیت رکھنے والی" چیزوں کے سلسلہ میں شاید یہ مقصد زیادہ آسانی سے حاصل ہو سکے، ہدایات میں ان "کم اہمیت رکھنے والی" چیزوں کا نام تو نہیں ہے لیکن فرانس کو بعد کے تجربہ نے خوب روشن کر دیا ہے کہ ان سے کیا مراد تھی۔ ان ہدایات کی ترتیب کے وقت انگلستان سے فرانس کو سن کے تار اور سن کے کپڑے کی برآمد "کم اہم" تھی۔

انگریزی حکومت اور اس کے وکلاء کی تجویزوں اور تشریحوں سے متاثر ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ اس سے انگلستان کو ایک غیر اہم رعایت دی جاتی ہے جو آخر میں خود فرانس کے لئے مفید ثابت ہوگی، فرانسیسی حکومت نے سن کے تار اور سن کے کپڑے پر محصول کو کم کر دیا اور اس طرح کم کیا کہ انگریزوں نے اس صنعت میں جو ترقیاں کر لی تھیں ان کے پیش نظر ان محاصل سے فرانسیسی صنعت کو کوئی امان حاصل نہ رہی۔ چنانچہ بعد کے سالوں میں انگلستان سے فرانس کو

اس چیز کی برآمد بے حساب بڑھ گئی (۱۸۳۸ء میں ۲۳ ملین فرانک سالانہ) اور انگلستان کو اس طرح جو سہولت حاصل ہوئی اس سے فرانس کی کروڑوں قیمت کی سنی کی صنعت کے ہاتھ سے نکل جانے اور اس کی زراعت اور ساری زرعی آبادی کی خوش حالی کو سخت نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اگر فرانس پھر محاصل بڑھا کر انگریزی مقابلہ کو روکنے کی تدبیر نہ نکال لیتا۔

روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ فرانس نے مسٹر پولٹ ٹامسن سے دھوکہ کھایا۔ ظاہر ہے کہ انہیں ۱۸۳۴ء ہی میں معلوم تھا کہ جو نئے اختراعات ہوئے ہیں ان کی وجہ سے آئندہ سالوں میں انگلستان کی سنی کی صنعت کیسی ترقی کرے گی؛ اور اس کارروائی میں انہوں نے خوب سمجھ لیا تھا کہ فرانسیسی حکومت ان اختراعات اور ان کے لازمی نتائج سے بے خبر ہے۔ آج سنی پر محصول کم کرنے کے حامی دنیا کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس کا صرف مقصد یہ تھا کہ بلجیم کی سنی کی صنعت کے لئے ایک رعایت کر دی جائے، لیکن کیا اس سے اس لاعلمی کی تلافی ہوتی ہے جو انگلستان کی ترقیوں سے بے خبری اور اس کے لازمی نتائج کو پہلے سے سمجھنے میں ان سے ظاہر ہوئی ؟

خیر، یہ جو کچھ ہو، اتنی بات صاف اور مسلّم ہے کہ فرانس کو لازمی طور پر اپنے کو از سرِ نو پناہ دینی چاہیئے ورنہ اسے اس کا خمیازہ یہ اٹھانا پڑیگا کہ اس کی سنی کی صنعت کا بہت بڑا حصہ انگلستان کے ہاتھ میں پہنچ جائیگا، اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ زمانہ جدید میں فرانس اور انگلستان کے درمیان آزادی تجارت کو وسعت دینے کی یہ پہلی کوشش انگریزی چالاکی اور فرانسیسی

تا تجربہ کاری کی امٹ یادگار رہے، ایک نیا معاہدہ میتھوین ہے، ایک دوسرا معاہدہ ایڈن!

لیکن جب مسٹر پولٹ ٹامسن نے دیکھا کہ فرانسیسی سوتی کا کپڑا بنانے والے شاکی ہیں اور فرانسیسی حکومت اپنی غلطی کی تلافی کرنے پر مائل ہے تو انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے بھی وہی کیا جو ان سے پہلے مسٹر ہسکسن نے کیا تھا۔ انھوں نے دھمکی دی، دھمکی یہ کہ ہم فرانسیسی شراب اور ریشمی سامان کی درآمد بالکل بند کر دیں گے۔ یہ ہے انگلستان کی عالم دوستی! فرانس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ایک ایسی ہزار برس پرانی صنعت کو تباہ ہونے دے جو اس کے غریب طبقوں کی خصوصاً زراعتی طبقوں کی ساری معیشت سے نہایت قریب کا تعلق رکھتی ہے، جس کی پیداوار ہر طبقہ کی اولین ضروریات زندگی میں شمار کی جا سکتی ہے، جس کی پیداوار کی کل قیمت ۲۰ یا ۳۰ ملین تک ہوگی۔ اس لئے کہ اس سے یہ رعایت خریدی جا سکتی ہے کہ انگلستان کے پہلے کے مقابلہ میں اور چند ملین قیمت کی شراب اور ریشمی سامان بیچا جا سکے۔ قدر اشیاء میں اس تفاوت سے قطع نظر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اگر جنگ کی وجہ سے دونوں قوموں کے تجارتی تعلقات ٹوٹ جائیں، یعنی فرانس اپنا فاضل ریشمی سامان اور شراب انگلستان کو نہ بھیج سکے اور اُدھر ساتھ ہی سوتی کے کپڑے جیسی اہم ضرورت زندگی کا قحط برداشت کرنا پڑے تو اس وقت فرانس کی کیا حالت ہوگی؟

اس پر ذرا غور کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ سوتی کے کپڑے کا مسئلہ محض معاشی خوشحالی کا مسئلہ نہیں ہے، جیسا کہ قوم کی قوت صنعتی سے متعلق ہر مسئلہ ہوتا ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ

یہ قوموں کی خود مختاری اور قوت کا سوال ہے۔ اور واقعی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کپڑے کی تیاری کے طریقوں کی تکمیل کے وقت ذہن مخترع کے سامنے یہ مقصد تھا کہ قوموں پر صنعت کی اہمیت زراعت سے اس کا الحاق اور ریاستوں کی خود مختاری اور قوت پر اس کے اثر کو واضح کر دے اور نظریہ رائج کے غلط دلائل کو طشت از بام کر دے۔ سب جانتے ہیں کہ مذہب رائج کا دعویٰ ہے کہ ہر قوم کو دولت آفرینی کی کسی مختلف شاخ میں فضیلت حاصل ہوتی ہے، جو اسے یا تو قدرت کی طرف سے ملتی ہے یا اس کی تعلیم وغیرہ سے اور یہ فرق اگر آزادی تجارت میں برابر ہو جاتا ہے۔ ہم نے کسی پچھلے باب میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ یہ دلیل صرف زراعت پر صادق آتی ہے جہاں دولت آفرینی کا زیادہ تر دارومدار آب و ہوا اور زمین کی قوت دولت آفرینی پر ہے لیکن یہ صنعت پر پوری نہیں اترتی کہ اس کے لئے منطقہ معتدلہ کی تمام قومیں یکساں اہل ہیں بشرطیکہ ان کے پاس اس کے لئے ضروری مادی، ذہنی، معاشرتی اور سیاسی ذرائع موجود ہوں۔ اس کی سب سے بیّن مثال خود انگلستان ہے۔ اگر ابھی بھی قومیں اپنے سابقہ تجربوں اور کوششوں اور اپنے قدرتی وسائل کی وجہ سے سوتی کپڑے کی صنعت کے لئے اوروں سے زیادہ اہل ہو سکتی ہیں تو اس کے لئے جرمن، بلجیم والے، ولندیزی اور شمالی فرانس کے باشندے اہل ہیں۔ ایک ہزار سال سے ان میں یہ صنعت موجود ہے۔ برخلاف اس کے انگریزوں نے پچھلی صدی کے وسط تک اس قدر کم ترقی کی تھی کہ انہیں سوتی کپڑے کی جو ضرورت ہوتی تھی اس کا بیشتر حصہ یہ وہیں سے منگاتے تھے۔ اگر وہ اس زمانہ میں اس صنعت کے لئے تاہینی محاصل نہ لگاتے تو خود اپنی ہی منڈی اور خود اپنی نوآبادیوں تک کے لئے خود ساختہ کپڑا فراہم

کرنا ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ یہ تو سب کے علم کی بات ہے کہ لارڈ کاسل ری اور لارڈ لیورپول نے پارلیمنٹ میں ثابت کیا تھا کہ تا مبنی محصول بغیر انگلستان کے سوتی کا کپڑا بنانے والے جرمنوں سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی اختراع کی وجہ سے ڈر ہے کہ تمام یورپ میں انگریز سوتی کے کپڑے کی صنعت کے اجارہ دار بن جائیں گے، ہرچند کہ سو سال پہلے وہ تمام یورپ میں اس کے سب سے بڑے بنانے والے تھے، بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ پچاس سال سے ہندوستان کی کپاس کی منڈی کے اجارہ دار ہیں حالانکہ سو سال پہلے یہ خود اپنی منڈی تک میں ہندوستانی روئی کا کپڑا بنانے والوں سے آزاد مقابلہ کی تاب نہ لا سکتے تھے۔

فرانس میں اس وقت اس پر بحث ہے کہ زمانہ حال میں انگلستان نے سوتی کپڑے کی صنعت میں ایسی بے پایاں ترقیاں کیونکر کر لیں حالانکہ سب سے پہلے نپولین نے روئی کاتنے کی مشین کی ایجاد پر اتنا بڑا انعام مقرر کیا تھا اور انگریزوں سے فرانسیسی کل بنانے والوں اور صناعوں نے اس طرف توجہ کی تھی۔ تحقیقات ہوتی ہے اس کی کہ انگریزوں میں زیادہ میکانکی صلاحیت ہے یا فرانسیسیوں میں؟ ہر قسم کی توضیحات پیش کی جاتی ہیں نہیں پیش کی جاتی تو بس وہی جو فطری اور صحیح تشریح ہے۔ یہ تو حماقت ہے کہ انگریزوں میں جرمنوں یا فرانسیسیوں سے زیادہ ہنرمندی یا صلاحیت تسلیم کی جائے، ایڈورڈ سوم سے پہلے سارے یورپ میں انگریز سب سے زیادہ خالی دھونس جمانے والے اور ناکارہ لوگ تھے، اس وقت انہیں کبھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ میکانکی صلاحیت یا ہنرمندی میں اٹلی یا بلجیم

والوں یا جرمنوں سے مقابلہ کریں، لیکن اس وقت سے ان کی حکومت نے انہیں تعلیم دینا شروع کی اور یہ رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچے کہ اب خود استادوں کی صنعتی صلاحیتوں سے انکار کر سکتے ہیں۔ انگریزوں نے سوتی کپڑا بنانے کی مشینوں میں پچھلے بیس برس کے اندر اگر دوسری قوموں اور خصوصاً فرانسیسیوں سے تیز ترقی کی ہے تو اس کی وجہ بس یہ ہے کہ:۔ (۱) وہ چرخ ثقیل میں یوں بھی ان سے آگے تھے (۲) خصوصاً سوتی تار کاتنے اور بننے سے قریب کا تعلق رکھنے والے فن یعنے روئی کاتنے اور بننے میں وہ ان سے آگے تھے، (۳) اپنی سابقہ سیاست تجارتی کی وجہ سے ان کے پاس فرانسیسیوں سے زیادہ سرمایہ تھا، (۴) سیاست تجارتی کے باعث سوتی کپڑے کے لئے ان کی اپنی منڈی فرانسیسی منڈی سے زیادہ وسیع ہے اور آخر میں (۵) یہ بات ہے، کہ مذکرہ بالا حالات کے ساتھ ساتھ ان کے تاجرانی محاصل نے ملک کی میکانکی صلاحیت کے لئے قوی تر محرک اور صنعت کی اس شاخ کی تکمیل میں مصروف ہو جانے کے لئے زیادہ وسائل فراہم کر دیئے تھے۔

ہم نے کسی اور جگہ یہ اصول پیش کئے ہیں اور ان پر بحث کی ہے کہ صنعت کی تمام شاخوں میں نہایت قریب کا تعلق باہمی ہوتا ہے، ایک شاخ کی تکمیل سے تمام دوسری شاخوں میں ترقی اور تکمیل کی تیاری ہوتی ہے، کسی شاخ کی طرف سے غفلت نہیں کی جا سکتی بلا اس کے کہ سب پر اس کا اثر پڑے، مختصراً یہ کہ کسی قوم کی مجموعی قوت صنعتی ایک ناقابلِ تقسیم کل ہے۔ چنانچہ سوتی کپڑے کی

صنعت میں اپنی جدید ترین ترقیوں سے انگریزوں نے ان اصولوں کی صحت کی ایک نمایاں مثال پیش کر دی ہے۔

باب (۳۴)

جزائری تفوق اور جرمن اتحادِ تجارتی

اس زمانہ میں ایک بڑی قوم بغیر قومی سیاست تجارتی کے کیا ہوتی ہے، اور قومی سیاست تجارتی سے کیا بن سکتی ہے اس کا تجربہ جرمنی نے پچھلے بیس برس میں خود اپنے اوپر کر لیا ہے۔ اس ملک کا حال بس وہ تھا جو فرینکلن نے ریاست نیوجرسی کے متعلق ایک مرتبہ کہا تھا یعنے ایک "پیپا جس میں سوراخ کر کر کے ہمسایوں نے جو کچھ اس کے اندر تھا سب کھینچ لیا ہو"۔ چنانچہ انگلستان اسی پر قانع نہ تھا کہ اس نے جرمنی کے کارخانوں کا بڑا حصہ برباد کر دیا ہے اور اب اون اور روئی کے سامان اور نوآبادیاتی پیداوار کی بے حساب مقداریں وہاں بھیجتا ہے، بلکہ وہ اپنی سرحدوں سے جرمن غلہ اور لکڑی بسا اوقات جرمن اون تک لوٹا دیتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ انگلستان جرمنی میں اپنی صنعتی پیداوار کا اس سے دہ چند بیچتا تھا جتنا کہ خود اپنی سلطنت ہند میں جس کی اتنی تعریف و توصیف ہے۔ اور پھر بھی یہ ہر چیز پر قابض جزیرہ والے غریب جرمنوں کے لیے وہ حق تک روا نہ رکھتے تھے جو اپنے محکوم ہندوؤں تک کو بھی دے رکھا تھا یعنی

صنعتی پیداوار کی قیمت زرعی پیداوار کی شکل میں ادا کر سکنے کا حق۔ جرمنوں نے اپنے کو برطانیوں کے سامنے ذلیل کیا، ان کا پانی بھرنے والے اور لکڑیاں چیرنے والے بنے، مگر بے سود۔ ان کے ساتھ اس سے بھی بُرا سلوک کیا گیا جیسا کہ کسی مغلوب قوم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ افراد کی طرح قومیں بھی جب اس بات کو گوارا کر لیتی ہیں کہ کوئی ایک ان کے ساتھ بدسلوکی کرے تو پھر سب انہیں حقیر جاننے لگتے ہیں اور بالآخر وہ بچوں کا کھلونا بن کر رہ جاتی ہیں۔ فرانس بھی اس پر قانع نہ رہا کہ جرمنی میں شراب، تیل، ریشم، ملبوسات کی بے حساب مقداریں بھیجے بلکہ مویشی، غلہ اور کپڑے کی جو برآمد جرمنی سے ہوتی تھی اسے وہ بھی ناگوار ہونے لگی۔ یہی نہیں، ایک چھوٹے سے بحری صوبہ نے جو پہلے جرمن صوبہ تھا اور جس میں جرمن آباد ہیں، جو جرمنی ہی کے ہاتھوں قوی اور مالدار بنا ہے اور ہمیشہ صرف جرمنی سے مل کر اور جرمنی کے وسیلہ ہی سے قائم رہ سکتا ہے، اس نے متواتر نصف قرن تک لفظی کٹ حجتیوں کی آڑ میں جرمنی کے سب سے بڑے دریا کو بند کر رکھا، اور ذلت کا پیالہ لبریز کرنے کے لئے کوئی سو برس سے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ قومیں عام آزادیٔ تجارت ہی کے ذریعہ قوت اور دولت حاصل کر سکتی ہیں!

یہ تھا ہمارا حال، اور اب کیا ہے؟ دس برس کے اندر جرمنی خوشحالی اور صنعت میں، احساسِ قومی اور قوتِ قومی میں ایک صدی آگے پہنچ گیا ہے اور کیونکر؟ یہ بھی اچھا ہوا اور مفید کہ وہ دیواریں گر گئیں جو جرمن کو جرمن سے جدا کرتی تھیں، لیکن

اس سے قوم کو کچھ بہت چین نہ ملتا اگر اس کی صنعت برابر پردیسی مقابلہ کے لئے کھلی ہوتی؛ اتحاد محاصلی نے محصول لگا کر عام استعمال کی صنعتی چیزوں کی جو تامین کر دی سچ پوچھو تو یہ اسی کا کرشمہ تھا۔

ہم کھلے طور پر اقرار کرتے ہیں۔ اور ڈاکٹر بورنگ نے ناقابلِ تردید طور پر واضح کر دیا ہے[1]۔ کہ اتحاد کی طرف سے جو محاصل لگائے گئے ہیں، وہ جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا تھا محض آمدنی کے لئے نہیں ہیں اور جیسا کہ ہس کسن کا خیال تھا۔ اسے ۱۵ فی صدی تک نہیں ہیں، بلکہ صاف بات یہ ہے کہ عام استعمال کی صنعتی چیزوں پر ۲۰ سے ۶۰ فی صدی تک کے تامینی محاصل ہیں۔

لیکن ان تامینی محاصل کا اثر کیا ہوا ہے؟ کیا ان چیزوں کے استعمال کرنے والے جرمن مصنوعات کے لئے اس سے ۲۰ تا ۶۰ فی صدی زیادہ ادا کر رہے ہیں جتنا کہ پردیسی چیزوں کے لئے ادا کرتے تھے؟ اور جیسا کہ نظریۂ رائج کے بموجب ہونا چاہیئے یا یہ مال پردیسی مال سے بُرا ہے؟ نہ کہیں۔ خود ڈاکٹر بورنگ نے اس کی تصدیق کی ہے کہ ہماری مامون مصنوعات پردیسی مصنوعات سے بہتر اور ارزاں ہیں۔ اندرونی مقابلہ اور پردیس کے تباہ کن مقابلہ سے تحفظ نے وہ کرشمہ کر دکھایا ہے جس سے مذہب رائج بے خبر ہے اور جس کے متعلق وہ کچھ جاننا ہی نہیں چاہتا۔ الغرض یہ صحیح نہیں ہے، جیسا کہ مذہب رائج کا دعوٰی ہے، کہ محصول تامینی دیسی مصنوعات کو بقدر اس محصول کے

---

[1] رپورٹ بنام لارڈ پامرسٹن بابت جرمن اتحاد محاصلی۔ از جان بورنگ۔ برلن ۱۸۴۰ء

گراں کر دیتا ہے۔ تھوڑے سے عرصہ کے لئے ممکن ہے کہ اس سے گرانی پیدا ہو لیکن ہر اس قوم میں جو صنعت کی اہلیت رکھتی ہے اس تامین کی وجہ سے اندرونی مقابلہ قیمتوں کو اس سے بھی نیچے پہنچا دے گا جہاں وہ آزاد درآمد کی صورت میں ہوتیں۔

ہاں، تو کیا پھر زراعت کو ان ہماری محصولوں سے نقصان پہنچا ہے؟ نہ کہیں۔ زراعت کو تو اتنا فائدہ ہوا ہے، پچھلے دس برس میں دہ چند فائدہ۔ زرعی پیداوار کی مانگ بڑھی ہے، ان کی قیمتیں ہر طرف چڑھی ہیں مشہور بات ہے کہ صرف ملکی کارخانوں کے فروغ کے باعث زمین کی قیمت میں ۵۰ تا ۱۰۰ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے، ہر جگہ بہتر مزدوری دی جا رہی ہے، ہر جانب ذرائع حمل و نقل میں ترقیاں ہو رہی ہیں یا زیر تجویز ہیں۔

ایسے درخشاں نتائج کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ہمیں اس نظام میں ترقی دینے کی ہمت ہو جس پر ہم نے چلنا شروع کیا ہے، اور اتحاد کی بہت سی ریاستوں نے اسے ترقی دینے کی تجویز بھی کی ہے لیکن اسے عمل میں نہیں لا سکی ہیں اس لئے کہ اتحاد کی بعض دوسری ریاستوں کے نزدیک فلاح اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ غلہ اور لکڑی پر سے انگریزی محصول اٹھا لئے جائیں اور کہتے ہیں کہ اس لئے بھی کہ اب بھی بہت سے با اثر لوگ عالمی نظام معیشت پر یقین رکھتے ہیں اور خود اپنے تجربہ کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بورنگ کی رپورٹ سے ان امور پر نیز جرمن اتحاد محاصل اور انگریزی حکومت کی تدابیر پر نہایت اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس لئے ہم اس تحریر پر روشنی ڈالنے کی

کوشش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں وہ نقطہ نظر بتلا دینا چاہئیے جس سے یہ رپورٹ لکھی گئی ہے۔ میلبورن کی وزارت میں مسٹر لاؤ بیشیر نے، جو محکمۂ تجارت کے صدر تھے، ڈاکٹر بورنگ کو جرمنی اسی نیت سے بھیجا تھا جس سے مسٹر پولٹ ٹامسن نے ۱۸۳۴ء میں انہیں فرانس روانہ کیا تھا۔ جس طرح فرانسیسیوں کو شراب اور برانڈی کے بارہ میں رعایتیں دے کر حکمہ دیا گیا تھا اسی طرح غلّہ اور لکڑی کے متعلق رعایتیں دے کر جرمنوں کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ اپنی ملکی منڈی کو انگریزی مصنوعات کے لئے کھول دیں۔ صرف ایک اہم فرق یہ تھا کہ فرانس کو جو مراعات دینی تھیں اُن کی انگلستان میں کوئی مخالفت نہ تھی اور جرمنوں کو جو رعایتیں دینی تھیں اُن کے لئے خود انگلستان میں لڑنا تھا۔

اسی لئے ان دونوں رپورٹوں کا میلان بالکل جدا جدا ہونا لازمی تھا۔ انگلستان و فرانس کے تجارتی تعلقات کے متعلق جو رپورٹ تھی وہ تمام و کمال فرانسیسیوں کیلئے لکھی گئی تھی، انہیں بتلانا تھا کہ کالبیر نے اپنی تامینی کارروائیوں سے کوئی قابلِ اطمینان نتائج حاصل نہیں کئے، انہیں یقین دلانا تھا کہ معاہدۂ ایڈن فرانس کے لئے مفید تھا اور ان کا برّاعظمی نظام یا موجودہ امتناعی نظام نہایت درجہ مضر۔ مختصر یہ کہ آدم اسمتھ کے نظریہ کی پوری پوری تائید کی ضرورت تھی، اور تامینی نظام کی کامیابیوں سے سراسر انکار لازم تھا۔

لیکن دوسری رپورٹ میں کام اتنا آسان نہ تھا، کہ اس میں انگریز زمینداروں اور جرمن

حکومت دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتا تھا، ان سے یہ کہتا تھا کہ "دیکھو، وہ ایک قوم ہے جس نے تادیبی کارروائیوں سے صنعت میں بے حساب ترقی کر لی ہے، جس کے پاس اس ترقی کے سب وسائل ہیں اور اس لئے وہ تیزی سے اس طرف قدم اٹھا رہی ہے کہ خود اپنی ملکی منڈی کو قابو میں لے آئے اور پردیسی منڈیوں میں انگلستان سے مقابلہ کرے؛ ایوان خاص کے قدامت پسند اور ایوان عام کے زمیندار اور یہ سب کچھ تمہاری شرارت ہے، یہ سب تمہارے احمقانہ غلہ کے قانون نے کیا ہے؛ اس لئے کہ اس سے جرمنی میں کھانے پینے کی چیزوں اور اجناس خام کی مزدوری کم رہی اور جرمن کارخانوں کو انگریزی کارخانوں کے مقابلہ میں آسانی رہی، ارے بے وقوفو، بس اب جلدی کرو، اور اس قانون کو ختم کر ڈالو، اس طریقہ سے تم جرمن کارخانوں کو دوہری تہری ضرب لگاؤ گے، اول تو یوں کہ جرمنی میں کھانے پینے کی چیزوں اور اجناس خام کی قیمت اور مزدوروں کی اجرت بڑھ جائیگی اور انگلستان میں کم ہو جائیگی؛ دوسرے جرمنی سے انگلستان کو جو غلہ کی برآمد ہوگی اس سے انگریزی مصنوعات کے جرمنی جانے میں مدد ملے گی، تیسرے جرمن اتحاد تجارتی نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی ہے کہ اگر انگلستان جرمن غلہ اور لکڑی کی درآمد پر محصول کم کر دے تو اس نسبت سے وہ معمولی ٹکی اور اون کے مال پر اپنے محصول گھٹا دیں گے، اس طرح ہم برطانوی یقیناً پھر ایک مرتبہ جرمن کارخانوں کو دبانے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن اس میں جلدی کرنا ضروری ہے، سال بہ سال کارخانہ والوں کا اثر اتحاد تجارتی میں بڑھتا جاتا ہے اور اگر تم نے دیر کی تو ممکن ہے کہ تمہارا غلہ کے قانون کو منسوخ کرنا بہت بعد از وقت ہو جائے، پانسہ پلٹنے میں بس اب

زیادہ دیر نہیں لگے گی، کچھ ہی دنوں میں جرمن کارخانے زرعی پیداوار کی مانگ کو اتنا بڑھا دیں گے کہ جرمنی کے پاس پردیس میں بھیجنے کے لیئے غلّہ ہوگا ہی نہیں، اس وقت تم جرمن حکومت کو کونسی رعایتیں دے سکو گے کہ وہ خود اپنے کارخانوں پر ہاتھ ڈالے اور اُنہیں خود اپنے لیئے رُوئی کاتنے سے اور نیز تمہاری پردیسی منڈیوں میں دخل اندازی کرنے سے روکے؟ رپورٹ تیار کرنے والے کے لیئے ضروری تھا کہ وہ یہ سب باتیں پارلیمنٹ کے زمیندار اراکین پر واضح کر دے۔ انگریزی انتظام حکومت میں خفیہ سرکاری رپورٹوں کی گنجائش نہیں ہے، لازم تھا کہ ڈاکٹر لھوبنگ کی رپورٹ عام طور پر شائع ہو اور بالخصوص اور ترجموں کی شکل میں جرمنوں کی نظر سے بھی گزرے، اس لیئے ایسی زبان ہرگز استعمال نہ ہونی چاہیئے تھی جس سے جرمن اپنے حقیقی مفاد سے آگاہ ہو جاتے۔ چنانچہ ہر اس تدبیر کے ساتھ جو پارلیمنٹ پر اثر ڈالنے کے لیئے کی گئی تھی ایک ایسے رد کی ضرورت بھی تھی جو جرمن حکومتوں کے لیئے کام میں آسکے، یعنی یہ بھی جتلانا ضروری تھا کہ نظام تابینی کی وجہ سے بہت سا جرمن سرمایہ غلط جگہوں میں لگ گیا ہے؛ اس نظام تابینی سے جرمنی کے زرعی مفاد کو نقصان پہنچے گا؛ زرعی مفاد اسی میں ہے کہ وہ پردیسی منڈیوں پر اپنی نظر رکھے، اور جرمنی میں تو زراعت ہی سب سے اہم دولت آفریں شغل ہے کہ جرمنی کے تین چوتھائی باشندے زراعت پیشہ ہیں، اور چیزیں بنانے والوں کی تابین کا تو ذکر ہی محض بے معنی لفاظی ہے صنعت کی ترقی تو پردیسی مقابلہ ہی سے ہوتی ہے اور جرمنی کی رائے عامہ تو آزاد تجارت ہی کی حامی ہے، عقل و فراست جرمنی میں اس وجہ سے عام ہے کہ لوگ کسی طرح بھاری

ہماری محاصل کی خواہش نہیں کر سکتے، اور ملک کے سب سے سمجھدار لوگ اس کے حامی ہیں کہ معمولی اُون اور روئی کے مال پر محاصل کم کر دیئے جائیں بشرطیکہ غلّہ اور لکڑی پر انگریزی محاصل میں کمی ہو۔

مختصر یہ کہ اس رپورٹ میں دو بالکل مختلف آوازیں بول رہی ہیں اور سخت مخالفوں کی طرح ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ ان دونوں میں سے سچی آواز کون سی ہے؟ وہ ہے جو پارلیمنٹ کو مخاطب کر رہی ہے یا وہ جس کا روئے سخن جرمن حکومتوں کی طرف ہے؟ اس کا فیصلہ چنداں مشکل نہیں۔ ڈاکٹر بورنگ نے پارلیمنٹ کو غلّہ اور لکڑی کے محاصل کم کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید میں اعداد، حساب و شمار اور شہادتیں پیش کی ہیں اور جرمن حکومتوں کو جو نظامِ تابعین سے ہٹانے کے لئے جو کچھ فرمایا ہے وہ محض سطحی بیانات تک محدود ہے۔

اب ذرا ان دلائل کو تفصیل سے دیکھیں جن سے ڈاکٹر بورنگ پارلیمنٹ پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کی مجوزہ تدبیر سے کام لیکر جرمن نظامِ تابعین کی ترقی کو نہ روکا گیا تو جرمنی میں مصنوعات کی منڈی ہمیشہ ہمیش کے لئے انگلستان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

ڈاکٹر بورنگ فرماتے ہیں کہ جرمن قوم کی امتیازی خصوصیات میں ضبطِ نفس، کفایت شعاری، محنت اور ذہانت، ان میں تعلیم عام ہے، اعلیٰ درجہ کے صنعتی مدارس نے سارے ملک میں حرفہ کی تعلیم پھیلا دی ہے، خصوصاً نقاشی کا فن انگلستان سے کہیں زیادہ ترقی پا چکا ہے، آبادی میں، مویشی اور خصوصاً بھیڑوں کی تعداد میں ہر سال کا

معتدبہ اضافہ ثابت کرتا ہے کہ زراعت کو اس ملک میں کیسی ترقی ہو رہی ہے؛ اراضی کی قیمت میں اضافہ کا ذکر رپورٹ میں نہیں ہے اور نہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کے بڑھنے کا؛ صنعتی اضلاع میں اجرتیں ۳۰ فی صدی بڑھ گئی ہیں؛ ملک میں غیر مستعمل قوت آبی کی فراوانی ہے اور یہ حرکت دینے والی قوتوں میں سب سے سستی قوت ہے؛ کان کنی کو ہر جگہ ایسا فروغ ہے کہ کبھی اس سے پہلے نہ تھا۔ سنہ ۱۸۳۲ سے سنہ ۱۸۳۶ تک

خام روئی کی درآمد	۱۱۹۰۰۰ سنٹنر سے بڑھکر	۲۴۰۰۰۰ سنٹنر ہوگئی ہے
روئی کے تاگے کی درآمد	۱۷۲۰۰۰ " " "	۳۲۲۰۰۰ " " " "
روئی کے تیار مال کی برآمد	۲۶۰۰۰ " " "	۷۵۰۰۰ " " "
پروشیا میں روئی کا کپڑا بننے کے کرگھوں کی تعداد	۲۲۰۰۰ (سنہ ۱۸۲۵) سے " "	۲۲۰۰۰ (سنہ ۱۸۳۴) تک " "
اون کی درآمد	۹۹۰۰۰ سنٹنر " "	۱۴۵۰۰۰ سنٹنر " "
اون کی برآمد	۱۰۰۰۰۰ " " "	۱۲۲۰۰۰ " " "
اونی سامان کی درآمد	۱۵۰۰۰ " " "	۱۹۰۰۰ " " "
اونی سامان کی برآمد	۴۹۰۰۰ " " "	۶۹۰۰۰ " " "

سنی کپڑے کی بنائی کو انگلستان، فرانس اور اٹلی میں بھاری محاصل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس لئے اس میں ترقی نہیں ہے، بلکہ سنی کے تار کی درآمد ۳۰۰۰ سنٹنر (۱۸۳۲) سے بڑھ کر ۸۶۰۰۰ سنٹنر تک پہنچ گئی ہے، زیادہ تر انگریزی مال

کی درآمد سے جس میں اب بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

۱۸۳۱ء میں ۱۲۰۰۰ سنٹنر نیل استعمال ہوا تھا، ۱۸۳۶ء میں ۲۴۰۰۰ سنٹنر، جو جرمن صنعت کی ترقی کا بیّن ثبوت ہے۔ ۱۸۳۲ء کے مقابلہ میں ۱۸۳۶ء میں مٹی کے درآمد دوگنی سے بھی زائد ہو گئی۔

پیتل کے برتنوں کی درآمد ۵۰۰۰ سنٹنر سے گھٹ کر ۲۰۰۰ سنٹنر رہ گئی اور ان کی برآمد ۴۰۰۰ سنٹنر سے ۱۸۰۰۰ سنٹنر کو پہنچ گئی۔

چینی کی درآمد ۴۰۰۰ سنٹنر سے کم ہو کر ۱۰۰۰ سنٹنر پر آ گئی اور برآمد ۷۰۰ سنٹنر سے بڑھ کر ۴۰۰۰ سنٹنر ہو گئی۔

پتھر کا کوئلہ ۱۸۳۲ء میں ۶ ملین ٹن نکلا تھا، ۱۸۳۶ء میں ۹ ملین ٹن۔

۱۸۱۹ء میں سیکسنی میں موزے بننے کی ۴۰۰۰ مشینیں تھیں، ۱۸۳۶ء میں ۲۰۰۰۰۔

۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۷ء تک سیکسنی میں اُون کاتنے کے کارخانوں اور تکلوں کی تعداد دوگنی سے زیادہ ہو گئی، ہر طرف مشین سے چلنے والے کارخانے قائم ہو گئے اور ان میں سے اکثر نہایت اچھی حالت میں ہیں۔

غرض یہ کہ صنعت کی تمام شاخوں میں جن کی تمہید کی گئی تھی بے حساب ترقی ہوئی ہے مخصوصاً عام استعمال کے اُونی اور سوتی سامان کے بنانے میں جن کا انگلستان کا آنا بالکل بند ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر بورنگ بھی ایک قابلِ اعتماد بیان کی بنا پر کہتے ہیں کہ "پرشیا کے بنے ہوئے مال کی قیمت انگریزی مال سے خاصی کم ہوتی ہے، یہ ضرور ہے کہ بعض رنگ بہترین انگریزی رنگوں سے کم

درجہ کے ہوتے ہیں لیکن دوسرے رنگ نہایت عمدہ ہوتے ہیں اور ان سے بازی لیجانا ناممکن ہے، کتائی، بنائی، اور تیاری کے سب طریقے برطانوی طریقوں کے بالکل ہم پلہ ہیں، مال کی صفائی میں بے شک کمی محسوس ہوتی ہے لیکن اس وقت جو کمیاں ہیں وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ غائب ہوتی جائیں گی۔"

یہ سمجھنا تو بہت سہل ہے کہ اس قسم کے بیانات سے بالآخر انگریزی پارلیمنٹ کو غلہ کا قانون منسوخ کرنے پر آمادہ کیا جا سکیگا جس کا اثر جرمنی پر تامینی نظام کا سا پڑتا رہا ہے، لیکن یہ بات تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ اس رپورٹ سے جرمن اتحاد تجارتی کس طرح اس مفید نظام تامینی کو چھوڑ دیگا جس سے اس نے اتنی بے حساب ترقی کر لی ہے۔

ڈاکٹر بورنگ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ جرمنی کی ملکی صنعت کو ملکی زراعت کو نقصان پہنچا پہنچا کر مامون کیا جا رہا ہے، لیکن ہم اسے کیسے یقین کر لیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ زرعی پیداوار کی قیمتیں اجرتیں، لگان، اراضی کی قیمت سب کی سب چڑھ گئی ہیں اور کسانوں کو جو مصنوعات درکار ہوتی ہیں ان کے لئے اسے پہلے سے کچھ زیادہ قیمت بھی ادا نہیں کرنی پڑتی۔

ڈاکٹر بورنگ نے حساب لگا کر یہ بھی بتلایا ہے کہ حساب سے جرمنی میں ایک صناع پیچھے تین زراعت پیشہ آدمی پڑتے ہیں، لیکن اس سے تو وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ابھی تک جرمن اہل صنعت کی تعداد جرمن اہل زراعت کی تعداد کے ساتھ صحیح نسبت نہیں رکھتی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں صحیح تناسب پیدا کرنے کی اس کے علاوہ اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ ان مصنوعات کو بھی مامون کیا جائے جنہیں آج تک جرمن منڈی کے لئے انگلستان میں ایسے آدمی تیار کرتے ہیں جو

جرمن زرعی پیداوار صرف ہیں نہیں لاتے بلکہ انگریزی۔

ڈاکٹر لورنگ ٹھیک فرماتے ہیں کہ اگر جرمن زراعت اپنی پیداوار کی نکاسی بڑھانا چاہتی ہے تو اسے پردیس پر نظر رکھنی چاہیئے، لیکن یہ بینی کہ زرعی پیداوار کی مانگ کس اندرونی صنعت کے فروغ سے بڑھتی ہے صرف انگلستان کے تجربہ ہی سے نہیں ملتا بلکہ خود ڈاکٹر لورنگ نے اسے چپ چپاتے تسلیم کر لیا ہے، جہاں وہ اپنی رپورٹ میں یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر انگلستان نے غلّہ کے قانون کی منسوخی میں ذرا اور دیر کی تو جرمنی کے پاس نہ فاضل غلّہ ہوگا نہ فاضل لکڑی کہ اسے پردیس میں بیچے۔

بلاشبہ ڈاکٹر لورنگ کا یہ دعوے بالکل صحیح ہے کہ جرمنی میں اب تک زراعتی اغراض ہی کو غلبہ حاصل ہے، لیکن اسی وجہ سے کہ اسے غلبہ حاصل ہے اسے کوشش کرنی چاہیئے (جیسا کہ ہم نے سابقہ ابواب میں ثابت کیا ہے) کہ صنعت کو ابھار کر اپنے اور صنعت کے درمیان توازن پیدا کرے کیونکہ زراعت کی مرفہ الحالی صنعت کے ساتھ توازن پر مبنی ہے نہ کہ غلبہ پر۔

رپورٹ کے مصنّف صاحب سخت غلطی میں مبتلا ہیں جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ خود جرمنی کے صنعتی اغراض کا تقاضا ہے کہ جرمن منڈیوں میں مقابلہ ہو، اس لئے کہ جہاں جرمن اہل صنعت جرمن منڈیوں کو سامان فراہم کرنے کے قابل ہو گئے تو لازمی طور پر اپنے فاضل مال کیلئے دوسرے ملکوں سے مقابلہ پر مجبور ہونگے اور اس مقابلہ میں جب ہی پورے اتر سکینگے کہ ان کا مال سستا ہو، اور سستا مال نظام تامینی کا اصلاً مخالف ہے کہ اس نظام کی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ صنعت والوں کے لئے اونچی قیمتوں کی ضمانت کردے۔ اس دلیل میں اتنے ہی جھوٹ اور اتنی ہی غلطیاں

ہیں جتنے اس میں لفظ ہیں، ڈاکٹر لوہرنگ اس سے تو انکار نہ فرماسکیں گے کہ کارخانہ والا جتنا زیادہ مال بنائے اتنی ہی اپنے مال کی قیمت سستی کرسکتا ہے یعنی جس صنعت کے پاس خود اپنی منڈی پہلے سے موجود ہو وہ پردیس کے لئے اتنا ہی سستا کام کرسکتی ہے، اس کا ثبوت خود ان نقشوں میں مل جائیگا جو انہوں نے جرمن صنعت کی ترقیوں کے متعلق شائع کئے ہیں۔ اس لئے کہ جس نسبت سے جرمن کارخانوں نے اپنی اندرونی منڈی پر قبضہ حاصل کیا ہے اسی نسبت سے ان کی مصنوعات کی برآمد میں اضافہ ہوا ہے، گویا جرمنی کے تازہ ترین تجربہ سے بھی وہی ثابت ہوتا ہے جو انگلستان کے پرانے تجربہ سے کہ مصنوعات کی قیمتوں کا بڑھنا ہرگز تامین کے لازمی نتائج میں سے نہیں ہے۔ اور یوں تو جرمن صنعت ابھی اس سے بہت دُور ہے کہ ساری دیسی منڈی کو مال فراہم کرسکے، وہاں تک پہنچنے کے لئے تو اسے وہ ۱۳۰۰۰ سنٹنر روئی کا سامان، ۱۵۰۰۰ سنٹنر اونی کا سامان، ۵ لاکھ سنٹنر روئی کا تاگا، بٹا ہوا سوت اور سنی کا تار خود بنانا ہوگا جو آج انگلستان سے آتا ہے اور جب یہ اس درجہ کو پہنچ جائیگی تو اِس وقت کے مقابلہ میں کوئی ۵ لاکھ سنٹنر تو خام روئی ہی اور منگایا کرے گی اور اس طرح منطقہ حارہ کے ممالک سے بلا واسطہ تعلق مبادلہ قائم ہوجائیگا اور اس خام مال کی ساری قیمت نہیں تو اس کا بڑا حصہ یہ خود اپنی مصنوعات سے ادا کیا کرے گی۔

رپورٹ کے مصنّف کا یہ خیال کہ جرمنی میں رائے عامہ آزاد تجارت کی موافق ہے محتاج اصلاح ہے۔ اس میں یہ اصلاح ضروری ہے کہ اتحاد تجارتی کے قیام کے بعد سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انگلستان میں "آزاد تجارت" کا اصلی مفہوم کیا ہے، اس لئے کہ جیسا

کہ مصنف صاحب خود فرماتے ہیں "جرمن قوم کے جذبات آرزو اور تخیل کے میدان سے ہٹ کر اپنے حقیقی اور مادی اغراض کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں"۔

رپورٹ کے مصنف بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ ذہانت جرمن قوم میں بہت عام ہے اور یہی وجہ تو ہے کہ جرمنی میں لوگوں نے سنساری خواب دیکھنا چھوڑ دیا ہے، اب لوگ یہاں اپنے دماغ سے سوچتے ہیں، اپنی قوت فیصلہ پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، اپنے تجربہ، اپنی سمجھ پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں، بہ نسبت ان نظری نظاموں کے جن سے ہر تجربہ کی تردید ہوتی ہے۔ وہ اب سمجھنے لگے ہیں کہ برک نے آدم آسمتھ سے تخلیہ میں یہ کیوں کہا تھا کہ کسی قوم پر سنساری نظاموں کے مطابق حکومت نہیں ہوتی بلکہ ان کے مخصوص قومی اغراض کے عام کے مطابق جس کا ڑی تحقیق سے پتہ چلتا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی میں لوگ ان ناصحوں پر مشتبہ نظر ڈالتے ہیں جو اسی منہ سے ٹھنڈی پھونک مارتے ہیں، اسی سے گرم۔ لوگ اپنے صنعتی حریفوں کی پسند اور مشوروں کی صحیح قدر جان گئے ہیں، اور جب کبھی انگریزوں کی طرف سے کوئی تجویز پیش ہوتی ہے تو لوگ ان ضرب المثل تحائف کو یاد کر لیتے ہیں جو ڈنائیڈ نے پیش کیے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہمیں شبہ ہے کہ با اثر جرمن مدبروں نے رپورٹ کے مصنف کو یہ امید دلائی ہو کہ جرمنی اپنے نظام تامینی کو انگلستان کی خاطر اور تھوڑے سے غلہ اور لکڑی کو انگلستان بھیجنے کی حقیر رعایت کے بدلہ میں ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیگا۔ بہر صورت جرمنی کی رائے عامہ ان مدبروں کو اپنے مفکرین میں جگہ دینے میں بہت تامل کرے گی۔ موجودہ جرمنی میں اس

لقب کا مستحق بننے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی عالمی مذہب معاشی کے سطحی فقرے اور دلچسپ زبانی یاد کرلے، وہاں اب مطالبہ یہ ہے کہ مدبر کو قوم کی قوتوں اور ضرورتوں کا علم ہو اور رائج الوقت نظریوں سے قطع نظر وہ ان قوتوں کو نشو ونما دینے اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے لیکن جسے یہی معلوم نہ ہو کہ قومی صنعت کو اس درجہ تک پہنچانے کے لئے جس پر اس وقت جرمن صنعت پہنچ گئی ہے کیسی عظیم الشان مساعی درکار ہوتی ہیں؛ جو شخص اپنے ذہن کی آنکھ سے اس کے مستقبل کی عظمت کا نظارہ نہ کر سکے؛ جو اس اعتماد کو جو جرمن اہل صنعت نے اپنی حکومتوں کی دانشمندی پر کیا ہے اس قدر غلط ثابت کر سکے اور قومی حوصلہ مندی کی روح کو ایسا کاری زخم لگا سکے؛ جو ایک، درجہ اعلیٰ کی صنعتی قوم کے بلند نقطہ نظر اور ایک غلہ اور لکڑی باہر بھیجنے والی قوم کے پست نقطہ نظر میں فرق نہ کر سکے؛ جو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ معمولی حالات میں بھی پردیسی غلہ اور لکڑی کی منڈی کس قدر غیر یقینی چیز ہے؛ اور اس قسم کی رعایتیں کتنی آسانی سے پھر واپس لی جا سکتی ہیں، اور اگر جنگ یا دوسری مخالفانہ کارروائیوں سے اس تجارت میں کھنڈت پڑ جائے تو کیا کیا تکلیفیں ہوتی ہیں؛ اور جو دوسری بڑی ریاستوں کی مثال سے یہ نہ سیکھ سکا ہو کہ قوم کا وجود، اس کی خود مختاری اور اس کی قوت کس طرح خود اپنی ہر طرح سے نشوونما پائی ہوئی قوت صنعتی پر مشروط ہوتی ہے، تو ایسا آدمی تو قوم کی قوتوں اور قوم کی ضرورتوں سے انتہائی بے خبری کا ثبوت دیتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ وہ شخص قومیت اور اتحاد کی اس ذہنیت کا جو ۱۸۱۳ء سے جرمنی میں پیدا ہوئی ہے بہت غلط اندازہ کرتا ہے جو رپورٹ کے مصنف کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ اتحاد تجارتی

کی سیاست پروشیا کے مخصوص اغراض کی پابند ہوگی کہ اتحاد کی دو تہائی آبادی پروشیا کی آبادی ہے، لیکن پروشیا کے اغراض تو چاہتے ہیں کہ انگلستان کو غلّہ اور لکڑی کی برآمد ہوا صنعت میں اس کا جو سرمایہ لگا ہے وہ کچھ بہت نہیں؛ اس لئے پروشیا تو ہر اس نظام کی مخالفت کرے گا جو پردیسی مصنوعات کی درآمد میں رکاوٹ ڈالے اور پروشیا کے تمام محکموں کے افسر اسی خیال کے ہیں۔

مگر پھر رپورٹ کے مصنّف صاحب شروع ہی میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ "جرمن اتحاد تجارتی دراصل اتحاد قومی کے اس خیال کا مجسّمہ ہے جو اس ملک میں بہت پھیلا ہوا ہے، اگر اس اتحاد کی اچھی رہنمائی ہوئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام جرمن اغراض ایک جمعیت میں متحد ہو جائیں گے۔ اس کے فوائد کے تجربہ نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا ہے؛ یہ جرمن اقوام کو ایک قوم بنانے کا پہلا قدم ہے؛ تجارتی مسائل میں مشترک اغراض کے ذریعہ اس نے سیاسی قومیت کی راہ ہموار کر دی ہے؛ اور تنگ نظری کے خیالات، تعصّبات اور عادات کی جگہ جرمن قومیت کا وسیع تر اور قوی تر عنصر پیدا کر دیا ہے"۔ اس نہایت صحیح تمہیدی بیان سے بھلا یہ رائے کیسے مطابقت رکھتی ہے کہ پروشیا قوم کی خودمختاری اور آئندہ عظمت کو اپنے مفروضہ اور بہرحال وقتی اغراض کی ذلیل پاسداری میں قربان کر دے گا؛ اور پروشیا یہ نہ سمجھے گا کہ جرمنی کے عروج و زوال کا انحصار اپنی قومی سیاست تجارتی پر ہے اور پروشیا کا عروج و زوال کل جرمنی کے ساتھ وابستہ ہے؛ اس بیان کے ساتھ کہ پروشیا کے محکموں کے تمام افسر تامینی کے مخالف ہیں یہ واقعہ کیسے مطابق ہوتا ہے کہ معمولی روئی اور اون کے سامان پر بھاری محاصل

کی تجویز پروشیا ہی سے اٹھی تھی؟ ان متضاد باتوں سے اور اس امر سے کہ مصنف نے رپورٹ میں سیکسنی کی صنعت کی حالت اور اس کی ترقیوں کا بیان نہایت درخشاں پیش کیا ہے کہ کیا یہ اندیشہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ پروشیا کے جذبہ رشک کو اکسانے کا خواہاں ہے؟

خیر، یہ تو جو ہو سو ہو، یہ بات البتہ بہت ہی عجیب ہے کہ ڈاکٹر بورنگ محکموں کے افسروں کے نجی بیانات کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ وہ انگلستان کے سیاست دان ہیں، انہیں تو رائے عامہ کی قوت سے واقف ہونا چاہیئے، انہیں تو بہرحال اچھی طرح جاننا چاہیئے، کہ ہمارے زمانہ میں محکمہ کے افسروں کی نجی رائے ان ریاستوں تک میں بہت کم وزن رکھتی ہے جہاں دستوری حکومت بھی نہیں ہے جب کہ وہ رائے عامہ اور خصوصاً قوم کے مادی مفاد کے خلاف ہو اور ایسی رجعت کی حامی ہو جس سے ساری قومیت خطرہ میں پڑ جائے۔ رپورٹ کے مصنف صاحب اسے خود بھی محسوس کرتے ہیں جب وہ (جلد ۱ صفحہ ۹) تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح انگریزی حکومت نے غلہ کے قوانین کی منسوخی کے معاملہ میں دیکھا تھا اسی طرح پروشیا کی حکومت کو بھی اس کا عام تجربہ ہو گیا ہے کہ سرکاری عہدہ داروں کی رائے ہر جگہ عمل میں نہیں آسکتی، اس لئے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اگر جرمن اتحاد تجارتی پہلے سے کوئی رعایت نہ بھی دے تو کیا جرمن غلہ اور لکڑی کو انگریزی منڈیوں میں آنے کی اجازت نہ دے دینی چاہیئے کہ اس سے خود بخود جرمن منڈیوں میں انگریزی مصنوعات کے لئے راستہ صاف ہوتا ہے۔ یہ رائے واقعی صحیح ہے، ڈاکٹر بورنگ کو صاف دکھائی دیتا ہے کہ انگریزی غلہ کے قانون نے جرمن صنعت کو فروغ بخشتا ہے اور

ان قوتوں کے بغیر جرمن صنعت کبھی اتنی مضبوط نہ ہو سکتی لہٰذا غلّہ کے قانون کی منسوخی یہی نہیں
کہ جرمن صنعت کی آئندہ ترقی کو روک دے گی بلکہ اسے پھر بہت پیچھے لا ڈالے گی، بشرطیکہ
جرمنی کے قوانین محاصل اسی حالت میں رہے جس میں اس وقت ہیں۔ افسوس ہے
کہ برطانیوں نے اس دلیل کی صحت کو ۲۰ برس پہلے نہ سمجھ لیا، اب کہ خود انگریزی قوانین
نے جرمن زراعت کو انگریزی صنعت سے جُدا کر دیا ہے اور جرمنی بیس سال تک صنعتی
تکمیل کے شاہراہ پر چل چکا ہے اور اس کے لئے بے حساب قربانیاں کر چکا ہے، اب تو
یہ سیاسی اندھاپن ہوگا اگر انگریزی غلّہ کے قانون کی منسوخی سے جرمن کسی طرح بھی
اس قومی شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے سے رُک جائے۔ نہیں، ہمارا تو پکّا عقیدہ ہے
کہ ایسی صورت میں جرمنی کو اپنے تامینی محاصل اسی نسبت سے بڑھا دینے چاہئیں جس
نسبت سے قانون غلّہ کی منسوخی سے جرمنوں کے مقابلہ میں انگریزی کارخانوں کو فائدہ پہنچے
جرمنی تو ابھی بہت عرصہ تک انگلستان کے مقابلہ میں سوائے اس کے اور کوئی سیاست
نہیں برت سکتا جو ایک ایسی کم ترقی یافتہ صنعتی قوم کو برتنی چاہئے جو پوری قوت کے
ساتھ سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی قوم کی ہمسری کی کوشش کر رہی ہے ہر دوسری
سیاست، ہر دوسری کارروائی، ہیں جرمن قومیت کے لئے خطرہ ہے۔ اگر انگریز دل
کو پردیسی غلّہ یا لکڑی درکار ہے تو وہ خوشی سے جرمنی سے یا اور جہاں سے چاہیں لیں،
لیکن اس وجہ سے جرمنی نہ اپنی موجودہ صنعتی ترقی کی تامین میں کمی کرے گا نہ اس کو آئندہ
ترقی دینے کی کوشش میں۔ اگر اہل برطانیہ جرمن غلّہ اور لکڑی سے کچھ سروکار نہ رکھیں گے

تو اور بھی اچھلے ہیں، جرمنی کی صنعت، اس کی جہازرانی، اس کی تجارت خارجہ اور بھی تیزی سے اُبھریں گی،
اندرون ملک میں حمل و نقل کے ذرائع اور بھی تیزی سے تکمیل کو پہنچیں گے، اور جرمن قومیت اور بھی یقین
کے ساتھ اپنی قدرتی بنیادوں پر قائم ہو جائیگی، ممکن ہے کہ پروشیا اس طریقہ سے اپنے مشرقی صوبوں کے
غلہ اور لکڑی کو اتنی چڑھی ہوئی قیمتوں پر نہ بیچ سکے جتنا کہ انگریزی منڈی کے یکایک کھل جانے کی صورت
میں بیچ سکتا لیکن اندرونی ذرائع حمل و نقل کی تکمیل اور صنعت کی وجہ سے اندرون ملک میں زرعی پیداوار
کی مانگ بڑھنے سے، ان صوبوں کے مال کی بکری خود جرمنی میں خاصی تیزی سے بڑھیگی اور اس
اندرونی بکری سے ان صوبوں کو جو ترقی ہوگی وہ ہمیشہ کیلئے ہوگی، یہ نہ ہوگا جیسا اب تک ہوتا تھا کہ دس
برس مصیبت ہے تو دس برس خوشحالی لیکن ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے پروشیا اس سیاست کے
ذریعہ جرمنی میں ان قدروں سے سوگنی طاقت حاصل کر لیگا جتنی کہ وہ ان بحری صوبوں میں وقتی
طور پر قربان کریگا یا یوں کہنا چاہیئے کہ مستقبل کے لیے بطور قرض لگائے گا۔

صاف ظاہر ہے کہ انگریزی وزارت کا مقصد اس رپورٹ سے یہ ہے کہ جرمنی میں معمولی
اون اور روئی کے مال کا داخلہ ہونے لگے، کچھ تو یوں کہ وزن کے حساب سے جو محصول لگتا ہے
وہ بالکل اُٹھ جائے یا اس میں کچھ تبدیلی ہو جائے، کچھ اس طرح کہ شرح محاصل میں کمی ہو جائے،
کچھ یوں کہ جرمن غلہ اور لکڑی کو انگریزی منڈی میں آنے دیا جائے، ان طریقوں سے جرمن نظام تائیدی
میں پہلی رخنہ اندازی مقصود ہے، جیسا کہ ہم ایک سابقہ باب میں بتلا چکے ہیں، عام استعمال کی یہ
چیزیں ہی اور سب چیزوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں کہ یہی صنعت قومی کے عناصر بنیادی ہیں
اگر مال کی قیمت پر دس فی صدی محصول لگا دیا جائے جیسا کہ بظاہر انگلستان کا منشا معلوم ہوتا

ہے، تو ماں کی نیت کم بنیادنے کی ہو چالیں ہیں ان کی مدد سے جرمن صنعت کا بڑا حصہ انگریزی مقابلہ کی زد میں آجائیگا خصوصاً جب کہ تجارتی کساد بازاری کی وجہ سے کبھی بھی انگریز اہل صنعت اس پر بھی آمادہ ہونگے کہ اپنے ذخیرہ مصنوعات کو جن داموں بھی ہو سکے منڈی میں لا پھینکیں۔ لہٰذا ہمارا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ انگریزی تجاویز کا مقصد تو اس سے کم نہیں معلوم ہوتا کہ سارے کے سارے جرمن نظام تامینی کو تہ و بالا کر کے جرمنی کو پھر ایک انگریزی زرعی نوآبادی کی حیثیت پر لوٹا دیا جائے۔

اسی مقصد کی خاطر تو پروشیا کو جتلایا جاتا ہے کہ اگر غلہ اور لکڑی پر انگریزی محاصل میں کمی ہو جائے تو اسے کتنا فائدہ ہوگا اور یہ کہ صنعت میں اس کا مفاد کس قدر کم ہے اسی غرض سے برانڈی پر محصول کم ہو جانے کی امید بھی پروشیا کو دلائی جاتی ہے اور پھر دوسری ریاستیں بالکل خالی کیوں جائیں اس لئے وعدہ کیا جاتا ہے کہ نیورن برگ کے سامان، بچوں کے کھلونوں، ایوڈی کولون، اور دوسرے سامان پر محصول کی ۵ فی صدی کی کمی کر دی جائے گی، اس سے چھوٹی ریاستیں بھی خوش ہو جائیں گی اور خرچ بھی کچھ زیادہ نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ اس رپورٹ سے جرمن حکومتوں کو یہ یقین دلانا مقصود ہے کہ اگر انگلستان ان کے لئے روئی اور سنی کا تار کاتنے تو اس میں ان کا بہت فائدہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک اتحاد تجارتی کی یہ تدبیر کہ سب سے پہلے چھپائی اور اس کے بعد بنائی کو مدد پہنچائی جائے اور اوسط قسم کے اور بہت باریک تار باہر سے منگائے جائیں بالکل درست تھی؛ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہی تدبیر ہمیشہ کیلئے صحیح ہے اگر قانون محاصل اپنے منشاء اصلی کو پورا کرنا چاہتا ہے تو اسے قومی صنعت کے ساتھ ساتھ ترقی کرنی لازمی ہے۔ اس کا ذکر آچکا ہے کہ قطع نظر اس اہمیت کے جو

کتائی کے کارخانوں کو فی نفسہ حاصل ہے ان سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی وابستہ ہے کہ ان کی وجہ سے منطقہ حارہ کے ممالک سے بلا واسطہ مبادلہ کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس طرح جہازرانی اور برآمد مصنوعات پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے اور مصنوعات کی کسی اور شاخ سے مشین سازی کے کارخانوں کو اتنی مدد نہیں پہنچتی جتنی کہ اس سے۔ اور چونکہ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں نہ قوت آبی کی اتنی کمی ہے نہ سیکھے ہوئے کاریگروں کی، نہ سرمایہ کی ایسی کمی ہے نہ ذہانت کی کہ جرمنی خود اس عظیم الشان اور نفع بخش صنعت کو خود نہ چلا سکے لہذا یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیوں نہ رفتہ رفتہ پہلے ایک نمبر کے تار کی کتائی کو اس طرح مامون کریں پھر دوسرے نمبر کے تار کو کہ ۵ سے ۱۰ سال تک ہمیں اپنی ضرورت کے لائق خود ہی کات لیا کریں۔ غلہ اور لکڑی کی برآمد کے فوائد کو کتنا ہی اونچا آنکھا جائے انہیں ان فوائد سے ذرہ برابر کی بھی نسبت نہیں ہے جو ہمیں کتائی سے لازمی طور پر حاصل ہونگے اور ہمیں تو اس خیال کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ کتائی کی وجہ سے زراعت اور جنگلات کی پیداوار کا جو صرف بڑھے گا اس کا حساب لگانا کہ ناقابل تردید طریق پر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ صنعت کی صرف اس ایک شاخ سے جرمن زمینداروں کو اس سے کہیں زیادہ فائدے حاصل ہونگے جتنے کہ کوئی پردیسی منڈی کبھی انہیں پیش کرے گی یا کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر بورنگ نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اگر اتحاد تجارتی اپنے محاصل درآمد میں معتد بہ کمی پر راضی نہ ہوا تو ہنوور، براونشوائیگ، دونوں میکلن برگ، اولڈن برگ، ہنزا شہر اس جمعیۃ میں شاید ہی شریک ہوں، لیکن اس تدبیر پر، جو انہوں نے پیش کی ہے، فی الحال غور کرنا بھی فضول ہے کہ یہ اس برائی سے کہیں زیادہ مضر ہے جس سے بچانے کے لئے یہ پیش کی گئی ہے، اور جرمنی کے

مستقبل کی خوشحالی پر ہمارا عقیدہ تو ہرگز اتنا کمزور نہیں ہے جتنا کہ رپورٹ کے مصنف کا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ جولائی کا انقلاب اس اتحاد تجارتی کے لئے مفید ثابت ہوا ہے اسی طرح غالباً کوئی آنے والا بڑا عالمی حادثہ ان تمام صنعتی شبہات، وسوسوں کو مٹا دیگا جنھوں نے ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اب تک جرمن قومیت کے وسیع تر مطالبات کو قبول کرنے سے روک رکھا ہے اور مادی اغراض سے قطع نظر قومیت کے لئے اتحاد تجارتی کی جو قدر ہے اور اس سے جرمن حکومتوں کو جو فوائد حاصل ہیں ان کا نہایت عمدہ مظاہرہ تو ابھی حال میں ہو چکا ہے جب کہ فرانس میں دریائے رہائن کو سرحد بنانے کا غلغلہ اُٹھا تھا۔

روز بروز جرمن حکومتوں اور جرمن اقوام کو بخوبی اس امر کو سمجھنا پڑیگا کہ اتحاد قومی ہی وہ چٹان ہے جس پر ان کی خوشحالی، ان کی عزت، ان کی قوت، ان کی موجودہ ہستی اور اس کے تحفظ، اور ان کی آئندہ عظمت کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے، لہذا روز بروز ان چھوٹی چھوٹی ساحلی ریاستوں کی علیحدگی متحدہ ریاستوں ہی کو نہیں بلکہ خود ان کو ایسی شرمناک قومی رسوائی کے مرادف معلوم ہوگی جس سے بہرصورت بچنا چاہیئے اور اگر ذرا روشنی میں نظر کیجیئے تو ان چھوٹی ریاستوں کو اتحاد سے جو مادی فوائد حاصل ہونگے وہ خود اس قربانی سے کہیں زیادہ ہیں جو انہیں کرنی ہوگی جوں جوں جرمنی کی صنعت، اس کا نظام نقل و حمل، اس کی جہازرانی اور اس کی تجارت خارجہ اس طرح فروغ پائیں گی جس طرح کہ وہ وسائل قومی کا لحاظ کرکے دانشمندانہ سیاست تجارتی کی صورت میں فروغ پا سکتی ہیں اور ضرور پائیں گی اسی قدر ان ریاستوں میں یہ آرزو قوی ہوگی کہ ان فوائد میں بلاواسطہ شریک ہوں اور اسی قدر وہ اس بری عادت کو چھوڑتی جائیں گی کہ فلاح و خوشحالی کے لئے

پردیس کا منہ تکیں۔

جہاں تک خاص طور سے ہنز اشہروں کا تعلق ہے سوابرگ کے اقتدار اعلیٰ رکھنے والے حلقۂ کلیسائی کی شاہنشاہانہ ذہنیت خود مختاری ہماری توقعات کو کسی طرح پست نہیں کرسکتی! جیسا کہ خود رپورٹ کے مصنف صاحب شہادت دیتے ہیں، ان شہروں میں ایسے بہتیرے انسان بستے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہامبرگ، بریمن اور لیوبک جرمن قوم کے لئے وہ بن سکتے ہیں اور ضرور بنیں گے جو لندن اور لیورپول انگلستان کے لئے یا نیویارک، بوسٹن اور فلے ڈلفیا امریکہ کے لئے ہیں۔ ان میں بہتیرے ایسے لوگ بستے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اتحاد تجارتی سے ان کی عالمی تجارت کو ایسے فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جو اتحاد کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے نقصان سے کہیں زیادہ ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ جس خوشحالی کے بقا کی کوئی ضمانت نہ ہو وہ محض سراب ہے۔

ان بندرگاہوں کا کونسا باشندہ اپنے جہازوں کے مجموعی وزن کے مسلسل اضافہ پر، اپنے تجارتی تعلقات کی مسلسل توسیع پر، دل سے خوش ہوسکے گا جب وہ یہ سوچے کہ بس دو (Frigates) ہلی گو لینڈ سے آکر دریائے ویزر اور ایلب کے دہانوں میں جم جائیں تو وہ ۲۴ گھنٹہ کے اندر ربع صدی کے اس تمام کام کو برباد کرسکتے ہیں لیکن اتحاد تجارتی تو خود اپنا بیڑا تیار کر کے کچھ دوسری قوموں سے معاہدہ کر کے، ہمیشہ کے لئے ان بندرگاہوں کی خوشحالی اور ترقی کی ضمانت کردیگا، یہ ان کے ماہی گیری کے مرکزوں کو ترقی دیگا، ان کی جہازرانی کیلئے خاص خاص مراعات کریگا، اور کارپرداز قنصل خانوں اور معاہدوں کے ذریعہ دنیا کے تمام ملکوں اور بندرگاہوں میں ان کے تعلقات تجارتی کی حفاظت کریگا اور انہیں بڑھائیگا، انہیں کے وسیلہ سے یہ نئی

نوآبادیاں قائم کریگا اور انہیں کی وساطت سے اپنی نوآبادیات کی تجارت چلائیگا، اس لئے کہ ۳½ کروڑ آبادی کی ریاستوں کی جمعیتہ (کہ تکمیل کے بعد اس اتحاد کی کم از کم اتنے آدمی ہوں گے) جس میں اگر ½ فی صدی سالانہ کا اضافہ ہو تو بہ آسانی دو یا تین لاکھ فاضل آدمی دے سکتی ہے؛ جس کے صوبے ایسے واقف کار اور تعلیم یافتہ آدمیوں سے بھرے پڑے ہیں جن میں دُور دراز ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کی خاص لت ہے، جن کے باشندے ہر جگہ جڑ پکڑ لیتے ہیں اور جہاں بھی ویران زمین کو کاشت میں لانے کا موقع ہوا اپنا گھر بنا لیتے ہیں؛ ایسی جمعیتہ قدرت کی جانب سے اس کام کے لئے مقرر ہے کہ نوآبادیاں قائم کرنے والی اور تمدن پھیلانے والی قوموں کی صف اوّل میں جگہ لے۔

اتحاد تجارتی کو مکمل کرنے کی ضرورت کا احساس جرمنی میں اس درجہ عام ہے کہ رپورٹ کا مصنّف یہ کہے بن نہ رہ سکا کہ "اور ساحل، اور بندرگاہ، اور جہاز رانی، ایک متحدہ جھنڈا، اپنا جنگی اور تجارتی بیڑا یہ اتحاد تجارتی کے حامیوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی آرزوئیں ہیں، البتہ روس کے بڑھتے ہوئے جنگی بیڑے اور ہالینڈ اور ہنزا شہروں کے روز افزوں تجارتی بیڑے کے مقابلہ میں اس اتحاد کے ترقی کرنے کی بہت کم توقع ہے۔" ہاں، ان کے مقابلہ میں بیشک نہیں ہے، لیکن ان کے ساتھ مل کر اور ان کے ذریعہ سے تو ضرور ہے اہر قوت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ حکومت کرنے کے لئے نفاق پیدا کرے، رپورٹ کا مصنّف جب یہ بتا چکا کہ ساحلی ریاستوں کے لئے اتحاد میں شریک ہونا کیوں بے وقوفی ہوگی تو اس کے بعد اب وہ ان بڑے بندرگاہوں کو بھی جرمن جسم قومی سے ہمیشہ کیلئے جُدا کرنا چاہتا ہے، اور الٹونا کے

گوداموں کا ذکر سنانا ہے جو ہامبرگ کے گوداموں کے لئے لازمی طور پر خطرہ کے باعث ہونگے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اتنی بڑی تجارتی سلطنت الٹونا کے گوداموں کو اپنے مقاصد کیلئے کارآمد بنانے کے ذرائع بھی تو نکال سکتی ہے مصنف نے اپنی ذہانت سے جو نتائج اخذ کئے ہیں ہم اُن کے پیچھے نہیں پڑتے ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر ان کو انگلستان پر منطبق کر دیا جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ انگریزی جسم سیاسی سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں لندن اور لیورپول کی تجارتی خوشحالی کو غیر معمولی فروغ ہو جائیگا۔ ان دلیلوں میں جو ذہنیت کارفرما ہے اس کا صاف صاف اظہار راٹرڈم کے انگریزی قنصل کی رپورٹ سے ہوتا ہے مسٹر الگزنڈر فیرپیرا اپنی رپورٹ کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:۔ "برطانیہ عظمیٰ کے تجارتی مفاد کے لیئے از حد ضروری ہے کہ مذکورہ ریاستوں نیز بلجیم کو اس اتحاد محاصلی کی شرکت سے روکنے کے لئے کوئی تدبیر اٹھا نہ رکھی جائے، اس کی وجوہ اس قدر واضح ہیں کہ ان پر بحث کی احتیاج نہیں"۔ ایسا فرمانے پر کوئی مسٹر فیرپیرسے کیوں خفا ہو؟ یا ڈاکٹر لوررنگ سے وہ فرمانے پر جو انہوں نے فرمایا؟ یا انگریزی وزراء سے ان کے فرمودہ کے مطابق عمل کرنے پر؟ وہ تو انگریزی جبلت قومی ان کی زبان سے بولتی اور ان کی وساطت سے عمل کرتی ہے۔ لیکن ان ذرائع سے آئی ہوئی تجاویز سے جرمنی کی فلاح اور بہبود کی توقع کرنا البتہ قومی خوش خصلتی کی مناسب حدود سے تجاوز کرنا ہوگا۔

مذکورہ بالا الفاظ پر مسٹر فیرپیرا یہ اضافہ فرماتے ہیں کہ:۔ "جو کچھ بھی ہو ہالینڈ کو ہمیشہ جنوبی جرمنی اور دیگر ممالک کے درمیان تعلقات کا خاص وسیلہ ماننا پڑیگا۔ ظاہر ہے کہ دیگر ممالک سے مسٹر فیرپیر صرف انگلستان مراد لیتے ہیں، ظاہر ہے وہ فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ اگر انگریزی تفوق

صنعتی کے ہاتھ سے بحر شمالی و مشرقی کے جرمن دروازے بند بھی ہو جائیں تب بھی جنوبی جرمنی کی مصنوعات اور نو آبادیاتی مال کی منڈی پر اپنا تسلط قائم رکھنے کیلئے ہالینڈ کا دروازہ باقی رہیگا لیکن ہم اپنے قومی نقطہ نظر سے یہ کہتے ہیں، اور زور سے کہتے ہیں، کہ ہالینڈ اپنے جغرافی موقع کے لحاظ سے، اپنے تجارتی اور صنعتی حالات کے اعتبار سے، اپنے باشندوں کی نسل اور زبان کے اعتبار سے، ایک جرمن صوبہ ہے، جو انتشار قومی کے زمانہ میں جرمنی سے جدا ہو گیا تھا، اور جس کو پھر اتحاد المانی میں شامل کئے بغیر جرمنی کی مثال اس گھر کی سی ہے جس کا دروازہ کسی غیر کے قبضہ میں ہو۔ ہالینڈ تو اسی طرح جرمنی کا ہے جیسے برٹنی اور نارمنڈی فرانس کے ہیں، اور جب تک ہالینڈ ایک خود مختار سلطنت بننے پر مُصر ہے اس وقت تک جرمنی بھی بس اتنی ہی خود مختاری اور قوت حاصل کر سکتا ہے جتنی فرانس حاصل کر لیتا اگر مذکورہ بالا صوبے انگریزوں کے قبضے میں رہے ہوتے۔ ہالینڈ کی تجارتی قوت کا زوال اس وجہ سے ہے کہ ملک اس قدر غیر اہم ہے۔ اور اپنی نو آبادیوں کی خوشحالی کے باوجود ہالینڈ کو اور زوال ہوگا اس لئے کہ معتدبہ بحری اور بری قوت کی فراہمی کے لئے ملک ضرورت سے زیادہ کمزور ہے اپنی قومیت پر اصرار کے باعث ہالینڈ برابر قرض میں دبتا جائیگا چاہے نو آبادیاں کتنی ہی خوشحال ہوں، اور پھر بھی وہ انگلستان کا دست نگر ہے اور اپنی ظاہری خود مختاری سے بس انگریزی تفوق کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اور یہی وہ پوشیدہ سبب ہے جس کی وجہ سے ویَن کی کانگرس میں انگلستان نے ہالینڈ کی نام نہاد خود مختاری کو از سر نو قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ بالکل یہی حال ہنزا شہروں کا ہے۔ انگلستان کی طرف ہو تو ہالینڈ انگریزی بیڑے کا ایک دُم چھلا ہے، جرمنی میں مل جائے تو وہ

جرمن قوت بحری کا سرمایہ ہو جاتے۔ اپنی موجودہ حالت میں ہالینڈ ہرگز اپنی نوآبادیوں سے اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکتا جتنا کہ جرمن اتحاد کا رکن ہونے کی صورت میں اٹھا سکیگا، اور کچھ نہیں تو اس وجہ سے ہی کہ نوآبادیاں بسانے کے لئے جو عناصر لازمی ہیں یعنے آدمی اور ذہنی قوتیں وہ ان کے اعتبار سے اس قدر کمزور ہے۔ علاوہ بریں ابتک اس نے اپنی نوآبادیوں سے جو کچھ فائدہ واقعی اٹھایا بھی ہے اس کا زیادہ تر مدار جرمن خوش خصلتی پر بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس بات پر تھا کہ جرمن خود اپنے قومی تجارتی مفاد سے ناواقف تھے، اس لئے کہ سب دوسری قومیں تو اپنی نوآبادیاتی مال کی منڈی خود اپنی نوآبادیوں اور اپنی مفتوحہ قوموں کے لئے وقف کر دیتی ہیں اور ہالینڈ کے پاس اس قسم کا جو فاضل مال ہوتا ہے اس کے لئے بس ایک جرمنی منڈی رہ جاتی ہے، جہاں ذرا جرمنوں کو یہ خیال ہوا کہ جو لوگ ہمارے ہاتھ نوآبادیاتی مال بیچتے ہیں انہیں یہ بھی تو چاہیئے کہ ہماری مصنوعات کو اوروں پر ترجیح دے کر خریدیں اسی وقت جرمنوں کو صاف صاف پتہ چل جائیگا کہ ہالینڈ کو اتحاد محاصل میں شرکت کرنے پر تو وہ مجبور کر سکتے ہیں۔ اور یہ اتحاد دونوں قوموں کے لئے از حد فائدہ رساں بھی ثابت ہوگا۔ جرمنی سے ہالینڈ کو وہ ذرائع ملیں گے جن سے وہ صرف اپنی موجودہ نوآبادیوں سے ہی کہیں زیادہ مستفید نہ ہو سکیگا بلکہ اور نوآبادیاں حاصل بھی کر سکیگا اور بسا سکیگا۔ جرمنی، ہالینڈ اور ہنزا شہروں کی جہازرانی کو ترجیح دیگا اور جرمن منڈی میں ہالینڈ کے نوآبادیاتی مال کو خاص مراعات حاصل ہونگی، اس کے مقابلہ میں ہالینڈ اور ہنزا شہر جرمن مصنوعات کی برآمد کو ترجیح دینگے اور اپنے فاضل سرمایہ کو جرمنی کے کارخانوں اور زراعت میں لگانا پسند کرینگے۔

ہالینڈ بحیثیت تجارتی قوت کے اس لئے پستی میں آگیا ہے کہ وہ ایک قوم کا فرد تھا اور

اس نے اپنے کو کل منوانا چاہا ہے اس نے جرمنی کے فوائے دولت آفریں کو دبا کر اور کمزور کر کے اپنا فائدہ ڈھونڈا، بجائے اس کے کہ اپنی عظمت کی بنیاد اندر کے ملکوں کی خوشحالی پر رکھتا کہ ان ہی کے ساتھ ایک ساحلی ریاست کا عروج و زوال وابستہ ہوتا ہے، اس نے جرمنی سے متحد ہونے کی جگہ اس سے الگ ہو کر بڑھنے کا حوصلہ کیا۔ ہاں تو یہ ہالینڈ اپنی بڑی خوشحالی بس جرمن اتحاد تجارت کے ذریعہ اور اس سے نہایت گہرے تعلق کی معرفت ہی دوبارہ حاصل کر سکتا ہے، اسی اتحاد کے ذریعہ ایک اعلیٰ درجہ کی زرعی صنعتی۔ تجارتی قوم کا قیام ممکن ہے۔

ڈاکٹر پیرنگ نے درآمد و برآمد کے نقشوں میں اتحاد تجارتی کو مہنزا شہروں اور ہالینڈ اور بلجیم کے ساتھ یکجا کر دیا ہے اور اس یکجائی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب ملک انگلستان کی صنعت کے کس قدر دست نگر ہیں اور اگر یہ باہم مل جائیں تو اپنی مجموعی قوت دولت آفریں کو کس قدر بے حساب ترقی دے سکتے ہیں۔ ان کا تخمینہ ہے کہ یہ ممالک انگلستان سے سرکاری قیمت کے لحاظ سے ۱۹۸۴۲۱۲۱ پونڈ کی اور خود بنائی ہوئی قیمت کے لحاظ سے ۸۵۵۰۳۴۷ پونڈ کی چیزیں منگاتے ہیں، لیکن برخلاف اس کے ان ممالک سے انگلستان کو صرف ۴۸۰۴۴۹۱ پونڈ کا سامان جاتا ہے جس میں ظاہر ہے کہ جاوا کی کافی اور مکھن اور پنیر وغیرہ کی وہ معتدبہ مقداریں شامل ہیں جو انگلستان ہالینڈ سے خریدتا ہے۔ ان میزانوں میں جلدیں کی جلدیں مضمر ہیں اہم ڈاکٹر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے نقشوں میں سب کو یکجا کر دیا، کاش یہ عنقریب سیاسی اتحاد کا شگون ثابت ہو۔

باب (۳۵)

بر اعظمی سیاست

ہم اپنی دوسری کتاب میں ظاہر کر چکے ہیں کہ معقول سیاست کا سب سے بڑا مقصد قوموں کو قانون انصاف کے ماتحت متحد کر دینا ہے۔ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ کرۂ ارض کی ممتاز قومیں، تمدن، خوشحالی، صنعت، اور قومیت میں جہاں تک ممکن ہو برابر ہو جائیں، اور ان میں باہم جو نفرت اور جھگڑے ہیں وہ ہمدردی اور ہم آہنگی میں مبدل ہو جائیں۔ لیکن اس مسئلہ کا حل بڑی مدت کا کام ہے، اس وقت تو قومیں متعدد اسباب سے ایک دوسرے سے متنفر اور دور دور ہیں۔ ان اسباب میں سب سے اوپر زمین کے جھگڑے ہیں۔ ابھی تک یورپی اقوام میں زمین کی تقسیم مقتضائے فطرت کے مطابق نہیں ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ابھی تک تو نظری حیثیت سے بھی لوگ مطابق فطرت تقسیم اراضی کے اصولوں پر متفق نہیں ہیں بعض تو یہ چاہتے ہیں کہ بلا لحاظ زبان، تجارت یا نسل وغیرہ کے ان کا علاقہ ان کے دار الحکومت کی ضرورتوں کے اعتبار سے قرار پا جائے، یعنی دار الحکومت علاقہ کے بیچ میں ہو اور جہاں تک ہو سکے بیرونی حملوں سے مامون ہو۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ ہے کہ دریاؤں کو سرحد بنایا جائے، دوسروں کا

دعویٰ ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ قرین انصاف ہے، کہ ساحل سمندر، پہاڑ، زبان، اور نسل دریاؤں کی نسبت بہتر سرحد کا کام دے سکتے ہیں لیکن ابھی ایسی قومیں بھی ہیں جن کے قبضہ میں دریاؤں کے وہ دہانے اور سمندر کے وہ سواحل نہیں ہیں جو دنیا سے ان کی تجارت کو ترقی دینے اور ان کی بحری قوت کے فروغ کے لئے لابد ہیں۔

اگر ہر قوم کے پاس وہ علاقہ ہوتا جو اس کی اندرونی ترقی اور اس کی سیاسی، صنعتی اور تجارتی استقلال کے لئے ضروری ہے تو اس وقت ملک فتح کرنا صحیح سیاست کے خلاف ہوتا اس لئے کہ علاقہ کی اس غیر فطری توسیع سے جس قوم کی حق تلفی ہوتی اس میں سخت جذبۂ مخالفت پیدا ہوتا اور قائم رہتا اور اس لئے فاتح قوم کو ایسے صوبوں کے زیر عنان رکھنے میں جو قربانیاں کرنی پڑتیں وہ ان پر قابض ہونے کے فوائد سے کہیں زیادہ ہوتیں لیکن مطابق عقل تقسیم اراضی کا تو فی الحال خیال نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس مسئلہ میں دوسری قسم کے بہت سے اغراض نے پیچیدگی پیدا کر دی ہے مگر ساتھ ہی اس سے بھی چشم پوشی ممکن نہیں کہ علاقوں کی از سر نو تقسیم کو قوموں کی اہم ترین ضرورتوں میں سمجھا جاتا ہے اور اس کی کوشش جائز کوشش ہے، بلکہ اکثر صورتوں میں تو جنگ کو حق بجانب ثابت کرنے کی وجہ ہے۔

قوموں میں نفرت کے دوسرے اسباب فی الحال یہ ہیں: صنعت، تجارت، جہازرانی، بحری قوت اور نو آبادیاں، مقبوضات کے بارہ میں ان کے اغراض کا اختلاف، ان کے درجۂ تمدن کا اختلاف، مذہب اور سیاسی حالات کا اختلاف، پھر ان متعدد اسباب میں حکمران خاندانوں اور قوموں کے اغراض سے اور گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دوسری طرف یہی نفرت کے اسباب ہمدردی کے اسباب بھی ہیں۔ کم طاقت والی قومیں زبردست قوموں کے مقابلہ میں باہم ہمدردی کرتی ہیں، جو خطرہ میں ہوتی ہیں وہ فاتحوں کے خلاف، بّری قوتیں بحری تفوق کے خلاف، صنعت اور تجارت میں کمزور ان کے خلاف جو تجارتی اجارہ داری کے لئے کوشاں ہیں، متمدّن قومیں کم متمدّن اقوام کے خلاف، شاہی حکومتوں والے ملک ان ملکوں کے خلاف ہیں جن میں بالکل یا کم و بیش جمہوری حکومت ہے۔

قومیں اپنے اغراض اور رجحانات کی پیروی آجکل یوں کرتی ہیں کہ اپنے ہم پلّہ اور ہم خیال قوموں سے مخالف اغراض اور رجحانات کے خلاف معاہدے کرتی ہیں، لیکن چونکہ یہ اغراض اور رجحانات مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں اس لئے یہ معاہدے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جو قومیں آج دوست ہیں کل دشمن ہو سکتی ہیں اور اس کے برعکس بھی۔ اس کا انحصار اس بڑی غرض یا اصول پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے متنفّر یا ایک دوسرے کی دوست تھیں۔

سیاست نے تو عرصہ ہوا سمجھ لیا ہے کہ قوموں کا یکساں کرنا اس کا آخری کام ہے، جسے لوگ یورپ میں توازنِ قوت کا قیام کہتے ہیں وہ ہمیشہ سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ کم طاقت والے زیادہ طاقت والوں کی زیادتیوں کو روکنا چاہتے ہیں، لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ سیاست نے اپنے قریبی مقصد کو آخری اور آخری مقصد کو قریبی مقصد سمجھ لیا ہے۔

سیاست کا قریبی کام تو ہر وقت بس یہ ہے کہ اچھی طرح پہچان لے کہ مختلف اغراض میں سے کن میں باہم ائتلاف اور مساوات قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے اور پھر اس کی

کوشش کرے کہ جب تک یہ مساوات قائم نہ ہو جائے باقی سب مسائل ملتوی رہیں اور پس پشت ڈال دیئے جائیں۔

جب یورپ کے خاندانی، شاہی اور امارتی اغراض نے قوت اور تجارت کے تمام خیالات کو بالائے طاق رکھ کر ۱۷۸۹ء کے انقلابی رجحانات کے خلاف اتحاد کیا تو ان کی سیاست بالکل صحیح تھی جب فرانسیسی سلطنت نے فتوحات کے میلان کو انقلاب کے رجحان کی جگہ دی تو اس کی سیاست بھی اسی قدر صحیح تھی۔

نپولین کی خواہش تھی کہ اپنے نظام براعظمی سے براعظم کی ایک متحدہ قوت انگریزی بحری اور تجارتی قوت کے خلاف بنائے، لیکن اس میں کامیاب ہونے کے لئے اسے سب سے پہلے چاہیئے تھا کہ براعظم کی قوتوں کے دل سے یہ خوف مٹا دیتا کہ فرانس انہیں فتح کریگا۔ وہ ناکام رہا اس لئے کہ اُس کے بری تفوق کے نقصانات ان قوموں کے نزدیک انگلستان کے بحری تفوق سے کہیں زیادہ تھے۔

سلطنت فرانس کے زوال کے ساتھ ہی اس بڑے ائتلاف کا مقصد ہی فوت ہو گیا اب براعظم کی قوتوں کو نہ فرانس کے انقلابی رجحان کا ڈر رہا نہ فاتحانہ جنون کا، البتہ انقلاب اور فرانسیسی فتوحات کے خلاف لڑنے جھگڑنے کے دوران میں انگلستان کا پلہ صنعت میں، تجارت میں جہازرانی میں بہت بھاری ہو گیا۔ اب براعظم کی قوتوں کا فائدہ اس میں ہو گیا کہ اس تفوق بحری تجارتی کے خلاف فرانس سے ائتلاف کریں، مگر ہوا یہ کہ مردہ شیر کے ڈر سے براعظم کی قوتوں نے اس زندہ تیندوے کا خیال نہ رکھا جو اس وقت ان ہی کی صفوں میں لڑتا رہا تھا، چنانچہ اتحاد مقدس

ایک سیاسی غلطی تھا۔

جولائی کے انقلاب میں اس غلطی نے خود اپنی سزا بھی پیدا کر لی اتحاد مقدس نے بلا ضرورت ایک ایسی مخالف قوت پیدا کر دی تھی جو موجود نہ رہی تھی یا کم از کم عرصہ تک پھر زندہ نہ ہوئی، بر اعظم کی دول کی خوش قسمتی کہ جولائی کے خاندان کو فرانس کے انقلابی رجحان کے سلا دینے میں کامیابی ہوئی، فرانس نے انگلستان سے اتحاد کیا جولائی کے خاندان کی اور دستوری شاہی کو مضبوط کرنے کی خاطر، انگلستان نے یہ اتحاد کیا اپنے تفوق تجارتی کو برقرار رکھنے کی غرض سے۔

فرانس اور انگلستان کا اتحاد ختم ہو گیا جب جولائی کا خاندان اور دستوری شاہی حکومت فرانس میں اچھی طرح جم گئی۔ لیکن دوسری طرف بحری قوت، جہاز رانی، تجارت اور صنعت کے بارہ میں فرانس کے اغراض پھر پیش پیش آنے لگے ظاہر ہے کہ اب پھر فرانس کو ان مسائل سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا بر اعظم کی دوسری دولتوں کو انگلستان کے تفوق بحری کے مقابلہ میں بر اعظم کی دول کے اتحاد کا قیام پھر دولت کا مسئلہ نبتا معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ جولائی کا خاندان فرانس میں نظم و نسق ریاست کے مختلف اعضاء میں ارادہ کا کامل اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے، اور انقلابی رجحانات سے جو مسائل علاقوں کی حدود کے متعلق پیدا ہو گئے تھے انہیں پس پشت ڈلوا دے، اور بر اعظم کے جن ملکوں میں شاہی حکومت ہے ان کے دل سے فرانس کے انقلابی اور فوج کشی کے رجحانات کا خیال یک قلم مٹا سکے۔

لیکن اس وقت بر اعظم یورپ کے اتحاد میں کوئی چیز اتنی حائل نہیں ہے جتنی یہ بات کہ بر اعظم کے مرکز کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو اس کا حق ہے یعنی تقسیم اراضی، اصول دستور، قومی خود مختاری

اور قومی قوت کے تمام مسائل میں براعظم یورپ کے مشرق و مغرب کے درمیان وسیلہ اور ثالث ہونے کی جگہ، کہ اپنے جغرافی موقع کی وجہ سے، اپنے وفاقی دستورِ حکومت کے سبب سے جس کی وجہ سے پڑوس کی قوموں میں فوج کشی کا خوف پیدا ہی نہیں ہو سکتا، اپنی مذہبی رواداری اور اپنے یہاں دوستی کے رجحانات کی وجہ سے اور آخر میں اپنے تمدن اور قوت کے عناصر ترکیبی کے باعث ایسی کا اہل ہے۔ یہ مرکز اس وقت جھگڑے کا سبب بنا ہوا ہے جس کے لئے مشرق اور مغرب باہم لڑتے ہیں اس لئے کہ یہ قومی اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ادھر سے ادھر ڈھلتا رہتا ہے اور دونوں کو توقع ہے کہ اسے اپنی طرف گھسیٹ سکتے ہیں لیکن اگر جرمنی ان بحری علاقوں کے ساتھ مل کر جو اس سے متعلق ہیں، ہالینڈ، بلجیم اور سکستان سے مل کر ایک مضبوط تجارتی اور سیاسی متحدہ کل بن جائے اور یہ طاقتور جسم قومی موجودہ شاہی، خاندانی اور مادی اغراض کے ساتھ نظام مندوبی کے اداروں کو، یہاں تک کہ ان کا نباہ ممکن ہو، یکجا کر دے تو یہ ایک عرصہ تک کے لئے براعظم یورپ کے امن کا ضامن ہو سکتا اور ایک پائیدار براعظمی اتحاد کا مرکز بن سکتا ہے

یہ بات واضح ہے کہ انگلستان کی بحری قوت اور تمام قوموں سے برتر ہے، جہازوں کی تعداد میں نہ سہی تو لڑنے کی قوت میں تو ضرور ہے، لہٰذا جو قومیں کم بحری قوت رکھتی ہیں اتحاد کے اندر قوت میں انگلستان کی برابری اسی طرح کر سکتی ہیں کہ آپس میں مل جائیں۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر کم درجہ کی بحری قوت رکھنے والی طاقت کو ہر دوسری کم بحری قوت رکھنے والی طاقت کے قیام اور اس کی خوش حالی سے ایک لگاؤ ہے یعنی انہیں اس سے بھی لگاؤ ہے کہ دوسری قوموں کے وہ ٹکڑے جو اب تک الگ ہیں اور کوئی بحری قوت نہیں رکھتے باہم

کم رکھتے ہیں، وہ مل کر ایک متحدہ بحری قوت بن جائیں۔ انگلستان کے مقابلہ میں فرانس اور شمالی امریکہ کا اس میں نقصان ہے کہ روس کی بحری قوت کمزور پڑ جائے اور برعکس، ان سب کا فائدہ ہے اگر جرمنی، ہالینڈ اور بلجیم ایک مشترکہ بحری قوت بن جائیں، اس لئے کہ جب تک الگ الگ ہیں تو یہ انگریزی تفوق بحری کے دم چھلے ہیں، مل جائیں تو یہ اس تفوق کے خلاف کم بحری قوت رکھنے والی دول کی مخالف جماعت کی تقویت کا سبب بن سکتے ہیں۔

کم بحری قوت والی قوموں میں کسی کے پاس ایسا تجارتی بیڑا نہیں ہے جو اس کی اپنی بین الاقوامی تجارت کی ضرورتوں سے زیادہ ہو، کسی کی صنعتی قوت دوسروں پر معتدبہ فوقیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی؛ یعنی کسی کو دوسرے کے مقابلہ سے ڈرنے کی معقول وجہ نہیں ہے، برخلاف اس کے اس میں سب کی غرض مشترک ہے کہ اپنے کو انگلستان کے تباہ کن مقابلہ سے محفوظ رکھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے دل کو یہ بات لگی ہونی چاہئیے کہ انگلستان کی غالب قوت صنعتی کے ہاتھ سے وہ دروازے نکل جائیں (یعنی ہالینڈ، بلجیم اور ہنزا شہر) جن کے ذریعہ انگلستان بر اعظم کی منڈیوں پر اب تک حکومت کرتا رہا ہے۔

منطقہ حارہ کے مال کی قیمت چونکہ زیادہ تر منطقہ معتدلہ کی مصنوعات میں ادا ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کا استعمال ان مصنوعات کی بکری پر منحصر ہے لہٰذا ہر صنعتی قوم کی کوشش ہونی چاہئیے کہ منطقہ حارہ کے ممالک سے براہ راست تعلق پیدا کرے۔ اب اگر دوسرے درجہ کی سب صنعتی قومیں اپنی غرض کو پہچانیں اور اس کے مطابق عمل پیرا ہوں تو پھر منطقہ حارہ میں کسی ایک قوم کو بہت زیادہ نوآبادیاں قبضہ میں رکھنے کا موقع نہ ہوگا، مثلاً اگر انگلستان اس مقصد میں

کامیاب ہو گیا جس کے لئے وہ کوشاں ہے یعنی نوآبادیاتی مال کی جتنی ضرورت اسے ہے وہ ہندوستان میں پیدا کرے تو پھر وہ جزائر مغربی ہند سے اسی وقت تجارت کر سکتا ہے، جب کہ اپنی مصنوعات کے بدلہ میں جو نوآبادیاتی مال اُسے ملتا ہے اُسے وہ دوسرے ملکوں میں کھپانے کا موقع ہو، اور اگر اسے دوسری جگہ نہ کھپایا جا سکے تو مغربی ہندی جزائر پر اس کا قبضہ بے سود ہے، ایسی صورت میں وہ یا تو ان مغربی جزائر کو چھوڑ دیگا یا ان سے تجارت کا حق دوسری صنعتی قوموں کو دے دیگا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ کم بحری قوت رکھنے والی تمام صنعتی قوموں کی اس میں مشترک غرض ہے کہ اس سیاست پر کاربند ہوں اور اس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہالینڈ جرمن اتحاد تجارتی میں شامل ہو جائے اور جرمنی کا تعلق ولندیزی نوآبادیوں سے زیادہ قریب کا ہو جائے تو اس میں کسی دوسری قوم کا نقصان نہیں ہے۔

جنوبی امریکہ اور جزائر مغربی ہند میں جب سے اسپین اور پرتگال کی نوآبادیاں آزاد ہوئی ہیں اس وقت سے یہ کوئی لازمی بات نہیں رہی ہے کہ ایک صنعتی قوم منطقہ حارہ میں خود اپنی ہی نوآبادیاں رکھے تب ہی اس قابل ہو کہ نوآبادیاتی مال کا براہِ راست اپنی مصنوعات سے مبادلہ کر سکے۔ چونکہ ان آزاد گرم ممالک کی منڈی آزاد ہے اس لئے ہر صنعتی قوم جو ان کھلی منڈیوں میں مقابلہ کی تاب لا سکتی ہے اور ان سے بلا واسطہ مبادلہ شروع کر سکتی ہے۔ البتہ یہ آزاد گرم ملک زیادہ نوآبادیاتی مال اُسی وقت پیدا کر سکتے ہیں، اور زیادہ مصنوعات اسی وقت لے سکتے ہیں، جب ان کے یہاں خوشحالی اور خوش اخلاقی، امن اور چین، نظم آئینی اور مذہبی رواداری

ہو۔ لہٰذا تمام کم بحری قوت رکھنے والی قوموں کی، اور خصوصاً ان کی جن کے پاس کوئی نوآبادی نہیں یا بہت کم نوآبادیاں ہیں، یہ مشترک غرض ہے کہ متحد ہو کر یہ حالات پیدا کریں۔ تفوق تجارتی (انگلستان) کو تو ان ملکوں کی حالت سے کیا بہت دلچسپی ہو سکتی ہے کہ اس کو تو اپنی دست نگر اور بندھی ہوئی نوآبادیوں یعنی ہندوستان اور جزائر مغربی ہند سے کافی مقدار میں نوآبادیاتی مال مل ہی جاتا ہے یا اُسے امید ہے کہ مل جایا کریگا۔ غلامی کے نہایت اہم مسئلہ کو بھی کچھ کچھ اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ ہم ہرگز اس انسان دوستی اور انصاف پسندی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے جو انگلستان کے اس جوش و خروش کی تہ میں ہے جس سے کہ وہ حبشیوں کو آزادی دلانے میں ساعی ہے؛ نہ ہم اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ یہ جوش و خروش انگریزی قوم کی سیرت کے لیئے باعث فخر ہے، مگر پھر بھی جب ہم ان کارروائیوں کے فوری نتائج پر نظر کرتے ہیں جو اس باب میں انگلستان نے اختیار کی ہیں تو ہم اس خیال کو رد نہیں کر سکتے کہ اس میں بہت کچھ سیاست اور تجارتی اغراض کی بھی آمیزش ہے۔ وہ نتائج یہ ہیں :-

ا۔ جب ان کالے لوگوں کو یکایک آزادی مل جائیگی اور یہ حیوانوں کی سی غلامی اور بے فکری سے اتنی تیزی کے ساتھ انفرادی خودمختاری کے اتنے اعلیٰ درجہ کو پہنچ جائیں گے تو جنوبی امریکہ اور جزائر مغربی ہند کے گرم ممالک میں نوآبادیاتی مال کی پیداوار غیر معمولی طور پر کم ہو جائے گی اور بالآخر صفر تک پہنچ جائے گی جیسا کہ سینٹ ڈامنگو کی مثال سے ناقابل تردید طور پر واضح ہے کہ جب سے فرانسیسی اور ہسپانی لوگ نکالے گئے ہیں پیداوار سال بہ سال کم ہوتی رہی اور برابر کم ہوتی جاتی ہے۔

۲۔ آزاد کالے برابر اپنی اُجرتیں بڑھوانا چاہتے ہیں اور محنت بس اتنی ہی کرتے ہیں جتنی کہ اشد ضروری احتیاجات کے رفع کرنے کے لئے ضروری ہو، یعنے اوّل اوّل آزادی سے بس کاہلی پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ انگلستان کے قبضہ میں ہندوستان ایسا ہے کہ اس سے وہ ساری دنیا کو نوآبادیاتی مال اچھی طرح فراہم کر سکتا ہے، ہر شخص واقف ہے کہ ہندو بہت محنتی ہوتے ہیں اور کھانے پینے اور دوسری ضروریات زندگی میں خصوصاً اپنے مذہب کی تعلیمات کی وجہ سے، جن میں گوشت کھانا منع ہے، بہت کفایت شعار بھی ہوتے ہیں، اس پر مزید یہ کہ دیسی لوگوں کے پاس سرمایہ کم ہے، نباتی پیداوار کے اعتبار سے زمین بہت زرخیز ہے، ذات پات کی تقسیم سخت ہے اور کام کی تلاش میں پھرنے والوں میں شدید مقابلہ ہے، ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مزدور کی اُجرت جزائر غرب الہند اور جنوبی امریکہ سے کہیں سستی ہے، چاہے ان جزائر میں کاشت کا کام غلام کریں چاہے آزاد کالے لوگ، لہٰذا جب ہندوستان میں تجارت آزاد ہو جائیگی اور انتظام ملکی کے بہتر اصول رائج ہو جائیں گے تو یہاں پیداوار بہت تیز رفتار سے بڑھے گی اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ انگلستان نوآبادیاتی مال کو صرف اپنی ہی تمام ضروریات ہندوستان سے مہیا نہ کرے گا بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی بڑی مقداریں بھیج سکیگا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جزائر غرب الہند اور جنوبی امریکہ میں پیداوار کی کمی سے جہاں دوسرے ملک بھی اپنی مصنوعات بھیجتے ہیں کوئی نقصان نہ ہوگا بلکہ اگر ہندوستان کی پیداوار بہت بڑھ گئی تو اسے فائدہ ہی ہوگا کہ اس منڈی میں تو مصنوعات تمام تر انگلستان بھیجتا ہے، اور آخر میں

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرا کر انگلستان نے شمالی امریکہ کی غلاموں والی ریاستوں کے سر پر ایک تلوار آویزاں کر دی ہے، اور یہ آزادی جیسے جیسے پھیلے گی اور شمالی امریکہ کے کالے لوگوں میں بھی اسی قسم کی آزادی حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو گی اسی قدر یہ ریاستہائے متحدہ کے لئے خطرناک ہوتی جائے گی! اور اگر معاملہ کو ذرا روشنی میں دیکھا جائے تو ان قوموں کو جو جنوبی امریکہ اور جزائر غرب الہند سے تجارت پر مجبور ہیں انسان دوستی کا یہ تجربہ (جس کے نتائج خود اُن لوگوں کیلئے مشتبہ ہیں جن کی نظر عام انسانی محبت کے خیال سے یہ کیا گیا ہے) ہرگز فائدہ مند نظر نہ آئیگا اور اگر وہ یہ سوال کریں تو بے وجہ نہ ہوگا کہ آیا ان کالے آدمیوں کا غلامی سے یکایک آزادی میں پہنچ جانا خود ان کالوں کے لئے ہی تو موجودہ حالات کے برقرار رکھنے سے زیادہ نقصان دہ نہیں ہے؟ کیا اس کے لئے کئی نسلیں درکار نہیں ہیں کہ ان کالوں کو جو تقریباً حیوانوں کی سی غلامی کے عادی تھے آزاد کام اور معیشت کی تعلیم دی جائے؟ کیا اس مقصد کا حصول اس طریق پر بہتر نہ ہوتا کہ غلامی سے آزادی میں تبدیلی کرتے وقت پہلے ایک نرم قسم کی زرعی غلامی رائج کی جاتی، پہلے زرعی غلام کو اپنی کاشت کی زمین میں کچھ حق ملتا اور اس کی محنت کے پھل کا ایک مناسب حصّہ اُسے دیا جاتا اور ساتھ ہی زمیندار کو اتنے حقوق حاصل ہوتے کہ وہ اس زرعی غلام کو محنت اور ضابطہ کا پابند رکھتا؟ کیا یہ حالت ان مفلوک الحال، بدمست، کاہل، بدکار، دریوزہ گر انبوہ کی حالت سے بہتر نہ ہوتی جنہیں "آزاد کالے لوگ" کہا جاتا ہے اور جن کے مقابلہ میں آئرستان کی فلاکت اپنی پست ترین شکل میں بھی خوشحالی اور تمدن کہی جا سکتی ہے۔

اور اگر کوئی ہمیں یہ یقین دلانا چاہے کہ روئے زمین پر جو بھی رہتا ہے اُسے خود اپنے

ہی برابر کی آزادی دلانے کا جوش انگریزوں میں اس درجہ قوی اور اتنا شدید ہے کہ وہ قابلِ معافی ہیں اگر وہ یہ بھول گئے کہ قدرت کبھی جست نہیں لگاتی، ہاں اگر کوئی ہمیں یہ یقین دلانا چاہے تو ہم یہ سوال کرینگے کہ کیا ہندوؤں کی سب سے نیچی ذاتوں کا حال امریکہ کے کالوں سے بھی بدتر اور زیادہ ناقابلِ برداشت نہیں ہے؟ پھر یہ کیا بات ہے کہ انگریزی انسان دوستی کا جذبہ اس مفلوک ترین خلائق کے لئے کبھی نہیں اُبھرا؟ اس کا کیا سبب ہے کہ انگریزی قانون نے کبھی ان کی طرفداری نہیں کی؟ اور یہ کیا ہے کہ انگلستان اس فلاکت سے خود اپنے کو مالامال کرنے میں کوشاں ہے اور کبھی اس کی بہتری کے لئے براہ راست اثر ڈالنے کا خیال بھی نہیں کرتا؟

انگریزی ہندی سیاست کا یہ ذکر ہمیں مسئلہ شرقی پر لے آیا۔ اگر ہم وقت کی سیاست سے وہ سب کچھ نکال دیں جو علاقوں کے باعث جھگڑوں، خاندانی، شاہی، امارتی یا مذہبی اغراض یا قوتِ اعتباری سے متعلق ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ شرقی میں برِّ اعظم کی دول کی ایک بڑی معاشی غرض مشترک ہے۔ اس وقت دول کی یہ کوشش کہ تھوڑی دیر کے لئے اس مسئلہ کو پسِ پشت ڈال دیا جائے کتنی ہی کامیاب ہو لیکن یہ مسئلہ ہمیشہ نئے زور کے ساتھ سامنے آئیگا۔ سب سوچنے سمجھنے والے آدمی مدت ہوئی اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ ترکی کی طرح جس قوم کی مذہبی اور اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی بنیاد کھوکھلی ہو اس کی مثال ایک نعش کی سی ہے جسے زندوں کی مدد کچھ عرصہ کے لئے کھڑا رکھ سکتی ہے لیکن جس کا سڑنا لابد ہے۔ جو حال ترکوں کا ہے بالکل وہی ایرانیوں کا ہے، وہی چینیوں اور ہندوستانیوں کا اور وہی سب ایشیائی قوموں کا۔ ہر کہیں جہاں کہیں ایشیا کی بوسیدہ تہذیب کو یورپ کی تازہ ہوا لگی ہے وہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی ہے اور یورپ کو جلد یا بدیر ضرورت

پڑیگی کہ ایشیا کو اپنی ماتحتی اور نگرانی میں لے، جس طرح ہندوستان کو انگلستان نے اپنی ماتحتی اور نگرانی میں لے لیا ہے۔ قوموں اور ملکوں کے اس خلفشار میں ایک قوم بھی تو ایسی نہیں ملتی جس کے قائم رہنے یا از سرِ نو پیدا ہونے کی ضرورت ہو یا جو اس کی صلاحیت رکھتی ہو۔ لہٰذا ایشیائی قوموں کا انتشار کلی تو اٹل ہے اور ایشیا کا پترجنم صرف اس طرح ممکن ہے کہ یورپ کی قوت حیات اس میں حلول کر لے، عیسائی مذہب اور یورپی اخلاق اور نظم رفتہ رفتہ رائج ہوں، یورپی لوگ وہاں جا جا کر بسیں اور حکومت کے یورپی نظام قائم ہوں۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ یہ نیا جنم کیا صورتیں اختیار کر سکتا ہے تو سب سے پہلے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مشرق کے اکثر حصوں کو قدرت نے ایسے وسائل ارزانی کئے ہیں کہ وہ یورپ کی صنعتی قوموں کو ہر قسم کی خام اجناس اور ضروریاتِ زندگی کی بڑی بڑی مقداریں فراہم کر سکتا ہے خصوصاً منطقہ حارہ کے پھل بکثرت پیدا کر سکتا اور یورپ کی مصنوعات کے لئے بڑی بڑی منڈیاں کھول سکتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اشارہ دیا ہے کہ یہ نیا جنم اُسی طریقہ سے عمل میں آئے جس طرح عموماً غیر مہذب قوموں کی تہذیب عمل میں آئی ہے، یعنے اپنی زرعی پیداوار اور دوسروں کی مصنوعات کے آزاد مبادلہ سے اسی وجہ سے تمام یورپی قوموں کو سب سے پہلے یہ اصول مضبوطی سے پکڑنا چاہیئے کہ ایشیا کے کسی حصہ میں کسی یورپی قوم کو کسی قسم کی خاص تجارتی رعایت حاصل نہ ہو، اور کسی حیثیت سے ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح نہ دی جائے۔ تجارت کی توسیع کے لئے بہت ہی مفید ہوگا اگر مشرق کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کو آزاد بنا دیا جائے جن کے یورپی باشندوں کو خود اپنے نظم ونسق کا حق حاصل ہو اور وہ دیسی

حکمرانوں کو سالانہ ایک رقم ادا کر دیا کریں، لیکن جیسا کہ ہندوستان میں انگریزوں نے کیا ہے، ان حکمرانوں کے ساتھ یورپی ایجنٹ مقرر کر دیئے جائیں اور امن، نظم اور تہذیب کو ترقی دینے کے لئے اس ایجنٹ کے جو مشورے ہوں ان کے یہ حکمراں پابند ہوں۔

برّاعظم کی تمام دول کا اس میں خاص طور پر مشترک فائدہ ہے کہ بحرِ قلزم سے بحرِ احمر اور خلیج فارس کے دونوں بحری راستے نہ تو تنہا انگلستان کے قبضہ میں آئیں، نہ ایشیا کی بربریت انہیں ناقابلِ گذر بنا سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر اہم لفظوں کی نگرانی آسٹریا کے سپرد کر دی جائے تو تمام یورپی اقوام کے لئے بہترین ضمانت ہو جائے گی۔

علاوہ بریں برّاعظم کی سب دول کی ایک غرض ریاستہائے متحدہ کے ساتھ بھی مشترک ہے یعنے اس اصول کا قیام کہ "جہاز آزاد تو مال آزاد" اور یہ کہ اگر اِکّے دُکّے بندر گاہ کی واقعی ناکہ بندی ہو تو اسے تو غیر جانبدار قومیں تسلیم کریں ورنہ پورے سواحل کی ناکہ بندی کا محض اعلان کر دینا ان کے لئے واجب التعمیل نہ ہو۔ آخر میں، ویران اور غیر آباد علاقوں کے الحاق کا اصول بھی دول برّاعظم کے مفاد میں نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ ہمارے زمانہ میں لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ پہلے پاپائے مقدس جزیرے اور برّاعظم لوگوں کو بخش دیا کرتا تھا، نہیں، اپنے قلم کی بس ایک جنبش سے کرۂ ارض کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ کسی کو اور دوسرا حصہ کسی کو عطا فرما سکتا تھا، لیکن کیا یہ صورت اس سے زیادہ قرینِ عقل ہے کہ ایک پورے سے برّاعظم کے برّاعظم پر اس کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے جس نے سب سے پہلے وہاں ایک ایسا ڈنڈا گاڑ دیا ہو جس پر ریشم کا ایک ٹکڑا لٹکتا تھا؟ اگر چھوٹے چھوٹے جزیروں کا معاملہ ہو تو انہیں دریافت کرنے والے کا حق ممکن ہے معقول

اور حق بجانب مانا جا سکے، لیکن جب ایسے جزیروں کا قصہ ہو جو ایک بڑی یورپی سلطنت کے برابر ہیں، جیسے نیوزی لینڈ یا کسی ایسے برِاعظم کا معاملہ ہو جو کل یورپ سے بڑا ہے، جیسے آسٹریلیا، تو اس وقت تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ صرف نوآبادی بسانے کی صورت میں اور صرف اس علاقہ پر جس پر نوآبادی بسائی گئی ہے، بلا شرکت غیرے قبضہ کا حق تسلیم کیا جائے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دنیا کے ان حصوں میں انگریزی نوآبادیوں سے کچھ فاصلہ پر جرمنوں اور فرانسیسیوں کو بھی نوآبادیاں بسانے کا حق کیوں نہ ہو۔

جب ہم ان تمام اغراض کو دیکھیں جو برِاعظم کی دول میں اس تفوق بحری کے خلاف مشترک ہیں تو معلوم ہو جائیگا کہ ان قوموں کو کوئی چیز اتنی درکار نہیں جتنی اتحاد اور ان کے لئے کوئی چیز اتنی مضر نہیں جتنی برِاعظم میں جنگ۔ گزشتہ صدی کی تاریخ سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ ہر جنگ جو برِاعظم کی دولتوں نے ایک دوسرے کے خلاف کی اس سے بس یہی نتیجہ نکلا کہ جزائری اقتدار (انگلستان) کی صنعت، دولت، جہازرانی، نوآبادیوں اور قوت میں اور اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نپولین کے نظام برِاعظمی کی تہ میں برِاعظم کی ضرورتوں اور برِاعظم کے اغراض کا صحیح خیال موجود تھا، اگرچہ اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نپولین اس بجائے خود صحیح خیال کو ایسے طریقہ سے عمل میں لانا چاہتا تھا جو برِاعظم کی دوسری دول کے مفاد اور ان کی خودمختاری کے منافی تھا۔ نپولین کے نظام میں تین بڑی بڑی خامیاں تھیں ایک تو انگریزی تفوق بحری کی جگہ وہ برِاعظم میں فرانس کا تفوق قائم کرنا چاہتا تھا، بجائے

اس کے کہ اس نظام کی بنیاد باقی قوموں کی ترقی اور مساوات پہ ہو اس کی نسبت یہ تھی کہ فرانس کے فائدے کے لئے باقی قومیں ذلیل یا تباہ و برباد ہوں، دوسرے یہ کہ اس کے ذریعے فرانس نے خود اپنے کو تو دوسری قوموں کے لئے بالکل بند کر دیا اور ان کے علاقوں میں آزاد تجارتی مقابلہ کا دعویدار بنا، تیسرے اس نے برّاعظم کی صنعتی قوموں اور منطقہ حارہ کے ممالک میں تجارتی تعلق کو تقریباً بالکل برباد کر دیا، اور بالآخر تجارت عالمی کو درہم برہم کر کے مجبور ہوا کہ اس کا علاج نقلی بدلہ کی چیزوں کے استعمال سے کرے۔

یہ بات بالکل صاف ہے اور روز بروز اور صاف ہوتی جائیگی کہ جوں جوں انگلستان کا تفوق صنعت، دولت اور قوت میں بڑھتا جائیگا اس برّاعظمی نظام کا خیال اور اس کو عمل میں لانے کی ضرورت کا احساس برّاعظم کی قوموں میں زیادہ شدت کے ساتھ پھر پیدا ہوگا لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ برّاعظم کی قوتوں کا اتحاد باہمی اس وقت کامیاب ہوسکیگا جب فرانس نپولین والی غلطیوں سے باز رہ سکے۔ یہ فرانس کی حماقت ہے کہ ماہیت حالات اور انصاف کے خلاف وہ جرمنی سے سرحد بدلنے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس طرح دوسری قوموں کو انگلستان سے ملنے پر مجبور کرتا ہے، یہ فرانس کی حماقت ہے کہ بحر قلزم کا ذکر یوں کرتا ہے گویا وہ فرانس کے ملک کے اندر کی کوئی جھیل ہے اور لیوانٹ اور جنوبی امریکہ میں بلاشرکت غیرے اثر حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

اقوام برّاعظم کا ایک مؤثر نظام تو مختلف قوتوں کے آزادانہ اتحاد ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اور اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے کہ اس سے جو فوائد قوموں کو پہنچیں وہ انہیں

برابر رکھنا چاہیئے اور برابر رکھے رکہ بس یہی ایک طریقہ ہے اور اور کوئی نہیں کہ دوسرے درجہ کی بحری قوتیں انگریزی اقتدار پر ایسا اثر ڈال سکیں کہ بغیر قوت اسلحہ کو محکم بنائے ہوئے انگلستان ان کمزوروں کے تمام جائز مطالبات تسلیم کرلے صرف اسی قسم کے اتحاد سے برا عظم کی صنعتی قومیں منطقہ حارہ کے ممالک سے اپنا تعلق قائم رکھ سکتی اور مشرق و مغرب میں اپنے اغراض کا تحفظ ایسکتی ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ اہل برطانیہ کو جو اقتدار اور نفوذ کے بہت ہی پیاسے ہیں یہ بات بہت گراں گذرے گی کہ وہ اس طرح بیٹھے دیکھا کریں کہ باہم تجارتی آسانیاں پیدا کرکے اور معاہدوں کے ذریعہ براعظم کی قومیں اپنی صنعت کو یوں تقویت پہنچا رہی ہیں، ایک دوسرے کی جہازرانی اور بحری قوت کو مضبوط کر رہی ہیں، ہر جگہ وحشی اور غیر آباد ممالک کی تہذیب اور ان کے بسانے میں اور منطقہ حارہ سے تجارت میں وہ حصہ حاصل کر رہی ہیں جو قدرت نے انہیں دیا ہے؛ لیکن اگر وہ مستقبل پر نظر کریں تو ان خیالی نقصانات پر کبھی انہیں تسکین ہو جائے گی۔

اس لئے کہ جن اسباب نے برطانیہ عظمی کو اپنے موجودہ مرتبہ اعلیٰ پر پہنچایا ہے وہی غالباً اگلی صدی ہی کے اندر اندر ریاستہائے متحدہ امریکہ کو صنعت، دولت اور قوت کے اس درجہ پر پہنچا دینگے جو انگلستان کے موجودہ درجہ سے اسی درجہ بلند ہوگا جتنا کہ انگلستان کا موجودہ مرتبہ چھوٹے ہالینڈ سے بلند ہے۔ واقعات کی فطری رفتار کا تقاضا ہے کہ اس عرصہ میں شمالی امریکہ کی آبادی بڑھ کر دسیوں کروڑ ہو جائیگی؛ کل وسطی اور جنوبی امریکہ میں وہ اپنی آبادی، اپنے ادارے، اپنی تہذیب، اپنی ذہنیت پھیلا دیگا، جس طرح اس نے حال میں میکسیکو کے قریبی صوبہ میں پھیلایا

دی ہے، اتحاد کے بندھن ان تمام بے اندازہ وسیع علاقوں کو لپیٹ لیں گے، دسیوں کروڑ آدمیوں کی آبادی ایک ایسے براعظم سے تمتع کرے گی جو باعتبار اپنی وسعت اور اپنی قدرتی دولت کے براعظم یورپ سے بے حساب فوقیت رکھتا ہے، اور اس مغربی دنیا کی بحری قوت برطانیہ عظمیٰ کی قوت بحری سے اس قدر افضل ہوگی جتنی کہ اس کے سواحل اور اس کے دریا لمبائی چوڑائی میں برطانوی سواحل اور دریاؤں سے بڑھے ہوئے ہیں۔

لہٰذا وہ زمانہ کچھ بہت دور نہیں ہے کہ وہی قدرتی ضرورت جو اس وقت فرانسیسیوں جرمنوں سے برطانوی تفوق کے خلاف ایک براعظمی اتحاد ہونا چاہتی ہے، برطانیہ کو امریکی تفوق کے خلاف ایک یورپی اتحاد قائم کرنے پر مجبور کرے گی، اس وقت برطانیہ عظمیٰ مجبور ہوگی کہ امریکن تفوق کے مقابلہ میں پناہ، امن اور قوت اور اپنے گم کردہ اقتدار کا بدل دول متحدہ یورپ کی قیادت میں ڈھونڈے اور پائے۔

انگلستان کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ بروقت قناعت کی مشق کر لے، بروقت تمام دول یورپ کی دوستی حاصل کر لے، اور بروقت اس تصور کی عادت ڈال لے کہ برابر والوں میں اگوا بننا ٹھیک ہے۔

باب (۳۶)

جرمن جمعیۃ محاصلی کی تجارتی سیاست

اگر کسی قوم میں صنعت قومی کے قیام کی صلاحیت ہے تو وہ جرمن قوم ہے۔ علوم و فنون، تعلیم اور ادب، انتظام ملکی اور مفید عام اداروں میں اپنے بلند مرتبہ کی وجہ سے؛ اپنے اخلاق اور مذہبیت، اپنی جفاکشی اور کفایت شعاری کے سبب سے؛ معاملات میں اپنے استقلال اور پامردی اور اپنی اختراعی قوتوں کی وجہ سے، اپنی نوآبادی کی کثرت اور قابلیت، اپنے علاقہ کی وسعت اور کیفیت، اپنی ترقی یافتہ زراعت، اور پھر بالعموم اپنے تمدنی، معاشرتی، اور ذہنی وسائل کے باعث۔

اگر اپنے مناسب حال تامینی نظام سے کوئی قوم بھی توقع کر سکتی ہے کہ اس کی ملکی صنعت کے لیئے، اس کی تجارت خارجہ اور جہاز رانی کے بڑھنے کے لیئے، اندرونی وسائل حمل و نقل کی تکمیل کے لیئے، زراعت کی مرفہ الحالی کے لیئے، نیز اپنی خود مختاری کے قیام اور اپنی قوت میں اضافہ کے لیئے مفید نتائج نکلیں گے، تو وہ جرمن قوم ہے۔

ہاں ہم یہ دعوےٰ کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جرمن نظام تامینی کی تکمیل ہی پر جرمن قومیت

کے وجود، خود مختاری اور اس کے مستقبل کا انحصار ہے تمام مرفہ الحالی کی زمین ہی میں رُوحِ قومی کا پودا جڑ پکڑتا اور خوب پھولتا پھلتا ہے، مادی اغراض کے اتحاد ہی سے اتحاد ذہنی پیدا ہوتا ہے اور انہیں دونوں سے قومی قوت قومیت بغیر اور اس ضمانت بن کہ یہ قومیت باقی رہے گی ہماری ساری کوششوں کی کیا قدر ہے چاہے ہم حاکم ہوں یا محکوم، امرا کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا شہریوں کے، عالم ہوں یا جاہل، فوجی ہوں یا غیر فوجی، صنعت والے ہوں کہ زراعت اور تجارت والے!

لیکن جب تک جرمنی اپنی ضرورت کے لائق روئی اور سنی کا تار خود نہ کاتے، اپنی ضرورت کا نوآبادیاتی مال بلا واسطہ منطقہ حارہ کے ممالک سے نہ منگائے اور ان کی قیمت خود اپنی مصنوعات سے ادا نہ کرے، جب تک یہ خود اپنے جہازوں میں تجارت نہ کرے، جب تک وہ اپنے جھنڈے کو پناہ نہ دے سکے، جب تک اس کے پاس دریاؤں، نہروں اور ریلوں کا مکمل نظام حمل و نقل موجود نہ ہو، جب تک جرمن جمعیتہ محاصلی تمام ساحلی جرمن ریاستوں پر، اور ہالینڈ اور بلجیم پر بھی شامل نہ ہو، اس وقت تک سمجھنا چاہیئے کہ یہ نظام تامینی اپنے مقاصد کو نہایت ہی نامکمل طور پر پورا کرتا ہے۔

ہم جب مصر، برازیل اور شمالی امریکہ سے خام روئی منگاتے ہیں تو اس کی قیمت اپنی مصنوعات میں ادا کرتے ہیں، لیکن جب ہم انگلستان سے سوت منگاتے ہیں تو اس کی قیمت ہم یا تو خام اجناس اور کھانے پینے کی چیزوں میں ادا کرتے ہیں جنہیں ہم خود زیادہ مفید طور پر تیار کر سکتے یا صرف میں لاسکتے تھے یا اس کی قیمت ہم نقد دھات کی شکل میں ادا کرتے ہیں جو ہم

نے اور کہیں سے حاصل کی تھی اور جسے ہم خود تیار کرنے کے لئے پردیسی اجناس خام یا خود استعمال کرنے کے لئے نوآبادیاتی مال کے خریدنے میں زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکتے تھے۔

اسی طرح مشین سے سنی کا تار کاتنے کے رواج نے ہمیں اس کا موقع دے دیا ہے کہ ہم نہ صرف ملک میں سنی کے کپڑے کا استعمال بڑھا سکتے اور اپنی زراعت کو مکمل کر سکتے ہیں بلکہ منطقہ حارہ کے ممالک سے بھی اپنی تجارت کو بہت زیادہ وسعت دے سکتے ہیں۔

صنعت کی مذکورہ بالا دو شاخوں، نیز اونی مال کی صنعت میں ہمارے لئے حالات اتنے ہی موافق ہیں جتنے کسی اور قوم کے واسطے، اس لئے کہ ہمارے پاس پانی کی بہت سی غیر مستعمل قوت موجود ہے، کھانے پینے کی چیزیں سستی ہیں اور اجرتیں کم ہیں، کمی جس چیز کی ہے وہ بس اس کی کہ ہمارے سرمایہ داروں اور صناعوں کو اس بات کی ضمانت ہو جائے کہ ان کا سرمایہ ضائع نہ ہوگا اور وہ بیکاری سے روٹی کو نہ ترسینگے۔ اگر ایک معتدل تامینی محصول لگا دیا جائے جو اگلے پانچ برس میں ۲۵ فی صدی تک پہنچ جائے اور یہاں پہنچکر چند سال چلتا رہے اور پھر کم ہو کر ۱۵ تا ۲۰ فی صدی ہو جائے تو اس سے یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی مخالفت میں نظریہ قدر کے حامی جو کچھ کہیں گے اس کی تردید ہم کر چکے ہیں، بلکہ اس کارروائی کی موافقت میں ایک بات یہ اور کہی جا سکتی ہے کہ صنعت کی ان بڑی شاخوں سے خاص طور پر ایک وسیع صنعت مشین سازی قائم کرے اور قابل صنعت کے عالموں اور عملی صناعوں کا ایک طبقہ تیار کرنے کے وسائل ہاتھ آتے ہیں۔

نوآبادیاتی مال کی تجارت کے معاملہ میں جرمنی کو بھی فرانس اور انگلستان کی طرح اس

اصول پر کاربند ہونا چاہیئے کہ اپنی ضروریات کے نوآبادیاتی مال کی خریداری کے بارہ میں منطقہ حارہ کے ان ممالک کو ترجیح دی جائے جو ہماری مصنوعات لیتے ہیں، یعنے بالفاظ مختصر ہم ان سے خریدیں جو ہم سے خریدتے ہیں۔ یہ صورت جزائر غرب الہند، اور شمالی اور جنوبی امریکہ سے ہماری تجارت میں پیش آتی ہے، لیکن ہالینڈ سے تجارت میں یہ صورت نہیں ہے، یہ ملک ہمیں نوآبادیاتی مال کی بے حساب مقداریں دیتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ہم سے بہت ہی کم مقداریں ہماری مصنوعات کی لیتا ہے، مگر اپنے نوآبادیاتی مال کی کھپت کے لئے ہالینڈ کو زیادہ تر جرمن منڈی ہی کا رُخ کرنا پڑتا ہے اس لئے کہ فرانس اور انگلستان تو یہ مال خود اپنی نوآبادیوں یا اپنے ماتحت ممالک سے مہیا کر لیتے ہیں اور یہاں کی مصنوعات کی منڈی پر ان کا قبضہ بلا شرکت غیرے ہے، لہذا یہ ہالینڈ سے نوآبادیاتی مال بہت کم لیتے ہیں۔

ہالینڈ کے پاس اپنی قابل ذکر صنعت تو ہے نہیں، لیکن نوآبادیاتی مال کی بڑی پیداوار ہے جو پچھلے زمانہ میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے اور جس میں ابھی بحساب اضافہ کی گنجائش ہے لیکن ہالینڈ جرمنی سے ناجائز مطالبہ کرتا ہے اور خود اپنے فائدہ کے خلاف عمل کرتا ہے کہ اپنے نوآبادیاتی مال کا بڑا حصہ تو جرمنی میں بھیجتا ہے اور مصنوعات کی جو ضرورت ہوتی ہے اسے جہاں سے اس کا جی چاہتا ہے پورا کرتا ہے۔ یہ بات ہالینڈ کے لئے بس دیکھنے ہی میں مفید ہے ورنہ ہے بڑی کوتاہ بیں سیاست، اس لئے کہ اگر ہالینڈ جرمن مصنوعات کو اپنے ملک اور اپنی نوآبادیوں میں ترجیح دے تو جرمنی میں ہالینڈ کے نوآبادیاتی مال کی مانگ اسی نسبت سے بڑھیگی جس نسبت سے کہ ہالینڈ اور اس کی نوآبادیوں میں جرمن مصنوعات کی بکری میں اضافہ ہوگا یعنے بالفاظ دیگر جرمنی

جس قدر زیادہ مصنوعات ہالینڈ کے ہاتھ بیچے گا اسی قدر زیادہ نوآبادیاتی مال خریدے گا، اور ہالینڈ جتنا زیادہ نوآبادیاتی مال جرمنی میں بیچے گا اتنی ہی مصنوعات جرمنی سے خرید کریگا اس تعلق باہمی کو ہالینڈ نے توڑ دیا ہے کہ وہ اپنا نوآبادیاتی مال تو جرمنی میں بیچتا ہے لیکن جو مصنوعات درکار ہوتی ہیں وہ انگلستان سے خریدتا ہے حالانکہ انگلستان چاہے کتنا ہی مال ہالینڈ میں بیچے جو نوآبادیاتی مال اسے چاہیئے اس کا بڑا حصہ خود اپنی نوآبادیوں یا اپنے محکوم ممالک سے ہی منگائے گا۔

جرمنی کا فائدہ یہ چاہتا ہے کہ وہ یا تو ہالینڈ سے مطالبہ کرے کہ جرمن مصنوعات کے فائدہ کے لئے ایک محصول تفریقی لگائے تاکہ ہالینڈ اور اس کی نوآبادیوں میں مصنوعات کی منڈی میں تنہا اس کا عمل دخل رہے، یا اگر ہالینڈ اس سے انکار کرے تو پھر وہ خود نوآبادیاتی مال کی درآمد کے سلسلہ میں وسطی اور جنوبی امریکہ اور جزائر غرب الہند کی آزاد منڈیوں کی موافقت میں محاصل تفریقی لگائے۔ یہی تدبیر ہالینڈ کو جرمن جمعیتہ محاصل میں شرکت پر آمادہ کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہوگی۔

اس وقت جو صورت حالات ہے اس میں کوئی وجہ نہیں کہ جرمنی اپنے چقندر کی شکر کے کارخانے ہالینڈ کی تجارت پر سے قربان کرے، اس لئے کہ خود اس مال کو تیار کرنے کی جگہ منطقہ حارہ کے ممالک سے مبادلہ کے ذریعہ اس کا حاصل کرنا تو اسی وقت مفید ہوگا کہ اس کی قیمت جرمنی اپنی مصنوعات سے ادا کر سکے۔

فی الوقت تو جرمنی کی توجہ خاص طور پر اس طرف ہونی چاہیئے کہ شمالی، وسطی اور جنوبی امریکہ سے اور جزائر غرب الہند کی آزاد منڈیوں سے اپنی تجارت کو وسعت دے۔ متذکرہ بالا تدابیر کے علاوہ اس غرض کے لئے یہ تدابیر اور قابل توجہ ہیں:۔ جرمن بندرگاہوں اور ان ممالک کے اہم

بندرگاہوں کے درمیان باضابطہ دخانی جہازوں کی آمدورفت کا سلسلہ، ان ممالک کو ہجرت کرنے میں سہولتیں بہم پہنچانا، ان ممالک اور جمعیتہ محاصل کے درمیان دوستانہ تعلقات کو وسعت دینا اور پائیدار بنانا، اور ساں کی تہذیب و تمدن میں ہر طرح ترقی کی کوشش کرنا۔

نئے تجربوں نے اچھی طرح بتلا دیا ہے کہ بڑے پیمانہ کی تجارت کو باضابطہ دخانی جہازوں کی آمدورفت سے کس قدر ترقی ہوتی ہے۔ فرانس اور بلجیم اس باب میں انگلستان کے نقش قدم پر پڑ لیئے ہیں، اس لیئے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جو قوم اس کامل تر طریقہ حمل و نقل میں پیچھے رہ گئی وہ لازم ہے کہ تجارت خارجہ میں بھی رجعت کریگی۔ جرمنی کے بندرگاہ بھی اس حقیقت سے آشنا ہو گئے ہیں اور بریمن کی ایک مشترک کمپنی کا ارادہ ہے کہ شمالی امریکہ آنے جانے کے لئے دو یا تین دخانی جہاز تعمیر کرائے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تدبیر بہت ہی ناکافی ہے۔ جرمنی کے تجارتی اغراض کا تقاضا یہی نہیں ہے کہ صرف شمالی امریکہ سے خصوصاً نیویارک، بوسٹن، چارلس ٹون، اور نیو آرلینس سے باضابطہ دخانی جہازوں کی آمدورفت ہو بلکہ کوبا، سان ڈومنگو، اور وسطی اور جنوبی امریکہ سے بھی دخانی جہازرانی کے ان موخر الذکر سلسلوں میں جرمنی کو کسی اور قوم سے پیچھے نہ رہنا چاہیئے، ہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اس مقصد کے لیئے جو وسائل درکار ہیں وہ جرمن بندرگاہوں کی حوصلہ مندی اور شادمانی کی قوت سے باہر ہوں اس لیئے ہمارے خیال میں یہ اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں کہ جمعیتہ محاصل کی ریاستیں دل کھول کر امداد دیں۔ اس امداد کی توقع اور جرمن جہازوں کی موافقت میں محاصل تفریقی کی امیدان بندرگاہوں کو اس اتحاد تجارتی میں شرکت کرنے کے لیئے بہت قومی محرک ثابت ہو گی۔

مذکورہ بالا ممالک اور جرمنی میں جب آمد و رفت کے وسائل یوں بڑھیں گے تو جرمن شہریوں کے لئے ان ملکوں کو ہجرت کرنے اور وہاں بسنے میں بھی خاصی آسانیاں پیدا ہونگی اور اس سے آئندہ تجارت کی توسیع کی بنیاد پڑے گی۔ اس مقصد کے لئے چاہیئے کہ جمعیتہ محاصلی کی ریاستیں ہر جگہ قنصل خانے اور سیاسی وکالتیں قائم کریں؛ یہ جرمن شہریوں کے سکونت پذیر ہونے میں اور ان کے کاروبار میں مدد دیں؛ اور ان ریاستوں کا ہر ممکن طریقہ سے استحکام حکومت اور تکمیل تہذیب و تمدن میں ہاتھ بٹائیں۔

ہم ان لوگوں کے بطلق ہمخیال نہیں ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ امریکہ کے جو حصے منطقہ حارہ میں ہیں وہ جرمن نوآبادیوں کے لئے شمالی امریکہ کے معتدل حصوں سے کم مفید ہونگے؛ ہم صاف اقرار کرتے ہیں کہ ہمیں موخر الذکر ملک سے بڑا لگاؤ ہے اور ہم نہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں نہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی اکیلا جرمن مہاجر ہو جس کے پاس کچھ سرمایہ بھی ہو تو اس کے لئے مستقل طور پر دولت مند بننے کی سب سے زیادہ توقع شمالی امریکہ کے مغربی حصہ میں ہے لیکن اس رائے کا ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر وسطی اور جنوبی امریکہ کو ہجرت کی اچھی طرح رہنمائی کی جائے تو قومی نقطہ نظر سے جرمنی کے لئے شمالی امریکہ کو ہجرت کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ فائدہ رساں ثابت ہو گی۔ شمالی امریکہ کو ہجرت کر کے جانے والے کتنے بھی مزے میں کیوں نہ ہوں جرمن قوم کو ان سے کیا حاصل؛ ان کی شخصیت ہمیشہ کے لئے جرمن قوم کے ہاتھ سے نکل گئی اور ان کی مادی و دولت آفرینی سے بھی جرمنی کو بہت کم پھل ملنے کی توقع ہے۔ یہ بڑا دھوکا ہی دھوکا ہے اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ میں بسنے والے جرمنوں میں جرمن

زبان قائم رکھ سکیں گے یا زمانہ گزرنے پر بالکل جرمن ریاستیں قائم کر سکیں گے ہم خود کبھی اس دھوکے میں مبتلا تھے، مگر موقع پر دس سال تک حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس سے نکل آئے ہیں یہ ہر قومیت کی روح کا یہ تقاضا ہے اور خصوصاً شمالی امریکہ کی قومیت کا، کہ زبان، ادب، انتظام ملکی اور آئین سازی میں یکساں ہو جائے۔ اور اچھا ہے کہ ایسا ہے۔ شمالی امریکہ میں آج کتنے جرمن بستے ہیں، لیکن یقین جانو کہ ان میں ایک ایسا نہیں جس کے پوتے پڑپوتے انگریزی زبان کو جرمن پر بمراتب ترجیح نہ دیں گے، اس لئے کہ یہ تعلیم یافتہ لوگوں کی ادبیات کی، قانون کی، انتظام ملکی کی، عدالتوں کی اور تجارت کی زبان ہو گی۔ شمالی امریکہ میں جرمنوں پر وہی گزرے گی جو ہوگونوٹوں پر جرمنی میں اور فرانسیسیوں پر لوئی زیانا میں گزری۔ فطرت کا یہی تقاضا ہے، وہ غالب آبادی میں جذب ہو جائیں گے، کوئی ذرا پہلے، کوئی ذرا بعد میں، اس لحاظ سے کہ کون اپنے ملکی بھائیوں کے کم ساتھ رہتا ہے اور کون زیادہ۔

جو جرمن شمالی امریکہ میں جا کر بسے ہیں ان میں اور جرمنی میں زیادہ تجارتی لین دین کے تعلقات کی بھی بہت کم امید کی جا سکتی ہے۔ جو شخص پہلے جا کر بستا ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنے لباس اور اپنے اوزاروں کا بڑا حصہ خود ہی بنائے اور اس مجبوری میں جو عادتیں پڑ جاتی ہیں وہ اکثر دوسری تیسری پشت تک ورثہ میں پہنچتی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ شمالی امریکہ خود صنعتی ترقی میں بڑی کوشش کرنے والا ملک ہے اور روز بروز اس کی اور زیادہ کوشش کریگا کہ اپنی مصنوعات کی منڈی کو خود ملکی صنعت کے لئے حاصل کر لے۔

لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ امریکہ کی مصنوعات کی منڈی جرمنی کے لئے بہت زیادہ

قابلِ لحاظ اور اہم نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف ہمارا خیال ہے کہ اکثر تعیش کی چیزوں کے لئے اور ایسی مصنوعات کے لئے جو آسانی سے نقل پذیر ہوتی ہیں اور جن میں مزدور کی اُجرت قیمت کا بیشتر حصہ ہوتی ہے یہ منڈی سب سے اہم منڈیوں میں ہے اور سال بہ سال اہم تر ہوتی جائیگی۔ ہم تو لیس یہ کہتے ہیں کہ جو جرمن شمالی امریکہ کے مغربی علاقوں میں ہجرت کر کے جاتے ہیں وہ جرمن مصنوعات کی مانگ کو بڑھانے میں معتدبہ مدد نہیں کر سکتے اور اس اعتبار سے وسطی اور جنوبی امریکہ کی ہجرت کو زیادہ ہمت افزائی کی ضرورت بھی ہے اور استحقاق بھی۔

یہ موخر الذکر ملک جن میں ٹکساس بھی شامل ہے زیادہ تر نوآبادیاتی مال پیدا کرتے ہیں صنعت میں یہ کبھی بھی نہ بہت ترقی کرینگے نہ کر سکیں گے۔ یہاں مصنوعات کی ایک بالکل اچھوتی اور بڑی منڈی فتح کرنے کے لئے ہے جس نے یہاں مضبوط تعلقات پیدا کر لئے وہ آئندہ ہمیشہ اسے اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔ ان ملکوں میں خود اپنی اخلاقی قوت نہیں ہے کہ تمدن کے کسی بلند تر مرتبہ پر پہنچ سکیں، منظم حکومتیں قائم کر سکیں اور انہیں استحکام بخش سکیں؛ یہ روز بروز اس عقیدہ پر پہنچیں گے کہ ان کی مدد باہر سے ہونی چاہیئے یعنی ہجرت کے ذریعہ لوگوں کے آکر بسنے سے۔ ان ملکوں میں انگریزوں اور فرانسیسیوں سے تو نفرت ہے کہ ایک تو یہ بہت مغرور ہوتے ہیں اور دوسرے قومی خودمختاری میں مداخلت کا رشک۔ جرمنوں میں اس کے بالکل مخالف صفات ہیں اور اس لئے ان سے محبت کی جاتی ہے۔ جمعیتہ محاصلی کی ریاستوں کو ان ممالک پر سب سے زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔

ایک متحدہ جرمن قنصلی اور سفارتی نظام یہاں قائم ہو جانا چاہیئے اور اس کے دفاتر میں

برابر خط و کتابت شروع ہو جانی چاہیئے، ضرورت ہے کہ نوجوان محققوں اور مفتشوں کو ان ملکوں میں سفر کرنے اور ان پر غیر جانبدارانہ رپورٹ دینے کی ترغیب دی جائے، نوجوان تاجروں کی ہمت افزائی کی جائے کہ جا کر ملک کو دیکھیں، نوجوان طبیبوں کی کہ وہاں جا کر مطب کریں، ضرورت ہے کہ کمپنیاں قائم ہوں جن میں حصے لیکر ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنے تحفظ میں لیا جائے، یہ کمپنیاں جرمن ساحلی شہروں میں بنیں، اور ان ملکوں میں بڑے بڑے علاقے خرید کر ان میں جرمن کاشتکار بسائیں، تجارت اور جہاز رانی کی کمپنیاں کھلیں جن کا مقصد ہو کہ ان ملکوں میں جرمن مصنوعات کے لیے نئی نئی منڈیاں پیدا کریں اور دخانی تجارتی جہازوں کے سلسلے قائم کریں، کان کنی کی کمپنیاں قائم ہوں جن کی غرض ہو کہ ان ملکوں کی عظیم الشان معدنی دولت سے تمتع کے لئے جرمن علم اور جرمن محنت کو کام میں لائیں۔ اراکین جمعیتہ کو چاہیئے کہ ہر ممکن طریقہ سے ان ملکوں کے باشندوں اور نیز ان کی حکومتوں کو اپنی طرف مائل کریں اور ان کے ذریعہ سے عام امن وامان، وسائل حمل ونقل، اور عام نظم پر اثر ڈالیں۔ بلکہ اگر ان ملکوں کی حکومتوں کو اس سے ممنون کیا جا سکے تو ان کی مدد کے لئے اچھی خاصی امدادی فوج بھیجنے میں بھی تامل نہ کریں۔

ممالک مشرق، یورپی ترکی اور ڈینیوب کے علاقوں میں بھی یہی سیاست برتنی چاہیئے، جرمنی کا اس میں بے حد فائدہ ہے کہ ان ملکوں میں امن اور نظم قائم ہو اور کسی اور جانب جرمنوں کی ہجرت نہ انفرادی حیثیت سے اس قدر سہل ہے نہ قومی حیثیت سے اس قدر مفید۔ ایرانی جھیل کے کنارہ تک جانے میں جو روپیہ اور وقت صرف ہوتا ہے اس

کے پانچویں حصہ میں ایک شخص فرانز ڈینیوب کے علاقہ سے اُٹھ کر مولڈیویا اور ولاچیا کو، یا سربیا کو، یا بحر اسود کے جنوب مغربی ساحل کو جا سکتا ہے۔ یہاں کے مقابلہ میں جو چیز اسے وہاں کھینچتی ہے وہ آزادی، امن اور نظم کی زیادتی ہے۔ ترکی کے موجودہ حالات میں جرمن ریاستوں کے لئے، بہ شرکت آسٹریا، یہ بات ناممکن تو نہ ہونی چاہیئے کہ حالات کو بہتر بنانے کے لئے ایسا اثر ڈالیں کہ جرمن مہاجر وہاں جانے سے نہ جھجکیں خصوصاً جبکہ حکومتیں خود نوآبادیاں بسانے کی کمپنیاں قائم کریں، ان میں حصے لیں اور انہیں ہمیشہ اپنے خاص حفاظت میں رکھنے کا وعدہ کریں۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی بستیاں جمعیتہ محاصلی کے ممالک کی صنعت پر تب ہی خاص طور پر مفید اثر ڈال سکتی ہیں، جب ان نوآباد مہاجروں کی زرعی پیداوار اور جرمن مصنوعات کے مبادلہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور اس مبادلہ کو سستے اور تیز وسائل حمل ونقل سے کافی مدد پہنچے، لہٰذا جمعیتہ کی ریاستوں کا مفاد اس میں ہے کہ ڈینیوب پر اِدھر سے اُدھر مال جانے میں آسٹریا ہر طرح کی آسانی پیدا کر دے! ڈینیوب میں دخانی جہاز رانی خوب زوروں میں شروع ہو، یعنی شروع شروع میں حکومتیں اس کی واقعی مدد کریں۔

بھلا اس سے زیادہ پسندیدہ اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ بعد کو جب جمعیتہ کی ریاستوں کی صنعت اور زیادہ ترقی کر جائے اور آسٹروی صنعت کے ہم پلہ ہو لے تو اپنی مصنوعات کے متعلق یہ دونوں معاہدہ کر کے ایک دوسرے کو مراعات دے دیں

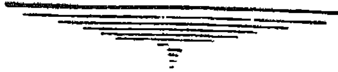
اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد آسٹریا اور جمعیتہ کی ریاستوں کا اس میں مشترکہ فائدہ ہوگا کہ ترکی صوبوں سے اپنی صنعت اور تجارت خارجہ کے لئے تمتع حاصل کریں۔

اس امید پر کہ جرمن ساحلی شہر اور ہالینڈ جمعیتہ محاصلی میں شریک ہو جائیں گے، پروشیا کو چاہیئے کہ ابھی سے ایک جرمن تجارتی جھنڈا بنا کر اور آئندہ جرمن بیڑے کی بنیاد رکھ کر کام کا آغاز کر دے اور آزما کر دیکھے کہ آیا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ یا پانچویں براعظم (آسٹریلیا) کے دوسرے جزیروں میں جرمن نوآبادیاں قائم ہو سکتی ہیں یا نہیں اور ہو سکتی ہیں تو کیونکر۔

اس آغاز اور ان آزمائشوں کے لئے نیز ان کاموں اور امدادوں کے لئے جن کا مطالبہ ہم نے پہلے کیا ہے جو وسائل درکار ہیں وہ اسی طریقہ سے ہو سکتے ہیں جس سے کہ انگلستان اور فرانس اپنی تجارت خارجہ اور قیام نوآبادیات کی امداد کے لئے، اور اپنے عظیم الشان بیڑوں کے قیام کے لئے وسائل حاصل کرتے ہیں یعنی نوآبادیاتی مال کی درآمد پر محاصل لگا کر۔ جمعیتہ کی اس کارروائی میں اتحاد، نظم اور قوت اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ جمعیتہ کی ریاستیں اس کا انصرام جہاں تک شمال اور سمندر پار کا تعلق ہے پروشیا کو اور جہاں تک ڈینیوب علاقہ اور مشرقی معاملات کا تعلق ہے آسٹریا کو سپرد کر دیں۔ مصنوعات اور نوآبادیاتی مال پر جو محصول اس وقت ہے اس میں اگر ۱۰ فی صدی کا اضافہ اور کر دیا جائے تو اسی سے سالانہ ۱۵ لاکھ کی رقم جمعیتہ کے تصرف میں آسکتی ہے۔ اور چونکہ مصنوعات کی برآمد بڑھنے سے یقین کے ساتھ توقع کی جاسکتی ہے کہ ہوتے ہوتے

جمعیتہ کی ریاستوں میں نوآبادیاتی مال کا صرف بڑھ کر موجودہ مقدار سے دُگنا اور تگنا ہو جائیگا اور اسی نسبت سے محاصل کی آمدنی میں اضافہ ہوگا لہٰذا مجوزہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیئے ان ریاستوں کے پاس کافی وسائل ہو جائیں گے بشرطیکہ یہ ریاستیں یہ اصول قائم کردیں کہ اس دس فی صدی محصول کے علاوہ محاصل درآمد کے اضافہ کا ایک حصہ بھی پروشیا کی حکومت کو ان مقاصد پر صرف کرنے کے لیئے دیا جایا کرے گا۔

جہاں تک ایک جرمن نظام حمل و نقل کا اور خصوصاً جرمن ریلوں کا تعلق ہے ہم اپنی اس تصنیف کا حوالہ دیئے دیتے ہیں جو خاص اس موضوع سے بحث کرتی ہے۔ یہ عظیم الشّان ترقی تو اپنا خرچہ آپ ادا کر دیتی ہے اور اس کے لیئے حکومتوں کی طرف سے جو کچھ درکار ہے وہ بس ایک لفظ میں ادا کیا جا سکتا ہے اور وہ لفظ ہے۔ **قوّتِ عمل**



شیخ نیاز احمد پبلشر نے اپنے
علمی پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام میاں فیروز الدین پرنٹر چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔